روحِ نظیر

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مؤلفہ

سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی

سنہ ۱۹۴۶ء

مطبوعہ آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ

گیا پرشاد اینڈ سنز

بکسیلر پبلشر - آگرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) دیباچہ

(طبع اوّل)

نفسیات کے محض سرسری مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان وقتاً فوقتاً مختلف کیفیات کے زیرِ اثر رہا کرتا ہے۔ کوائف ذہنی کی ماہیت پر غائر نظر ڈالنا اور اُن کی تکوین و انحطاط کی تشریح کرنا تنقید کا مبحث نہیں۔ تاہم اس تنوع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اِس موقعے پر اتنا بتا دینا لازمی معلوم ہوتا ہے کہ صفاتی اعتبار سے کیفیات کی کم از کم دو قسمیں ضرور کی جا سکتی ہیں، یعنی ایک تو وہ جن کو ہم اعلیٰ کہتے ہیں اور دوسری وہ جن پر اسفل کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہ اصول جس طرح افرادِ عامہ کے لیے صحیح ہے اسی طرح شاعر پر بھی صادق آتا ہے۔ والٹر پیٹر کا قول ہے کہ شاعر اعلیٰ اور اسفل کیفیات کا ایک مجموعہ ہوا کرتا ہے۔ یہ تباین فی نفسہٖ ذاتی نہیں بلکہ اضافی ہے اور درحقیقت مدارجِ غور و انہماک پر مبنی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ شاعر اپنے موضوع پر جیسی بسیط نظر ڈالتا اور اپنی تصنیف میں جس درجہ انہماک پیدا کرتا ہے

اسی حیثیت سے اُس کی کیفیات ذہنی کی بلندی اور پستی کے مدارج مرتب کئے جاتے ہیں۔ لیکن اِس فرق کے سمجھنے اور اس کی داد دینے کے لئے مزاج اور نفس کی حقیقی اور قرار واقعی تربیت کی ضرورت ہے۔ جو افراد انہماک و طمانیت نفس کی وساطت سے اس تربیت کے روبرو سر نیاز خم کردیتے ہیں اُن میں ایک استعداد پیدا ہوجاتی ہے جس کے قیام کا اثر لازمی طور پر اُن میں یہ صلاحیت پیدا کردیتا ہے کہ وہ صناعت تو پرحیات اور عوائد میں ہمیشہ ان اجزا کو جو وہبی، وجدانی اور مترنم ہوں، مصنوعی، کسبی اور جامد سے ممیز کرلیتے ہیں۔

ان الفاظ سے غالباً انتخاب کی غرض و غایت پر کافی روشنی پڑتی ہے اور اتنا ضرور واضح ہوجاتا ہے کہ اس تالیف کا مقصد صحیح کیا ہے اور مولف کس بات کو خصوصاً نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ مزید برآں انتخاب کے اور بھی متعدد فوائد ہیں جن کی صراحت اِس موقع پر کچھ ایسی ضروری نہیں۔ لیکن چند باتیں اتنی اہم ہیں جن پر کم از کم سرسری نظر ڈال لینا ناگزیر ہے۔ یقیناً کسی عقل سلیم کے مدعی کو دنیائے جدید کے باشندوں کے عموماً اور تعلیم یافتہ طبقے کے خصوصاً غیر معمولی انہماک اور کثرت مشاغل سے انکار نہیں ہوسکتا۔ قطع نظر اس سے ملک کا موجودہ سیاسی تلاطم اور قومی خیالات کا حیرت انگیز انقلاب ایسے بیّن واقعات ہیں جو کسی نوع نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ پس ایک بڑی جماعت ایسے افراد کی ہے جنھیں اِن وجوہ سے مطالعے کے لئے بہت کم وقت میسر آتا ہے۔ اِس لئے اِن کو اپنا عزیز و بیش قیمت وقت، ایسے ادب پر جو مصنوعی، کسبی اور جامد ہو ضائع کرنا صرف ناپسند ہی نہیں بلکہ ایسا کرتے ہوئے وہ درد بھی محسوس کرتے ہیں۔ لہذا اس صنف کے لوگوں کے تفنن طبع اور ورزش ذہنی کے لئے صرف منتخب پھول اور چیدہ جواہر پیش کرنا لازمی ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب افادی مطالعے کے لئے انتخاب کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے یہ اصلاح پیش کریں کہ انتخاب ایسا کام ہے جو پڑھنے والے کو بطور خود کرنا چاہئے۔ یہ اعتراض اپنے مقام پر درست اور ہر حیثیت سے معقول ہے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کا مذاق ادب

فطرتاً نہایت صحیح اور مکمل ہوتا ہے۔ یہ لوگ جبلتاً شعر کے حسین و ہمہ گیر عناصر کی جانب منجذب ہو سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسی حساس طبعیتیں بہت کم ہیں اور ایسے لوگ جن میں تربیت اور مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ جیسے معلم ذرائع بھی شعری حس بہ مشکل پیدا کر سکتے ہیں، زیادہ ہیں۔

لیکن یہ دونوں طبقے میرے مخاطب صحیح نہیں۔ طبقۂ اول کی سریع الاحساسی کسی بیرونی تحریک یا خارجی مدد کی محتاج نہیں۔ وہاں ہر نظر شعر اور ہر حس نغمے کا حکم رکھتی ہے۔ طبقۂ ثانی کا جمود ازل سے ناقابل شکست ہے۔ ارباب ذوق کی کوشش ان میں رقت و ترنم کی لطیف کیفیات برانگیختہ نہیں کر سکتی۔

ہمارا مخاطب ایک دوسرا گروہ ہے جو اپنی نوعیت میں ان دونوں سے جدا ہے۔ یہ وہ اہل مطالعہ ہیں جن میں نوجوان مبتدیان ذوق خصوصاً بکثرت شامل ہیں۔ یہ عجلت پسند بعض ان خشک و بدمزہ اجزا سے تنگ آکر جو تقریباً ہر سخنور کے کلام میں پائے جاتے ہیں شعری تفریح کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ بیٹھتے ہیں اور پھر کبھی اس غریب شاعر کی جانب توجہ مبذول کرنا گوارا نہیں کرتے۔ سب سے زیادہ مضر تو یہ ہے کہ بری رائے قائم کر کے اس کی ترویج اپنا اخلاقی فرض قرار دے لیتے ہیں۔ اس طرح ان محاسن کا خون ہو جاتا ہے جن کی داد صرف بالغ نظری سے دی جا سکتی تھی اور جس کے فقدان کا غریب شاعر کسی طرح ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

اس جگہ یہ جتانا ضروری ہے کہ وہ بلند پایہ مقامات جن کو سہواً یا کسی مغالطے کے زیر اثر سرسری طور پر ٹال دیا جاتا ہے اپنی ندرت کے اعتبار سے پڑھنے والے کے معلومات میں معتد بہ اضافہ، خیالات میں عظیم الشان ارتفاع اور مطلع نظر میں ایک وقیع اور سودمند اصلاح تجویز کرنے کے بوجہ احسن اہل ہوتے ہیں۔

اب مؤلف کا کام ہے کہ وہ ان خشک اور بدمزہ اجزا سے جن پر بعض اوقات مزخرفات کا اطلاق کیا جاتا ہے کلام کو پاک کر دے۔ بہت سے خصوصیات، بالخصوص کسل و انقباض کے لمحوں میں تفریح و شگفتگی پیدا کرنے کی بنا پر شعرا کی صحبت، دنیا میں بہترین صحبت ہے۔ لیکن یہ لوگ ہر وقت اپنے بہترین انداز سے مزین نہیں رہتے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ مناسب موقع تلاش کر کے بہ عنوان جمیل ان کی انجمن میں بار حاصل کریں ساتھ

ہی ساتھ مولف کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ خود ایک مرتبہ تعارف کرادے۔ اس کے بعد پڑھنے والے کو اس کی حالت پر چھوڑ دے کہ وہ اپنے تعلقات خود جاری رکھے یا ختم کردے۔ لیکن مؤلف کے مہیا کردہ مواد تفریح کے استعمال اور اس کے ذریعے جلب منفعت کی توقعات کے بارے میں اس مقام پر ارباب مطالعہ کو ایک اور خاص امر کی ہدایت کرنا ضروری ہے جو بیشتر نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ اسٹیل ایک بڑے مصور کا قول نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جس طرح بعض صورتیں بعض مصوروں کے لئے قلم کے لئے مخصوص ہوتی ہیں اسی طرح بعض عنوان بعض شعرا کا حصہ ہوا کرتے ہیں"۔ یہ اصول من وعن انتخاب مطالعہ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی شاعر کے کلام کا کما حقہ لطف نہیں اٹھا سکتا جب تک اس میں یہ اہلیت نہ ہو کہ وہ اس شاعر کی زندگی میں اس کا رفیق و ہمدم بن سکتا۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ کسی شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہونا یا نہ ہونا مزاج اور افتاد طبیعت پر بہت کچھ منحصر ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ہی شاعر یا ایک ہی تصویر کو پسند نہیں کرتا۔ مزاج ہمارے دوستیوں کو ہو بہو بانٹ میں طے کرتا ہے اور مزاج ہی کے فیصلے پر ہمیں ادبی مشاغل کی بنا قائم کرنی چاہئے۔

لیکن باایں ہمہ مزاج اور دماغ کی تربیت جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے قرین امکان ہے۔ اس شخص کو جو کسی شاعر کے کلام میں تاثیر اور دلکشی نہیں پاتا یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے تئیں اس کی ہمجلیسی کے قابل بنائے۔ بسا اوقات عدم وقوف اور فقدان لذت نااہلی کے باعث نہیں ہوتا بلکہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ پس اگر ابتدا میں کسی شاعر کے داخلی معانی ہماری دسترس سے باہر معلوم ہوں تو ہم کو مایوس نہ ہونا چاہئے۔ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب حیات کی کشمکش جو جملہ امور کی معلم ہے کسی سرور یا الم کے موقعے پر ان سارے حقائق کو یکایک منکشف کر دیتی ہے جو ہماری کم نگاہی کے سبب ہم سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ شادمانی کے لمحوں میں اور غم کے مواقع پر بھی بالیقین شعرا کی صحبت ہمارے لئے بہترین نعمت اور بدرجہ اتم مسرت بخش ہے۔ شعر زندگی کے ان دشوار گزار راستوں میں جن سے کوئی شخص بیشتر سے واقف

نہیں ہوتا ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے اگر ہم حسن پرستی، زندہ دلی اور محبت نوازی سے جو شعر کی جان ہے اپنی نظریں کشادہ، اپنا دماغ حاضر اور اپنی ہمدردیاں سرگرم رکھیں۔

یہ جملہ باتیں جو اب تک بیان کی گئیں اصولاً ہر اعتبار سے نظیر پر صادق آتی ہیں۔ اس بنا پر اور اس کے علاوہ اور بہت سے وجوہ کی بنا پر نظیر کے کلام کا انتخاب اس حیثیت اور شان سے شائع کرنا نہایت ضروری تھا۔ باوجود ایسا نغزگو اور عدیم المثال شاعر ہونے کے ملک و ملت اب تک نظیر کی تمام و کمال روشناس نہیں۔ بلکہ موجودہ واقفیت اگر وہ کسی نوع واقفیت کہی جا سکتی ہے، جہل کی صورت میں نمایاں ہوتی تو زیادہ سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ قابل افسوس تو یہ امر ہے کہ ارباب ذوق اور اہل علم کو بھی اس بلند پایہ سخنور کے کلام پر اتنا عبور نہیں جتنا دوسرے اساتذہ کے کلام پر ہے بلکہ اُن کا تغافل اور عدم توجہی کسی طرح عوام الناس سے کم نہیں۔ اُردو زبان باوجود اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے شاعری کو اپنے مربیانہ فیضان سے ہمیشہ مالامال کرتی رہی ہے۔ اُردو بولنے والوں کو شعر و سخن سے ہر زمانے میں جو دلچسپی رہی ہے وہ شعرا کی کثرت سے صاف ظاہر ہے۔ اس صورت میں نظیر سے ناواقفیت اور بے پرواہی اور بھی تعجب انگیز ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ ذوقِ عام، صحیح مذاق شعر و ادب نہ تھا اور اس سے ہمارے استعجاب کا پورا جواب مل جاتا ہے۔

بہر حال اب مطالعہ کرنے والوں کو سہولت بہم کرنے اور دماغوں کو نظیر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہترین نظموں کا ایک مختصر مجموعہ پیش کیا جائے جو آئندہ ارباب تلاش کے نزدیک تحقیق و تنقید کا پیش خیمہ بن سکے۔ کسی شاعر کا مطالعہ کرتے وقت اس کا ضرور لحاظ رکھنا چاہیے کہ اس کے کلام کا کم از کم اتنا حصہ ضرور پڑھ لیا جائے جس سے زندگی اور آرٹ کے متعلق اس کے نقطۂ نظر کا کافی اندازہ ہو سکے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کلام کا وہ حصہ پیش نظر ہو جس میں شاعر نے پورا پورا زور تخئیل صرف کیا ہے۔ میں نے اپنی لیاقت اور استعداد کے مطابق اسی نوعیت

کا کلام منتخب کرنے کی کوشش کی ہے ۔ تاہم متبعین کے لئے ابھی بڑی گنجائش باقی ہے ۔ یقین ہے کہ یہ ترغیب بار ور ہوگی اور اس بنیاد پر نئی نئی عالی شان عمارتیں تعمیر کی جائیں گی ۔

بحمد اللہ اب ملک میں بیداری کے آثار نمودار ہیں اور استقلال کی روشنی دلوں پر مسلط ہو چکی ہے اس لئے قوی امید ہے کہ ملک خود اپنے پوشیدہ جواہر کو گمنامی کی تاریک کانوں سے کھود کھود کر نکالے گا اور ہر جوہر قابل کی اس کی حیثیت اور محاسن کے مطابق پوری پوری داد دی جائے گی ۔

جدید تمدن سے روشناسی اور مغربی ادبیات کے ورود نے ہندوستانی مذاق میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر دی ہے ۔ علاوہ بریں مغربی و مشرقی خیالات کے تواصل سے جو ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا ہے وہ بھی بالذات نہایت لطیف اور کیف آور ہے ۔ بہرحال انگریزی ادبیات میں جس طرز کی نظمیں پائی جاتی ہیں وہ اُردو زبان میں میسر نہیں ۔ ہر چند موجود شعرا اس جانب مائل ہیں تاہم اساتذہ کا کلام جواب بہت سے وجوہ سے ادب القدما کی حیثیت سے ہمارے پیش نظر ہے اس طرز سے خالی ہے ۔ یہاں اساتذہ کو سر نیاز خم کرنا پڑتا ہے لیکن اُردو زبان کا درفش سرورری کسی طرح سرنگوں نہیں ہوتا کیونکہ یہاں سے نظیرؔ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نظیرؔ کی شخصیت سب سے بلند نظر آتی ہے اور یہیں سے نظیرؔ کی فوقیت کا ثبوت اور معترضین کا جواب دونوں بہم ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ مغرب پسند حضرات کا اعتراض رد کرنے کے لئے نظیرؔ کا صرف وہ کلام پیش کرنا زیادہ قرین مصلحت ہے جو اُن کے خیال میں قطعی مغربی انداز پر ہے اور جس کو مشرقی چاشنی کے متوالے خالص اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں ۔

اس انتخاب کی ایک سیاسی غایت بھی ہے جو کسی عنوان مفاد سے خالی نہیں ۔ نظیرؔ کا کلام دیکھ کر اور اس کی ہمہ گیری سے شاعر کی بے تعصبی کا اندازہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ معلوم ہوگا کہ قرون ماضیہ میں ہندوستان کی ایک قوم دوسری ہمسایہ قوموں کے جذبات کا یہاں تک پاس و لحاظ کرتی تھی کہ شعرا ارادۃً یا اضطراراً ان کا اظہار اپنا فرض منصبی قرار دے ۔ بیتے تھے بلکہ یہ بھی واضح ہوگا کہ اس سرزمین پاک کے بے جرم و خطا

مطعون باشندے اس قسم کے شریفانہ حیات سے بے بہرہ اور محروم نہیں جن پر ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور قوموں کے باہمی اتحاد و مصالحت ہمدردی اور رواداری کی بنیاد رکھی جا سکے۔ یہ غیر فانی نکتہ نظیر کے کلام کا زندہ معجزہ ہے اور ملک کے بد اندیشوں کا جو ہمیشہ اختلاف کے حامی اور شکر رنجیوں کے معاون رہے ایک دندان شکن جواب ہے۔

نظیر کا کلام ایک زخار سمندر ہے جس میں ہر قسم کے موتی بحد و شمار دستیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے انتخاب کرنے والے کو بہت زیادہ گنجائش ہے۔ اسی فیض عام کی برکت سے اس تالیف میں بھی ہر مذاق کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہندو، مسلم، شیعہ، سنی، سکھ ہر مذہب اور عقیدے کے پیرو کے لئے کافی دلچسپی کا التزام کیا گیا ہے۔ نظموں کی نوعیت اور مختلف مذاقوں کی رعایت کا ذکر لاحاصل معلوم ہوتا ہے۔ مطالعے سے ہر بات خود ظاہر ہو جائے گی۔

نظموں کے ناموں کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے اور میں معترف ہوں کہ اس بارے میں تحقیق دشوار ہے۔ مختلف نسخوں میں مختلف عنوان دیئے ہوئے ہیں۔ میں نے نظیر کا تجویز کردہ عنوان معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا سراغ کچھ تو پرانے نسخوں سے لگایا ہے اور کچھ نفس مضمون سے اندازہ کیا ہے۔ پھر بھی پورے یقین کے ساتھ صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس انتخاب میں جو نظمیں شامل ہیں ان کی سات مختلف نسخوں سے صحت کی گئی ہے۔ لیکن شہباز کے ایڈیشن پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے۔ مگر جہاں ہر نسخے میں اختلاف واقع ہوا ہے اور شہباز کے ایڈیشن سے بھی کافی تسلی نہیں ہوئی تو میں نے اکبر آباد کا باشندہ اور یہاں کی ہر قسم کی زبان سے واقف ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے کو ترجیح دی ہے۔ واللّٰہ اعلم بالصواب

اس تالیف میں عموماً اور دیباچہ نگاری میں خصوصاً انگریزی ادبیات سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔ دیباچہ میں متعدد انگریزی انشا پردازوں اور حقیر مؤلف کے خیالات کا امتزاج ہے۔ بعض جگہ فقروں کا بجنسہ ترجمہ کر دیا گیا ہے جو واوین کے اندر بند ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر عبارت کا ربط قائم رکھنے اور دوسری انسانی ضروریات

کے باعث یہ مقامات علیحدہ نہ رکھے جاسکے اور اس طرح مخلوط ہوگئے کہ قوسین کے اندر بھی بند نہیں۔ ممکن ہے عالی حوصلہ حضرات اس پر انگشت نما ہوں لیکن اس بارے میں صرف اس قدر گزارش کرنا غالباً عذر گناہ نہ سمجھا جائے گا کہ اُردو زبان خصوصاً نثر ابھی بہت کم مایہ ہے۔ دوسری زبانوں اور ادبیات سے خیالات کا اقتباس کرکے اپنی زبان میں شائع کرنا اور اُس کو سرمایہ دار بنانا کسی نوع مفاد اور دلچسپی سے خالی نہیں اور معیوب بھی نہیں تصور کیا جاسکتا۔

جون سنہ ۱۹۲۲ء
آگرہ

مخمور اکبرآبادی

دیباچہ (۲)

(طبع دوم)

روح نظیر پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب چوبیس ۲۴ برس کے بعد اس کا دوسرا نقش شائع ہو رہا ہے۔ صرف ایک ہزار جلدوں کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے لئے، جس میں سے کم و بیش تین سو نسخے احباب اور اعزا کے حلقے میں مفت تقسیم ہوئے ہوں، یہ طویل مدت بڑی ہمت شکن ہے۔ لیکن اس احساس کی بنا پر کہ نظیر کے مطالعے کا ذوق روزافزوں ترقی کر رہا ہے اور اس اعتماد پر بھی کہ اس ذوق کے نشو و نما میں روح نظیر نے بھی قدرے قلیل حصہ لیا ہے، اس صحیفے کی دوسری اشاعت پیش کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ اس اشاعت کے متعلق ذیل کی باتوں پر توجہ دلانا ضروری ہے:-

(۱) پہلی اشاعت صرف چالیس نظموں پر مشتمل تھی۔ اس کی انتالیسویں نظم جو حافظ کی ایک غزل کی تضمین ہے، اس مرتبہ حذف کر کے، گیارہ مزید نظمیں اضافہ کر دی گئی ہیں۔ اس طرح جدید اشاعت میں پچاس نظمیں شامل ہیں۔

۲- پہلی اشاعت میں غزلیں شامل نہ تھیں لیکن اس میں بہت سی غزلیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ ان غزلوں کو تین حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے:-

(۱) غزلیں

(۲) مسلسل غزلیں

(۳) موضوعی غزلیں

۳- غزلوں کے علاوہ چند تضمینیں اور مستزاد بھی شامل کیے گئے ہیں۔

۴- جو نظمیں بڑھائی گئی ہیں، اُن پر تبصرہ بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ "پری کے سراپے" پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر نوع کی غزلوں، مستزادوں اور تضمینوں پر بھی تبصرہ کر دیا گیا ہے۔

۵- پہلی اشاعت میں نویں نمبر کی نظم کا نام "ذکر مرغاں" ہے۔ اس اشاعت میں اس کا نام بدل کر "چڑیوں کی تسبیح" رکھ دیا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی نام نظیر کا رکھا ہوا نہیں ہے۔ "برسات کی بہاریں"، "کلجگ" "مفلسی" اور پہلی "ہولی" کے بہت سے بند، جو پہلی اشاعت میں شامل نہ تھے، اس اشاعت میں بڑھا دیئے گئے ہیں۔ لیکن شہباز کے نسخے کے مقابلے میں چھ بند "برسات" میں، چار "مفلسی" میں اور چھ پہلی "ہولی" میں اب بھی کم ہیں۔

۶- پہلی اشاعت کے وقت کئی مختلف نسخوں سے صحت کی سعی کی گئی تھی۔ بسا اوقات شہباز پر حصر کیا گیا تھا۔ اب عزیزی دمجی ضیاسے عباس ہاشمی صاحب ضیائی بدایونی صدر یہ صاحب ریاست گوالیار کی وساطت سے ایک قلمی نسخہ میسر آیا ہے۔ یہ نسخہ گوالیار کے ایک قدیم فرانسیسی خاندان کے کتب خانے میں اب تک محفوظ تھا۔ چنانچہ اس اشاعت کی صحت میں اس نسخے پر حصر کیا گیا ہے۔

۷- اس نسخے میں بہت سی غیر مطبوعہ غزلیں میسر آتی ہیں۔ یہ نسخہ ابتداءً دیوان کے طور پر مرتب کیا گیا تھا، لیکن اصل مرتب کرنے والے یا کسی دوسرے شخص نے غالبًا بعد کو اس میں کچھ نظموں کا بھی اضافہ

کر دیا ہے۔ اس لئے اس نے جزواً کلیات کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بہر حال اس سے غزلوں اور نظموں دونوں کی صحت میں بڑی مدد ملی ہے۔

۸۔ اس اشاعت میں صحت کا بڑا التزام کیا گیا ہے لیکن کہیں کہیں اب بھی بس نہیں چلا۔ چنانچہ غزلوں کے بعض مصرعے جن کی صحت نہ ہو سکی درج نہیں کئے گئے۔ پہلی اشاعت کی کتابت کی غلطیوں اور دوسری خامیوں کی بھی اس اشاعت میں صحت کر دی گئی ہے، لیکن اس اشاعت میں بھی بعض کتابت کی خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔

۹۔ پری کے سراپے میں شہباز ایڈیشن اور قلمی نسخے میں بڑا فرق ہے۔ شہباز کے یہاں کل اٹھارہ اور قلمی میں بیس بند ہیں۔ قلمی کا بارہواں اور تیرہواں بند شہباز کے یہاں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بندوں کی ترتیب، بندوں میں مصرعوں کی ترتیب اور مصرعوں میں لفظوں کی ترتیب میں بھی فرق ہے۔ کہیں کہیں، دونوں کے الفاظ مختلف ہیں۔ تیسرے بند کے پہلے مصرعے میں شہباز نے "خوب" درج کیا ہے اور قلمی میں "زور" استعمال ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ پروفیسر شہباز جیسے اہل نظر اور نظیر شناس نے "خوب" کو "زور" پر کیسے ترجیح دیدی۔ "زور" نظیر کا محبوب لفظ ہے اور عہد کی زبان کا سچا نمونہ ہے۔ اسی طرح شہباز نے اپنے نویں اور دسویں بندوں کے پانچویں مصرعے میں، دونوں جگہ "مونڈھوں" استعمال کیا ہے۔ نویں میں یہ لفظ بالکل برمحل ہے لیکن دسویں میں سیاق اس کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں "مونڈھوں" کی جگہ "کولھوں" ہونا چاہئے۔ نظیر ایک ہی لفظ کو دو جگہ لانا پسند نہیں کرتا۔ قلمی نسخے کا شہباز ایڈیشن سے ہر اختلاف نظیر کی زبان اور مزاج شعری سے پوری مطابقت کرتا ہے۔ یہ شہادت اس کی صحت اور سند کی بڑی دلیل ہے۔ اس بنا پر ہر جگہ قلمی نسخے کے اندراج کو ترجیح دی گئی ہے لیکن میں اپنے فیصلے کو قول فیصل کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ ادبی مسائل مزید ذاتی تحقیق و تفتیش کے ہمیشہ محتاج رہتے ہیں۔

۱۰۔ "بھونچال" نامی نظم میں شہباز کے نسخے میں صرف اٹھارہ بند ہیں اور قلمی میں پچیس۔ اس کے علاوہ

بعض مصرعوں میں بھی اختلاف ہے۔ اسی طرح "جوانی اور بوڑھاپے کی لڑائی" اور "مفلسی" نامی نظموں میں بھی دونوں نسخوں میں اختلاف ہے۔ میں نے بہر عنوان قلمی نسخے کا اتباع مناسب سمجھا ہے۔

۱۱۔ نظموں میں جہاں مکالمے کی صورت پیدا ہوگئی ہے وہاں واوین کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ "کرشن جنم" "جوگی نامہ" اور "جوگن نامہ" نظموں میں مکالمے کی کثرت ہے۔ ان میں خصوصیت سے اس نوع کا التزام کیا گیا ہے۔

۱۲۔ نظیر کے جو مصرعے کسی عنوان غلط معلوم ہوتے ہیں وہ حقیقت میں غلط نہیں۔ افسوس ہے کہ ہم تک اس صورت میں پہونچے ہیں۔ زبان کے تغیر، زمانے کے لازمی ردو بدل اور کاتبوں کی سہل انگاری نے بعض الفاظ اور محاوروں کو اس قدر مسخ کردیا ہے کہ اصل تک پہونچنا آسان کام نہیں رہا۔ اس کا الزام نظیر کے سر تھوپنا بے انصافی ہے۔ اس لئے نظیر پسندوں کو صحت کی کوشش میں برابر مصروف رہنا ضروری ہے۔ نظیر کا صحیح لفظ بہم کرنے کے لئے نظیر کے عہد کی زبان ہر وقت پیش نظر ہونی چاہیے۔

۱۳۔ اس اشاعت میں فرہنگ اور حواشی کی ضخامت وہی ہے جو پہلی اشاعت میں تھی اور حواشی کی تاریخی صداقت کی ضمانت نہیں کی جاتی۔ جو نظمیں اور غزلیں اس میں اضافہ کی گئی ہیں ان کی فرہنگ اور حواشی مرتب نہ کئے جاسکے۔ "موت" نامی نظم مطبع کی غلطی سے شامل ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے اس پر تبصرہ بھی نہیں کیا گیا۔

۱۴۔ اس کتاب کا مسودہ، اکتوبر ۱۹۴۲ء میں مطبع کو سپرد کردیا گیا تھا مگر اب تک اس کے تکملے اور اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ دیکھئے کب تک اس قید سے آزاد ہو۔

---

(۲) مؤلف کا یہ پرانا خیال کہ آزاد نے نظیر کے باب میں سہو ہوا (صفحہ ۶) اب تک بالکل بدل چکا ہے۔

سہو کے امکان کی جگہ سہو عمد نے لیلی ہے۔ آب حیات میں جگہ نہ دے کر آزاد نے دانستہ نظیر کی اہانت کی کوشش کی ہے۔ وہ اگر دیانت سے نظیر کو شاعر نہیں مانتا تو اس کے ذوقِ شعر فہمی پر حرف آتا ہے۔ نظرانداز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نظیر کو جدید رنگ کی شاعری کا پیش رو تسلیم کرنے کے لئے طیار نہ تھا۔ اگر یہ وجہ بھی غلط ہے تو یہ الزام مسلم ہے کہ محض عامۃ الورود خیالات سے متاثر ہو کر آزاد نے اپنی ناقدانہ بصیرت کو پس پشت ڈال دیا اور نظیر کے متعلق غور و فکر، تحقیق و تفتیش کی سعی نہ کی۔

---

(۳)

انجمن ترقی اردو نے ۱۹۴۲ء میں 'مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا مرتب کردہ' دیوان نظیر شائع کیا ہے۔ اس موقعے پر 'اس مجموعے کے متعلق حسب ذیل گزارش بے محل نہ ہو گی۔

۱۔ مرزا صاحب نے اپنے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے کہ ان کے مرتب کردہ دیوان میں نظیر کا کل غزلیہ کلام شامل ہے۔ یہ خیال ذیل کے وجوہ سے غلط ہے :۔

(۱) ضیائے عباس ہاشمی ضیائی بدایونی والا نسخہ، جس سے میں نے اس اشاعت کے لئے انتخاب کیا ہے، بہت سی ایسی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے جو اور کہیں میسر نہیں آتیں۔

(۲) مولوی عابد علی صاحب شاہ گنج آگرہ کے ذخیرے میں جو خود ان کا مرتب کردہ ہے، بہت سا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔

(۳) منشی درگا پرشاد مہرہ ایڈوکیٹ ورئیس پنی گلی آگرے کے مرتب کردہ سرمائے میں بہت سا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔

(۴) ان کے علاوہ اور بھی چند مقامات کا ذکر روایتاً سنا گیا ہے مگر ان کے متعلق حتم و یقین کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً یہ کہ :۔

(الف) پنڈت کیلاش ناتھ کنزرو مرحوم وکیل سرکار و رئیس اکبرآباد، کے قبضے میں بہت سا غیر مطبوعہ کلام تھا جس کا بیشتر حصہ پورے دیوان حافظ کی تضمینوں پر مشتمل تھا۔ کلام میں حافظ کی تضمینوں کی موجودگی اس روایت کو قرین قیاس بناتی ہے۔ بہر حال، مجھے اس کلام کا پتہ نہ لگ سکا۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو وہ کلام اس وقت بھی کسی نہ کسی کے قبضے میں موجود ہے۔

(ب) بابو رام گوپال ایڈووکیٹ سہارنپور کے قبضے میں کچھ کلام ہے۔ یہ اسی کھتری خاندان کے چشم و چراغ ہیں، جہاں میاں نظیر پڑھانے جایا کرتے تھے۔ ان کے پاس کلام کی موجودگی نہ صرف قرین قیاس ہے بلکہ یقینی ہے۔ خود انھوں نے اور ان کے بعض عزیزوں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے مگر اب وہ کسی مصلحت سے بات ٹالتے ہیں۔ ایک مستند تصویر بھی، ان کے قبضے میں بتائی جاتی ہے۔ مگر اس ذخیرے تک میری رسائی نہ ہو سکی۔

(ج) بہ قول مولوی عابد علی صاحب، بندرابن کے کسی حلوائی یا کنجڑے کے پاس بہت سا غیر مطبوعہ کلام موجود ہے۔

(د) مختلف لوگوں کو زبانی یاد ہے جو سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ ان حافظوں میں، پھیری کے فقیر، قلندر، خونچے والے اور چناجور گرم والے بھی ہیں۔

(۵) نثر میں، سہ نثر ظہوری کے طرز کی کئی نثریں ہیں۔ ان میں سے حسن بازار اور قدرتیں دو کا حوالہ پروفیسر شہباز نے دیا ہے۔ ان دونوں کے قلمی نسخے اور ان کے علاوہ دو اور جو نہایت بوسیدہ اور کرم خوردہ ہیں خود میرے پاس موجود ہیں۔

(۶) بہر حال جب تک ان سب ذرائع سے جمع کر کے، سارا کلام ایک جگہ شائع نہ کیا جائے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا سا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

۲ - کتاب کی کتابت و طباعت ناقص ہے۔ حیرت ہے کہ انجمن نے جو کثیر سرمائے اور بیش از بیش ذرائع کی مالک ہے، اردو کے نظیر جیسے رکن اعظم کے کلام کو، ایسی بد دلی سے شائع کرنا جائز رکھا۔

۳ - انتخاب میں کسی خاص اصول یا ترتیب کو مد نظر نہیں رکھا گیا اور دیباچے میں محض عامۃ الورود باتوں پر نظر ڈالی گئی ہے جن سے کوئی بصیرت پیدا نہیں ہوتی۔ نظیر جیسے شاعر کا کلام اس سے بہت زیادہ گہرے، تحقیقی و تنقیدی مطالعے کا مستحق ہے۔

۴ - نظیر کو محض روایتی نقطۂ نظر سے دیکھ کر بورژوا ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

۵ - ۳۱ صفحے پر مرزا صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ نظیر نے غالب کے مضمون کو الٹ دیا ہے۔ یہ بیان فاش تاریخی غلطی ہے۔ نظیر، غالب سے کم و بیش ساٹھ برس متقدم ہے۔ نظیر نے ۱۸۳۰ء اور غالب نے ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے مضمون لکھتے وقت، دونوں کے عہد حیات پر غور نہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود غالب نے نظیر کا مضمون الٹ کر باندھا ہے۔ غالب کے کلام میں، اس نوع کے توارد کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ تبصرے میں، اس موضوع پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

خاتمے میں ایک بات عرض کر دینی ضروری ہے۔ میں نے کئی سال کی متواتر محنت کے بعد نظیر پر ایک دوسری کتاب مرتب کی ہے، جس کا نام نظیر نامہ ہے۔ یہ ضخیم کتاب نظیر کے شاعرانہ فلسفۂ نظر کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں مکمل ہو چکی ہے۔ اگر کاغذ کا یہ قحط اور کتابت و طباعت کی یہ دشواریاں حائل نہ ہوتیں تو یہ کتاب بھی اب تک شائع ہو جاتی۔ میں برابر کوشش کر رہا ہوں کہ جلد سے جلد نظیر نامہ شائع کر سکوں۔

نئی دہلی

مئی ۱۹۴۶ء

مخمور اکبر آبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۳) فہرست مضامین

مقدمه

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدمہ (۳)

تمہید | شاعری کے محاسن کا تذکرہ کرتے ہوئے آرنلڈ ایک مقام پر رقم طراز ہے کہ شاعری "تنقید زندگی" ہے۔ اس دعوے کی حقیقت نمائی اور صداقت پر جو بین ہے اگر یقین کر لیا جائے تو شاعری کی ضرورت تسلیم کر لینا ہر قبیل سے لازم آتا ہے۔ اس لئے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا وجود مہذب قوموں کے لئے ناگزیر ضروریات حیات میں سے ہے اور اس کی ترقی قومی حیات و عوائد کی ترقی کے پہلو بہ پہلو رہتی ہے۔ جس طرح کوئی قوم فلسفی اور مقنن کی دماغی و ذہنی مساعی سے بے نیاز نہیں رہ سکتی اسی طرح شاعر کی روح پرور خدمات قومی ضروریات سے حذف نہیں کی جا سکتیں۔ اگر فلسفی اپنی عزیز عمر اور تمام ترقوتیں

مقصد حیات، اسباب فلاح اور وسائل نجات کی تلاش و جستجو کے لئے وقف کر دیتا اور مقنن، بہبود و امن عامہ کو مدنظر رکھ کر کامل ترقی اور اعلیٰ معیار حیات تک پہونچنے کے ذرایع بہم کرنے کی کوششیں کرتا اور شاہراہ سعی و عمل پر بہ اسلوب احسن قدم زن ہونے کے لئے قواعد منضبط کرتا ہے، تو شاعر بھی اسی شغف و انہاک کے ساتھ قومی غیرت و حمیت کو زندہ اور احساس قومیت کو جو حیات قومی کے لئے غالباً سب سے زیادہ ضروری عنصر ہے، بیدار رکھتا ہے۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت اور ہر لحظہ ملک کے حیات کے مد و جزر سے باخبر رہے اور اخلاق کی درستی میں نمایاں حصہ لے۔ مردہ آرزوؤں کو زندہ کرنا، پست ہمتوں کو ابھارنا اور خفتہ جذبات میں تلاطم و ہیجان پیدا کرنا شاعر کا فرض اولین ہے۔ شعر فطری وجدان کو برانگیختہ کرتا ہے، طبیعتوں کو جوش اور ولولہ، خیالات کو جدت اور لطافت اور دلوں کو مسرت اور تازگی بخشتا ہے۔ جس قوم کا ذوق شعری کند ہو جائے سمجھ لو کہ اس کے آثار حیات زائل ہو چکے اور وہ تنزل کی جانب مائل ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قوم کو زندہ اور باخبر رکھنے اور اس میں جد و جہد کی روح پھونکتے رہنے کے لئے شاعر کی شخصیت اتنی ہی ضروری ہے جتنی فلسفی و مقنن کی۔ لیکن دراصل ان سب سے زیادہ ضروری نقاد کا وجود ہے، جو ہر چیز کو نقد کی روشنی میں پیش کر کے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتا ہے۔ تنقید وہ کسوٹی ہے جس سے شعر کے حسن اور قبح کا اندازہ کیا جاتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر نے کہاں تک اپنا فرض انجام دیا اور اس کی شاعری کس حد تک شاعری کہی جانے کی مستحق ہے۔ اس وقت نظیر اور نظیر کا کلام ہمارے پیش نظر ہے۔ اب ہم نقد کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں گے کہ نظیر کیا تھے اور ان کا کلام کیا اہمیت رکھتا ہے۔

گمنامی نظیر کا نام لیتے ہی جو چیز سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ ان کی گمنامی ہے۔ نظیر کو گلشن جناں کی سیر کرتے ہوئے تقریباً ۹۴ برس ہو گئے۔ یہ مدت اتنی کافی ہے کہ اگر ابنائے وطن اس مرحوم سخنور کی طرف توجہ کرتے تو تحقیق اور تنقید کا بڑا ذخیرہ ارباب مطالعہ کے قبضے میں ہوتا۔ ایک صدی کی مدت اتنی کافی ہے جس میں زندہ اور باخبر قوموں کے شعرا مدارج شہرت و قبولیت طے کر کے آسمان عروج و سربلندی کے ستارے بن جاتے ہیں اور ان کے کلام کا شمار ادب القدما کی برگزیدہ فہرست میں ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہندوستانی ادب قدیم کے لئے جو اپنے حسن میں کامل اور اپنی

نوع میں یگانہ ہے ہنوز روزِ اول ہے۔ حیف ہے اس ملک اور ملت کی خفتہ بختی پر جس نے اپنے گوہرِ یک دانہ کو گردِ گمنامی سے اس طرح آلودہ کر رکھا ہو۔ پورے یقین کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ نظیر کی حیات میں ان کی قدردانی کا کیا عالم تھا۔ اتنا ضرور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ساٹھ ستر برس کی مدت میں جیسا روح فرسا اور جوہر کُش برتاؤ اُن کے ساتھ کیا گیا اس سے بدرجہا بہتر قدردانی غالباً ان کی حیات میں ہوئی ہوگی۔ لیکن اس پر بھی بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظیر فی الحقیقت جس قدر قدردانی کے مستحق تھے اتنی قدر ان کی حیات میں بھی نہیں ہوئی۔ تاریخ ادب اُردو اس امر کی شاہد ہے کہ ذوقِ شعری نے اس وقت تک ارتقا کی اس منزل میں قدم نہ رکھا تھا جہاں سے نظیر کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ بلکہ شاعری ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل بھی طے نہ کر چکی تھی کہ اس فطری مُغنی نے اپنے آلہامانہ نغمے چھیڑ دیئے۔ زمانے کی بھونڈی قدامت نواز طبیعت کسی اور طرف مائل تھی اور ان کے نفیس و اختراع پسند خیالات کا رجحان کسی اور جانب تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی تیز رفتاری نے ادبیات کے سُست رو کارواں کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا۔ پس اس طرح نظیر تو اپنے ہی وقت میں روشِ زمانہ سے بہت آگے نکل گئے لیکن اہلِ ملک میں یہ صلاحیت اتنی پیدا نہ ہو سکی کہ اُن کی کُنہ بیان کو سمجھتے اور اس کی مناسب داد دے سکتے۔ ہاں ایک نئی اور دلچسپ چیز سمجھ کر تھوڑی بہت واہ واہ ضرور کرتے رہے۔ نظیر کے معاملے میں اتنی سخت حق تلفی اور انصاف کا خون ہونے کی غالباً یہی سب سے بڑی تاریخی وجہ ہے جس تک رسائی ممکن ہے۔ مگر چونکہ وہ ایک مستغنی مزاج والے اور غیر ستایش پسند بزرگ تھے انھوں نے کبھی اس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اپنے کو جس کام پر مامور سمجھتے تھے وہ کام انھوں نے ہمیشہ نہایت اطمینان و خاموشی سے انجام دیا اور جو پیغام قسامِ ازل نے انھیں ودیعت کیا تھا عمر بھر اس کی تلقین کرتے رہے۔ جدید تمدن کی معرفی نے نظیر کے محاسن کو حقیقی روشنی میں پیش کیا ہے اور اب ہمارے نزدیک وہ وقت آگیا ہے جب ان کی پوری پوری قدرشناسی کی جائے گی۔

کوئی بڑا شاعر اتنا گم نام نہیں

نظیر کی مخصوص سربلندی اور انتہائی گمنامی دونوں کو ایک جا جمع کر کے لازمی طور پر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کوئی بڑا شاعر اتنا گمنام نہیں۔ ہر چند متعدد فارسی تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے لیکن تفصیل کے ساتھ کسی میں نہیں اس لئے اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ البتہ پروفیسر شہباز نے جو تذکرہ مرتب کیا ہے اس سے بہت

کچھ حالات کا پتہ چلتا ہے۔ عوام اور سطح نظر گروہ تو ایک طرف بالغ نگاہ اور اصحاب تحقیق کی نظر سے نظیرؔ کا پوشیدہ رہنا بظاہر بہت تعجب انگیز ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد صاحب تذکرہ آبِ حیات کی وسیع تلاش و جستجو سے نظیرؔ کے پوشیدہ رہنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آزاد نظیرؔ کو شاعر نہ سمجھتے تھے دوسرا یہ کہ اُن سے سہو ہوا۔ آزاد کی جوہر شناس نگاہ کے متعلق یہ شبہہ کرنا کہ وہ نظیرؔ کے قائل نہ تھے ہم بہتان سمجھتے ہیں۔ پس یہ خیال تو ایک منٹ کے لئے بھی قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ البتہ دوسری وجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ گزشتہ زمانے میں مذاق سخن اس درجہ مصنوعی ہو گیا تھا کہ فطرت شناسوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ اس عام بدمذاقی نے لوگوں کو روز بروز نظیرؔ کی جانب سے غافل کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار زوال اس حد پر پہونچ گیا جہاں سے پھر کمال کی ابتدا ہونے لگتی ہے۔ اس ماحول کے زیر اثر اگر آزاد سے سہو ہوا ہو تو زیادہ تعجب خیز نہیں۔ گمنامی کی ایک وجہ اور بھی سمجھ میں آتی ہے اور اس کے غالباً نظیرؔ خود ذمہ دار ہیں۔ وہ ایک درویش صفت صاحبدل، قانع، باوضع، مستغنی، خوددار، عالی ظرف، بلند حوصلہ اور سیر چشم بزرگ تھے۔ اس لئے انھوں نے کبھی کسی دربار کی ملازمت یا حاضر باشی پسند نہ کی۔ کئی درباروں سے طلبی بھی ہوئی مگر جانا پسند نہ کیا۔ شہباز کی رائے کے مطابق راجا کاشی مقیم اکبر آباد کے یہاں ان کا تعلق ثابت ہے لیکن وہ برائے نام تھا۔ کسب معاش یا حصول زر کی خاطر نہ تھا۔ غالباً خودداری اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ رئیسوں کی دربارداری کریں اور ان کی جا و بیجا خوشامد، چاپلوسی، سخن پروری اور ناز برداری کا بار اپنے حقیقت پرور نفس پر ڈالیں۔ وہ شاعری کا صحیح مفہوم جانتے تھے اور اس کو کسی فرد واحد کی تعریف و توصیف سے آلودہ کرنا باعث ننگ سمجھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شعر دل کی تحریک سے ظہور پذیر ہو سکتا ہے نہ کہ رُؤسا کی فرمائشوں اور حصول عطایا کی خواہشوں سے۔ شاعری ان کا شغل شوق تھا وہ اسے کسب معاش کا ذریعہ بنانا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ درباروں سے تعلق نہ پیدا کرنے اور رُؤسا کی مجلسوں سے الگ رہنے کی ایک وجہ غالباً ان کی فارغ البالی اور معاش سے بے فکری بھی تھی وہ اپنے گھر کے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ کسی کی امداد و حمایت کے محتاج نہ تھے۔ غالباً یہی وہ بات ہے جس نے ان کے مزاج کی شریفانہ خصوصیات کے قرار و قیام میں ہمیشہ مدد دی۔ پس چونکہ تمام عمر خانہ نشینی سے کام رہا اس لئے ملک میں مشہور اور مقبول نہ ہو سکے۔ صرف گرد و نواح کے باشندے

قدرے قلیل واقف رہے۔ چونکہ ملک میں مراسلت اور تبادلۂ خیالات کے ذرائع اس وقت تک اتنے ترقی یافتہ نہ تھے کہ کوئی شاعر گھر بیٹھے پُجے اور اس کا کلام شہر بہ شہر پھیل جائے اس لئے ملک عموماً اُن سے بے خبر رہا، ہاں اکبر آباد میں ان کی عزت و توقیر اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں طبقوں میں ہمیشہ بہت زیادہ رہی۔

شاعرانہ اہلیت نظیرؔ کے متعلق ایک متنازعہ فیہ امر یہ بھی ہے کہ آیا وہ شاعر ہیں یا نہیں۔ گزشتہ زمانے میں جبکہ ایشیائی شاعری کے مصنوعی شاہدے کا رنگ دلوں پر نہایت گہرائی کے ساتھ غالب تھا اور تعصب اور تنگ خیالی نے آنکھوں پر پردے ڈال رکھے تھے، ملک میں ایک باوقعت گروہ ایسا تھا جو نظیرؔ کی شاعری کا قائل نہ تھا۔ لکھنؤ اور دہلی کے شعرا خصوصاً آخرالذکر جو ہمیشہ زبان اور شاعری کو اپنی میراث سمجھتے رہے ہیں، اس خیال کے بہت بڑے حامی رہے۔ یہ جماعت نظیرؔ کو ایک ہزل گو، فحش پسند، صحت لفظی سے معرا یا وہ گو ناظم اور مبتذل طبقے کا آدمی سمجھتی رہی۔ ان کے اجتہاد اور مافوق العادت کمالِ شاعری کا اعتراف تو درکنار نظیرؔ کو زمرۂ شعرا میں بھی جگہ دینا انھیں پسند نہ تھا۔ یہ تو خیر متقدمین کا ذکر ہے، لیکن اس زمانے میں بھی جب کہ علم کا چرچا گھر گھر، اور ذوق کی جنس اس قدر عام ہے، پُرانی لکیر کے پیٹنے والے قدامت پرست لوگ موجود ہیں جو نظیرؔ کی اہلیت کے قائل نہیں اور ان کو اب تک ایک تُک بندہی سمجھتے ہیں۔ اس مخالف گروہ کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ نظیرؔ کا کلام اور ان کی زبان اپنے زمانے کے معیارِ سخن سے جانچنا چاہتے ہیں۔ یہ فاش ادبی و تاریخی غلطی ہے اور اس سے سراسر نادانی ٹپکتی ہے۔ وہ لوگ اس بات کو مدنظر نہیں رکھتے کہ نظیرؔ جس زمانے کے شاعر ہیں وہ اُردو کا بچپن تھا اور اس وقت یہ زبان منازلِ تکوین طے کر رہی تھی۔ تراکیب میں آج کل کی سی شستگی اور پاکیزگی نہ تھی۔ بھاشا کے الفاظ کثرت سے شامل تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ شاعری اس قدر لسانی اور عروضی قیود کی پابند نہ تھی۔ انشا کے بعد سے عروض، زبان، اور صحت لفظی کے متعلق جو جو قیود لگائے گئے وہ اس وقت نافذ نہ تھے۔ پس نظیرؔ پر جو انشا کے معاصر اور دورِ تکوین کے سخنور ہیں، ان قیود کا اتباع کیونکر فرض ہو سکتا تھا۔ وہ اس زمانے کی ضروریات کے خلاف ان قواعد کی پابندی خود اپنے اوپر کیونکر عائد کر لیتے۔ بہرحال اُس وقت کی مشکلات جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں، نظیرؔ کے لئے کیا کم تھیں کہ وہ اور قیود اپنے اوپر لگاتے۔ اس لئے نظیرؔ پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ مخالفوں کے غلط فتوؤں اور جوہر کش ہرزہ سرائی

سے نظیر کی شان شاعری اور اہمیت سخنوری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ خود اس طبقے کے تعصب، بدذوقی اور کم نظری کا اظہار ہوتا ہے۔ غالباً وہ لوگ شاعری کا صحیح مصرف نہ جانتے تھے اور اگر جانتے تھے تو کم سے کم یہ خیال ضرور رکھتے تھے کہ خود وہی شاعری کا بہترین حق ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کاش ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ وجدان کسی فرد واحد یا مخصوص طبقے کی ملک نہیں ہوتا۔ جدت کی الہام آفریں روح پرور نسیم جہاں چاہتی ہے اپنے خوش گوار جھونکوں سے دماغوں کو تروتازہ اور روحوں کو معطر کر سکتی ہے۔ قسام ازل کی فراغ حوصلگی نے کسی جمعیت کو اپنی بے پایاں نعمتوں سے بے بہرہ نہیں رکھا۔ ملک کا کوئی گوشہ، جہاں رمز شناس موجود ہوں فطرت کے فیض عام سے محروم نہیں رہ سکتا۔ رموزِ الوہیت کا سرچشمہ ہر جگہ جاری ہے اور عام اجازت ہے کہ لوگ اس سے سیراب ہوں۔ جس کے پاس ظرف موجود ہے اور جس پر تشنگی غالب ہے وہی اس سے سیراب ہو سکتا ہے۔ نظیر کے پاس یہ ظرف جملہ خصوصیات کے ساتھ موجود تھا اور تشنگی بھی غالب تھی۔ انھوں نے خود سیر ہو کر پیا اور ہزاروں کو سیراب کیا۔ اب تک جو شخص نظیر کی مدد کا طالب ہو، وہ اس کو چشمۂ فیضان کا راستہ بتا سکتے ہیں۔ پس ایسے شخص کے لئے کیونکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض ایک ہزل گو اور بازاری شاعر ہے۔

نظیر کے کلام کو سوقیانہ طرز سخن کا مترادف سمجھنا بہت بڑی اخلاقی غلطی ہے۔ وہ ایک نغز گو، بذلہ سنج اور رمز شناس شاعر تھے۔ انھوں نے باتوں باتوں میں کھیل کود اور تماشوں میں لے جا کر ظرافت اور تفنن کے پیرائے میں وہ وہ کار آمد اصول بتائے اور مفید نصیحتیں کی ہیں جن پر اگر سچے دل سے غور اور عمل کیا جائے تو انسان کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا اور دنیا کے پیچیدہ راستوں کو بہت آسانی کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔ نظیر نے نئی بندشوں اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ قدیم فرسودہ استعارے اور تشبیہوں کو چھوڑ کر جدید باتوں کی ترویج کی اور انواع و اقسام کے نئے خیالات پیدا کئے۔ زندگی کے حالات پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی اور جس شعبے کو اٹھایا اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ایشیائی شاعری میں نیچرل شاعری کا پیوند لگانے کا فخر سب سے پہلے اکبر آباد کے اسی قدیم سخن گو کو حاصل ہے۔ زبان پر قدرت، معاشرت پر عبور، فطرت کی رمز شناسی، مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت، نفسیات کا علم، مختلف علوم و فنون کا وقوف، رفتار زمانہ سے دلچسپی، سیاسی بصیرت، صنعت و حرفت سے واقفیت، ہمدردی، ظرافت، سوز و گداز، ترنم، محبت، غرض یہ کہ

شاعری کے سارے لوازم اور شاعر کے جملہ محاسن نظیر کی ذات میں جمع ہیں۔ انھیں شاعر نہ سمجھنا غلطی ہے۔

علمیت

نظیر کو شاعر نہ سمجھنے والا طبقہ ان کی علمی لیاقت کا بھی منکر ہے۔ کہتے ہیں کہ میاں نظیر علم سے بے بہرہ اور جاہل آدمی تھے۔ اب رہا شاعرانہ کمال تو اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ زورِ طبیعت نے انھیں تُک بند بنا دیا تھا یہ نظریہ قطعی غلط ہے۔ نظیر کا شمار اُن کے زمانے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں تھا۔ بہت سے لوگوں کا اس ایک نظم پر استدلال ہے جو انھوں نے اپنے متعلق کہی ہے اور جس میں انھوں نے اپنی بے علمی اور کم مائیگی کا اعتراف کیا ہے۔ قدیم تمدن کو مدنظر رکھتے ہوئے جس کی رو سے انکسار اور ہیچمدانی کا اظہار اعلیٰ ترین اخلاقی خوبیوں میں شمار کیے جاتے تھے، نظیر کے اشعار کے ظاہری معنی لینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ عربی میں تو غالباً نظیر کو زیادہ استعداد نہ تھی مگر فارسی کے وہ بہت بڑے عالم تھے۔ فارسی کی جملہ درسی کتب تو انھوں نے طفولت اور تعلیم ہی کے زمانے میں پڑھ لی تھیں لیکن ادب عالیہ کی مشہور تصانیف تمام عمر اُن کے مطالعے میں رہیں۔ اُن کا پیشہ معلمی تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے مکاتب کی حالت آج کل کے مکاتب کی طرح زبوں نہ تھی۔ طلبا وہیں سے فارغ التحصیل ہو کر اور اعلیٰ تعلیم کی سندیں لے کر نکلتے تھے۔ پھر ہر قسم کی سیاسی، ملکی، آئینی ذمہ داریاں اُن کے سپرد کی جاتی تھیں۔ لہٰذا ایسے مکاتب میں درس دینا بھی کسی معمولی شخص کا کام نہ تھا۔ جب تک مسلم الثبوت استاد اور مستند لیاقت کا معلم نہ ہو اتنی بڑی ذمہ داری ہرگز اس کو سپرد نہ کی جاسکتی تھی۔ اس لیے نظیر کا معلم ہونا ہی اِس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے منتخب فاضل اور بڑے ذی علم بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی شہادتیں ہیں جن سے ان کا صاحب علم ہونا ثابت ہے۔ علمی قابلیت کے ماسوا وہ زبانوں کے بہت بڑے ماہر تھے اور یہ قدرت اُن میں خداداد تھی۔ فارسی، عربی کو چھوڑ کر وہ ہندی، پنجابی، مارواڑی، پوربی اور برج بھاشا یہ پانچ زبانیں اور جانتے تھے۔ اس طرح اردو ملا کر آٹھ زبانوں میں دخیل تھے۔ مختلف علوم اور فنون میں ان کے عام معلومات نہایت وسیع تھے اور ہر شعبۂ علم میں تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھتے تھے۔ چنانچہ رمل، نجوم، ہندسہ، موسیقی، منطق، وغیرہ میں شغف کا پتہ ان کے کلام سے چلتا ہے۔ اپنے ملک کی سیاست کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن تاریخ سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ تاریخی ناموں کے حوالے اور تاریخی واقعات کے جابجا تذکروں سے مترشح ہوتا ہے

کہ تاریخ پر ان کو بڑا عبور تھا اور یہ علم ان کے پسندیدہ ترین مضامین میں سے تھا۔

رنگ کے موجد نظیر خود اپنے رنگ کے موجد ہیں۔ اس لئے متقدم کی فضیلت اُن کا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنا رنگ خود پیدا کیا، خود ہی اس پر چلا کی اور اپنے ہی پر اس کا خاتمہ کر دیا۔ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ طبیعت کے زور نے انھیں شاعر بنایا تھا۔ فطرت نے اُن کے ذوق کی تربیت کی تھی اور حقیقت شناسی نے انھیں مکمل کر دیا تھا۔ اپنے طرز سخن میں وہ کسی کے پیرو یا مقلد نہ تھے۔ چونکہ انگریزی سے محض ناواقف تھے اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے مغربی شعرا کا تتبع کیا۔ مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ استاد ازل نے انھیں خود ہی سکھا پڑھا کر اُتارا تھا۔ جو رنگ ان میں خاص طور پر نمایاں تھا وہ مصور حقیقی ہی نے اُن میں بھرا تھا۔ عمر کا بہت ابتدائی حصہ تو حیرت و استعجاب میں گزرا لیکن جب مناسب وقت آیا تو حجاب کے پردے ان کی آنکھوں سے اٹھنے لگے۔ رموز فطرت اور حقائق شعری اُن پر روشن ہونے لگے۔ اب ان کی داخلی قوتوں نے جو ان کو ازل میں ودیعت کی گئیں تھیں، انھیں مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی آنکھیں پوری پوری کھول دیں۔ جو دیکھیں وہی محسوس کریں اور جو محسوس کریں وہی زبان پر لائیں۔ جو زبان پر لائیں وہی عقیدہ رکھیں اور اس عقیدہ کو ارباب نگاہ کی ہدایت اور معلومات کے لئے بجنسہ ان تک پہنچا دیں۔ نظیر کی بدنامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ فرسودہ راستے سے ہٹ کر چلے۔ لوگ جس کو صراط مستقیم سمجھے ہوئے تھے انھوں نے اُسے ٹیڑھا راستہ تصور کیا اور ملک کے مذاق پر ذرا اعتنا نہ کی۔ اپنے غلط ماحول سے مطابقت کرنی نہ چاہی بلکہ شاعر کا پیغمبرانہ فرض اپنے ذمہ لیا کہ غلط ماحول کو بدلیں اور حقیقی ماحول پیدا کریں۔ ملک کے مصنوعی طرز سخن کو وہ صرف ناپسند ہی نہ کرتے تھے بلکہ ناپسند کرنے پر مجبور تھے۔ قدیم مذاق کا جامۂ کہن اب بہت تنگ ہو چلا تھا۔ نظیر کی ہمہ گیر و وسیع تخئیل اس میں نہ سما سکتی تھی۔ ان کی طبیعت کا متواتر تقاضا تھا کہ وہ ان خود ساختہ بندشوں سے رہا ہو کر آزادی کی وسعتوں میں پرواز کریں اور فطرت کے مطالعے میں مشغول ہو جائیں۔ زمانہ انھیں اپنی طرف کھینچتا تھا اور فطرت اپنی طرف۔ کچھ دن تک تو یہ کشمکش رہی لیکن طبیعت کا فطری زور غالب آتا معلوم ہوا۔ حیات کی نزاکت مدد پر کمر بستہ ہوئی۔ آخر کار جبلی زور آزادی نے ان تمام عارضی بندشوں کو توڑ کر اپنے خیال کو بالکل آزاد کر لیا اور وہ مصنوعی رنگ کو چھوڑ کر فطرت کی رنگا رنگیوں میں ڈوب گئے۔

نظیر کا آرٹ | نظیر کی شاعری میں مہتم بالشان خودداری اور احساس بشریت کی ایسی جھلک پائی جاتی ہے جو بیمانہ جذبات اور دل کی پُرمغضب تحریکوں کی ترویج کے لیے ناموزوں ہے اور ان کے کلام کو شریفانہ، حسین، اور موثر خیالات کے اظہار کا لاثانی ذریعہ بناتی ہے۔ یہ اثر کچھ تو سعدی اور دیگر قدیم اساتذہ کے دانستہ اتباع سے پیدا ہوتا ہے اور کچھ سطحی خیالات سے احتراز کرنے سے۔ دنیا کے تماشوں کو محض تماشا سمجھنا اور دنیا کی دلچسپیوں میں شامل ہو کر اُن کی برائیوں سے علیحدہ رہنے سے کلام میں ایک وقار پیدا ہو گیا ہے جو علوئے تخئیل سے متحد ہو کر دلوں پر نہایت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ نظیر کی نادر خصوصیت شاعری بالکل نمایاں ہے اور بہت آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ خصوصیت اُن کا خلوص اور غیر متنازعہ فیہ حقیقت پسندی ہے۔ نظیر کے تخئیل اور حیات میں افسانوی مسرت والم، بے معنی اثر پذیری اور نمائشی نفاست نہیں۔ وہ ہمارے سامنے جس جذبے کی کیفیت پیش کرتے ہیں اس کی برقی رو پہلے اُن کے ذی حیات قلب میں دوڑ چکتی ہے۔ نصیحتوں کی اُن کے کلام میں بڑی کثرت ہے لیکن وہ کسی ایسی بات کی تلقین نہیں کرتے جو پہلے خود ان کی رہنمائی نہیں کر چکی۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں سماعی شہادت کی بنیاد پر نہیں بلکہ عینی مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنا پر۔ وہ اُن مناظر معاشرت کا نقشہ کھینچتے ہیں جن کے درمیان رہ کر انھوں نے زندگی کے رموز پر غور کیا ہے اور جن نے ان کی روح کو حسین جذبات، پاکیزہ خیالات اور مستحکم ارادوں کا مستقل نشیمن بنا دیا ہے۔ اُن کے جذبات کسی ذاتی مقصد یا نمائش کی خاطر ظاہر نہیں ہوتے بلکہ اس لئے ابل پڑتے ہیں کہ اُن کا رقیق دل اُن کے ضبط پر قادر نہیں۔ اپنے جذبات کے اظہار میں وہ پورا پورا ترنم صرف کرتے ہیں۔ زبان اگرچہ کبھی کبھی بازاری ہو جاتی ہے لیکن کبھی صحت اور حقیقت سے معرا نہیں ہوتی۔ خلوص کے علاوہ اُن میں ایک اور کمال ہے جس کا اظہار انتخاب عنوان میں ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہے کہ کمال کا اظہار عنوان سے بے پرواہ رہنے میں ہوتا ہے۔ نظیر ہر عنوان کو دلچسپ بنا دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ معمولی شاعر معمولی انسان کی طرح ہمیشہ بیرونی واقعات سے اُس مدد کا طالب رہتا ہے جو اس کو صرف اپنے باطن سے مل سکتی ہے۔ نظیر میں یہ کمال ہے کہ وہ ادنیٰ باتوں، گھریلو واقعات اور سادہ مناظر سے وہ کیفیات اور مطالب پیدا کر لیتے ہیں جو معمولی شعرا دقیق مسائل سے بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ نوعی ہمدردی کے ساتھ رواداری اور

رواداری کے پہلو بہ پہلو مذہبی بے تعصبی نظیرؔ کے کلام کا وہ ممتاز جوہر ہے جو ہندوستانی شعرائے متقدمین میں عموماً ناپید ہے۔ یہ جوہر سرزمین ہندوستان کے اس مغنی کے لوازم دل فریبی میں فائق ترین عنصر ہے۔ فواحش کی دراندازی کے باوصف رکاکت اور ابتذال نظیرؔ کے کلام سے چھو کر نہیں نکلے۔ ہاں عریانی جو اہل فلسفہ کے نزدیک آرٹ کی تکمیل اور محاکات کی مترادف ہے بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن اس کی غایت صرف اظہار واقعہ ہے۔ کسی قسم کا تمسخر یا استکراہ مدنظر نہیں۔ جس طرح ایک نقاد کسی تصویر پر نقد کرتے ہوئے، جہاں اس کے محاسن کا ذکر کرتا ہے وہاں اس کے معائب کا بھی ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا، اسی طرح نظیرؔ جب معاشرت کا سماں کھینچتے ہیں تو خوبیوں کے ساتھ عیبوں پر بھی لامحالہ اُن کی نگاہ پڑتی ہے۔ چونکہ وہ ایک صاف گو اور ایمان دار مصور ہیں اس لئے وہ معائب کو بھی اسی آزادی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں جتنا دوسری خوبیوں کو، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُن کو دکھاتے ہوئے وہ ایک پوشیدہ درد ایک غیر محسوس شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ جب وہ اپنی جنس کو شرمناک حرکتوں میں مبتلا دیکھتے ہیں تو ان کی فطری غیرت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ لیکن فوراً ہی ان کی انتہائی شرافت جوش میں آتی ہے اور تمام غم اور غصہ ہمدردی اور حمایت میں مبدل ہو جاتا ہے۔

نظیرؔ نے اپنے رومانی و پرفسانہ خیالات کو ادب قدیم کے پُرسکون انکسار کا جامہ پہنایا ہے، جس سے راحت و انبساط کی ذی حیات کیفیت طاری ہوتی ہے اور کچھ لمحوں کے لئے دنیا کا تمام غم و الم محو ہو جاتا ہے۔ بیان کا تسلسل، تراکیب کی دلکشی، بحور کا ترنم، ناگزیر الفاظ کا تجسس، ان کے رنگ کی خصوصیات ہیں۔ دقیقہ رس ناظر اور صداقت شعار مصور کی حیثیت سے نظیرؔ کا کوئی مدمقابل نہیں۔ دقیق النظری کے ساتھ ساتھ قدرتی مسلمات کا ایک عالمانہ وقوف بھی ان کی فطرت میں شامل ہے جو اُن کی تمثیلوں، تشبیہوں اور استعاروں کو جو مناظر قدرت سے اخذ کئے جاتے ہیں دوگنا مؤثر بنا دیتا ہے اور جب ان پر کلام کی لذت بخش موسیقیت و شیرینی، اصوات سے معانی پیدا کرنے کی قوت کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے تو پھر نظیرؔ کی حیرت انگیز دلفریبی و دل نوازی کا راز منکشف ہونے لگتا ہے۔

نظیرؔ کا موضوع انسان اور اُس کی معاشرت ہے۔ بنی نوع انسان کی ان کے نزدیک خاص اہمیت ہے اور وہ ان کی انتہائی دلچسپی کا باعث ہے اس لئے وہ اس کو ہر رنگ میں اور ہر پہلو سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہر حالت میں

اور ہر مقام پر اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ہر قسم کی حرکات و سکنات سے بخوبی واقف ہو کر اس کو دنیا کے جملہ نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کا کوئی فعل ان میں نفرت و امتلا کے جذبات پیدا نہیں کرتا۔ ایک طرف تو وہ انسان کو جرم و خطا کا پتلا اور قدم قدم پر بہک جانے والا سمجھتے ہیں، دوسری طرف وہ دنیا کی رنگا رنگیوں اور نظر فریبیوں سے خوب واقف ہیں۔ اس لئے وہ اپنے موجب ہمدردی کی خطاؤں اور غلطیوں کو لائق سرزنش خیال نہیں کرتے، بلکہ اس کی کمزوریوں کو سمجھ کر اس پر رحم کھاتے ہیں۔ اس کو جملہ آلودگیوں سے نکال کر حقیقت کا صحیح راستہ دکھانا چاہتے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ دنیا کے لئے ایک پرامن وسکون زندگی اور وسیلۂ نجات بہم کریں۔ وہ اپنے کو اسی خدمت پر مامور سمجھتے ہیں اور یہی کام انجام دینے کے لئے ہم اُن کو ہر صحبت، ہر شغل، ہر مجمع میں دیکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ انسان کی ہر دلچسپی میں دلچسپی لیتے اور معاشرت کے ہر رنگ میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اس پر لطف یہ ہے کہ جس آزادی کے ساتھ وہ اعلیٰ مجلسوں میں حصہ لیتے ہیں اسی بیباکی کے ساتھ ادنیٰ طبقوں میں نشست و برخاست کرتے ہیں۔ وہ صرف انسان اور اُس کی معاشرت پر فدا ہیں اور اس کے بہبود و فلاح کی فکر میں ہر وقت غرق رہتے ہیں۔ وہ غالباً نیک و بد، اعلیٰ و ادنیٰ کے فرق کے قائل نہیں۔ ہر چیز ان کے نزدیک ایک ہے۔ وہ وحدت کو ہر شے میں دیکھتے ہیں اور اُسی کے گیت جا بجا گاتے پھرتے ہیں۔

معشوق کی تذکیر دورِ قدیم کے اُردو شعرا نے مرد کو اپنا معشوق گردان کر اسی جنس کر خت پر تمام نازک خیالیاں صرف کی ہیں اور اسی کو اپنے جذبات محبت و یگانگت، درد و خلش، سوز و گداز کا مرکز قرار دیا ہے۔ کلام میں جا بجا مذکر کی ضمیر استعمال کی گئی ہے، جس کی وجہ سے گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ تخاطب عورت کی طرف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فارسی شعرا کا غیر محسوس اثر ہے جو اب تک دلوں پر اُسی قدر گہرائی کے ساتھ قائم ہے۔ ایرانی ادبیات کا اضطراری اتباع اور اس کے ساتھ بھاشا کی شاعری کی عدم واقفیت بھی بہت کچھ اس فاش ادبی غلطی کی ذمہ دار ہے۔ فطری ماحول میں غیر فطری وجود کا ذہنی ورود بدنمائی پیدا کرنے اور شعر کی نزاکت و نفاست زائل کر دینے کے علاوہ فی نفسہٖ نہایت مذموم ہے۔ اس نوع کے تخیّل کا

ثقل، تکدُر و تنغص کا ایسا مکروہ بار دماغ پر ڈالتا ہے جس کی گرانی شعر کے لطیف اجزا پر غالب آکر اس کی مسرت آفریں کیفیت محسوس نہیں ہونے دیتی۔ نظیر کی شاعری ہر قسم کے تصنع اور جملہ غیر فطری آلائشوں سے مبرا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا عام عیب ہے جس سے ان کا دامن عصمت بھی بالکل پاک نہ رہ سکا۔ نظیر نے جگہ جگہ عورت سے خطاب کیا ہے اور ضمیر اور فعل دونوں مونث استعمال کئے ہیں لیکن کہیں کہیں مرد معشوق سے بھی خطاب ہے اور ضمیر مذکر ہے۔ بہر حال ان کے یہاں اس عیب کا جزوی وجود بھی نہایت تعجب خیز ہے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ ان کی فطرت پسند طبیعت نے اس ستم کو کیونکر جائز رکھا۔ وہ بھاشا زبان کے بہت بڑے ماہر اور اُس کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات ان کی طبعی اور ازلی فطرت پرستی کے بھی منافی ہے۔ غالباً ملک کے مذاق کی رعایت اور شعرا کی روشِ عام کی مطابقت نے اُن سے ایسا کرایا۔ پہلے ہی وہ بہت سے دیرینہ قیود اور قدیم بندشیں توڑ چکے تھے اگر اس قانون کی بھی بالکل خلاف ورزی کرتے تو نہ معلوم اور کتنے متہم کئے جاتے۔ غالباً یہی وجہ اُس کی پابندی کی ہو سکتی ہے۔ مگر ان کی آزاد خیالی دیکھتے ہوئے پھر یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت کو کسی پابندی کا ماتحت دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ پھر اپنے مزاج کے خلاف انھوں نے اس رکاکت کو کیونکر جائز رکھا۔ یہ نکتہ نظیر کی شاعری کا ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ بہر حال اس فرسودگی کے ارتکاب کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ عمداً یا سہواً کسی کے تتبع میں یا بہ طور خود جس وجہ سے بھی ہو یہ عیب کلام میں موجود ہے اور ہر حالت میں خود نظیر اس کے ذمہ دار ہیں۔

خالص ہندوستانی شاعر | نظیر ہر لحاظ سے قطعی ہندوستانی شاعر ہیں۔ وہ ہندوستان کے باشندے ہیں اور ہندی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اپنے ولایتی ہونے کا دعویٰ کر کے لوگوں پر غلط اثر ڈالنا یا ان کو مرعوب کرنا نہیں چاہا۔ تحمل، بردباری، انکسار جو ہندیوں کے اجزائے سرشت ہیں وہ سب اُن میں موجود تھے۔ نظیر کی مادری زبان اُردو ہے اور اسی زبان کو انھوں نے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ فارسی گوئی سے قاصر تھے بلکہ اِس لئے کہ فطرت کا ودیعت کردہ پیغام انھیں ہندوستانیوں کو پہونچانا تھا۔ اس لئے وہی زبان اختیار کرنی لازمی تھی جو پیغام سُننے والوں کی تھی۔ وہ زبان نہ تو معرب و مفرس اُردو تھی نہ سنسکرت کے نامانوس الفاظ ملی ہوئی برج بھاشا۔ سیدھی سادی عام فہم

ہندوستانی ہے جس میں بھاشا اور اُردو دونوں کے معمولی معمولی الفاظ شامل تھے۔ فارسی میں بھی نظیر کا کلام نظم و نثر موجود ہے لیکن وہ اُردو کلام کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صرف ذاتی تفریح اور اپنی خاص صحبت کے ارباب علم کی ضیافت طبع کے لئے تھا۔ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کو وہ بدیشی زبانیں سمجھتے تھے اس لئے ان پر انحصار کرنا اور اُن سے زیادہ مدد لینا انھیں گوارا نہ تھا۔ اِن دونوں زبانوں کے ثقیل الفاظ کے استعمال سے بھی وہ اجتناب کرتے تھے بلکہ حُبِ وطن یہاں تک مجبور کرتی تھی کہ زیادہ تر بھاشا کے الفاظ کی ترویج اُردو میں کریں اور اس طرح انھیں مانوس بنائیں۔ جذبات و محسوسات کے لحاظ سے بھی نظیر قطعی ہندوستانی شاعر ہیں۔ ہندوستان کے دریا، ہندوستان کے پہاڑ، ہندوستان کے مناظر، انھیں بہت گرویدہ کرتے اور ان کی دلچسپی کا سبب ہیں۔ وہ خیالی مناظر سے لطف اندوز نہیں ہوتے، خیالی بہار کا سماں نہیں کھینچتے بلکہ ہندوستان کی برسات کی بہاریں اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور انھیں نظم کرتے ہیں۔ اُن کی تشبیہیں، اُن کے استعارے، ہندوستانی مناظر قدرت کی چیزیں ہیں اور ان کی مثالیں ہندوستانی زندگی پر مبنی ہوتی ہیں۔ عرب کے خانہ بدوش بدوی کی پُرحرب زندگی اُن کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتی مگر ہندوستان کا امن کوش صحرا نورد بنجارہ اُن کے دل پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ وہ اس کی معاشرت سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کی تمثیل سے فوراً اپنی اعلیٰ ترین تخئیل کے لئے لباس تیار کر لیتے ہیں۔ ایرانی بادشاہوں کی عظمت و شان کے افسانے شعرا کے کلام میں عام طور پر مذکور ہیں لیکن نظیر کے قلب پر اکبر کی پُرشکوہ زندگی اور ہندوستان کے دیگر جلیل القدر سلاطین کی شوکت و جبروت کا نقش مرتسم ہے۔ دارا و سکندر، جمشید و فریدوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں اپنے ملک کا عظیم الشان شہنشاہ اکبر فوراً یاد آجاتا ہے اور اس کی تلمیح وہ اپنے کلام میں قائم کر لیتے ہیں۔ ایران و عرب، بابل و نینوا اور دیگر قدیم ممالک کے مشہور مقامات، ہندوستانی شعرا کے نوک زبان سہی مگر نظیر اپنے وطن کے تاریخی مقامات کا رتبہ کسی طرح، چاہ بابل اور دیوار چین سے کم نہیں سمجھتے۔ وہ ہانسی، حصار، چتوڑ گڑھ، کالنجر کا ذکر کر کے سلف کے فراموش شدہ کارناموں کی یاد تازہ کرنا چاہتے ہیں۔

ذہنی گلستاں اور خیالی چمن ان کے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتے کیونکہ اس قسم کی ہزاروں چیزیں ان کے دماغ میں موجود ہیں۔ وہ ہمیں ہندوستان کے باغوں کی سیریں کرانا چاہتے اور وہاں کے ہر پھول کی خوشبو سے ہمیں مانوس کرنا چاہتے

ہیں۔ بلبل ہندوستان کی سرزمین میں ناپید ہے اس لئے نظیر کو اس کی خیالی ہزار داستانی میں کوئی واقعی دلچسپی نہیں پیدا ہوتی۔ ڈھیئر کی لرزاں آہیں، کوئل کی دردبھری کوک، پپیہے کی پیہم نالہ وزاری، پی کہاں پی کہاں کی پُر الم صدائیں وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں اس لئے ان کی غمگساری پر آمادہ ہیں۔ لال، بئے، مینا، طوطی، کبک، تدرو کے دلکش ترانے اُن کے فطری ترنم کو متحرک کرتے ہیں اور وہ اُن کی مسرتوں میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ اُن کی بازی واشغال کے طائر سارے ہندوستانی ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں وہ نظیر کو طرح طرح سے لبھاتے ہیں اور شعر کہتے وقت مثالیں اور تشبیہیں بن کر اُن کے سامنے آحاضر ہوتے ہیں۔ ہندوستانی پھولوں کی عطر پاشیاں اُن کے دماغ کو ہر وقت معطر اور ان ہی کی نظر پرور خوش رنگیاں ان کی نگاہوں کو ہر لحظہ بشاش وخنداں رکھتی ہیں۔ رابیل، سیوتی، بیلا، چمیلی کی بھینی بھینی خوشبوئیں، چمپا کی مست نکہتیں، گلاب کے قرابے ہر وقت اُن کے لئے وقف ہیں۔ اُن ہی کنجوں میں متمکن ہوکر مبداء فیض سے وہ اپنا الہام حاصل کرتے ہیں اور اہل ذوق کی تفریح کے لئے وہیں وہ اس کو نغموں کی شکل میں منتشر کرنے کے لئے شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ جاڑا، گرمی، برسات خاص ہندوستان کے موسم ہیں اس لئے ان کو عزیز ہیں۔ اوس کی اذیت صرف ہندوستان میں ہوتی ہے اس لئے وہ اس کا ذکر کرنا اپنے ملک کی خصوصیت کا اظہار سمجھتے ہیں۔ بسنت ہندوستان کا موسمی تیوہار ہے اس لئے انھیں مرغوب ہے۔ کورا برتن خاص ہندوستان کی مٹی کا بنا ہوا ہے اس لئے وہ اُس کی سوندھ پر فدا ہیں۔ کورے برتن میں گنگا کا پانی پینا انھیں آب حیات سے زیادہ خوش گوار ہے اور اسی لئے وہ اس کو جام جمشید پر ترجیح دیتے ہیں۔

معاشرت نگاری نظیر کا کلام ان کے زمانے کی معاشرت کے ہر پہلو کے متعلق ہے۔ مغربی تمدن کے ورود نے ہندوستانی طرز زندگی میں بڑا تغیر پیدا کردیا ہے۔ نشست وبرخاست کے قرائن، اکل وشرب کے طریقے، رفتار وگفتار کے انداز، باہمدگر تعلقات ومواننست کے قواعد، آداب مجلس غرض ہر قسم کے عوائد معاشرت پر بڑا اثر پڑا اور ان میں پیشتر کی بہ نسبت اب بہت بڑا اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ اس لئے اس زمانے میں ہندوستان کی معاشرت ایک مخلوط شے ہے جس سے قدیم طرز زندگی کا بہ مشکل صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قدیم صحبتیں اور اُن کے رونق دینے والے تو اب کہاں میسر ہاں اُن کا

ذکرِ خیر افسانۂ یارانِ کہن کی طرح کتب سیر یا قدیم اساتذہ کے کلام میں ضرور دستیاب ہوسکتا ہے۔ چنانچہ نظیر کا کلام اسی قبیل کی شاعری ہے جس سے قدیم معاشرت کے از یاد رفتہ حالات مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔ اُن کے کلام میں خالص ہندوستانی معاشرت کا تذکرہ ہے اور کسی نہ کسی پہلو سے معاشرت کے ہر شعبے پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالی گئی ہے۔ نظیر کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کوئی شخص یہ خیال کرلے کہ نظیر سے صرف مسلمانوں کی قدیم معاشرت کا حال معلوم ہوگا۔ ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ وہ ہندوؤں کی معاشرت کے بھی اتنے ہی بڑے ماہر ہیں جتنے مسلمانوں کے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ہندو شعرا میں ایسے بہت کم نکلیں گے جو ہندو معاشرت دانی میں نظیر کا مقابلہ کرسکیں۔ اُن کی نگاہ کی وسعت انھیں ہر طبقے کی حالت سے بخوبی واقف رکھتی ہے۔ کچھ ہندو مسلمانوں ہی پر منحصر نہیں ہندوستان کی ہر قوم کی معاشرت کا ان کو یکساں علم و تجربہ ہے۔ اُمرا کے طریق زندگی اُن کے روزمرہ کے مشاغل، اُن کی دلچسپیوں اور تفریحوں کے اسباب، متوسط طبقے کی طرز معاشرت، غربا کے عادات و اطوار، عام شہریوں کے لہو و لعب، شہر کے مختلف پیشہ وروں کے چال چلن، ہنود کے تیوہار، مسلم اور ہندو خواتین کے رسم و رواج، خانگی زندگی کی کیفیت، صوفی اور فقرا کے خصائل، آزادوں، بدمعاشوں، تماش بینوں کی بدوضعی، پھکڑوں کی عریانی، میلے ٹھیلوں کی رنگ رلیاں، ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں، غرض معاشرت کے جتنے کوائف ہیں سب کا کچھ نہ کچھ ذکر ان کے یہاں موجود ہے۔ پرانے زمانے کے رسوم میں بہت سے ایسے ہیں جن کے جاننے والے اب تک موجود ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جن کا چرچا صرف ادنیٰ یا مبتذل طبقے میں ہے، شریفوں میں ان کا رواج ترک ہوچکا ہے، لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا عامل اب کوئی نہیں۔ بلکہ ان کے جاننے والے بھی ناپید ہوچکے۔ بعض رسوم اب قطعی مفقود ہوچکے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن کی صرف صورت بدل گئی ہے۔ پہلے وہ کچھ تھے اور اب امتداد زمانہ سے بدل بدلا کر کچھ کے کچھ ہوگئے ہیں مگر بہ صورت مبدّل قایم اور جاری ہیں۔ بہرحال نظیر کے کلام سے ہر رواج کا سراغ بخوبی لگ سکتا ہے اور اگر کوئی شخص چھان بین پر آمادہ ہو تو تمام رسوم و رواج کو ان کی اصلی ہیئت میں دیکھ سکتا ہے۔ معاشرت کے مورخ کے لئے نظیر کا کلام نہایت بار آور مرکز تلاش و جستجو ہے۔ تمدن کی تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لئے نظیر کے کلام سے نہایت پُرمعنی اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

حاکیانہ انداز | اُردو زبان کے شعرا نے عام طور پر غزلیں زیادہ کہیں اور جہاں تک ممکن ہوا اسی طرزِ سخن کو روز بروز ترقی دینے کی کوشش کی۔ طرح طرح کے مضامین پیدا کئے، بندشوں میں جدت پیدا کی، طرزِ ادا کے انوکھے ڈھنگ نکالے۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عمقِ تخئیل کے ساتھ الفاظ میں شستگی اور دلفریبی پیدا ہوتی گئی مگر شاعری پر رنگ تغزل غالب رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج عاشقانہ جذبات سے تو اُردو شاعری اس قدر مالا مال نظر آتی ہے لیکن اساتذہ کے کلام میں بیانیہ کلام کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔ شعرائے متقدمین تغزل میں اس قدر منہمک رہے کہ اس طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہ کی۔ ہاں کسی کسی نے مثنویاں لکھ کر بیانیہ طرزِ سخن کا کچھ کچھ حق ادا کیا ہے۔ لیکن مثنویوں میں بھی عشق و محبت، ہجر و وصال، سوز و گداز کا عنصر اس قدر زیادتی کے ساتھ موجود ہے کہ مثنوی کا منشائے صحیح فروعی لوازم میں خلط ملط ہو کر ایک حد تک مفقود سا ہو جاتا ہے۔ بہر حال واقعہ نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اساتذہ میں نظیر پہلا شخص ہے جس نے اس نوع کے انداز میں خامہ فرسائی کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے کلام میں بیشتر حصّہ بیانیہ نظموں ہی کا ہے۔ نظیر اس طرز خاص کے شیدائی ہی نہ تھے بلکہ اِس کے بڑے ماہر بھی تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ موجد اپنی ایجاد کو تکمیل پر نہیں پہونچا سکتا بلکہ متاخرین اِس کی کمی اور کوتاہیوں کو پورا کیا کرتے ہیں۔ نظیر کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے بیانیہ طرزِ سخن کو اُردو میں خود ہی پیدا کیا اور خود ہی اس کی تکمیل بھی کر دی۔ انھیں معاملہ بندی اور واقعات نظم کرنے کا بڑا ملکہ تھا۔ میلوں کی کیفیتیں اور ہندو مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی تقریبوں کو جہاں بیان کیا ہے ان کی معمولی سی معمولی تفصیل بھی نظر انداز نہیں کی۔ جس جگہ فصل کی دلچسپیوں اور موسم کی دلفریبیوں کا نقشہ کھینچا ہے وہاں شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ اصلیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہر شعبے کی ادنیٰ ادنیٰ چیز بیان کی نظر ہے اور اس کو بیان کر دینے سے ان کے کلام کی زینت دوبالا ہوتی ہے۔ برسات کے موسم میں سبزوں پر جو بیر بہوٹیاں اور ٹیلوں پر دھتورے پیدا ہو جاتے ہیں وہ بھی ان کی باریک بیں نظر سے نہیں بچتے۔ وہ جس صیغے کو اٹھاتے ہیں، ابتدا سے انتہا تک اُس کے امتیازات کی چھان بین کر ڈالتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں کتنی رسائی اور بیان میں کتنی وسعت ہے۔ واقعات کی مصوری کے لئے اول تو اس امر کی ضرورت ہے کہ جملہ مدارج پر شاعر

کی نگاہ حاوی ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کو اپنے کلام پر بھی قدرت ہو۔ اگر یہ دونوں چیزیں موجود ہوں تو بہترین مرقع بن سکتا ہے۔ نظیر میں یہ دونوں خصوصیتیں کمال کے ساتھ موجود تھیں۔ واقعات و احوال عالم کی بصیرت و واقفیت کے علاوہ وہ زبان پر پورا عبور اور محاوروں پر بڑا تبحر رکھتے تھے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ تخئیل کی رنگینی اور بیان کی سلاست و روانی ان کے مرقع پر رنگ تکمیل کا کام کرتی ہیں۔ اس پر نظم کی برجستگی و بیساختگی، ادائے مطالب کی سہولت و بے تکانی، کلام کی زیب و زینت پر اور چار چاند لگا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس قدر تصویریں کھینچی ہیں وہ ہر لحاظ سے مکمل اور ہر عنوان سے نظر فریب ہیں، جن میں خد و خال کے اعتبار سے اصل اور نقل کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ قوت بیان اور صورت گری میں نظیر، انیس کے ہم پلہ ہیں۔ یہ مملکت انہی دونوں سخنوروں کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ قادر الکلامی کی وجہ سے، بیان میں جو شیرینی و فصاحت ہے وہ حسن شعری کو اور افزوں کر دیتی ہے۔ ٹیگور کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک خیال کو بار بار دھرایا جاتا ہے۔ یہ التزام نظیر کے کلام میں عام طور پر موجود ہے۔ مسدسوں اور مخمسوں کے آخری مصرعوں کا ہر بند میں اعادہ شعر کے اثر کو بڑھاتا اور ایک قسم کا دل گداز ترنم پیدا کرتا ہے جس کا لطف صرف بار بار پڑھنے سے ہی آ سکتا ہے۔

اخلاقی پہلو نظیر کی قوت بیان دکھا کر اب اُن کا کلام اخلاقی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں شاعرانہ زور طبیعت نے غیر معمولی بیباکی اختیار کر لی ہے۔ اُن کا مطالعہ بلاشبہ سنجیدہ طبائع کو شاق گزرتا ہے لیکن اس کراہت و گرانی سے قطع نظر، کلیات نظیر میں بہت بڑا جزو ایسا ہے جو متین خیالات، سنجیدہ جذبات، اور پاکیزہ نظریات سے مملو ہے۔ میرے پیش نظر اس وقت صرف یہی حصہ ہے اور اس تحت میں صرف اسی سے بحث کی جائے گی۔ نظیر کے اخلاق کا سب سے زیادہ تاباں جوہر اُن کی بے تعصبی ہے۔ اگر وہ کسی جگہ اسلامی معاشرت کے کسی صیغہ پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری جگہ فوراً ہی ہندو سوسائٹی کے ہم رتبہ و ہم رنگ شعبہ کا تذکرہ اسی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک مصرعے میں مسجد کا ذکر ہے تو دوسرے میں مندر کا ذکر لازمی ہے۔ جس طرح کسی منطقی قیاس میں کبریٰ کے بعد صغریٰ کا وجود اخذ نتیجہ کے لئے ضروری ہے، اسی طرح نظیر کے یہاں درویشوں

اور صوفیوں کی حالت رقم ہونے کے بعد ہندو جوگی اور تیاگی کا بیان ناگزیر ضروریات اخلاقی میں سے ہے۔ نظیر نے اپنی شاعری میں ہندو مسلم جذبات کا ایسا نازک توازن قائم رکھا ہے جس پر مذہبی تفریق کا بڑے سے بڑا حامی اور بد بیں سے بدبیں متعصب بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ نظیر اپنے مذہب میں بڑے راسخ الاعتقاد تھے۔ ایسی صورت میں اتنی کامل رواداری اور ایسی خالص بے تعصبی دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ بادی النظر میں دونوں فرقوں کے افراد کے لئے نظیر کے مطمح نظر کی پیروی محال معلوم ہوتی ہے لیکن وحدت شناسوں کے لئے کچھ دشوار نہیں۔ کاش ملک میں نظیر جیسے دو چار شاعر اور پیدا ہو جاتے تو آج ہندوستان کو یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔

اب نظیر کے واعظانہ انداز کو لیجیے۔ نصیحت کرنے کے ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک بالواسطہ دوسرا بلا واسطہ۔ نظیر نے اپنے کلام میں ان دونوں طریقوں سے کام لیا ہے لیکن اول الذکر کا مصرف بہت زیادہ ہے۔ بلا واسطہ نصیحت کا اثر سننے والے پر محض ایک نظرئے کا سا ہوتا ہے۔ نہ اس کی یاد دیرپا ہوتی ہے نہ اس کا اثر قیام پزیر ہوتا ہے۔ لیکن بالواسطہ نصیحت ہمیشہ نہایت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ نظیر نے زیادہ تر بالواسطہ نصائح سے کام لیا ہے۔ انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ جب کوئی بات ممنوع قرار دیدی جاتی ہے تو اس کی طرف طبیعت خواہ مخواہ زیادہ مائل ہوتی ہے اور اس کی خیالی دلچسپیاں خواہ وہ فعل اُن سے قطعی معرا ہی کیوں نہ ہو طرح طرح سے دل لبھاتی اور استقلال پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن جب اُسی چیز کا نقشہ اچھی طرح دکھا کر اور اُس کے جملہ معائب کی تفصیل من و عن پیش کر کے اُس سے احتراز کرنے کے لئے کہا جائے تو طبیعت فوراً قبول کر لیتی ہے۔ پس نظیر کو جب کسی معیوب شغل زندگی یا ملعون صیغۂ معاشرت کی برائیوں سے متنبہ کرنا ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس فعل کا من و عن نقشہ کھینچتے اور اس کی تمام ظاہری دلفریبیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جب اُس کی سیمیائی نظر فریبیوں کی جملہ تفصیل کی تشریح کر چکتے ہیں تو نہایت دلپذیر پیرائے میں اس کے معائب کی مکمل تصویر پیش کر کے اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس طرح پڑھنے والے کے دل پر ایسا مستقل نقش قائم ہو جاتا ہے جس کو کوئی شیطانی وسوسہ زائل نہیں کر سکتا۔ ڈرامہ اور بائیسکوپ کے تماشوں کے ذریعے سے نصیحت کرنے اور ذہن پر مستقل اثر ڈالنے کا جو طریقہ آج عقلائے یورپ نے

رائج کیا ہے وہ صدیوں پیشتر اس ہندوستانی سخنور کے کلام میں مستعمل ہے۔ لقمان کی بابت مشہور ہے کہ وہ اپنے عارضی مالک کو نصیحت کرنے کے لئے مدت تک مناسب موقعے کا منتظر رہا۔ فصل کٹنے کا وقت اس کے نزدیک نصیحت کا بہترین محل تھا۔ اس نے پوری قوت سے اپنا فرض انجام دیا اور اس کی نصیحت نے بالیقین اپنا مستقل اثر چھوڑا۔ نظیر انسانی نفسیات کے ماہر ترین نبّاض تھے۔ وہ کبھی بے موقعہ نصیحت نہیں کرتے لیکن کسی موقعے کو ضائع بھی نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کو مقبولیت اور ان کی موعظت کو پُر اثری کا فخر حاصل ہے۔ نظیر کے حکیمانہ پند و نصائح کی تفصیل تو کہاں تک دی جائے مگر نیک کرداری، خوش معاملگی، پاکبازی، خداترسی، ہمدردی، ایمان داری، وسعت اخلاق اور صداقت کی پُرتاکید تلقین، بخل، محبتِ زر، مکاّئدگری، دنیا پرستی اور لہو بازی کی ہجو، سخاوت، شجاعت، منکسر مزاجی اور خودداری کی تعریف، غرض ہر قسم کے مواعظ حسنہ جس جس اسلوب سے بیان کئے ہیں وہ اُن کا حصّہ ہیں اور اُن کی اہمیت میں کسی کو مجال دم زدن نہیں۔

لوکل کلر یا مقامی رنگ | اُردو میں لوکل کلر یا مقامی رنگ کی آمیزش نظیر کے اولیات میں سے ہے۔ یہ وہ غیر منفک صفت ہے جو کلام کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ ہوتی ہے۔ اس کا ایک لازمی خاصہ یہ ہے کہ کلام سے اس کی علیحدگی بہر نوع ناممکن ہوتی ہے۔ اگر کوئی لوکل کلر اپنے مقام سے جدا کر لیا جائے تو اثر و لطف زائل کر دینے کے ساتھ ساتھ اس کی غایت مقصد اصلی کو بھی فوت کر دے گی۔ یعنی جس نتیجے کی توقع کی جاتی ہے وہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا غالباً زیادہ درست ہوگا کہ لوکل کلر کی موجودگی میں نظم کی ساری بنیاد صرف اُسی پر قائم ہوتی ہے۔ نظم یا فسانہ جو کچھ بھی ہو وہ مقامی خصوصیات کے ساتھ اس طرح مخلوط ہوتا ہے کہ دوسرے ماحول میں اس کا وقوع محض ایک لایعنی سی بات ہو جاتی ہے۔ مثلاً نظیر کی ''ہولی'' پیش کی جا سکتی ہے۔ ہولی کا تہوار خاص ہندوستان کی سرزمین اور آب و ہوا سے وابستہ ہے، انگلستان یا عرب میں اس کا وقوع ناممکن ہے۔ وہاں کی موسمی کیفیات وہاں کے رسم و رواج اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لئے وہاں کے شعرا میں اس قسم کے جذبات ہرگز پیدا نہیں ہوسکتے۔ اُردو میں اس لطیف عنصر کا فقدان شاعری کے فطری شعبے میں بڑی بدنمائی ہے۔ قدیم اساتذہ کے کلام میں اس کا

استعمال قطعی نہیں لیکن نظیر کی شاعری اس الزام سے بری ہے - غالباً نظیر ہی ایسا شاعر ہے جس نے اپنے وطن کی خصوصیات کو شاعری میں داخل کیا ہے، دیکھئے :-

اس سیہ ابر میں یوں اُڑتے ہیں بگلے جیسے — لبِ مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی ضیا
جگنو اس طرح چمکتے ہیں کہ جوں وقتِ سنگار — ماتھے پر ہاتھی کے شنگرف ہے گویا جُھوکا
مور کا شور، فغاں غوک کی، جھینگر کی جھنکار — پی پی ہر آں پپیہے کی ہے کوئل کی صدا

سیہ ابر میں بگلے کا اڑنا، جگنو کی چمک، غوک کی فغاں، جھینگر کی جھنکار، پپیہے کی پی پی، سب ہندوستان کی مقامی دلفریبیاں ہیں - اس کے ساتھ کمال یہ ہے کہ جن چیزوں سے ان کو تشبیہ دی گئی ہے، مثلاً لبِ مالیدہ مسی، ماتھے پر ہاتھی کے شنگرف، وہ بھی خالص ہندوستانی چیزیں ہیں - واقعہ یہ ہے کہ یہ صنعت کسبی یا اختیاری نہیں، فطری اور حقیقی شاعر کا حصہ اور ناگزیر جزو طبیعت ہوتی ہے - اس لئے جو شخص جس مقام کا باشندہ ہے اور ذرا بھی صحیح حسِ شعری رکھتا ہے وہ وہاں کے مناظر اور مخصوص چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا - لیکن اگر کسی شاعر کی نظر اپنے ملک کے امتیازات پر کسی نہ کسی عنوان سے نہیں پڑتی تو اس کے مکمل شاعر ماننے میں کلام ہے - ظاہر ہے کہ نظیر نے کسی کے تتبع میں لوکل کلر اختیار نہیں کیا بلکہ یہ خیال ان کا طبع زاد تھا، اسی سے صاف ظاہر ہے کہ بعض صنائع شعری فطری ہوتے ہیں اور شعر سے اس طور پر ان کا علاقہ ہوتا ہے کہ حساس طبیعت انھیں خود بخود پیدا کر لیتی ہے -

ایلیگری یا تمثیل | لفظ ایلیگری یا تمثیل قریب قریب شاعری کا مترادف ہے - اس لئے کہ شاعری خود ایک قسم کی لفظی مماثلت ہے جس میں پسندیدہ الفاظ سے دلپذیر پیرائے میں اصل واقعات کی تصویر کھینچی جاتی ہے - ایلیگری اور شاعری دونوں میں، افکار مجردہ ہیولائی شکل میں نمودار ہوتے ہیں - جس طرح پہیلی مطول تشبیہ ہے اسی طرح تمثیل مطول استعارہ ہوتی ہے - ایلیگری، مصنف کے مطالب، دلائل اور مواعظ کو انسانی یا مادی شکل میں ملبوس کر کے پڑھنے والے کے ادراک سے قریب تر کر دیتی ہے - اس طرح مفہوم کا تجزیہ کرنے اور الفاظِ مرقومہ سے معنوی مطالب اخذ کرنے میں جو ذہنی کاوش

شامل ہوتی ہے وہ بھی فی نفسہ نہایت دل آویز اور پُر اثر بن جاتی ہے۔ ایلیگری میں قصہ اور معنوی مفہوم ایک دوسرے کے متقابل ہوتے ہیں، لیکن یہ تو قریب قریب کبھی نہیں ہوتا کہ یہ تقابل جملہ مراتب میں مکمل ہو جائے۔ پس ایک مسلسل اور مطوّل ایلیگری میں، ایلیگری عموماً فسانے پر غالب آ کر اس کی دلچسپی کو زائل کر دیتی ہے۔ بہر حال اس وقت ایلیگری کی ماہیت اور اس کے تاریخی ارتقا پر بحث کرنی منظور نہیں۔ صرف اتنا دکھانا ہے کہ نظیر کے کلام میں یہ لطفِ ادب بھی موجود ہے اور لوکل کلر کی طرح یہ بھی ان ہی کا طبع زاد ہے۔ ایلیگری کا استعمال ہر قوم و ملت کے مذہبی اور آسمانی صحائف اور یونان و روما کے ادب قدیم اور دیگر ادب القدما میں بھی ہے لیکن اُردو کے شعرا کو اس سے مس نہیں رہا۔ یوں تو تمثیلی نظمیں نظیر کے کلام میں متعدد ہیں لیکن بنجارہ نامہ، ہنس نامہ، اور خواب، خاص دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ اول الذکر دو نظمیں تو بہت ہی عمیق اور بلند پایہ تمثیلیں ہیں۔ خواب میں کسی قدر رندانہ جھلک ہے تاہم اس میں بھی احوال دنیا کی فوری دگرگونی اور تماشا گاہ عالم کے سیمیائی جلوؤں کی بے ثباتی کا نقشہ نہایت لطیف اور شاعرانہ انداز میں کھینچا ہے۔

بنجارہ نامہ میں نہایت مؤثر پیرائے میں یہ دکھلایا ہے کہ انسان حرص و ہوا میں مبتلا ہو کر حصول زر کی خواہش کرتا ہے اور اسی مدعا کو پورا کرنے کے لئے طرح طرح کی کوششیں کرتا اور قسم قسم کی تکالیف و صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ اس عمل اور جد وجہد کے دوران میں وہ موت سے جس سے کسی حالت میں مفر نہیں بالکل بے خبر سا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ موت یکایک اس کو آ دباتی ہے اور اس کا تمام مال و جواہر، ساز و سامان، سیم و زر، عزیز و اقارب حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی اس کے کام نہیں آ سکتی۔ یہ نظم نہایت دلگداز پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ اس پر لطف یہ ہے کہ اول سے آخر تک نظم میں ایک واعظانہ انداز ہے۔ تمثیل کے لئے بنجارے اور اس کی زندگی کا تلازمہ اختیار کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے کہ بنجارے کی تمثیل اہل ہند کو نصیحت کرنے کے لئے ایک حکیمانہ تلاش ہے، بنجارے کا نام اور پیشہ کچھ ایسی رومانی اور پُر فسانہ چیزیں ہیں جن کا ذکر آتے ہی جد و جہد، سفر، بے سروسامانی، عارضی قیام، اور خانہ بدوشی کے مصائب خود بخود سامنے آنے لگتے ہیں جن سے رحم کا جذبہ برانگیختہ ہوتا ہے اور جب ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے کہ اس کی ساری کوششیں لاحاصل، جملہ مساعی بے سود ہیں، اس کی پیہم جد و جہد مستقل سفر و بے سروسامانی کا آخر میں

اُسے کوئی ثمرہ نہیں ملے گا تو دنیا کے تمام مشاغل، سارا انہاک ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے۔

ہنس نامے میں، طیور کا تلازمہ ہے۔ مختلف اقسام و متباین عادات و خصائل کے باشندگانِ عالم کو مختلف النسل طیور کا مترادف و ہم طریق قرار دیا ہے۔ اِس نظم میں بھی مسلسل تمثیل ہے اور تمثیل کے جملہ مراتب انسانی کے ہم رتبہ مقامات پر حاوی ہیں۔ ظاہر ہے کہ سوسائٹی کے جملہ افراد کو باہم دگر، انس و محبت ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو یہ جذبات اِس قدر ترقی کر جاتے ہیں کہ یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ بغیر ایک دوسرے کے دیکھے کوئی چارہ نہیں بلکہ زیست محال ہے۔ ہنس کی ہم جلیسی نے سارے طائروں میں یہی خیال پیدا کر دیا تھا کہ اس کی فرقت برداشت نہ ہو سکے گی۔ اس لئے سب نے اپنی اپنی ہمت کے موافق اس کی رفاقت کی کوشش کی لیکن سب تھک تھک کر رہ گئے:۔

آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

اسی طرح انسان جب اپنے وطنِ حقیقی کی طرف مراجعت کرتا ہے تو اس کی اولاد، عزیز و اقارب، دوست احباب اس کی جدائی کے خیال سے اپنا برا حال کرتے ہیں اور کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کاش ہم بھی اسی کے ساتھ چلے جاتے کہ یہ رنج دیکھنا نہ پڑتا۔ آخر کار ہر شخص اپنے تعلقات کے مطابق اس کے جنازے کو ایک خاص مقام تک پہنچا آتا ہے۔ کچھ لوگ نمازِ جنازہ پڑھ کر رخصت ہو آتے ہیں، کچھ قبرستان تک پہنچا کر چلے آتے ہیں، کچھ قبر میں اُتار کر نکل آتے ہیں، کچھ دفن میں شامل ہو کر مٹی دے کر واپسی اختیار کرتے ہیں لیکن قبر میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ وہاں سے ہنس بچارا اکیلا ہی سدھارتا ہے۔ ہنس نامہ اول سے آخر تک نہایت عبرت انگیز نظم ہے۔ اِس میں فریبِ محبت اور اس کے دل شکن انجام کا جیسا پُر درد مرقع پیش کیا ہے وہ قطعی غیر فانی ہے۔

ادب القدما | میاں نظیر کا کلام اب اُردو ادبیات کے لئے ادب القدما کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب قدیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم کے علاوہ، سادہ اور مؤثر بھی ہوتا ہے۔ اس میں الفاظ کی شان و شوکت کم ہوتی ہے مگر معانی کا تراکم زیادہ ہوتا ہے۔ نظیر کے کلام کی بھی بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں صاف، سیدھے، عام فہم مضامین نظم

کئے گئے ہیں۔ شعری آرائشوں مثلاً تشبیہ اور استعاروں کا اس حد تک لحاظ نہیں رکھا گیا کہ نفس مضمون پر ان کا کوئی اثر پڑے اور وہ ذہن سے بالکل مفقود ہی ہو جائے۔ حسن بیان اور طرز ادا سے وہ کام لیا ہے جو تلازمے اور تلمیح کی ٹھونس ٹھانس سے لیا جاتا ہے۔ اسی باعث معمولی معمولی تشبیہوں میں خاص لطف ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے اثر و نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سادگی اور عدم تصنع کے ماسوا نظیر نے روایات پارینہ اور اساطیر قدیمہ کو جامۂ شعری پہنا کر اپنے جذبۂ قدامت پرستی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ بھارت ورش کے ماقبل تاریخ واقعات اور ہند و علم الاصنام کے نیم مذہبی افسانوں اور حکایات کو جس خوبی اور حسن عقیدت سے نظم کیا ہے وہ کسی ہندو شاعر سے بھی ممکن نہیں ہوا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ہند د مذاق اور تہذیب کی جو چیزیں ہیں وہ خالص اسی قدیم رنگ اور ٹھیٹھ اسی زبان میں نظم کی گئی ہیں۔ نظیر نے صرف سادہ واقعات ہی کو نظم نہیں کر دیا بلکہ ایسی کامل مصوری کی ہے جس سے ہزاروں برس پیشتر کی ہندی معاشرت کا سماں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں اسلاف کی جس قدر تصویریں کھینچی ہیں وہ ساری ابھی تک اسی آب و تاب کے ساتھ باقی ہیں۔ حاصل کلام نظیر کے کلام میں، سادگی، عریانی، پر اثری، صداقت، ترنم غرض ادب قدیم کی جتنی نوعی خصوصیات ہیں سب موجود ہیں۔

شیکسپیر | شیکسپیر کی عظمت شاعری چونکہ مسلم الثبوت ہے اور چونکہ دنیائے مغرب میں وہ آسمان ادب کا روشن ترین ستارہ ہے اس لئے اُردو کے انگریزی خواں ناقدوں میں یہ ایک فیشن سا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے موضوع تنقید شاعر کو شیکسپیر کا مقابل قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظیر میں ہر حیثیت سے شیکسپیر کا ہم پلہ ہونے کی اہلیت ہے۔ اوّل یہ کہ گمنامی دونوں کی صفت مشترک ہے۔ جس طرح شیکسپیر کی قدر دانی اس کی حیات میں نہ ہوئی اسی طرح میاں نظیر بھی اپنی زندگی میں زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں ہم اوصاف شعرا کے حالات و سوانح عمری اس قدر کم دستیاب ہوتے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شیکسپیر زبان کا بڑا زبردست ماہر تھا تو نظیر کو بھی اپنی زبان پر بڑا عبور تھا۔ دونوں نے الفاظ کا استعمال اس کثرت سے کیا ہے کہ دونوں زبانوں کے کسی شاعر نے اتنا نہیں کیا۔ دونوں کو ہمہ دانی، ہمہ گیری، نفسیات اور معاشرت کے سمجھنے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔

دونوں ہر کیریکٹر کو اس کمال سے لکھتے ہیں کہ اس کی ضد ان ہی کی قلم سے اسی کمال سے لکھی ہوئی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ شیکسپیر نے ڈرامے لکھے ہیں لیکن نظیر نے ڈرامے نہیں لکھے۔ ڈرامہ نویسی کے لئے اِس کی بڑی ضرورت ہے کہ شاعر انسانی اطوار و اخلاق میں کامل بصیرت رکھتا ہو۔ نظیر کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کے کردار کی ہر کنہ سے خوب واقف تھے اِس لئے ان میں ڈرامہ نویسی کی قوت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اگر وہ ڈرامہ لکھتے تو یقیناً اُن کے کیریکٹر شیکسپیر کے کرداروں کا مثنیٰ ہوتے لیکن افسوس یہ ہے کہ اہل اُردو کو اِس کا مذاق ہی نہ تھا۔

اُردو میں ڈرامے کا رواج نہ ہونے کے دو وجوہ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اہل ملک ڈرامے سے ناواقف تھے دوسرے یہ کہ اصناف سخن میں کوئی صنف ایسی نہ تھی جس کو ڈریمٹک پوئٹری کا مترادف سمجھا جا سکتا۔ اِس لئے اس طرز سخن کی عدم موجودگی نے اُردو میں ڈرامے کی ترویج نہ ہونے دی۔ اب اِس شعبے میں کوششیں ہو رہی ہیں لیکن انھوں نے ابھی وقیع ادبی صورت اختیار نہیں کی۔

تقدیم و تاخیر کلام یورپ کے ادیبوں میں ایک زمانے سے یہ رواج چلا آتا ہے کہ وہ اپنے شعرا کا کلیات تاریخ کے اعتبار سے مرتب کرتے ہیں۔ اول تو وہاں کے تمام شعرا خود ہی اس کا خیال رکھتے ہیں، لیکن جن اساتذہ کے زمانے میں یہ طریقہ رائج نہ تھا ناقدوں اور تبصرہ نگاروں نے اپنی کوششوں سے اُن کے کلام کو بھی اسی طرح ترتیب دے لیا ہے۔ اِس کے بہت سے فوائد ہیں۔ منجملہ ان کے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے کو شاعر کی ذہنی ترقی کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ تو مسلّم ہے کہ عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ کلام میں زور اور خیالات میں پختگی اور سنجیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ تاریخ وار ترتیب سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جس زمانے کا کلام دیکھنے کو دل چاہے فوراً وہی نکال کر دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ التزام اس حد تک کیا جاتا ہے کہ نظموں کی تاریخیں بھی عنوان کے ساتھ ساتھ لکھ دی جاتی ہیں۔ باوجود حالات کی نایابی کے شیکسپیر کے کلام کی اس قدر چھان بین کی گئی ہے کہ یہ بھی پورے طور پر تحقیق ہو گیا ہے کہ کون سا ڈرامہ شاعر نے کس حصۂ عمر میں لکھا تھا۔ ایک ہی حصۂ عمر کے کئی ڈراموں میں بھی تقدیم و تاخیر معلوم کر لی گئی ہے۔ یہ زندہ اور قدر دان قوموں کے علمی کارنامے ہیں۔ اہل ہند بھی اگر اپنے اساتذہ

کا کلام اس طرح مرتب کرنا چاہیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ محض غزل گو شعرا کے کلام میں تو یہ کسی قدر دشوار ہوگا لیکن نظیر کے کلام میں، جہاں مستقل عنوانوں پر نظمیں کثرت سے موجود ہیں نفسِ مضمون کی شہادت اور رہنمائی سے نظموں کی تقدیم و تاخیر تحقیق کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن اس کام میں بڑی محنت اور جانفشانی، تلاش اور جستجو تحقیق اور تنقید کی ضرورت ہے اور یہ کسی فردِ واحد کا کام بھی نہیں۔ مؤلف نے اس باب میں کسی قدر کوشش کی لیکن راہ کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کو دیکھ کر آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ مجبوراً اس ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ ایک وجہ نظر اندازی کی یہ بھی ہے کہ اِس چھوٹے سے رسالے میں ایسی دقیق اور وسیع علمی تحقیقات کی گنجایش بھی نہیں ہے۔ یہ کام بڑے پیمانے پر شروع کرنے کا ہے۔ بہر حال اس شعبے میں کامیابی سے بالکل نا امیدی نہیں ہے۔ لہٰذا اس وقت صرف اس عنوان سے روشناس کرا کے اس کام کو آیندہ ناقدانِ کلامِ نظیر کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔

مقبولیت | باوجود اس گمنامی اور کس مپرسی کے نظیر کے کلام کو جیسی مقبولیت حاصل ہوئی وہ بہت کم شعرا کو میسر ہوتی ہے۔ عوام الناس کو اِن کے کلام میں جیسی دلچسپی ہے دوسرے شعرائے متقدمین یا حال کے کلام میں نہیں۔ تعلیم یافتہ، جہلا، اربابِ نشاط، ہنود میں مختلف خیال مشاغل اور معاشرت کے لوگ غرض ہر قسم کے افراد کی زبان پر نظیر کا کلام کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ساتھ ہی اِس کے یہ لوگ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان کی زبانوں پر کس کا کلام ہے۔ یا یہ کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں اسے شعر کہتے ہیں۔ اگر کسی کو شعر صحیح طریقے پر یاد نہیں تو وہ اپنے طور پر توڑ مروڑ ہی کر پڑھتا اور اس سے لطف اُٹھاتا ہے اور موقع موقع سے اس کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن جو اتنا بھی کرنے سے قاصر ہے تو کم سے کم شعر کا خیال ضرور اس کے ذہن نشین ہے اور مناسب جگہ وہ اس کو مثل کی صورت میں دھرا بھی دیتا ہے۔ اکبر آباد اور دوسرے شاہی شہروں کے قدیم شریف گھرانوں کی پردہ نشیں خواتین نظیر کے کلام کی بہت بڑی محافظ ہیں۔ حرم کے اندر نظیر کے اشعار اور اُن کی نظموں کا مذہبی کلام اور مناقبوں کے علاوہ، اتنا چرچا نہیں۔ لیکن مثالیں، کہاوتیں اور کلیے جو اُن کے کلام سے مستنبط ہوتے ہیں عام طور پر بی بیوں کے زبان زد ہیں۔ اس ضمن میں میاں نظیر امیر خسروؒ کے ہمدوش ہیں۔ جس طرح ان کی پہیلی اور کہہ مکرنیاں شریف خاندانوں میں تفریح و تفنن کے لئے رائج ہیں اسی طرح نظیر کی کہاوتیں،

مثلاً "غریب کی جورو سب کی بھابی"، "کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں" عام طور پر مستعمل ہیں۔ عورتوں کو یاد ہونا قبولِ عام کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اِن جملہ باتوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ نظیر نے اپنی جادو بیانی سے قلوب کو تسخیر کیا اور ان کا سحر اثر کلام دلوں کا مالک ہے۔ شاعر کے نام و نشان سے ناواقف ہونے کے باوجود اس کا کلام لوگوں کے طبائع پر نقش ہے اور دلوں کا جزو بنا ہوا سینوں سے لگ رہا ہے۔ آہ یہ حافظانِ کلام نظیر امتداد زمانہ کے ساتھ روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اور نظیر کے ریزہائے دل و جگر ان کے ساتھ پیوندِ خاک ہو رہے ہیں۔

کثرتِ کلام | نظیر کے کلام کی کثرت اور ہمہ گیری دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طاقتِ گویائی اتنی غیر معمولی تھی کہ اِس نے انھیں پُرگو شاعر بنا دیا۔ اُردو کلام کے علاوہ فارسی کا غیر مطبوعہ کلام بہت سا موجود ہے جس سے دنیا اب تک روشناس نہیں ہوئی۔ اس میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں۔ سہ نثر ظہوری کے انداز پر جو نثر میاں نظیر نے لکھی ہے وہ اس نوع کی نثر کا نمونہ اور آپ اپنی نظیر ہے۔ باوجود اس پُرگوئی اور کثرت کلام کے اُن کے کلام میں سلاست اور روانی ایسی موجود ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موزوں کرنے میں انھیں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی اور نہ کوئی خاص ذہنی سعی کرنی پڑتی تھی۔ "حکیمے سخن برزباں آفریں" نے ان کا دماغ ہی موزوں بنایا تھا اور اِس موزونیت کا یہ عالم تھا کہ نثر غالباً زبان سے نکلتی ہی نہ تھی۔ شاعری پر نثر کی سی قدرت کا راز اسی ازلی موزونیت میں پنہاں ہے۔

تضییع کلام | تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ لیکن جو کچھ باقی رہا وہ بھی پورا طبع نہیں ہوا۔ کلیات کے علاوہ بہت سی نظمیں اور رہیں جو انھوں نے لوگوں کو کہہ کہہ کر دیدی تھیں اور پھر کبھی ان کا نام بھی نہیں لیا۔ فقیر، خونچہ والے، اور پیشہ ور ان سے بہت سی نظمیں کہوا کہوا کر لے گئے تھے جن کا کلیات میں پتا بھی نہیں۔ نظیر کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص ان کے پاس آکر کسی مضمون پر کہنے کی فرمائش کرتا تھا تو وہ فوراً کہہ کر اُسی وقت اُسے دیدیا کرتے تھے۔ یہ لوگ اِن نظموں کو لے جا کر تبرک کے طور پر اپنے پاس رکھتے تھے۔ بہر حال اس قسم کی کسی نظم کا اندراج کلیات میں نہیں اور یہ چیزیں قطعی ضائع ہو جانے کے برابر ہیں۔ میرے ایک بزرگ جنھیں میاں نظیر کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر سے شرف تلمذ حاصل ہے، بیان فرماتے تھے کہ اُنھیں محلہ ڈھولی کھار میں ایک بوڑھا شخص ملا جو میاں نظیر کی ایک نظم پڑھا

کرتا تھا۔ یہ نظم اس نے خاص اپنے ہی لئے کہوائی تھی۔ اس کا قصہ اس نے اس طرح بیان کیا کہ "جب میں جوان تھا مجھے ایک عورت سے عشق سرزد ہوا۔ جب میں اپنی محبوبہ کی محبت میں بہت بےچین ہوا اور اس کا فراق مجھ سے کسی طرح برداشت نہ ہو سکا تو میں میاں نظیر کے پاس تاج گنج گیا اور اُن سے اپنا حالِ دل بیان کرکے چارہ گری کی خواہش کی۔ میاں نظیر نے مجھے یہ نظم کہہ دی۔ چنانچہ جب مجھے دردِ ہجر بہت ستاتا اور بےچین کرتا تھا تو میں اس نظم کو پڑھا کرتا تھا اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہو جاتی تھی"۔ اس بوڑھے عاشق کی جوانی اور اس کا ولولۂ محبت اور جوشِ جنوں تو اب خود اسی کی زندگی کے لئے ایک بھولا ہوا خواب، ایک افسانۂ پارینہ بن گیا تھا مگر ایامِ نشاط کی باقیات صالحات وہ فراقیہ نظم یادِ ایام کی حیثیت سے اب تک اس کی زبان پر تھی جسے وہ بڑے لطف سے پڑھ پڑھ کر فریبِ آرزو، کو یاد کیا کرتا تھا۔ نظیر کے عہدِ زریں کی زندہ یادگار قدیم رنگیں صحبتوں کا نام لیوا، پیرِ فرسودہ" آہ نظیر کی مجلس جاوداں میں جا پہونچا اور اب ان سے عشقِ حقیقی کا راز دریافت کر رہا ہے لیکن وہ فراقیہ نظم بھی جو ایک مدت تک اس کی مونسِ تنہائی اور غمگسارِ فرقت بنی رہی تھی، عاشقانِ سماوی کی دلدہی اور دلسوزی کے لئے اسی کے ساتھ دنیا سے اُٹھ گئی۔ پروفیسر شہباز کا قوم اور ملک اور اُردو زبان پر خصوصاً بڑا احسان ہے کہ انھوں نے غیر معمولی تکلیفیں اُٹھا کر اور طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کرکے کلامِ نظیر ایک جگہ صحت کے ساتھ جمع کر دیا اور اُن کے سوانح عمری جو کچھ مہیا ہو سکے زندگانی بے نظیر میں جمع کرکے ملک کے مردہ شاعر کو زندہ کر دیا ورنہ رہا سہا کلام بھی ضائع ہو جاتا اور سوائے کفِ افسوس ملنے کے کوئی چارہ باقی نہ رہتا۔

تخریب کلام | نظیر کے کلام کی جیسی روح فرسا تخریب کی گئی ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ کلام سے لوگ بےخبر رہے کیونکہ بہت سے ایڈیشن موجود ہیں لیکن کلام کا کُٹّا ایسا کیا گیا ہے جس کو دیکھ کر بڑا درد محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کی دماغی کاوشوں کی داد جس عدیم المثال تغافل سے دی گئی ہے، وہ ملک کے لئے نہایت شرم انگیز ہے۔ جتنا کچھ کلام باقی ہے اور میسر آ سکتا ہے وہ بھی بہت زیادہ غلط ہے۔ نہایت تمسخر انگیز غلطیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر پہلے ہنسی اور پھر غصہ آتا ہے۔ افسوس ہے کہ چھاپنے والوں نے ذرا صحت کا خیال نہیں کیا، جیسا ہاتھ لگا غلط سلط

چھاپ ڈالا۔ بہت سی غلطیاں تو ایسی ہیں جو امتدادِ زمانہ اور دوریٔ عہدِ نظیرؔ کی وجہ سے پیدا ہوئیں لیکن بہت سی ایسی بھی ہیں جو محض مطابع اور کاتبوں کی غفلت اور سہل انگاری سے رونما ہو کر مستقل بن گئیں۔ صحت کرنا اب بہت دشوار کام ہو گیا ہے۔ میں نے صحت کی بہت کوشش کی ہے لیکن پھر بھی بہت سے شکوک باقی رہ گئے ہیں۔ شہباز کا مرتبہ کلیات اِس وقت کلامِ نظیرؔ کا بہترین اور مستند مجموعہ ہے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ اس میں بھی غلطیاں موجود ہیں۔ اس سے شہباز مرحوم کی لیاقت یا مساعی پر معاذاللہ کسی قسم کا اعتراض کرنا منظور نہیں ہے صرف تصحیح کی دشواری پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ شہباز مرحوم کے یہاں غلطیاں باقی رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اکبرآباد کے باشندے نہ تھے۔ اس لئے یہاں کی زبان کے محاورے اور مقامی اصطلاحات سے انھیں واقفیت نہ تھی۔ نظیرؔ کا کلام اس قدر غلط اور خلط ملط ہو جانے کی ذمہ دار ملک کی عام بدمذاقی، اہلِ علم کا تغافل، کاتبوں کا جہل اور بے پرواہی، مطابع کی زر پسندی اور فرائض سے بے خبری ہے۔ ایسے مہتم بالشان شاعر کا کلام کھو بیٹھنے اور غلط کر دینے کا ملک کے دامن پر ایسا بدنما دھبہ ہے جو قیامت تک یا کم سے کم اس وقت تک جب تک کلام کی قرار واقعی تصحیح نہ ہو جائے اِس کے دامن سے نہ دُھلے گا۔

اکبرآباد کی قدیم زبان

نظیرؔ کی زبان اکبرآباد کی خالص قدیم زبان ہے اور یہی ٹکسالی اُردو ہے۔ عہدِ حاضر میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ نظیرؔ کی زبان کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ نظیرؔ کی زبان کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ وہ کسی وقت اِن مقامات کی زبان کی دست نگر رہے۔ چونکہ نظیرؔ متقدم اور بہت پُرانے زمانے کے شاعر ہیں اِس لئے یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اِن کی زبان جنسِ اعلیٰ ہے اور دیگر مقامات کی زبانیں اس کی انواع ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے اساتذۂ متاخرین نے آنکھ کھول کر جس زبان کو دیکھا وہ نظیرؔ کی زبان تھی۔ پس اسی کو اصل قرار دے کر اسی میں ترمیمیں اور اصلاحیں کیں۔ اس لئے دہلی، لکھنؤ کی شُستہ زبانیں اکبرآباد کی قدیم زبان کی ارتقائی شکلیں ہیں۔ نظیرؔ کی زبان کو خاندانِ اُردو میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اُردو شعرا میں وَلی اور بنی نوعِ انسان میں حضرت آدم کو ہے۔ تاریخِ زبان مرتب کرنے کے لئے اگر کوئی شخص قدیم اُردو زبان کا پتہ لگانا چاہے تو کلامِ نظیرؔ اس کی پوری پوری

رہبری کرے گا اور اس سرچشمے سے اس کو پوری سیرابی ہو سکے گی۔ اکبرآباد کی ڈیڑھ صدی پیشتر کی زبان کا سراغ صرف نظیر کے کلام سے لگ سکتا ہے۔ کلام چونکہ مقدار میں کثیر ہے اس لئے ایک ہی جگہ تحقیق و تفحص کے لئے بڑا سرمایہ اور ہر قسم کے نمونے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کا استعمال اس کثرت سے ہے کہ اردو کا بڑے سے بڑا شاعر سوائے میر انیسؔ کے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ طیور کے نام، کبوتروں کی قسمیں، ہندو مذہب کی اصطلاحیں، پیشہ وروں کے لٹکے، لہو و لعب کے چٹکلے غرض ہر شے کے الفاظ اور پھر اُن کے مترادف اس کثرت سے کلام میں ملتے ہیں کہ اُردو کو نامکمل اور محتاج زبان کہنا غلط معلوم ہونے لگتا ہے۔ نظیر کے کلام سے قدیم الفاظ کی ایک اچھی خاصی کتاب لغات تیار ہو سکتی ہے جو نہایت کارآمد ثابت ہو۔ الفاظ کی کثرت اور لغت دانی میں نظیر عربی زبان کے اساتذہ کے ہم پلہ ہیں۔

زبان پر اجتہاد | نظیر اُردو کے ایام طفولیت کے شاعر ہیں۔ اس زمانے میں شعرا کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت کم تھا۔ اس لئے جو لوگ صاحب نظر و استعداد تھے وہ حسب ضرورت دوسری زبانوں کے مناسب الفاظ تلاش کر کے اُردو میں کھپاتے تھے۔ یہی ضرورت نظیر کو بھی درپیش تھی۔ انھوں نے بھی اپنی ضروریات کے لئے نئے نئے الفاظ وضع کر کے زبان پر اجتہاد کیا۔ مترادفات تلاش کرنے میں انھیں بڑی قدرت تھی اور یہ کمال انھیں ہر زبان میں یکساں حاصل تھا۔ فارسی عربی الفاظ کے لئے بھاشا سے اور بھاشا کے لفظوں کے واسطے فارسی سے اتنا موزوں مترادف ڈھونڈھ لاتے ہیں جس کو دیکھ کر بیساختہ مُنہ سے واہ نکل جاتی ہے۔ اجتہاد زبان اور عروض کی بہت سی مثالیں میرؔ اور دیگر اساتذائے متقدمین کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ نظیر کے کلام میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اب نئے اور عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ نظیر کے وضع کردہ محاورے اور الفاظ کثرت سے ہیں۔ اُن میں سے بہت سے تو مقبول ہو کر زبانوں پر چڑھ گئے اور زبان کا جزو بن کر اس طرح مخلوط ہو گئے کہ اب تمیز بھی نہیں کئے جا سکتے لیکن وہ الفاظ جو اب نئے نئے معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں وہ ہیں جو کسی وجہ سے عام نہ ہو سکے اور صرف اُن ہی کے کلام تک محدود رہے۔ اب چونکہ اس زمانے میں مستعمل نہیں ہیں اس لئے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کو کم نظر غلط اور اہل بصیرت اجتہاد کہتے ہیں۔ اس بنا پر نظیر کے کلام کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے جدید معیار سے جانچنا غلط ہے۔ نظیر نے اپنے کلام میں ادبی، کو نکل

یا روزمرہ، اور سلینگ یا بازاری و مبتذل تین قسم کی زبانوں کا استعمال کیا ہے۔ ادبی زبان میں تو انھوں نے زیادہ تر عربی فارسی کے مانوس الفاظ پر اکتفا کی ہے اور یہ زبان پاکیزہ خیالات اور سنجیدہ جذبات اظہار کرنے کے لئے تجویز کی ہے۔ روزمرہ میں انھوں نے جگہ جگہ اجتہاد کیا ہے۔ یہاں ہندی کے الفاظ دل کھول کر استعمال کئے ہیں۔ فارسی محاروں کا ترجمہ اور مہتد الفاظ کی ترویج بھی اسی صیغے میں کی گئی ہے۔ اب رہی سلینگ یا بازاری زبان، اسے وہ غیر سنجیدہ اور عریاں موقعوں پر استعمال کرتے ہیں۔ میلے ٹھیلے، لہو ولعب، عوام الناس کی ہر قسم کی بُری بھلی صحبتوں میں وہ اس زبان کو بولتے ہیں اور یہ ہر طرح جائز ہے۔ زبان کی عالمانہ تقسیم اور ہر موقعے پر مناسب حال زبان کا استعمال نظیر کی ایجاد اور اُن کے مجتہدانہ کمال کا بین ثبوت ہے۔

زبان پر احسان | نظیر کا اُردو زبان پر بڑا احسان ہے۔ اس معاملے میں سب سے پہلے اُن کی دوربینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے کتنی مدت پہلے تاڑ لیا تھا کہ یہ زبان جس کی اب ابتدا ہے ایک دن ہندوستان کی علمی اور دفتری زبان بن کر رہے گی۔ مستقبل کی اس بصیرت کے ساتھ اُردو کی کم مائیگی اور بے بضاعتی بھی ان کے پیش نظر تھی۔ اس لئے انھوں نے اپنی تمام کوششیں اس زبان کو وسیع کرنے اور سرمایہ دار بنانے کے لئے وقف کر دیں۔ اُن کا کلام شاہد ہے کہ انھوں نے اپنی اور اپنے زمانے کی زبان کو اس قدر وسیع کر لیا تھا کہ انھیں الفاظ کی کمی محسوس نہ ہوتی تھی اور اس وجہ سے وہ کوئی خیال کسی انداز سے ادا کرنے میں قاصر و عاجز نہ تھے۔ اُردو کو وسیع کرنے کے لئے فطری اعتبار سے انھوں نے ہندی کو زیادہ مناسب زبان خیال کیا۔ چنانچہ بھاشا کے موزوں اور عام فہم الفاظ چھانٹ چھانٹ کر استعمال کرنا شروع کئے اور عبارت میں اس خوبی سے کھپائے کہ سیاق سے اُن کے معانی اور مطالب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس حسن استعمال سے دو فائدے ہوئے۔ اوّل تو یہ کہ الفاظ بہت جلد مل جل گئے، دوسرے یہ کہ سامعے کو ناگوار نہ معلوم ہوئے۔ نئے الفاظ کا سامعے کو ناگوار معلوم نہ ہونا اُن کے جزو زبان بن جانے کی بہت بڑی شہادت ہے۔ بھاشا کے الفاظ کی معرفی کے پہلو بہ پہلو نظیر نے عربی فارسی کے ثقیل الفاظ کو ترک بھی کرنا شروع کیا۔ فارسی سے انھوں نے محاوروں کے معاملے میں مدد لینی زیادہ مناسب سمجھی۔ فارسی محاوروں کا ترجمہ اُن کے کلام

میں بہت دستیاب ہوتا ہے۔ زبان کی ضرورت کو اِس حد تک سمجھنا اور پورا کرنے پر اتنا قادر ہونا معمولی آدمی کا کام نہیں ہے۔ کوئی شاعر جب تک خاص لسانی ملکہ اور مختلف زبانوں پر کامل تبحر نہ رکھتا ہو اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتا۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ نظیر بڑے ماہر لسانی تھے اور اُن کو رموز فصاحت و بلاغت سے خاص واقفیت تھی۔ نامانوس کو مانوس بنا کر بھی کلام میں روانی اور سلاست کوٹ کوٹ کر بھر دینا ان ہی کا حصہ تھا۔

قومی شاعر ہے محض ادبی نہیں غالب اور بیدل کی طرح نظیر خالص ادبی شاعر نہیں ہیں، بلکہ اسکوٹ لینڈ کے مشہور شعرا اسکوٹ اور برنس کی طرح قومی مغنی ہیں۔ غالب اور بیدل کے مانند اِن کا موضوع فلسفہ اور تصوف نہیں۔ وہ عریاں میں پوشیدہ کو نہیں ڈھونڈھتے بلکہ انسان کو بہترین مظہر حقیقت و الوہیت سمجھتے ہیں۔ اس لئے اُن کا موضوع جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے انسان اور اُس کی معاشرت ہے۔ وہ اِن شعرا کی طرح مشکل پسند بھی نہیں ہیں۔ اِن کا کلام معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہیں۔ وہ بالخصوص عوام کے شاعر ہیں اور ان ہی کے جذبات اور حیات کی ترجمانی اپنا فرض اولیں سمجھتے ہیں۔ باوجود کوئی قدیم مثال سامنے نہ ہونے کے ان کی تیز نگاہوں نے کائنات اور انسان کا سچا تعلق معلوم کر لیا۔ اس انکشاف نے ان کی ذہنی قوت اور بڑھا دی اور پھر انھوں نے نفسی تحقیقات کی تیاری شروع کی۔ صداقت اور دلکشی اُن کے شاعرانہ امتیازات ہیں اور شاعرانہ حیثیت سے نہیں بلکہ انسانی حیثیت سے وہ ہمارے لئے زیادہ دلچسپ اور مؤثر ہیں۔ نظیر کی روح حقیقی شاعرانہ روح ہے۔ اِس کو صرف چھیڑ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے نغمہ پیدا ہونا لازمی ہے۔ چھیڑنے کے لئے کسی خاص مضراب کی حاجت نہیں۔ فطرت کا معمولی سے معمولی جزو حتیٰ کہ ایک نفس انسان بھی اُن کے لئے مستقل حسن ہے۔ نظیر کو خصوصاً اس وقت دیکھو جب کہ وہ اپنی مرغوب جماعت میں بے تکلف ہوتے ہیں۔ اِس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی سرگرم، ہمہ گیر اور پُرخلوص انسانی ہمدردی کا کیا عالم ہے۔ اُن کی پر اعتماد، نامحدود محبت کا کیا رنگ ہے اور وہ اپنے محبِ خاص انسان کے لئے کیسی کیسی فیاضیاں کر سکتے ہیں۔ اُن کا شہری دوست اور گندم رنگ دوشیزہ اُن کے لئے ذلیل اور معمولی نہیں بلکہ ہیرو اور ملکہ ہیں جن کی وہ بادشاہوں سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی قلوب کی پُراسرار صناعی اور مقدرات کی ناقابل

قیاس ظلمت وضیا کے مظہر صرف بلند منزلت کاخ وایوان ہی نہیں بلکہ اُن کا اظہار ہر جھونپڑے میں جہاں انسان بستا ہے ہوسکتا ہے۔ ہم نظیر کو عوام کی صحبتوں میں دلچسپی لیتے، ہنستے بولتے، ملتے جلتے، اُن کے مشاغل میں حصہ لیتے اور ان ہی کی زبان بولتے دیکھتے ہیں لیکن ان کے روزمرہ میں رکاکت اور ابتذال نہیں ہے۔ کسی موقعے پر وہ عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کو جو ان کی شریف بشریت کے عناصر ہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بس یہی بالغ نظری اور صفائی قلب اُن کے کمال کی بنیاد ہے۔

نوا آزادانہ نظیر کے دربار کا دروازہ ہمیشہ وا رہتا تھا اور ان کی صحبت ہر شخص کے لئے صلائے عام تھی۔ اس لئے وہاں ہر رنگ کا آدمی حاضر ہوتا تھا۔ یہ ادنیٰ طبقے کے لوگوں اور غربا کے ساتھ خاص مراعات کرتے تھے اور یہ لوگ بھی اُن کی خدمت میں خاص طور پر گستاخ تھے۔ چنانچہ فقیر، ان سے مناقبیں، قلندر صدائیں اور پھیری کے خونچے والے لٹکے کہوا کر لے جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کے بہت سے کلام کی نوا آزادانہ اور لے قلندرانہ ہے۔ اس قسم کی نظمیں خاص طور پر طویل اور مترنم بحروں میں ہیں تاکہ گانے میں سہولت ہو اور لَے کے ساتھ خوب پڑھی جاسکیں۔ نظیر کا کلام اکبرآباد اور مضافاتِ اکبرآباد کے خصوصاً اور ملک کے عموماً فقیروں کی زبان پر ہے۔ سنا جاتا ہے کہ بنگال کے فقیروں کو بھی ان کا کلام بہت یاد ہے۔ فقیروں کو جو مناقبیں اور معجزے میاں نظیر کے یاد ہیں وہ ایسے حسب حال اور پُر اثر ہیں جن سے خاص کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یہ فقیر اب بہت تھوڑے رہ گئے ہیں اور جو کچھ ہیں وہ چراغ سحری ہیں۔ ہر چند یہ کلام سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آرہا ہے لیکن اس طریقے سے اول تو کلام کی صورت بہت کچھ بدلتی جارہی ہے دوسرے فقیروں کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ پھیری والے پیشہ وروں اور خونچے والوں کو بھی نظیر کا کلام جس کی نوا آزادانہ ہے کافی یاد ہے۔ یہ لوگ اسے گا گا کر اپنی چیزیں بیچتے ہیں، جس کی وجہ سے خوب بکری ہوتی ہے۔ مشتہر کرنے کا اتنا مؤثر اور فطری طریقہ نظیر کی ایجاد ہے۔ آگرے میں گا گا کر سودا بیچنے اور لے کے ساتھ چیز کا اعلان کرنے کا رواج غالباً نظیر کے وقت اور ان ہی کی نظموں کی بدولت پڑا۔ آگرے کے چورن بیچنے والوں کو جو خونچہ لگاتے ہیں نظیر کے لٹکے بہت سے یاد ہیں جو نہایت پُر لطف اور سامعہ نواز ہیں۔

متروکات و معائب | مردہ زبانوں کا تو خیر کوئی ذکر نہیں، جو زبانیں زندہ ہیں یعنی جن کی بولنے والی قومیں روئے زمین پر موجود ہیں اُن میں روزمرہ تبدیلیاں اور آئے دن اختلافات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اگر نوشیرواں کے دربار کا کوئی امیر اس وقت زندہ ہو جائے تو وہ ایران کی موجودہ زبان سے بہ مشکل کوئی مطلب سمجھ سکے گا۔ نظیر کے زمانے سے اس وقت تک زبان اُردو میں بڑی بڑی ترمیمیں اور تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔ سینکڑوں الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جو اب قطعی متروک ہیں۔ اسی طرح نظیر کے کلام میں جو بہت سی ترکیبیں مستعمل ہیں وہ اب رائج نہیں۔ پس جس طرح اور اساتذہ کے کلام میں متروکات کا استعمال ناجائز نہیں سمجھا جاتا اسی طرح نظیر کے کلام کا بھی عیب نہیں خیال کیا جا سکتا۔ نظیر کے کلام پر یہ ایک بڑا اعتراض ہے کہ اُن کے یہاں صحت لفظی کا التزام نہیں۔ یہ اعتراض بھی جملہ متقدمین پر ایک ہی طرح صادق آتا ہے۔ ہر چند اس زمانے میں صحت لفظی کی کوئی قید نہ تھی لیکن نظیر کے معاملے میں اس کا ایک خاص جواب موجود ہے۔ وہ یہ کہ نظیر عوام کے تلفظ کے مطابق لفظوں کو باندھتے ہیں اور چونکہ وہ عامۃ الناس کے ہی مخصوص شاعر ہیں اس لئے اس معاملے میں انھیں ہر طرح کا اختیار اور پوری آزادی حاصل ہے۔ یہ بات کیسی بے محل ہوتی کہ وہ کنہیا جی کے جنم میں ہندو عورتوں کی زبان کی جگہ لکھنؤ کی خواتین کی زبان لکھتے اور بلدیو جی کے میلے میں برج کے گنواروں کی بجائے دہلی کے ثقات کی۔ نظیر کی شاعری پر بعض لوگ یہ بھی اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ وہ مرصع نہیں ہے۔ یہ اعتراض اگر صحیح بھی تسلیم کیا جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے موجد اپنی ایجاد کو مرصع اور مکمل نہیں بنا سکے۔ یہ متاخرین اور متبعین کا فرض ہے کہ تقلید کے راستے میں جو فرد گزاشت اور کمی دیکھیں پوری کر دیں لیکن نظیر کا کلام مرصع اور مکمل بھی ہے۔ وہ اپنا رنگ اپنے ہی پر ختم کر گئے۔ جب ٹھنڈے دل سے نظیر کی شاعری پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کی بنا مخصوص محاسن پر قائم ہے۔ وہ اٹھارویں اُنیسویں صدی عیسوی کے صرف بہت بڑے شاعر ہی نہ تھے بلکہ ہندوستان کی سرزمین کے ایک نہایت عالی وقار صناع بھی تھے۔ یہ اعتراض کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے کام نامکمل چھوڑا۔ ان کے کام کی ماہیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہی بہت زیادہ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ تمام

عناصر جن سے ان کی شاعری مرکب ہے، ان کو خود ہی دریافت بھی کرنے پڑتے تھے۔ یہ سارے جواہر جن کی تلاش میں وہ ہر وقت سرگرم کار رہتے ایک ایسے ویرانے میں، مدفون تھے جن کا وجود اور کسی فرد کی نہیں بلکہ صرف ان ہی کی نگاہ نے دریافت کر لیا تھا۔ اس باب میں یہاں تک کہنا پڑتا ہے کہ ان کو کھود نکالنے کے لئے اوزار بھی اُن ہی کو بنانے پڑتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کو ایسی شدید ظلمت میں پایا جہاں کوئی مدد، کوئی اوزار، کوئی نمونہ موجود نہ تھا اور اگر کوئی نمونہ موجود تھا تو وہ نہایت ذلیل اور ادنیٰ قسم کا۔ کہا جاتا ہے کہ نظیر کے کلام میں بیجا اعادے کا عیب ہے۔ فی الواقع یہ شعر کا بڑا عیب ہے لیکن اعادے کی کثرت صرف اس وقت ناگوار ہوتی ہے جب ایک ہی بات یا خیال بار بار دُھرانے سے طبیعت پر بار پڑے اور یکسانیت سے جی اُکتا جائے۔ لیکن جس صورت میں ایک ہی خیال مختلف موقعوں پر مگر ہر مرتبہ نئے نئے خیالات کے ماحول میں پیش کیا جائے تو بُرا نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس سے کلام میں زور اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ فنِ موسیقی کی شہادت اِس عیب کے حسن کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ترنم کے ساتھ جو روانی اور سلاست پیدا ہو جاتی ہے وہ مزید بر آں ہے۔

عروض | نظیر کے عروض پر تفصیلی بحث کرنے میں طول کا اندیشہ ہے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ نظیر کے کلام میں بہ ظاہر عروضی غلطیاں موجود ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ عروضی غلطیاں کلام غلط ہو جانے سے بعد میں پیدا ہو گئیں یا خود نظیر سے سرزد ہوئیں اس کی تحقیق سردست بہت دشوار ہے۔ اِس وقت جو کلام میسر ہے اس میں خامیاں موجود ہیں۔ موجودہ ضروریات کے لئے صرف اسی کلام پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ غلطیاں کس نوعیت کی ہیں۔ ان میں بعض غلطیاں تو قافیہ سے متعلق ہیں اور بعض وزنِ شعر سے یعنی یہ کہ تقطیع کرتے وقت بعض حروف مثلاً ع، ح، ر، ہ تقطیع سے گر جاتے ہیں۔ اس قسم کے معائب نظیر کے کلام میں کچھ نئی بات نہیں، شہباز نے مثالیں دے کر دکھایا ہے کہ قدیم اساتذہ کے کلام میں بھی یہ نقائص کثرت سے موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِس ابتدائی زمانۂ شاعری میں شعر پر ایسے دقیق قیود عائد کرنا اس دور کے دور میں شعرا نے مناسب نہ سمجھا۔ اِس عام جواب سے نظیر پر اعتراض کا بھی جواب مل جاتا ہے لیکن اُن کے متعلق ہمیشہ یہ ایک خاص بات اور یاد رکھنی چاہئے

کہ وہ بسا اوقات الفاظ کا تلفظ عوام کی زبان کے مطابق کر جاتے ہیں۔ اِس نکتے کو یاد رکھنے سے نہ صرف اِس بات کا بلکہ اور بہت سے اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے۔ عوام کی زبان کے مطابق تلفظ کر کے مصرع پڑھنے میں بہت سے حروف جو بظاہر تقطیع سے گرتے معلوم ہوتے ہیں خارج نہ معلوم ہوں گے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ نظیر نے جو کچھ کیا وہ عمداً اور دانستہ کیا۔ وہ کسی طرح عروض میں عاجز نہ تھے۔ ہاں مشرقی عروض کی سخت بندشوں سے تنگ آ کر ان کی فطری آزادی پسند طبیعت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تخئیل کی صحت اور شگفتگی کی خاطر کہیں عروض کے قواعد قربان ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ وہ عروض کو شعر کا صرف جزو ضروری سمجھتے تھے جزو لاینفک نہ سمجھتے تھے اور اس نظرئیے میں وہ ارسطو کے ہم خیال تھے۔

فحشیات نظیر کے کلام میں جہاں فحش اور غیر سنجیدہ باتیں ہیں اُن کے متعلق کئی جگہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کا وجود محض معاشرت نگاری کی بنا پر ہے۔ اِن کو اگر نظر انداز کر دیا جاتا تو انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا پہلو پوشیدہ رہ جاتا، جس سے نظیر کی اہلیت اور ہمہ گیری پر اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس موضوع پر زیادہ بحث کی حاجت نہیں۔ صرف سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری کے فاضلانہ تبصرے مطبوعہ نقاد اگست ۱۹۱۳ء کا ایک حصہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے اس عنوان پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

"بعض نظمیں جو غیر مہذب ہیں، اُن سے نظیر کی شاعری کو حقیقتاً کوئی تعلق نہیں۔ بلاشبہ اِن کا شمار نظیر کے نتائج افکار میں ہو سکتا ہے لیکن چونکہ اُن کا وجود تفنن طبع یا کسی خارجی تحریک پر مبنی سمجھا جاتا ہے اِس لئے کلام نظیر کی تنقید کے واسطے وہ بطور معیار کے کام نہیں دے سکتیں۔ اِن مخرب اخلاق و اشتعال انگیز نظموں کی شانِ نزول یا غرض و غایت کیا تھی؟ اس کا صحیح جواب اس وقت دینا محال ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ معاشرت انسانی کے جو تاریک پہلو نظیر نے دکھلائے ہیں وہ غیر فطری یا سرتا پا غلط ہیں۔ ممکن ہے کہ سوسائٹی کی اصلاح کی غرض سے، شاعر نے یہی مناسب سمجھا ہو کہ لوگوں کے آگے، اُن کی مذموم عادات و خصائل کا تذکرہ، من و عن کر دیا جائے کہ اُنھیں اپنی دردناک اور غیرت سوز حالت پر غور کرنے کا موقع ملے اور اس سے شاید اتنا ہو کہ وہ اپنے خصائل و اخلاق

کی درستی بہ آسانی ہو جائیں۔ اِسی کے ساتھ یہ بھی بعید از امکان نہیں کہ انھوں نے اپنی طبعی خواہش سے ایسا کیا ہو۔ تاہم اِس کے لیے نظیرؔ کو خصوصیت سے ملزم گرداننا ناانصافی ہے خصوصًا اُس حالت میں کہ سعدی ایسے گراں پایہ فلسفی شعرا کا دامن ہزل گوئی کے بدنما داغ سے ملوث نظر آرہا ہے۔ ہمیں "خذ ما صفا ودع ماکدر" کے عاقلانہ اصول پر کاربند ہونا چاہیے۔ اچھے مال کی قدردانی کرنا چاہیے اور خراب چیز کی طرف نظر بھی نہ ڈالنا چاہیے۔ اِس مسلک کو اختیار کرنے کے بعد اربابِ نظر متلاشی ہوں گے تو اُنھیں "ویرانۂ نظیرؔ" کی خاک سے بہت سے بیش قیمت خزف ریزے ایسے ملیں گے جن سے ادب و لٹریچر کا تاج غیر معمولی زیب و زینت پا سکتا ہے۔ متعدد نظمیں نظیرؔ کی اِس قسم کی ہیں کہ اُن کا انتخاب تعلیمی کورس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اور اُن کا منتخب مجموعہ نونہالانِ قوم کے ہاتھ میں بلا کسی خدشے کے بغرضِ استفادہ دیا جا سکتا ہے۔"

رسمِ خط ہر شخص جانتا ہے کہ بعض قدیم الفاظ کی کتابت کا طرز بھی پرانا ہے۔ لیکن اب قدیم الفاظ کے ترک کے ساتھ اُن کا طرزِ کتابت بھی بدل گیا ہے۔ اِس تالیف میں رسمِ خط کہیں تو قدیم ہی قائم رکھی ہے کہیں جدید کر دی ہے۔ قدیم کتابت صرف اُن مقامات پر قائم رکھی ہے جہاں ضرورتِ شعری نے اِس کے قائم رکھنے کے لیے مجبور کیا۔ "جاوے" "آوے" اور اس قبیل کے الفاظ کو اسی شکل میں رکھا گیا ہے۔ اگر بدل دیئے جاتے تو شبہہ ہو سکتا تھا کہ نظیرؔ نے اسی طرح لکھا ہوگا۔ لیکن اُدن، اُدسے، اونہیں کو اُن، اُسے، اُنہیں کر دیا گیا ہے اس لئے کہ ایسا کر دینے سے تلفظ میں کوئی فرق نہیں پڑتا نہ اور کوئی شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ اب بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی کتابت بدل دینے سے بعض اوقات تو مصرع کی موزونیت پر اثر پڑتا ہے اور بعض اوقات نہیں پڑتا مثلاً ایدھر، اودھر، چنانچہ جس جگہ تلفظ صاف طور پر "ایدھر" ہے اور بدلنے سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے وہاں کتابت اِسی طرح رکھی ہے۔ لیکن جہاں تلفظ ادھر ہے اور بدلنے سے بھی مصرع موزوں رہتا ہے وہاں بے خوف کتابت بدل دی گئی ہے۔

سوانحِ نظیرؔ پروفیسر شہبازؔ نے زندگانیٔ بے نظیر میں نظیرؔ کے عقلی و نقلی سوانح عمری جمع کئے ہیں اور کلام کو

زندگی کے واقعات کی روشنی میں دکھانے کی کچھ کچھ کوشش کی ہے۔ اس سے نظیر کی پیدائش، وطن، پیشہ، مزاج، چال چلن، اخلاق، اشغال، معاشرت، سیرت غرض زندگی کے جملہ حالات بخوبی واضح ہوجاتے ہیں لیکن اس مجموعے کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ نظیر کی تذکرہ نگاری کا مسئلہ پورے طور پر حل ہوگیا۔ اس سے واقعات کی کیا بی کی جانب اشارہ کرنا مقصود نہیں بلکہ اِس پر نظر ہے کہ تذکرے کا مدعا حاصل کرنے کے لئے اُن کا محدود اور نامکمل استعمال کیا گیا ہے۔ اگر کوئی فردِ واحد واقعی اِس کا اہل ہے کہ اس کی حیات کے واقعات اور خصائل یادگار کے طور پر ضبطِ تحریر میں لائے جائیں تو انصاف کا یہی فیصلہ ہے کہ عوام الناس خصوصاً اس کے اہلِ وطن کو اس کی سیرت کے جملہ اندرونی سرچشموں اور وسائل سے روشناس کرادینا چاہیئے۔ زمانے کو دکھا دینا چاہیئے کہ دنیا اور انسانی زندگی اس کے ذاتی نقطۂ نظر سے اس کے نفس پر کس حیثیت و رنگ میں منکشف ہوئیں۔ اس کے عہد کے خارجی واقعات نے اس میں کیا ترمیم کی اور اس نے اپنی شخصیت اور باطنی تاثرات سے ان میں کیا تغیر پیدا کیا۔ وہ کس کس کوشش اور قابلیت سے اُن پر غالب آیا اور کیسے کیسے تصادم اور کن کن صعوبتوں کے بعد اُن سے مغلوب ہوگیا۔ ان سب باتوں کو ایک فقرے میں یوں کہنا چاہیے کہ سوسائٹی نے اس پر اور اس نے سوسائٹی پر کیا اثر ڈالا۔ کسی فرد کی حیات کے متعلق جو شخص اِن سوالات کا شافی جواب دے وہ اس کے تذکرے کا مکمل نمونہ پیش کر سکتا ہے۔ بے شمار انسانوں میں صرف معدودے چند نفوس اس نوعیت کا مطالعہ کئے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ بہت سے تذکرے لکھے جاتے ہیں اور معصوم و عجائب پسند طبائع کو خوش اور مطمئن کرنے کے لئے لکھے جانے بھی چاہئیں لیکن جو اس مفہوم کو ادا نہ کریں گے وہ صرف ایک بار مطالعے کے بعد ہمیشہ کے لئے طاقِ نسیاں کے سپرد کردئے جائیں گے۔ اب میں غلطی نہیں کرتا تو نظیر اِسی فہرست کے چند افراد میں سے ہیں۔ لیکن اِن کا ایسا مطالعہ جس کا یہ ماحصل ہو اب تک نہیں کیا گیا۔ اِس ضمن میں میری کوشش ناکافی اور کمزور ثابت ہوتی اس لئے میں نے اِس سے گریز کیا۔ نہ ایسی بحث اس مختصر جریدے کا موضوع بن سکتی ہے۔

قطعات | اب دو قطعات تاریخ درج کئے جاتے ہیں جن سے میاں نظیر کی وفات کا سن نکلتا ہے۔ ان میں پہلا نظیر

نظیر کے صاحبزادے خلیفہ گلزار علی اسیر کا نتیجۂ فکر ہے اور دوسرا حکیم قطب الدین خاں باطن کا جو نظیر کے شاگرد رشید تھے۔ قطعات حسب ذیل ہیں :-

(۱) چہ خوش در رحلتش آورد فکرِ طبع تاریخے — نظیر اکبرآبادی چوں زیں دنیائے ابتر شد
نظامِ نظم باہم درہم و برہم شدہ یکسر — مخمس بے سروپا، بیت بیدل، فرد بے سرشد

۱۲۴۶ھ

دوسرا ملاحظہ ہو :-

(۲) ہزار حیف ز باطن گزشت استادم — کہ بے نظیر جہان و نظیر علم آموز
دوازدہ چہل و شش بود چوں سنہ ہجری — گزاشت نظم جہاں و جہان الم آموز
سن وصال طبیعت با نظام آورد — سرغزل و رباعی و مطلع و دل سوز

۱۲۴۶ھ

خاتمہ نظیر کا کلام جس بحث و تنقید کا مستحق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس کا حق ادا نہ ہو سکا۔ کلام کے صنائع و بدائع، انواع و اقسام، حقیقت و معنویت، نظیر کا شغفِ موسیقی، غرض بہت سے نکات ایسے ضروری ہیں جن پر اس وقت روشنی نہیں ڈالی جا سکی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ نظیر کی محاسن نگاری میری محدود قابلیت سے بہت بالاتر ہے۔ اس وقت جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ منتشر خیالات کا ایک مجموعۂ پریشان ہے جس میں کمالات نظیر کا احصا محال ہے۔ اب ارباب کرم سے استدعا ہے کہ اس ناکام کوشش کو بہ نظر اصلاح ملاحظہ فرمائیں اور جو جو معائب اور کوتاہیاں اس میں باقی رہ گئی ہیں انہیں از روئے ذرہ نوازی نظر انداز کریں یا ان کی طرف میری توجہ دلائیں۔ اس صحیفے کا مقصد کلام نظیر پر روشنی ڈالنا نہیں بلکہ ملک کو ان کے کلام سے جدید طریقے پر معرف کرانا اور اہل بصیرت کی توجہ اس کی جانب مبذول کرانا ہے تاکہ کسی اعلیٰ پیمانے پر ان کے کلام کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہو سکے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اگر نظیر کے متعلق کوئی مہتم بالشان تحریک شروع کی گئی تو یہ جریدہ جو اس وقت صرف ایک پیش خیمے کی حیثیت رکھتا ہے، اُس وقت نمونے کا کام دے گا اور اس عالی شان ایوان کا سنگ بنیاد بن سکے گا۔

شیوه

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبصرہ

نظیر کے کلام کے عام اور نمایاں محاسن پر سرسری بحث کرنے کے بعد اب اُن خاص نظموں کی طرف توجہ کی جاتی ہے جو اس صحیفے کے لئے منتخب کی گئی ہیں۔ یہاں ہر ایک نظم کو جدا جدا لے کر اس کے داخلی لطائف دکھانے اور اُن پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

آلہی نامہ ایک عبرت مندانہ نظم ہے جس میں فنائے جہاں اور بقائے رحمان کے مسلم الثبوت مسئلے کی تشریح کی گئی ہے اور دقیق حکیمانہ نکات کو عام فہم نصیحتوں میں منتقل کرکے شعر کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ ادل

تو اس نظم میں ایک بہت بڑا کمال یہ ہے کہ مختلف موجودات عالم اور اجزائے کائنات پر باری باری سے نظر ڈال کر عالم اسباب کی ناپائداری اور خلاق عالم کا دائمی قیام ثابت کیا ہے۔ دوسرے اول سے آخر تک صداقت اور حقیقت کی ایک ایسی برقی رو اس نظم میں دوڑتی چلی جاتی ہے جو قلب کو یکسر مضطرب کر دیتی ہے اور پھر دنیا کے تمام مشاغل و تعلقات ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جن چیزوں کو مثال کے طور پر فانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ بادی النظر میں استحکام و استقامت کا ایسا اہم نمونہ پیش کرتی ہیں جن کی فنا کا بظاہر گمان بھی نہیں ہوتا لیکن جب ایسی عظیم الشان و محتشم اشیائے عالم کی فنا کا مرقع پیش نظر ہو جاتا ہے تو عبرت اور ہیبت کے وحشت انگیز آثار دل پر طاری ہونے لگتے ہیں۔ دیکھئے یہ بند کس قدر عبرت آموز ہے:۔

جو شاہ کہاتے ہیں کوئی اُن سے یہ پوچھو — دارا و سکندر رہ گئے آہ کدھر کو
مغرور نہ ہو شوکت و حشمت پہ وزیرو — اس دولت و اقبال پہ مت پھولو امیرو

نے ملک نہ دولت نہ سرانجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر کا بہت بڑا کمال یہ ہے کہ وہ سنجیدہ موقعوں پر سطحی چیزوں سے اس طرح گریز کرتے ہیں کہ ذرا بھی شبہہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی بھی موقعے پر اُن سے کوئی سروکار رکھتے ہوں گے۔ دنیا کی فنا اور اہل دنیا کی چند روزہ حیات کا منطقی نتیجہ وہ یہ نکالتے ہیں کہ باہمی تفرقے اور تنازعے محض بیکار اور عبث ہیں اور اس لئے بے تعصب اور صلح کل روادارانہ اور پُرامن زندگی بسر کرنے کی تلقین اس طرح کرتے ہیں:۔

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں — جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں — عاشق تو قلندر رہے نہ ہندو نہ مسلماں

کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر کی اس نظم کا یہ بند الہامی ہے۔ شاعر کی پیغمبرانہ خصوصیات، معلوماتِ عامہ، بصیرت، دوربینی اور پیشین گوئی کی اس سے بہتر مثال غالباً دنیا کے کسی لٹریچر میں میسر نہیں آسکتی۔ اس کو دیکھ کر لامحالہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ نظیر ہندوستان کے موجودہ سیاسی تلاطم کو اپنی دوربین نگاہوں سے دیکھ چکے تھے اور اس زمانے کے مذہبی اتحاد کی رہنمائی کے لئے انھوں نے یہ کلیہ وضع کیا تھا۔

برسات کی بہاریں، فصل اور موسم کے متعلق خاص مشرقی مذاق کی نظم ہے اور شاعر کے طبعی ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ اس میں جابجا اپنے وطن کی خصوصیات فائقہ کا تذکرہ ہے۔ اس لئے برسات کی بہاریں، مناظر کی دلفریبیاں، سوسائٹی کے مشاغل، ساری باتیں ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہیں۔ موسم کے تغیر سے روزمرہ کی زندگی میں جو جو واقعات پیش آتے اور تبدیلیاں ہوتی ہیں سب کا سچا حال اور صحیح مرقع شاعر نے پیش کیا ہے۔ اس نظم میں، دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بے سود کوشش نہیں کی گئی بلکہ ہندوستان کی برسات کے قطرے قطرے کے دریا ہونے کا ثبوت دیا گیا ہے۔ نظیر کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آواز سے صورت کی تخلیق اور ترنم سے کیفیت کی صورت گری کرتے ہیں۔ اس نظم میں یہی التزام کیا گیا ہے۔ اس نوع کی مصوری کے لئے انھوں نے جابجا ایسے موزوں اور مترنم الفاظ استعمال کئے ہیں کہ صورت مفہومہ کا سچا منظر اور کیفیت متعلقہ کا سچا اثر، باصرے اور سامعے کے لئے پیدا ہو جاتا ہے:۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزے کی لہلہاہٹ، بوندوں کی جھمجھاوٹ، ایسی ترکیبیں ہیں جن میں لہلہاہٹ کے صرف تلفظ سے سبزے کی تازگی، ہلکے دہانی پن اور خفیف جنبش کا سماں بندھ جاتا ہے اور جھمجھاوٹ کے محض ترنم سے بوندوں کے تواتر کی موسیقی سامعہ نوازی کرنے لگتی ہے۔ اس نظم کے تیسرے اور پانچویں بندوں میں بھی اس قسم کی صنعتیں موجود ہیں۔ برسات

کے لطائف کی ہو بہو مگر سادہ اور غیر مصنوعی تصویر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں　　گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں　　اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہندوستانی برسات کی دلفریبیاں اس قیامت کی ہوتی ہیں کہ ان میں مبتلا ہو کر کسی شخص کو دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہ سکتی۔ لیکن نظیر کی رمز شناس بصیرت برسات کے مجازی حسن میں، حقیقی جمال کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔ وہ حسن مطلق کی ناقابل برداشت جلوہ ریزیوں سے متاثر ہو کر بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں:۔

کویل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا　　اور مور کی زٹل میں تیرا پیام ہے گا
یہ رنگ سو مزے کا جو صبح و شام ہے گا　　یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

برسات کی بہاروں میں عشاق کے اضطراب اور درد فرقت کا جہاں تذکرہ ہے وہاں بھی ہندی شاعری کی نازک ترین خصوصیت قائم رکھی ہے۔ جنس لطیف کو عاشق قرار دے کر ہجر کی کلفتیں اور پیا سے دوری کی مصیبتوں کا سارا دکھ درد بیان کیا ہے۔ وصل سے شاد کام پیا کی پیاریوں اور بے قرار برہنوں کی قلبی کیفیات کی مصوری میں جو خوبی ہے وہ تحریر میں نہیں آسکتی، صرف محسوس کی جاسکتی ہے برسات کا پورا پورا لطف لوٹنے والی بنی سنوری رنگین پریوں کی عیش آرائیاں، شوخ و شنگ طرحداروں کے حسن بے پناہ کا زاہد فریب عالم، مستان شباب اور متوالی ادا والیوں کی توبہ شکن رنگ رلیاں، اگرچہ عشاق کے لئے بجائے خود نہایت مہلک و تباہ کن ہیں لیکن نظیر نے ان کا نقشہ جن پیارے الفاظ میں کھینچا ہے وہ خالص ان کے حصے کی چیز ہے، آہ کہتے ہیں:۔

اور جس صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی　　گلنار یا گلابی یا زرد سرخ دھانی
کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی　　جھولوں میں جھولتی ہیں اوپر پڑے ہے پانی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اِس بند سے پہلا ایک اور بعد کے دو بند بھی اِسی ستم کے ہیں، گو شاعرانہ رنگ غالب ہے اور جوانی کی رندانہ بے باکی اپنی جھلک دکھا رہی ہے مگر جس رنگ میں ہیں محاکات کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ برسات کی مصوری کرنے میں اِس کے اثرات اور لازمی نتائج کسی کو نظر انداز نہیں کیا۔ امرا و غربا کے مکانوں کی حالتیں، ان کے طرزِ معاشرت، سب کا موقعہ بہ موقعہ تذکرہ ہے۔ غرض کہ بیر بہوٹی، کنسلائی، دھتورے، پھنسی، پھوڑا، کچھ بھی ان کی نظر سے نہیں بچا۔ یہاں تک کہ ظرافت کے لئے برسات میں پھسلنے پھسلانے کا بھی حال موجود ہے۔

بنجارے نامہ ایک حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری اور ناصحانہ نظم ہے۔ یہ معنوی اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔ اِس کے پوشیدہ مطالب جس قدر عمیق ہیں اس کی ظاہری دلچسپی اُسی قدر نمایاں ہے۔ حقیقی معانی سے قطع نظر کر لیا جائے تو بھی نظم بالذات نہایت لطیف اور مکمل رہتی ہے۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ دقیق و عمیق نظم نظیر کے کلام میں نہیں ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ غالباً اس سے زیادہ مقبول بھی ان کی کوئی نظم نہیں ہوئی۔ اول تو اس کی بحر نہایت مترنم اور حسرت و یاس کے خیالات اظہار کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ اس کی روانی و تسلسل سے ایک قسم کا سکون قلب پر طاری ہو جاتا ہے جو فی نفسہ حسرت و یاس کا بڑا معاون ہے۔ دوسرے خیالات اور الفاظ بحر سے اس طرح وابستہ ہیں کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہ نظم کسی دوسری بحر میں لکھی جاتی تو اس میں اتنی دلکشی اور جاذبیت پیدا نہ ہوتی اور نہ اس پر اختراع فائقہ کا اطلاق ہو سکتا تھا۔ علاوہ اِس کے کہ شاعر نے بنجارے کی خانہ بدوش زندگی سے انسان کی نقش بر آب ہستی کی تمثیل پیدا کی ہے، اظہارِ خیال اور مرقع کشی کے لئے، الفاظ اتنے موزوں، مناسب، اور بجے تُلے منتخب کئے ہیں جن کا جواب ناممکن ہے۔ الفاظ کثرت سے استعمال کرنے، غیر مانوس کو مانوس بنانے، اور مترادف بہم کرنے کا جو کمال نظیر میں بدرجۂ اتم ہے، وہ اس نظم سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے۔ اِس بند کو دیکھئے :-

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے　　　اے غافل تجھ سے بھی چترا اک اور بڑا بیوپاری ہے

کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے　　کیا داکھ منقا سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

عاشق نامہ ایک عارفانہ نظم ہے اور اپنی طرز میں نہایت مکمل ہے۔ اہل تصوف کے اعتقاد و یقین، ہمہ اوست کی تشریح اس سے بہتر غالباً نہیں ہو سکتی۔ ساری نظم اول سے آخر تک نہایت صاف، سادہ و پاکیزہ اور عام فہم الفاظ میں ہے۔ اول تو نظم کا ہر ہر مصرع بیساختہ ہے لیکن ہر بند کے چوتھے مصرعے میں بیساختگی اور بلاغت کی انتہا نظر آتی ہے۔ ہر بند بجائے خود اس قدر پُر معنی او رمکمل ہے کہ قوت انتخاب مجروح ہے۔ لیکن معشر کی ٹیپ کی، جو ہر بند میں دُہرائی جاتی ہے، فصاحت و بلاغت و معنویت سب سے بالاتر ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان　　عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

نظیر تو دلبر کو ہر آن، ہر بات، ہر ڈھنگ میں پہچان لیتے ہیں لیکن ٹیگور کہتے ہیں:۔

"وہ وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین میں ہل چلا رہا ہے جہاں سڑک بنانے والا پتھر توڑ رہا ہے، وہ اُن کے ساتھ دھوپ اور بارش میں ہے اور اس کا ملبوس خاک میں اٹا ہوا ہے۔ یہ خرقۂ سالوس اُتار کے پھینک دے اور اسی کی طرح خاک زمین پر اُتر آ"

دوسری جگہ اسی خیال کو ٹیگور نہایت پُرسکون و متین الفاظ میں یوں اظہار کرتے ہیں:۔

"کیا تم نے اُس کی خاموش آواز قدم نہیں سُنی وہ آتا ہے، آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔
ہر لمحہ اور ہر عمر میں، ہر دن اور ہر رات وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔
میں نے بہت سے گیت مختلف کیفیات قلب میں گائے لیکن ان کا لحن ہمیشہ یہی رہا کہ وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔
گرم اپریل کے معطر ایام میں، جنگل کے راستے سے وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔ تُمہارے جولائی کی باراں تاریکی میں بادلوں کے گرجنے والے رتھ پر وہ آتا ہے اور ہمیشہ آتا ہے۔

تو ہتر الم کی حالت میں اسی کے قدم ہیں جو میرے دل کے اندر گڑھ جاتے ہیں اور اسی کے قدموں کا زریں مس ہے جو میری مسرتوں کو درخشاں بنا دیتا ہے "

شخصیتوں کا مقابلہ ایک ناپسندیدہ سی کوشش ہے لیکن اتنا بتا دینا نہایت دلچسپ ہوگا کہ ٹیگور کی اس نظم کے ہر ہر خیال کا مترادف عاشق نامے میں مل سکتا ہے۔ دونوں نظموں کو ساتھ پڑھنے سے بہت لطف حاصل ہوتا ہے، اور دونوں ایک دوسرے کے محاسن پر خوب روشنی ڈالتی ہیں۔

آدمی نامہ ایک قسم کی فلسفیانہ نظم ہے جس میں انسانی سوسائٹی کے مختلف دیتایئن مراتب دکھائے گئے ہیں۔ نظیر چونکہ انسان کے عاشق اور معاشرت کے شیدائی ہیں اس لئے وہ یہ نظم کہنے پر مجبور ہوئے وہ دیکھتے ہیں کہ ہر متنفس فطری اعتبار سے اور خدا کے نزدیک بھی ایک ہی سی حیثیت رکھتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے ہر شخص برابر اور حیثیت و شان میں یکساں نہ سمجھا جائے۔ اپنے خیال اور مطمح نظر کے خلاف، مراتب میں اختلاف اور حیثیات میں فرق دیکھ کر انھیں خاص تعجب ہوتا ہے۔ اس لئے وہ انسانی معاشرت اور مشاغل کے مختلف پہلو ایک جگہ جمع کرکے دکھلاتے اور اہل بصیرت کی توجہ دنیا کے واقعات کی گوناں گونی کی طرف مبذول کرنے کے لئے کہتے ہیں :-

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی | اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی | نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ایک شخص کو بادشاہ اور دوسرے کو ٹکڑے چباتا دیکھ کر خداوند عالم کے ناقابل درک و فہم رموز کا احساس ہونے لگتا ہے اور مشیت کا لاینحل پہلو پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اس نظم کی سادگی، شستگی اور روانی میں ادب القدما کی سی جھلک پائی جاتی ہے اور نظیر کی بیساختہ گوئی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ نظم اس قدر مسلسل، بے تکلف اور بے تصنع ہے کہ مصرعوں پر نثر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگر مصرعے کی نثر کرنا چاہیں تو الفاظ کی نشست و

ترتیب بدلنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ میاں نظیر کا سا' یہ کمال سوائے میر انیسؔ کے اساتذہ میں کوئی نہ پیدا کرسکا۔ سعدی نے بھی آدمی نامے کی مماثل ایک نظم "درصنعت حق تعالیٰ" کریما میں لکھی ہے۔ نظیر اور سعدی دونوں اساتذہ کا موضوع ایک ہی ہے لیکن نظیر نے صنعتِ حق کو مخصوص کرنے کے لئے آدمی کو اس کا مظہر قرار دے لیا ہے۔ یہ انتخاب بہترین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نظیر کی نظم جس قدر بسیط اور جامع ہے سعدی کی اتنی نہیں سعدی فرماتے ہیں :۔

یکے پاسبان و یکے بادشاہ	یکے دادخواہ و یکے تاج خواہ
یکے تاجدار و یکے تاجدار	یکے سرفراز و یکے خاکسار
یکے بے نوا و یکے مالدار	یکے نامراد و یکے کامگار

آدمی نامہ جیسی سنجیدہ نظم میں کہیں کہیں ظرافت کا چٹپٹا پن بھی موجود ہے اور کیوں نہ ہو شاعر کا فطری چلبلاپن کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔ ایک جگہ کہتے ہیں :۔

اور آدمی ہی ان کی چُراتے ہیں جوتیاں

نظیر عیدگاہ یا جامع مسجد میں نماز پڑھنے کو گئے ہوں گے 'جوتہ لامحالہ دروازے پر اُتار دیا ہوگا۔ کوئی صاحب موقع دیکھ کر اُٹھالے گئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو اور یہ اُس وقت دیکھ رہے ہوں۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال	اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال

* اس شعر کا کسی قدر تاریخ سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ نظیر کے زمانے میں پنڈاریوں کی رہزنی شباب پر تھی۔ اُن کی دست بُرد سے مسافروں کو سخت اذیتیں اور تکلیفیں پہونچتی تھیں۔ یہ لوگ دھوکا دے کر مسافر کو لگا لاتے تھے اور موقع پاکر گلے میں رومال ڈال کر پھانسی دیتے اور چشم زدن میں مار ڈالتے تھے۔ اس کا مال و اسباب آپس میں بانٹ کر صرف میں لاتے تھے۔ اس شعر میں غالباً اس طرف اشارہ ہے۔

ہنس نامہ ایک مشہور حکیمانہ تمثیل یا الیگری ہے۔ اِس میں دو نصیحتیں پہلو بہ پہلو کی گئی ہیں۔ پہلی اور بالکل نمایاں تو یہ ہے کہ انسان کی زندگی عارضی ہے۔ جب وہ دُنیا سے رخصت ہوتا ہے تو تن تنہا جاتا ہے۔ کوئی دوسرا خواہ کیسا ہی ہمدم اور رفیق ہو ساتھ نہیں دیتا۔ دوسری سطح سے کسی قدر نیچی یہ ہے کہ محبت سے اِس قدر مغلوب نہ ہونا چاہیے کہ اپنی حقیقت اور ماہیت نظروں سے پوشیدہ ہو جائے قبل اس کے کہ تجربہ نااہل ثابت کرے ہمیں خود اپنی طاقت کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ اب ہنس نامے کی داخلی شعریت کو لیجیے۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو ناصحانہ جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا اور دوسرا حاکیانہ۔ نظم میں حکایت یہ ہے کہ ایک ہنس نے کسی شہر سے آکر ایک پیڑ کی کسی شاخ پر اپنا گھر بنالیا۔ اس شجر پر رہنے والے جتنے پرندے تھے، سب کو، چند روز میں، اس سے کمال محبت ہو گئی۔ آخر کار ہنس کے وطن جانے کا دن آیا۔ پہلے تو پرندوں نے اس بات کو باور کرنا نہ چاہا لیکن جب یقین ہو گیا کہ یہ کسی طرح نہیں رُک سکتا، تو اس کی محبت نے یہاں تک مجبور کیا کہ اِس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہر ایک اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق اس کے ساتھ اُڑا۔ آخر کو سب نے تھک کر پلٹنا شروع کیا اور ہنس اکیلا ہی سدھارا۔ اس نظم کی ایک بہت بڑی ظاہری خوبی یہ ہے کہ طیور کے نام اس میں کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک مقام پر اتنے نام اُردو میں غالباً کہیں نہ ملیں گے۔ اِس سے شاعر کی عام واقفیت اور زبان دانی کا کمال ثابت ہوتا ہے۔ مزید معنوی خصوصیت یہ ہے کہ مختلف اقسام کے پرندوں سے مختلف قسم، خیال، مزاج، ہیئت اور طبائع کے انسان مراد ہیں۔ ہر طائر کی حیثیت و اہلیت کے مطابق اس کے ساتھ اوصاف منسوب کئے گئے ہیں۔ وہ جس خدمت کی صلاحیت رکھتا ہے وہی اُس سے وابستہ کی گئی ہے۔ مثلاً بلبل چونکہ چھوٹی چڑیا اور بہار کی مغنّیہ ہے اِس لئے اس کے سپرد گانے کا کام ہے۔ کوّے اور کوئل کے دل میں ہنس کی محبت دکھائی ہے اس لئے کہ یہ ہمیشہ سے ناکام اور ازل سے اہل درد ہیں۔ کلنجن اور کلنگ چونکہ بڑے جثے کے پرند ہیں اس لئے وہ جنگ بجانے پر مامور ہیں۔ سیمرغ ایک عالی حوصلہ اور پُر احتشام پرند ہے، اس کی عظمت اس طرح

قائم رکھی ہے کہ وہ ملنے کا شائق ہوا۔ گرچہ بینکہ چونکہ قومی مگر ادنیٰ طبقے کا پرند ہے اس لئے اُسے پنکھا جھلنے کا کام دیا گیا ہے۔ غرض جس طائر کی حیثیت اور جُثے کے موافق جو خدمت تھی وہ اسے سپرد کی گئی ہے۔ آٹھویں اور نویں بندوں میں پیڑ کی پُر امن وسکون شاد و خرم زندگی کا مرقع پیش کیا ہے۔ لیکن دسویں اور گیارہویں بندوں میں لطف و طمانیت زائل ہوتے دیکھ کر دل پر رقت و یاس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جس وقت انسان مرنے لگتا ہے اور اس کو اپنے اقربا سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہونے کا یقین ہو جاتا ہے تو اسی قسم کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ کسی سے تقصیر بحل کراتا ہے، کسی سے رخصت ہوتا ہے اور کسی کو وصیت کرتا ہے۔ غرض کہ عجب پُر حسرت سماں ہوتا ہے، جس کے خیال سے جی تھرّاتا ہے۔ وہی کیفیت اس وقت ہنس کی دکھائی ہے۔ اس کے بعد پرندوں کا اضطراب دکھایا ہے اور یہ وہی کیفیت ہے جو انسان کے مرجانے کے بعد ہوتی ہے۔ آخر کے پانچ بندوں میں پرندوں کی درماندگی اور بیچارگی جو انسانی عاجزی کی مترادف ہے دکھائی ہے۔ آخر کے بند میں ساری نظم کا ماحصل ہے۔ فرماتے ہیں:۔

دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ پھر راہ　　جب شکل یہ ہو وے تو بھلا کیونکہ ہو نرباہ
ناچاری ہو جس جا تو وہاں کیجئے کیا چاہ　　سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

روضۂ تاج گنج چونکہ عمارت کے متعلق ہے اس لئے اس کو مصوّرانہ نظم کہہ سکتے ہیں۔ نظم کا لہجہ وصفانہ ہے۔ اس میں لوکل کلر یا مقامی رنگ اپنے پورے حسن کے ساتھ موجود ہے۔ یہ نظم شاعرانہ مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔ کہیں شاعرانہ مبالغہ یا تعلّی سے کام نہیں لیا گیا۔ عمارت اور چمن کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ اس سادہ بیانی اور سادگی میں ایسی دلکشی ہے کہ ہزار رنگ آمیزیاں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ کلس کے ہلال کی سادہ اور فطری تعریف اس سے بہتر الفاظ میں ناممکن ہے۔ کہتے ہیں:۔

اور وہ کلس جو ہے سر گنبد پہ سربلند　　ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند

ہر ماہ جس کے غم پہ مہ نو نثار ہے

اس کے بعد کے بند کی لطافت بار بار پڑھنے سے اور زیادہ بڑھتی اور دوبالا ہوتی ہے۔ آگے چل کر عمارت کی صناعیاں الفاظ میں منتقل کی ہیں اور محاکات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے کہ سنگ تراشی کے نازک ترین نمونے اور کامل ترین صنعتیں کاغذ پر دکھائی ہیں۔ دیکھئے :-

ہیں بیچ میں مکان کے وہ دو مرقدیں جو یاں ۔۔۔ گرد ان کے جالی اور مجّر ہے درفشاں

سنگین گل جو اس میں بنائے ہیں تہ نشاں ۔۔۔ پتے، کلی، سہاگ، رگ و رنگ ہے عیاں

جو نقش اس میں ہے وہ جواہر نگار ہے

آخری سے پہلے دو بند، باغ کی تعریف میں ہیں جن کو پڑھنے سے غیر معمولی شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور طبیعت نہایت تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ کسل و انقباض کے لمحوں میں اس نظم سے بہتر رفیق کوئی نہیں ہو سکتا۔ تمام تکدّر اور اُداسی آن واحد میں فرو ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک شعر کا یہ بہترین فریضہ ہے اور اسی کا نام شاعری کا کمال ہے۔

تندرستی نامہ ایک اعلیٰ درجے کی ناصحانہ نظم ہے جس کی ابتدا واعظانہ انداز میں ہوتی ہے۔ اس میں اول سے آخر تک یہ جتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا میں آبرو اور تندرستی دونوں بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ آگے چل کر اسی خیال کو وسیع کیا ہے جا بجا اسی کی تشریح کی ہے اور مختلف مثالیں دے دے کر سمجھایا ہے — زبان کے اعتبار سے یہ نظم نہایت صاف ہے۔ البتہ کہیں کہیں متروک الفاظ کا استعمال ہے۔ دیکھئے یہ بند حقیقت کا کیسا سچا مرقع ہے :-

ہوں گرچہ لاکھ دولتیں ہیں بسیار کے کنے ۔۔۔ اور نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوں بنے ٹھنے

بہتر ہیں مفلسی کے میاں چاب بنے چنے ۔۔۔ جو تندرست ہیں وہی دولہا ہیں اور بنے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست

اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اِس بند کی معنویت و صداقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ علالت میں کوئی چیز بھلی نہیں معلوم ہوتی اور تندرستی میں اگر سرد پانی بھی پیو تو شیر و شہد کا مزہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سعدی سا حقیقت شناس حکیم تندرستی کو لوازم حیات میں نہایت ضروری سمجھتا ہے:-

اے خالق ہر بلند و پستی　　　شش چیز عطا بکن زہستی
علم و عمل و فراخ دستی　　　ایمان و امان و تندرستی

ذکرِ مرغان ایک پُر رمز صوفیانہ نظم اور اُردو میں بالکل نئی چیز ہے۔ یہاں نظیر نے اپنے مجدّد اور خلّاق ہونے کا ثبوت دیا ہے اور شاعرانہ و مغنّیانہ آرٹ کا پورا پورا کمال دکھایا ہے۔ وہ ہر شام و سحر، طیور اور حشرات الارض کی آوازوں میں نغمۂ وحدانیت سُنتے اور اُسے صوتِ سرمدی کی آوازِ بازگشت سمجھ کر اس پر وجد کرتے ہیں۔ حافظؔ نے اپنی ہستی کو طائر کی مغنّیانہ حیات کا مترادف قرار دے کر کہا ہے:-

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　آنچہ اُستاد ازل گفت ہماں می گویم

حافظؔ کا خیال ہے کہ خدا جو کچھ مجھ سے کہواتا ہے میں چڑیوں کی طرح کہتا ہوں، لیکن نظیر اپنی دردناک خموشی کو محسوس کر کے چڑیوں کی حالت پر رشک اور اپنی غفلت پر افسوس اور ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

کس کس کا لوں نام غرض ہیں جتنے طائر خورد و کبیر　　　کوئی کہے یا حیؑ توانا کوئی کہے یا رب قدیر
طائر تو سب یاد کریں اور ہم غفلت میں ہیں اسیر　　　ہم سا غافل دنیا میں اب کوئی نہ ہوگا آہ نظیر
سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

غالباً اسی قسم کے کسی جذبے نے ٹیگور کے دل میں یہ صورت اختیار کر لی ہے جس کا اظہار اس طور پر ہوا ہے:-

"جب تو مجھے گانے کا حکم دیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا قلب، اس لطف پرستش کی سمائی اپنے دل میں نہ پاکر، فخر و غرور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، میں تیری صورت دیکھتا ہوں اور میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

جو کچھ میری زندگی میں سخت و کرخت ہے، ایک شیریں نغمۂ واحد کی صورت میں رقیق ہو کر تبدیل ہو جاتا ہے اور میری پرستش اس مسرور طائر کی طرح جو سطح سمندر پر اڑ رہا ہو اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں تو میرے گانے میں دلچسپی لیتا ہے، میں جانتا ہوں کہ صرف ایک مغنی کی حیثیت سے میں تیرے حضور میں آتا ہوں۔

میں اپنے وسیع البسط بازوئے نغمہ کے کنارے سے تیرے قدموں کو چھو لیتا ہوں، جن تک پہنچنے کا حوصلہ میں کبھی نہیں کر سکتا تھا،

مسرت سرود سے سرشار ہو کر میں اپنے تئیں بھول جاتا ہوں اور تجھے اپنا دوست کہتا ہوں حالانکہ تو میرا مالک و آقا ہے۔"

ذکر مرغان میں معنوی محاسن کے علاوہ لفظی و شعری صنائع بھی ہیں۔ ایلیٹریشن (یعنی ایک حرف سے شروع ہونے والے الفاظ کا بالالتزام ایک مصرع میں آنا) کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ نظم کو ذرا لحن کے ساتھ پڑھنے سے نہایت خوشگوار ترنم پیدا ہوتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔

فنا نامہ ایک عبرت مندانہ نظم ہے۔ میاں نظیر کو جو دلچسپی تاریخ سے تھی وہ اس نظم سے صاف ظاہر ہے۔ پوری نظم اول سے آخر تک عبرت کا ایک بسیط اور پُر درد سبق ہے۔ اہل بصیرت کے لئے اس سے زیادہ سامان پند و نصیحت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتا۔ اس کی زبان نہایت صاف ہے لیکن خال خال قدیم اصطلاحوں کا استعمال ہے جو اس وقت غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا استعمال ناگزیر تھا۔ مثالوں اور تشبیہوں میں ہندو مسلم جذبات کا توازن قائم رکھا ہے۔ پوری نظم سنجیدہ خیالات عبرت آموز واقعات اور سود مند

پند و نصائح کا ایک پر معنی چمن ہے، جس میں عبرت کے پھول جا بجا کھلے ہوئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ حوادث اور تغیرات عالم کا اِس سے بہتر اور موثر الفاظ میں تجزیہ بہت دشوار بلکہ محال ہے۔ دیکھئے یہ بند کیسے کیسے اولوالعزم راجاؤں اور عالی نسب فرماں رواؤں کے قدیم واقعات یاد دلاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا اب صرف نام ہی نام دنیا میں باقی رہ گیا ہے:۔

یا راج بنسی ہو کر دنیا میں راج پایا　　چتوڑ گڑھ ستارا کالنجر آبنایا
جب توپ نے اجل کی آمورچہ لگایا　　سب اڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا
گڑھ، کوٹ، توپ، گولہ سنگر ہوا تو پھر کیا

طفلی کے عنوان سے جو نظم ہے وہ نہایت پاکیزہ، سادہ اور فطری جذبات سے لبریز ہے۔ ہندوستانی شعرا میں ایسے بہت کم ہیں جنہوں نے جوانی کے علاوہ اور کسی حصۂ عمر پر نظر ڈالی ہو اور سوائے عاشقانہ جذبات محبت کے اور اصناف محبت سے بھی متاثر ہوئے ہوں۔ ہاں نظیر کی ہمہ گیری نے اِن پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ طفلی میں ہندوستانی نقطۂ نظر بھی موجود ہے اور دوسرے ممالک کے بچوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ہندوستانی بچوں کی معاشرت، اُن کے نازونعم سے پرورش کئے جانے کے حالات، اور بچوں کے متعلق والدین کے جذبات کا صحیح نقشہ اس میں موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بچپن نکل جانے کے بعد جب دنیا کے آلام و مصائب انسان کو گھیرتے ہیں تو طفلی کی بے فکریاں اس کو یاد آتی ہیں اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے:۔

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

اِس نظم کی زبان بہت صاف ہے لیکن کہیں کہیں متروک الفاظ جیسے ووں، گھرنا، اونٹنے، وغیرہ کا استعمال ہے۔ دیکھئے بچوں کی بے تصنع زندگی اور طمانیت نفس کا کیا سچا مرقع ہے:۔

جو ان کو دو دو سو کھا لیں پھیکا ہو یا سلونا　　ہیں بادشہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا

جس جا یہ نیند آئی پھر واں ہے ان کو سونا　　پروا نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیئے بچھونا
بھونپو کوئی بجالے پھرکی کوئی نچالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

اِس محبت بھری نظم کا، جو ہر صاحبِ اولاد کے نازک ترین حسیات کو برانگیختہ کرتی ہے، اِس سے بہتر کیا خاتمہ ہو سکتا ہے :-

جیتے رہیں سبھوں کے آس و مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جوانی عاشقانہ وجوانانہ نظم ہے اور رندانہ لہجے میں لکھی گئی ہے۔ یہ نظم جوانی دیوانی کی کرشمہ سازیوں سے سرتاپا لبریز ہے اور اس میں انسانی فطرت کے خلاف ایک حرف نہیں بتایا جا سکتا۔ اس نظم میں شباب کی بے لگام عیش آرائیوں اور بے حجاب لطف اندوزیوں کا منظر تو پیش نظر کیا ہی گیا ہے لیکن بیان کی بیساختگی و بے باکی نے اس نظم میں ایک خاص کیفیت اور لطف مکرر پیدا کر دیا ہے۔ انداز بیان میں اگر ثقاہت یا سنجیدگی سے کام لیا جاتا تو عنوان کی پوری پوری داد دی جا سکتی تھی۔ فطری جذبات کی فطری داد، صرف فطری شاعر ہی دے سکتا ہے اور صرف وہی فطری لطف برانگیختہ کر سکتی ہے۔ جوانی وہ عمر ہے جس میں انسان اندھا ہوتا ہے اور اس میں جو کچھ نہ کر بیٹھے تھوڑا ہے۔ شباب کی کارفرمائیاں کہاں تک گنوائی جائیں، ہر شخص اپنے دل سے پوچھ لے کیا حالت ہے :-

لڑتی ہے کہیں آنکھ کہیں دست کہیں سین　　چھوٹا ہے کہیں پیار کسی سے ہیں لگے نین
وعدہ کہیں اقرار کہیں سین کہیں نین　　نے جی کو فراغت ہے نہ آنکھوں کے تئیں چین
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

یہ نظم حقیقت میں کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔ ہر بات اس قدر صاف ہے کہ کسی تشریح اور وضاحت کی حاجت باقی نہیں رہ گئی۔ آرٹ اگر عریانی کا نام ہے تو یہ نظم اُس کا بہترین مظاہرہ ہے۔

بڑھاپے کی نظم بہت سے عناصر کا مجموعہ ہے۔ آزمودگی، خوش طبعی، ظرافت، رندی تو ایسے اجزا ہیں جو سطح پر نظر آتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ساری نظم عبرت کا نہایت پُر تاسف و درد انگیز مرقع ہے۔ جوانی میں جو باتیں جزو فطرت اور طبیعت ثانیہ ہوجاتی ہیں وہ پیری میں بہ مشکل چھوٹ سکتی ہیں لیکن زمانہ ان کو جائز نہیں رکھتا اور عمر ان کی اجازت نہیں دیتی۔ بڑھاپے کی تکلیفیں خود ہی کیا کم ہوتی ہیں۔ اس پر بیداد ستم ہے کہ مشاغل لطف و مسرت سے بھی ہاتھ اُٹھا لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ دست کش ہونا نہ ہونا تو اپنے ہاتھ کی بات ہے لیکن اس وقت تو یہ مجبوری آپڑتی ہے کہ عیش و مسرت خود بوڑھے کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ وہ تو لاکھ چاہتا ہے کہ جوانانہ افعال اس سے سرزد ہوں لیکن دیکھنے والے ان کا اعتراف نہیں کرتے۔ اعتراف کی بجائے ان کا تو یہ حال ہے کہ:-

چل کر کوئی کُبڑے کی طرح قد کو جھکاوے   نقلیں کوئی ان پوپلے ہونٹوں کی بناوے
یہ خواری تو اللہ کسی کو نہ دکھاوے   ڈاڑھی کے کنئے اُنگلی کو لالا کے نچاوے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بُڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ع۔ عشق جو کرتا ہے سنتے ہیں جوان مرجائے ہے، لیکن اگر کوئی عاشق بوڑھا ہوجاتا ہے تو اس غریب کو جیتے جی موت آجاتی ہے۔ قویٰ ضرور بوڑھے ہوجاتے ہیں مگر دل جوان رہتا ہے۔ اس کی وہی حالت رہتی ہے مگر حالات بدل جاتے ہیں۔ بس اس کو جو جو مصیبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں اسی کا دل خوب جانتا ہے، سچ ہے

حُسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست

نظیر کی یہ نظم نہایت مشہور و مقبول ہے اور آرٹ کے اعتبار سے ممتاز ہی نہیں بلکہ اختراع فائقہ سمجھی جاتی ہے۔ شہباز لکھتے ہیں کہ یورپ میں خصوصاً بہت مقبول و دلپسند ہے۔ ڈاکٹر فیلن بھی اِس کے بڑے مدّاح ہیں۔

فقیروں کی صدا ایک ناصحانہ نظم ہے جس کا لہجہ قلندرانہ ہے۔ نظم کا تخاطب بوڑھوں سے ہے اور مضمون مختصر طور پر یہ ہے کہ اب زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں ہر لمحہ موت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ دنیا کے جس قدر تعلقات ہیں اُن کو ختم کرو اور عقبیٰ کی فکر میں لگو۔ نظم کو پڑھ کر حسرت و یاس کے جذبات کا ہجوم ہوتا ہے اور دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ زندگی کا اختتام اور موت کا قُرب کچھ ایسے پُر اثر، مناسب حال، اور موزوں الفاظ میں بیان کیا ہے جس سے بے بسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں:-

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ہر دم تن کو چُنتی ہے ‏ ‏ جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات یہ لکڑی گھنتی ہے
تم گٹھڑی باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دُھنتی ہے ‏ ‏ اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بُنتی ہے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چُکا چلنے کی فکر کرو بابا

اس نظم میں ایک اور خاص لطف یہ ہے کہ موت کے قرب کے علامات بیان کئے ہیں اور وہ جون بنین کی مشہور تمثیلی تصنیف "پلگرمس پروگریس" کے بعض مقامات سے ملتے جلتے ہیں۔ جن حضرات نے اس کتاب کو پڑھا ہے وہ سمجھ لیں گے کہ کرسچین اور اس کی زوجہ کے علاماتِ مرگ ذیل کے بند سے کس قدر یگانگت رکھتے ہیں:

سر کانپا چاندی بال ہوئے منہ پھیلا پلکیں آن جھکیں ‏ ‏ قد ٹیڑھا کان ہوئے بہرے دو آنکھیں بھی چُندھیائے گئیں
سکھ نیند گئی اور بھوک گھٹی دل سست ہوا آواز نہیں ‏ ‏ جو ہونی تھی وہ ہو گزری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اب شاعر کی جمعیت خاطر اور طمانیت نفس دیکھئے۔ ایسی نازک حالت اور ایسے پُرآشوب وقت میں اعمال صالح اور اخلاق حسنہ کی تلقین کرتا ہے۔ اظہار خیال کے لئے اس نظم میں سفر سے استعارہ کیا ہے اور اول سے آخر تک اسی خوبی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ اب زندہ دلی ملاحظہ فرمائیے ایسی خشک اور سنجیدہ نظم میں بھی ظرافت سے باز نہیں رہتے۔ چھٹا بند ملاحظہ کیجئے:۔

خوشامد ایک تجربہ کارانہ نظم ہے جس سے نظیر کی عالی ظرفی اور پختہ خیالی کا ثبوت ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سلجھی ہوئی طبیعت پائی تھی اور بڑے دوربیں ومآل اندیش تھے۔ ان سب محاسن کی اس نظم سے بالواسطہ تلقین بھی ہوتی ہے۔ خوشامد سے یہ مطلب نہیں کہ آدمی کمینوں کی طرح مبتذل خوشامد کرے اور اپنے کو اس قدر گرا دے کہ خودداری پر حرف آجائے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ دنیا میں عموماً نیک برتاؤ اور اس طرح کا عمل کرے جس سے نہ کسی کا دل دکھے نہ کسی کو آزار پہنچے۔ دوسرے لفظوں میں صلح کل اور منکسر مزاج رہنے اور غرور وتکبر سے پرہیز کرنے کی تلقین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خوش خلق اور جھک کر ملنے والے کی سوسائٹی بڑی عزت کرتی ہے:۔

آپڑا ہے جو خوشامد سے سر وکار اُسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُلفت کے خریدار اُسے
آشنا ملتے ہیں اور چاہے ہیں سب یار اُسے اپنے بیگانے غرض کرتے ہیں سب پیار اُسے
جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

کلجگ ایک واعظانہ نظم ہے جس کا لہجہ قلندرانہ اور بیان فقیرانہ ہے جو نفس مضمون سے پوری مطابقت کرتا ہے۔ یہ نظم بہت پراثر اس لئے ہے کہ اس کی ہر نصیحت آزمودہ کاری پر مبنی ہے۔ اس کو پڑھ کر بُرے سے برا اور سخت سے سخت دل ظالم بھی ایک مرتبہ تھرا اُٹھتا ہے اور اپنے افعال قبیحہ کا نتیجہ بد اپنی آنکھوں کے

سامنے پھرتا دیکھنے لگتا ہے۔ جس شاعر نے نظیر کی طرح تقریباً ایک صدی دنیا میں رہ کر اس کے نشیب و فراز کو دیکھا اور باہمی تعلقات کو برتا ہو وہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ دنیا جائے مکافات ہے۔ اس میں جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا :-

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے　　نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے

اس نظم کی بہت بڑی اور بڑی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں افعال کا توازن نمایاں کیا ہے۔ یعنی یہ کہ جس قسم کی نیکی کروگے اسی قسم کا معاوضہ ملے گا۔ جس انداز کی بُرائی پر کمر باندھوگے اسی طرز کا بدلہ سہنا پڑے گا۔

میوہ کھلا میوہ ملے، پھل پھول دے پھل پات لے　　آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے

اظہارِ خیال اور نیک و بد افعال کی مصوری کے لئے جیسے مناسب جملے تلاش کئے ہیں وہ بجائے خود قابلِ داد اور کانٹے کے تُلے ہوئے ہیں۔ ہر ٹکڑا اپنے مقام پر شاعر کی تلاش اور قادرالکلامی کا بیّن ثبوت ہے۔ بحر ایسی ہے جس کا ترنم مغنّیٔ فطرت نے خاص اسی نظم کے لئے خلق کیا ہے۔

کانٹا کسی کے مت لگا گر مثلِ گل پھولا ہے تو　　وہ تیرے حق میں زہر ہے کس بات پر پھولا ہے تو

مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھانس کا پولا ہے تو　　سُن رکھ یہ نکتہ بےخبر کس بات پر پھولا ہے تو

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

نظیر کے ناصحانہ کلام میں، یہ نظم میرے نزدیک ہر اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے۔ اس کے بیش قیمت نصائح اس قابل ہیں کہ ہم انہیں اپنے بچوں کے نصاب تعلیم میں داخل کریں تاکہ انھیں خوش اخلاقی اور نیک کرداری کی تلقین ہو اور وہ آئندہ زندگی میں دنیا کے انقلابات اور عالم کے تغیرات سے ڈرتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اعمال کی سزا و جزا کی تشریح اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ لقمان نے جو نصیحت اپنے عارضی آقا کو کرنے کے لئے مدت تک موقعے کا انتظار کیا وہ نصیحت نظیر ان سادہ الفاظ میں کرتے ہیں۔

زبان کی سادگی اور عام فہمی کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ سنئے :-

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں جَو سے جَو چاول سے چاول پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں دیسا وہ کل واں پاوے گا
کل دیوے گا کل پاوے گا کلپاوے گا کلپاوے گا

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہات لے

مفلسی مصورانہ نظم ہے لیکن موضوعِ مصوری چونکہ دلچسپ نہیں اس لئے نظم میں کوئی خاص لطافت و جاذبیت پیدا نہیں ہوئی۔ نظیر کے کلام میں یہ ایک معمولی سی نظم ہے۔ اس میں کوئی خاص حسن شعری نہیں۔ نہ تخیل کا عمق ہے نہ الفاظ کی رنگینی مگر سادہ الفاظ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ واقعات کا بالکل سچا عکس ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ ہر چیز کا صحیح اندازہ تجربے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو بہت سے لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے اس لئے کہ وہ کبھی اُن کے تجربے میں نہیں آئیں۔ مثلاً ایک دولتمند جو ہمیشہ عیش و عشرت میں بسر کرتا رہا ہے عسرت اور مفلسی کی تکالیف سے ہرگز واقف نہیں ہو سکتا۔ میاں نظیر نے اس موقعے پر کتنا سچ فرمایا ہے :-

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سُلاتی ہے مفلسی

یہ دُکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

دلچسپ عنوان اور رنگین موضوع پر لکھ کر نظم کو مقبول اور دلچسپ بنا لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ دوسرے درجے کے شعرا بھی ایسا کر لیتے ہیں، لیکن خشک مضامین میں شعریت پیدا کرنا طبقۂ اول کے اساتذہ کا کام ہے۔ اس قسم کی نظموں سے میاں نظیر کی اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہرچند وہ مفلس نہ تھے بلکہ برخلاف اس کے نہایت فارغ البالی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے لیکن پھر بھی اُنھوں نے مفلسی کی حالت اس

خوبی سے لکھی ہے گویا خود اُن پر یہ حالت گزر چکی ہے۔ اس نوع کی مصوری شیکسپیر کی خصوصیت کبریٰ سمجھی جاتی ہے لیکن نظیر میں بھی کمال کے ساتھ موجود ہے۔ یہ کہنا کہ یہ نظم بیساختہ اور بے تصنع ہے نظیر کے لئے کوئی ستایش نہیں لیکن اس کے علاوہ اس نظم کے اور بھی محاسن ہیں اور وہ مجملاً یہ ہیں کہ باوجود طویل ہونے کے اس میں بدمزگی یا توارد نہیں ہے۔ ہر جگہ ایک نیا خیال نظم کیا گیا ہے اور جو خیال جس موقعے پر ہے اس کا پورا حق ادا کیا گیا ہے۔ زبان بہت صاف ہے اور متروکات کا استعمال شاذ ہے۔ یوں تو مفلس کی مجبوریاں ہر جگہ نہایت افسوس ناک ہیں لیکن یہ بند کس قدر دل شکن اور پُر درد ہے۔ اس کے علاوہ انسانی فطرت کا کیسا حقیقی اور غائر مطالعہ ہے:۔

رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کو آن کو	سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
سو محنتوں میں اس کی کھپاتی ہے جان کو	چوری پہ آکے ڈالے ہے مفلس کے دھیان کو
آخر ندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

معجزہ حضرت علی علیہ السلام ایک عقیدت مندانہ نظم ہے اور اس کا اختتام سپاس مندانہ الفاظ میں ہے۔ اس معجزے کی واقعیت کا کوئی پتہ نہیں چلتا، اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ معجزہ واقعی ہوا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظیر تک اس کی اطلاع کیونکر پہنچی اور راوی کس حد تک معتبر ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ معجزے کا واقعہ نظیر کی خیال آرائی کا ثمرہ ہے۔ لیکن جس ذات سے یہ معجزہ منسوب کیا جاتا ہے، اس سے ایسے ایسے بے شمار معجزے ظہور میں آئے ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نظیر کا خیال بے بنیاد یا خلافِ عادت واقعے کی طرف رجوع ہوا۔ بہر حال ہمیں اس سے بحث بھی نہ ہونی چاہیے، کیونکہ یہ کام وقائع نگاروں اور مورخوں کا ہے۔ ہمیں تو صرف شاعرانہ اعتبار سے نظم پر نگاہ ڈالنی ہے۔ معجزے کی ابتدا بالکل اس طرح ہوتی ہے جس طرح کوئی شخص بیٹھا ایک جماعت کے سامنے کچھ بیان کر رہا ہے۔ کسی واقعے یا قصّے کے شروع کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے:۔

سُنتے ہواے علیؑ کے محبانِ دوستدار ... اک معجزہ میں کہتا ہوں اس شہ کا آشکار
ہے تازہ واردات بہ از نقل روزگار ... تھا کوئی شخص دولت و حشمت میں نامدار
اک روز وہ گیا تھا کہیں کھیلنے شکار

دوسرے بند میں شیر اور شیرنی کے مسکن کا نقشہ ہے۔ تیسرا بند اس قدر پُر اثر ہے کہ بے اختیار جی بھر آتا ہے۔ اول کے دو مصرعوں سے شیرنی کی بے فکری اور مسرت کا اظہار ہوتا ہے اور آخر کے تین مصرعوں سے غم کی پوری کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ آخر کا مصرع خصوصاً نہایت پُر درد ہے۔ بہائم کے بچے حالانکہ جنگل میں اکیلے رہتے ہی ہیں، ان کا ماں باپ سے چھوٹ جانا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن شاعر کے اندازِ بیان نے منظر کو اس قدر پُر درد بنا دیا ہے کہ یہ سُن کر کہ بچے جنگل میں اکیلے رہ گئے کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے۔ جب شیر اور شیرنی با حالت تباہ واپس آئے اور دونوں بچے گھر میں نہ دیکھے تو شیر سے ضبط نہ ہوسکا، اور وہ غش کھا کے گر پڑا۔ لیکن شیرنی نے جو قصد کیا اس سے بڑی عالی ہمتی کا ثبوت ملتا ہے۔ مادرانہ محبت کی فوقیت اور نسائیانہ ضبط و تحمل کی برتری اس طرح دکھائی ہے:-

وہ شیر کھا کے غش گرا اک بار کر کے آہ ... اور شیرنی نے لی نجف اشرف کی واں سے راہ
سر پیٹتی چلی وہ بیاباں سے سوگوار

آگے چل کر شیرنی کی مصیبت اور بیکسی کی تصویر جن پُر درد الفاظ میں کھینچی ہے وہ آپ اپنی مثال اور دل ہلا دینے والی چیز ہے۔ شیرنی کے دفعۃً بازار نجف میں پہونچ جانے سے وہاں کے باشندوں میں جو تہلکہ پڑا اس کے بیان میں خوف و انتشار کے محاکات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ روضۂ انور پر پہونچنے کے بعد شیرنی کی حالت کا مرقع، مصوری کی تکمیل اور جذبات نگاری کی انتہا ہے۔ شریفوں کا شیرنی کی حالت زار پر رحم کھا کر جناب مقدس میں عرض کرنا اور وہاں سے جواب ملنا، بچے لیجانے والے بادشاہ کو تنبیہ ہونا اور اس کا خوف سے تھرّا کر بچے روانہ کرنا، بچوں کا نجف میں آنا، ماں سے ملنا اور شیرنی

کا اظہار سپاس و احسانمندی، یہ تمام واقعات اِس خوبی کے ساتھ بیان کیے ہیں جن کا لطف بار بار پڑھ کر دل ہی خوب محسوس کر سکتا ہے۔ بہر حال اس نظم کا کوئی بند کیف سے خالی نہیں۔ پوری نظم ادب اور آرٹ کی ایک اختراع فائقہ ہے۔ ایک مذہبی نظم کو جس کا تعلق محض ایک فرقے کے عقیدت مندانہ حسیات سے ہو اس قدر دلچسپ، عام پسند اور مکمل بنا دینا صرف نظیر ہی کا کام تھا۔ جس شخص کا اخلاق، ظرف اور استغنا اس حد تک بڑھا ہوا ہو کہ وہ حضرت علی علیہ السلام جیسے صاحب جود وسخا کی بارگاہ کرم سے صرف آبرو کا طالب ہو وہی ایسی بلند پایہ نظمیں لکھ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آبرو دنیا کی نعمتوں میں سب سے زیادہ سر بلند ہے اور اس کی طلب سے نظیر کے نفسیات کی پاکیزگی اور علو کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس شخص کا دماغ نشو و نما کے ایسے اعلیٰ نقطے پر پہونچ چکا ہو اس کی زبان سے کیونکر کوئی معمولی شعر نکل سکتا ہے۔

دوالی ایک واقعاتی نظم ہے جس میں رندانہ خیالات کی اول سے آخر تک بھرمار ہے۔ اس نظم میں معاملہ بندی کی پوری داد دی گئی ہے اور دوالی کے معاشرتی پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ دلچسپ اور رنگین باتوں کو نظر انداز کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوالی کا تیوہار ہندوستان کی خصوصیات میں سے ہے اور اپنے اندر بڑی جاذبیت اور لطافت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ نظیر نے اس کے زریں پہلو کو بالکل چھوڑ دیا ہے اور محض مبتذل اور سیاہ رخ پر نظر ڈالی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرت کا زیادہ تعلق انہی باتوں سے دیکھ کر انہی پر زیادہ زور دینے کی کوشش کی ہے۔ اصل میں اس لطیف تیوہار کی برائیوں کی جانب توجہ دلا کر اُن کی اصلاح کرنا مدنظر ہے۔ اس طرح اس نظم میں اخلاقی خوبیاں تو پنہاں ہیں لیکن شاعری کے اعتبار سے اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔ جگہ جگہ بندش سست اور مصرعے کمزور ہیں۔ صحت لفظی کی بھی کہیں کہیں کمی نظر آتی ہے۔ متروکات کا استعمال بھی ہے۔ بہر حال دوالی پر جیسی دلچسپ اور مکمل نظم نظیر لکھ سکتے تھے یہ اس قسم کی نہیں۔ ہاں آخر میں نظیر نے اپنے رنگ کی خصوصیت قائم رکھی ہے۔ جواریوں کی برائیاں دکھا کر ان کا فطری رحم جوش میں آتا ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کہیں میری باتوں سے اِن کا

دل نہ دُکھا ہو۔ اس ڈر سے فوراً ان کی اشک شوئی کرنے کے لئے وہ اپنے کو بھی اُن کے زمرے میں شامل کر کے کہہ اُٹھتے ہیں :-

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانیو یارو　　　نصیحتیں ہیں انہیں دل سے مانیو یارو
جہاں کو جاؤ یہ قصہ بکھانیو یارو　　　جو جُواری ہو نہ بُرا اس کا مانیو یارو
نظیر آپ بھی ہے جواریا دوالی کا

حضرت سلیم چشتی ایک سپاس مندانہ نظم ہے اور اپنی نوعیت میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ ایک ایسے شاعر کے قلم سے جس کا مذہب شیعہ ہو ایسی نظم کا نکلنا بظاہر تعجب انگیز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شاعر وہی ہے جو حسن کو حسن سمجھ کر دیکھے اور مذہب کا صحیح احساس رکھتا ہو۔ مذہب کبھی کسی بزرگ سے سوئے ظن رکھنا نہیں سکھاتا، محبت اور عقیدت کی تعلیم دیتا اور احترام کی تلقین کرتا ہے۔ مذہب تعصب کو خصوصاً بُرا سمجھتا ہے اور شاعر کے لئے تو یہ سم قاتل ہے۔ جہاں تعصب نے دراندازی شروع کی وہیں طبیعت نے یک طرفی پر کمر باندھی اور شاعری تباہ ہونی شروع ہوئی۔ نظیر کے یہاں تعصب کا نام نہیں ہے۔ اسی لئے اُن کے کلام میں ایسی سحر اثری پائی جاتی ہے۔ یہ نظم ہر اعتبار سے نہایت بلند پایہ ہے۔ خیالات میں علو، الفاظ میں شکوہ اور تراکیب میں شستگی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ بندشیں نہایت چست اور مصرعے بالکل بیساختہ ہیں۔ ہر بند برابر کا نپا تلا ہے اور پوری نظم ایک رنگ میں ہے۔ زبان میں صفائی اور ادبیت ہے اور متروکات کا استعمال بالکل نہیں ہے۔ دیکھئے پہلے بند سے کس قدر محبت اور عقیدت ٹپکتی ہے :-

ہیں دو جہاں کے سلطاں حضرت سلیم چشتی　　　عالم کے دین وایماں حضرت سلیم چشتی
سر دفتر مسلماں حضرت سلیم چشتی　　　مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی
سردار ملک عرفاں حضرت سلیم چشتی

دو جہاں کے سلطاں، عالم کے دین وایماں، سر دفتر مسلماں، سردار ملک عرفاں، کہنا احترام اور عقیدت کی

انتہا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں تعصب پرزے پرزے ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نظم میں جگہ جگہ نہایت پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے لیکن آخر کا بند خاص نظیر کے رنگ کی چیز ہے :۔

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بو سے　　حرمت ہے دوستوں کی حضرت تمہارے رو سے
یہ چاہتا ہوں اب میں سو دل کی آرزو سے　　رکھیو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے
اے موجد ہر احساں حضرت سلیم چشتی

اس بند کا دوسرا مصرع الہامی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ دوستی کی اس سے زیادہ تعریف غالباً کسی لٹریچر میں میسر نہیں آسکتی۔ انتہا درجے کی محبت میں یہ الفاظ منہ سے نکل سکتے ہیں۔ ہر شخص کا ظرف ان کی خلاقی کی صلاحیت اور ہر زبان ان کے بیان کی قدرت نہیں رکھتی :۔

ہولی ایک موسمی اور مصورانہ نظم ہے جو نظیر کے بہترین کلام میں سے ہے۔ اس نظم کو شروع اس خوبی سے کیا ہے کہ موسم کی حالت اور کیفیت کا پورا اندازہ صرف لفظوں سے ہو جاتا ہے۔ پہلے بند کا پہلا مصرع تو موسم کی حالت بہت ہی صاف صاف بتاتا ہے لیکن تیسرے مصرعے میں جو حسین ذریعہ موسمی کیفیت اظہار کرنے کا نکالا ہے اس کی لطافت کی بناہ نہیں :۔

پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

بحر کا ترنم اور الفاظ کی نشست تو نظم کی جان ہیں لیکن تیوہار کے رسوم کے جزئیات کی مصوری جس انداز سے کی ہے، اس سے معاشرت پر عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہولی کی رنگ رلیوں کا محفل کی دلچسپیوں سے جہاں تک تعلق ہے اُن کا سماں دیکھئے کیسا پُرکیف اور کتنا ہیجان پرور ہے :۔

ساماں جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا　　وہ سب ساماں مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا　　اس عیش مزے کے عالم میں ایک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس نظم کو بار بار اور گا گا کر پڑھنے سے، قوتِ خیال، ہولی کا ایک ذہنی سماں اپنے لئے پیدا کر لیتی ہے جس کا لطف صرف اسی حالت میں محسوس کیا جا سکتا ہے اور ضبطِ تحریر میں کسی طرح نہیں آسکتا۔

نانک شاہ گرو سپاس مندانہ نظم ہے اور اس سے نظیرؔ کی وسعت نظر، مذہبی بے تعصبی اور عام معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ دیکھئے کس عقیدت اور احترام کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو — وہ کامل رہبر ہیں جگ میں یوں روشن جیسے ماہ، گرو

مقصود، مراد، امید، سبھی بر لاتے ہیں دلخواہ گرو — نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو اور ہردم بولو واہ گرو

یہ نظم کسی قدر خشک اور بدمزہ ہے لیکن اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ اس کا تعلق ایک فرقے کے عقیدت مندانہ جذبات سے ہے اس لئے ہر شخص کے دل پر اثر نہیں کرتی۔ اس کی پُراثری اور معنویت کا حال سکھوں سے پوچھئے۔ اس نظم میں سکھوں کی مذہبی اصطلاحوں اور پنجابی الفاظ کا استعمال بہت ہے جو ہم لوگوں کے لئے غیر مانوس ہیں۔ نظم میں فی نفسہ کوئی تصنع یا غیر فطری پہلو نہیں ہے اور ٹیپ کے دو مصرعے جو ہر بند میں دوہرائے گئے ہیں خاص دل سے نکلی ہوئی چیز ہیں اور دل پر اثر کرتے ہیں:۔

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں، بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو اور ہردم بولو واہ گرو

کنھیا جی کا جنم ایک واقعاتی اور رعایانہ نظم ہے اور خالص ہندو مذاق کی چیز ہے۔ یہ اُس قبیل کی نظموں میں سے ہے جو کسی شاعر کو اس کے گروہ میں ممتاز کر دیتی ہیں۔ ہر شاعر اپنے حصے کی ایک نہ ایک خصوصیت اپنے رنگ میں سب سے علیحدہ رکھتا ہے جو صرف اسی کا حصہ ہوا کرتی ہے۔ یہ نظم نظیرؔ کی اسی خصوصیت کی حامل ہے۔ اول تو یہ ہندوستان کے قدیم صنمیات سے متعلق ہے اس لئے شاعرانہ مذاق رکھنے والوں کے

لئے خاص دلچسپی رکھتی ہے دوسرے مذہب سے متعلق ہے اس لئے ہندوؤں کی خاص دلچسپی کی شے ہے۔ قدیم ہندو معاشرت اور رسم و رواج کا بھی اس سے کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔ بھاشا کے مانوس اور غیر مانوس دونوں قسم کے الفاظ کا اس میں کثرت سے استعمال ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظیر ہندو فلسفے اور ہندو نجوم سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ جگہ جگہ ان علوم کے بالواسطہ اور بلاواسطہ حوالے موجود ہیں۔ بھاشا کے الفاظ اس نظم میں، خصوصاً اس قدرت کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں جس سے اس زبان پر بھی نظیر کا اجتہاد ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھئے کرشن جی کے لئے کتنے صفاتی نام مہیا کئے ہیں:-

پھر آیا واں ایک وقت ایسا جب آئے گربھ میں منموہن
گوپال، منوہر، مرلیدھر، سیکشن، کشورن، کیول من
گھنشام، مُراری، بنواری، گردھاری، سندر شیام برن
پربھوناتھ، بہاری، کان للا، سکھدائی، جگ کے دکھ بھنجن
جب ساعت پرگٹ ہونے کی واں آئی مُکٹ دھریّا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنھیا کی

جہاں عورتوں کی رسموں کا سماں کھینچا ہے وہاں عورتوں کی زبان بڑے کمال کے ساتھ لکھی ہے۔ یہ خصوصیت جس کی اس موقعے کے لئے نہایت ضرورت تھی اگر اس کمال کے ساتھ نہ ہوتی تو اس نظم اور بالخصوص اس مقام کا پایہ بہت گر جاتا۔ نظم کا یہ مقام خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہے۔ گھر میں بچہ پیدا ہونے کے وقت خواتین کے مشاغل، ان کی سرگرمیوں اور مسرتوں کا، دیکھئے کیسا بےمثال، صحیح اور مفصل نقشہ کھینچا ہے۔

سب ناری آئیں گوکل کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں
کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت بجا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم مکھ اس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں
کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں، کچھ سونٹھ سٹھورا کرتی تھیں
کچھ کہتی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو
کچھ کہتیں ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو
کوئی گھٹی بیٹھی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی
کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے کوئی کرتہ ٹوپی میوہ گھی

کوئی دیکھے روپ اس بالک کا کوئی ماتھا چومے مہر بھری　　کوئی بھنوؤں کی تعریف کرے کوئی آنکھوں کی کوئی پلکوں کی
کوئی کہتی عمر بڑی ہووے اے بیر تمھارے بالے کی
کوئی کہتی بیاہ بھولاؤ اس آس مرادوں والے کی
کوئی کہتی بالک خوب ہوا اے بھینا تیری ننگ ت نی　　یہ بالے ان کو ملتے ہیں جو دنیا میں ہیں بڑھ بھاگی
اس کنبے کی بھی شان بڑھی اور بھاگ بڑھے اس گھر کے بھی　　یہ باتیں سب کی سُن سُن کر یہ بات جسودا کہتی تھی
اے بیر یہ بالک جو ایسا اب میرے گھر میں جنا ہے
کچھ اور کہوں میں کیا تم سے بھگوان کی مو پر کرپا ہے

اِن بندوں کی اور کوئی خصوصیت کسی کی نظر میں ہو یا نہ ہو لیکن ان کی موسیقیت تو اس غضب کی ہے کہ دل بے قابو ہو جاتا ہے:۔

بانسری ہندو مذاق کی ایک وصافانہ نظم ہے جو کرشن جی کی زندگی کے محبوب ترین شغل شوق و تفنن کا نقشہ کھینچتی ہے۔ ہندوؤں کے لئے تو اس نظم میں خدا جانے کیسی جاذبانہ عقیدت پنہاں ہے لیکن دوسرے لوگوں کے لئے بھی اس کی مترنم لطافت بہت پُر لذت و کیف ہے:۔

جس آن کانہہ جی کو وہ بنسی بجاؤنی　　جس کان میں وہ آدنی واں سدھ بھلاؤنی
ہر من کی ہو کے موہنی اور چت لبھاؤنی　　نکلی جہاں دُھن اس کی وہ میٹھی سہاؤنی
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری

نظم کے عنوان اور نفس مضمون میں جس قدر شعریت ہے اتنی خود نظم میں نہیں ہے۔ متروک الفاظ اس کثرت اور بھاشا کی اصطلاحیں اس بہتات سے استعمال کی ہیں کہ نظم کے معانی اِس زمانے کے اُردو دان طبقے کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں بھاشا کے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو

عام طور پر سمجھ میں آسکتے ہیں تو وہ مقامات مار رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ ذیل کے بند کو ذرا پڑھئے اور پھر وہ سماں ذرا نگاہوں کے سامنے کھینچنے کی کوشش کیجئے۔ دیکھئے کیا کیفیت طاری ہوتی ہے:-

موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن　　لے اُس کی من کی موہنی دھن اس کی چت ہرن
اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بجن　　کیا جل پون نظیرؔ پکھیرو و کیا ہرن
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

آگرے کی تیراکی ایک مصورانہ نظم ہے اور لوکل کلر یا مقامی رنگ کی آمیزش کا اچھا نمونہ ہے۔ نظیر نے برسوں آگرے کا یہ میلا دیکھا ہے۔ حقیقت میں بڑی حق تلفی ہوتی اگر وہ اس میلے کا اتنا حق بھی ادا نہ کرتے۔ آگرے کی تیراکی نے انہیں طرح طرح سے لبھایا اور ان کے لئے ہزاروں طرح کی دلچسپیاں اور مسرتیں پیدا کی ہیں۔ اس لئے ان تمام لطیف احسانات کے بدلے میں نظیر نے بھی اس میلے کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ کہتے ہیں:-

جب پیرنے کی رُت میں دلدار پیرتے ہیں　　عاشق بھی ساتھ اُن کے غمخوار پیرتے ہیں
بھولے، سیانے، نادان، ہشیار پیرتے ہیں　　پیر و جوان لڑکے عیار پیرتے ہیں
ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

یہ نظم بڑی پاکیزہ ہے اور مشہور نظموں میں سے ہے۔ جہاں تک نظم کا تعلق ہے ہر مصرع نہایت پُرکیف بے تصنع اور بیساختہ ہے۔ زبان بالکل صاف، شستہ اور متروکات سے معرّا ہے۔ اب رہا نفس مضمون تو اس کی خوبیاں بھی اپنی جگہ پر مستقل اور غیر فانی ہیں۔ آگرے میں دریا کنارے جس قدر مشہور مقامات اس وقت تھے اور جن کا تیراکوں سے کوئی لگاؤ تھا، ان سب کا تذکرہ کر کے ان کی تاریخ کو زندہ

کر دیا ہے۔ اِن میں سے بہت سے مقامات کے جاننے والے بھی اب باقی نہیں۔ اگر نظیر کی یہ نظم نہ ہوتی تو ان مقامات کے نام بھی ان کی عمارتوں کے ساتھ مٹ جاتے۔ تاریخ پر نظیر کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔ اِس کے علاوہ پانی کی مختلف ہیئتوں کے نام ایک بند میں اکھٹے کئے ہیں۔ یہ زبان پر بڑا احسان ہے۔ ہر چند یہ نام تیراکوں کی زبان پر ہیں اور بہت سے وہ بھی نہیں جانتے لیکن عامۃ الناس اِن سے قطعی بے خبر تھے۔ نظم میں ان کا ذکر لانے سے اول تو اِن میں ادبی شان پیدا ہوگئی ہے اور جو کچھ عمومیت تھی وہ زائل ہوگئی ہے۔ دوسرے پانی کی ہیئتوں کے لئے جواب تک صرف دیکھی جاتی تھیں مگر بیان نہ ہوسکتی تھیں، الفاظ مہیا ہوگئے ہیں، جن کو ہر شخص روزمرہ اور ادبیات میں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ اس نظم میں اور بہت سی شاعرانہ خصوصیات ہیں جو بالذات بڑی کیفیت رکھتی ہیں۔ تیراکی کا سماں دیکھئے:۔

جمنا کا پاٹ گویا صحن چمن ہے بارے
پیراک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارے
مُنہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے گورے پیارے
پریوں سے بھر رہے ہیں منجدھار اور کنارے
کچھ وار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کتنے کھڑے ہی پیریں اپنا دکھا کے سینہ
سینہ چمک رہا ہے ہیرے کا جوں نگینہ
آدھے بدن پہ پانی آدھے پہ ہے پسینہ
سرُوں کا یہ چلا ہے گویا کہ اک قرینہ
دامن کمر پہ باندھے دستار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

دوسرے بند کا چوتھا مصرع لاجواب ہے۔ اس کی تشبیہ بالکل نئی اور داد سے مستغنی ہے۔

موسم زمستاں موسمی نظم ہے اور اپنے مقام پر اختراع فائقہ کا حکم رکھتی ہے۔ اس نظم میں موسم کی حالت پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی ہے اور کئی طرح سے زمستاں کی مصوری کی ہے۔ سب سے پہلے

نفس زمستاں کی محاکات نگاری کی ہے ۔ دیکھئے :۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا بھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا خم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس بند کا پہلا مصرع تو خیر ایک واقعے کا اظہار کرتا ہے لیکن دوسرے مصرعے میں صرف دو لفظوں "ہنس ہنس" سے شاعر نے کمال دکھایا ہے اور جاڑے کی انتہائی تکلیف پیش نظر کر دی ہے۔ جاڑے کو ایک انسان قرار دے کر یہ دکھایا ہے کہ جب وہ اہل عالم کو سردی کی تکلیف میں مبتلا دیکھتا ہے تو اس کو ان کی حالت زار پر بجائے رحم آنے کے ہنسی آتی ہے۔ وہ ان پر تمسخر کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ ختم ہو کر دنیا کو سردی کی اذیت سے نجات دے اور سنبھل جاتا ہے۔ تیسرا مصرع پھر سردی کی فریب کاری کی شرح کرتا ہے اور ایک موسمی حقیقت کا بھی اظہار ہے۔ چوتھے مصرعے میں رات کا سماں اور جاڑے کی سختیوں کا ذکر ہے۔ پانچویں مصرعے میں دکھایا ہے کہ جاڑا اپنے افعال سے پہلے تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ چلا جائے گا اور پھر طرح طرح سے دھوکا دیتا ہے۔ آخر کار دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی سختیاں شروع کر دیتا ہے یعنی یہ کہ چلے کا جاڑا پڑنے لگتا ہے۔

یہاں تک تو زمستاں کے مظالم اور اس کی فریب کاریوں کا ذکر تھا۔ اب ان کا اثر انسانوں پر ملاحظہ فرمائیے۔ دیکھئے سردی میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے اور پھر اس حالت کو کس قدر تفصیل کے ساتھ شاعر نے دکھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذیل کے بند میں نظیر نے محاکات کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور مصوری کی قرار واقعی داد دی ہے۔ دیکھیئے سماں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھپو ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
کلّے پر کلّہ لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکّی سی

ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

تھر تھر کا زور، بتیسی بجنا، پھو ہو ہو ہو اسی سی سی سی، کلے پر کلہ لگنا، دانتوں کا چنے سے دلنا، یہ ایسی باتیں تو ہیں نہیں جن کی تشریح کی ضرورت ہو۔ سردی کے موسم میں ہر شخص پر یہ حالت گزرتی ہے لہذا آپ بیتی کا خود اندازہ کر کے ہر شخص نظیر کی محاکات نگاری کی داد دے سکتا ہے۔ میرے بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس نظم میں مصور شاعر کے عاشقانہ و جوانانہ جذبات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ جاڑے کی مصوری کرنے میں آگے چل کر، نظیر نے تخئیل سے بہت زیادہ کام لیا ہے اور سردی کو مکمل نمونہ صنعت و آرٹ بنانے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر یہ دو باتیں یعنی حقیقت نگاری اور خیال آرائی یا یوں کہیے کہ عکاسی اور آرٹ نقیضین معلوم ہوتی ہیں۔ واقعات کی صورت گری اور صناعی یا آرٹ میں جس کی تمام تر بنا تخئیل پر ہوتی ہے بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی صورت میں ایک حد مقرر ہوتی ہے اور نگاہ اس سے باہر کسی طرح نہیں جا سکتی۔ دوسری صورت میں خیال بالکل آزاد ہوتا ہے اور تصویر کی تکمیل خیال کی بلند ترین پرواز پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ لیکن نظیر نے عکاسی اور آرٹ کو ایک جگہ جمع کر کے مافوق العادت کمال اور مجتہدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقت نگاری میں خیال آرائی کا لطف ملاحظہ فرمائیے:۔

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا
اور تن میں نیمہ شبنم کا ہو جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا
ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اک فراش کھڑا
فراش بھی پنکھا جھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس کے بعد کے دو بندوں میں عاشقانہ و جوانانہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ دونوں بند کسی قدر عریاں ہیں لیکن اتنی مہذب عریانی کی مثال بمشکل کسی لٹریچر میں مل سکتی ہے۔ پانچویں بند کا تیسرا مصرع:۔

مجبوب گلے سے لپٹا ہو اور کبھی چٹکی لاتیں ہوں

محاکات کی اعلیٰ ترین ونادر ترین مثال ہے۔ ہر چند نہایت عریاں ہے لیکن پھر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ کھلے الفاظ میں کوئی بات نہیں کہی گئی۔ نہ الفاظ ہی فرداً فرداً ایسے ہیں جن میں خواہ مخواہ کوئی عریانی ہو۔ صرف الفاظ کی نشست اور مصرعے کے سیاق سے وہ سماں کھینچا ہے جسے ہزار تصویریں بھی ادا نہیں کرسکتیں۔

اومس ایک موسمی اور مصورانہ نظم ہے جسے صرف ہندوستان کا فطری شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ اس نظم میں اومس کی کیفیت اور اُس سے جو جو اذیتیں انسان کو پہنچتی ہیں وہ سب نہایت خوبی کے ساتھ مفصل بیان کی ہیں اور ایسی مصوری کی ہے کہ نظم پڑھتے پڑھتے اومس کی کیفیت طبیعت پر طاری ہو کر جی گھبرانے لگتا ہے اور اومس کی سی اذیت ہونے لگتی ہے۔ دیکھئے برسات کے زمانے میں بڑی گرمی سے قلب میں جو اضطراب اور طبیعت پر جو ہجوم تکدر و انقباض ہوتا ہے اس کا یہ سماں کتنا مصورانہ ہے:۔

بدلی کے جو گھر آنے سے ہوتی ہے ہوا بند ۔۔۔ پھر بند سی گرمی وہ غضب پڑتی ہے یک چند
پھینکے کوئی پگڑی کوئی کھولے ہے کھڑا بند ۔۔۔ دم رُک کے کُھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اومس

اس نظم میں بھی نظیر نے ایک جگہ عکاسی اور آرٹ کو ملا کر ایک نئی چیز پیدا کی ہے اور اومس کا ایک خیالی منظر پیدا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اومس میں تو لازم ہے نہ پنکھا نہ ہوا ہو ۔۔۔ ایک کوٹھری ہو جس میں دھواں آکے بھرا ہو
اور مکھیوں کے واسطے گڑ تن سے ملا ہو ۔۔۔ اس وقت مزہ دیکھئے اومس کا کہ کیا ہو

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اومس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اوس

"اوس" اول سے آخر تک مکمل چیز اور مصوری کی اختراع فائقہ ہے۔ نظم فی نفسہ نہایت پاکیزہ، بے تصنع اور بیساختہ ہے۔ زبان بالکل صاف اور متروکات سے معرّیٰ ہے۔ نظیر کی شاعری کے اعلیٰ نمونوں میں اوس بلاخوف تردید پیش کی جا سکتی ہے۔

کورا برتن وصافانہ نظم ہے اور اس فہرست کی نظموں میں سے ہے جن پر اردو زبان اور ادب لطیف بجا ناز کر سکتے ہیں۔ اس کے بیان میں ادب قدیم کی سی سادگی اور لطافت اور اس کے خیالات میں الہامی کلام کی سی شادابی، وسعت اور علو ہے۔ کہتے ہیں:-

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی — جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی
بوند پانی کی اُن میں جب کھنکی — کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی
تازگی جی کی اور تری تن کا
واہ کیا بات کورے برتن کی

واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے سن سن کی وہ پیاری صدا سنی ہے اور کورے برتن کی وہ معصوم و شاداب کیفیت جو اس میں پانی پڑتے وقت ہوتی ہے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہ تو اس بند کا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں لیکن جنھوں نے نہیں دیکھی اُن کے لئے بھی اس کی خیالی لطافت بادۂ ناب کے سرور کا حکم رکھتی ہے۔

دوسرے بند میں پانی کی نوعی بزرگی کا اعتراف کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ پانی جب کورے برتن میں ملتا ہے تو اس کے سامنے آب حیات کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ حقیقت میں کوئی نہیں جانتا کہ آب حیات کیا چیز ہے لیکن پانی ہزاروں آدمیوں نے کورے برتن میں پیا ہے جس سے یہ بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ پانی کا مزہ کورے برتن سے بہتر کسی چیز میں نہیں آ سکتا۔ پس جب پانی کا اس

سے بہتر مزہ انسان کے تجربے میں نہیں تو یہ کہنا کہ کورے برتن میں پانی پینا آبِ حیات کے مزے کو مات کرتا ہے مبالغہ نہیں۔ اب ذرا ان مصرعوں کی تازگی اور شادابی ملاحظہ کیجئے:۔

سوندھی سوندھی ٹھنڈو لیاں باندھیں ہم نے پانی کی گولیاں باندھیں

اب آگے بڑھئے اور کورے برتن اور اس کے متعلقات کے دوسرے لطائف دیکھئے:۔

کورا پنہاری کا جو ہے مٹکا اس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا
لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا دل گھڑے کی طرح سے دے پٹکا
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

دوسرے مصرعے میں "مٹکا" صرف ایک لفظ سے جو مطلب ادا کیا اور سماں کھینچا ہے وہ دوسرے لفظوں میں پوری نظم سے بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ تیسرے مصرعے میں جو جاذبیت ہے اسے دیکھ کر ٹیگور کی یہ نظم یاد آتی ہے:۔

"جب دو بہنیں پانی لینے جاتی ہیں تو اس مقام پر آتی ہیں اور مسکراتی ہیں۔ وہ ضرور کسی شخص سے واقف ہوں گی جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں۔ دونوں بہنیں جب اس جگہ سے گزرتی ہیں تو آہستہ آہستہ آپس میں باتیں کرتی ہیں، انھوں نے ضرور اس شخص کے بھید کو تاڑ لیا ہوگا جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں، یکایک اُن کے گھڑے ہلتے ہیں اور پانی چھلک جاتا ہے جب وہ اس مقام پر پہنچی ہیں۔ انھوں نے ضرور سمجھ لیا ہوگا کہ اس شخص کا دل دھڑک رہا ہے جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں۔ دونوں بہنیں جب اس مقام پر آتی ہیں تو ایک دوسری کی طرف دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ اُن کے تیز تیز بڑھنے والے پاؤں میں ایک خندہ مضمر ہے جو اس شخص کے دماغ کو پریشان کر دیتا ہے جو درختوں کے پیچھے کھڑا رہتا ہے

جب کبھی وہ پانی لینے جاتی ہیں۔"

ٹیگور نے جن خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے ایک پوری نظم لکھی ہے وہ نظیر نے صرف ایک مصرعے سے ادا کئے ہیں :-

لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا

بہ ظاہر یہ ایک مصرع ہے اور صرف ایک معمولی سے خیال کو ظاہر کرتا ہے لیکن پاؤں کے کھٹکے میں جو جو وارداتیں پنہاں ہیں ان کو سوچئے اور لطف اٹھایئے۔ خیال کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اب دوسری کیفیت سے لطف اندوز ہوجیئے۔ نظیر فرماتے ہیں :-

کورے کوزوں کو دیکھ عالم میں   کوزے مصری کے بھر گئے غم میں
یوں وہ رستے ہیں آب کے نم میں   جیسے ڈوبے ہوں پھول شبنم میں
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

دیکھئے یہ بند کس بہار کا ہے۔ اس کی اور اس کے بعد کے بند کی لطافت گرمیوں میں محسوس کی جاسکتی ہے جس وقت پیاس لگ رہی ہو اس عالم کا پیش نظر ہونا تو درکنار اس بند کا پڑھنا ہی کافی ہے۔ دیکھئے کیا کیفیت قلب پر طاری ہوجاتی ہے اور کس قدر سکون محسوس ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے میں صرف دو لفظوں "عالم میں" نے شاعر کے تمام ذہنی مطالب ادا کردئے ہیں اور کورے کوزوں کے جملہ ظاہری اور باطنی محاسن اور ان کی ساری جاذبیت دکھادی ہے۔ لیکن چوتھے مصرع کی لطافت و شگفتگی، شادابی و عطر بیزی کی انتہا نہیں۔ مسرت و سرور کی بے پناہ کیفیت قلب پر طاری کرتا ہے۔ نظم کا آخری بند کسی قدر رندانہ ہے لیکن آپ اپنی مثال ہے۔ پڑھیئے اور سر دھنئے !۔

کوروں پر جو نظیر جوبن ہے   جو جھرے میں کہاں وہ کھن کھن ہے

جس گھڑونچی پہ کورا باسن ہے　　　وہ گھڑونچی نہیں ہے گلشن ہے
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

تیسرے مصرعے میں "باسن" نے "باسن" کہنے والی بہت سی قدیم ہستیاں یاد دلا دیں۔ اس لفظ کے بولنے والے آہ مدت ہوئی پیوند خاک ہو گئے اور اب کورے باسنوں میں جنت کی شراب طہور پی رہے ہیں۔ دنیا میں باسن کا وجود صرف اُن ہی کے ساتھ تھا اور ان ہی کی زبان پر وہ اچھا بھی معلوم ہوتا تھا وہ بھی ان ہی کے ساتھ پیوند زمیں ہو کر اپنے کل کا جزو جا بنا۔

کل شئ یرجع الیٰ اصلہ

کوّا اور ہرن کا بچہ ایک منظوم قصہ اور حکایانہ نظم ہے جس کا ماخذ انوار سہیلی ہے۔ اس لئے اس کو منظوم ترجمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں ایک کوّے اور ہرن کے بچّے کی دوستی کا فسانہ مذکور ہے، جس سے نظیر کی قوت بیان و حکایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نظم کی زبان نہایت صاف اور شستہ ہے اور نظم بھی فی نفسہ بالکل بے تکان اور بے ساختہ ہے۔ نظم کی وجہ سے مطالب ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ یا تصنع پیدا نہیں ہوا اور قصہ بالکل اسی طرح ادا ہوا ہے جس طرح نثر میں ہوتا۔ اردو میں طویل منظوم افسانوں کی کمی نہیں لیکن اتنے مختصر منظوم فسانے بہت کم ہیں۔ یہ نظم اپنی نوعیت کی ایک خاص چیز ہے جو بچوں کے درس میں شامل کرنے کے لئے بہت اچھی ہے۔ آخر میں نظیر نے اس قصے سے ایک اخلاقی نتیجہ اخذ کیا ہے جو خود نہایت اہم اور سبق آموز ہے:۔

گیدڑ نے اس ہرن کا جو چیتا تھا واں بُرا　　　پائی اسی نے اپنی بدی کی وہیں سزا
تھا یہ تو نثر میں نے اسے نظم میں کیا　　　پھونچا نظیر جب وہ خوشی ہو کے اپنی جا
کوّے کے ساتھ پھر وہ بہت خوش رہا ہرن

خواب کا طلسم ایک عاشقانہ نظم اور ایک پُر معنی ایلیگری ہے جس میں دنیا اور دنیا کی دلفریبیوں کی بے ثباتی کی مصوری کی ہے۔ نظم اول سے آخر تک ایک رنگ میں ہے اور نہایت دلچسپ ہے۔ اس کا لٹریچر اول درجے کا ہے اور الفاظ کے انتخاب میں شاعر نے خاص طور پر اہتمام کیا ہے کوئی لفظ، کوئی بندش، کوئی مصرع ایسا نہیں جو لطافت سے خالی اور ادبیت سے معرّیٰ ہو غرض کہ پوری نظم ایک پُر کیف چمنستاں ہے جس کی دلکشی صرف اس کی سیر سے قلب پر اثر کرتی ہے۔ پہلے بند میں اس بے فکری اور فارغ البالی کا نقشہ ہے جو انسان کو کبھی کبھی میسر آجاتی ہے۔ اس کے بعد تین بندوں میں دنیا کی ان نظر فریب آرائشوں اور سیمیائی جلووں کا سماں ہے جو انسان کو طرح طرح سے لبھاتے اور اس کو مافیہا سے غافل کردیتے ہیں۔ نظیر کی سماں بندی کا ایک مختصر نمونہ ملاحظہ فرمائیے :۔

گلشن کہیں چمن کہیں شیشہ صراحی جام　　فرش طلا بچھا کہیں یکسر جڑت کا کام
تھی نقرئی زمیں تو سنہرے تمام بام　　طاق و رواق اس کے چمکتے تھے یوں مدام
گویا کہ اینٹ اینٹ جواہر کی ہے جڑی

اس کے بعد ایک ستم ایجاد مہ لقا کے حسن و جمال کا سراپا، اس کے شباب کی زاہد فریبیاں، اس کی شوخیاں اور طرحداریاں، اس کا سنگھار اور آرائشیں ان تمام باتوں کا تذکرہ ہے اور ان تمام کے مجموعے سے مراد دنیا ہے۔ اب اس کا بے پناہ عالم اپنی آنکھوں سے دیکھئے :۔

خونریز ابرو جان کی قاتل ہر اک نگاہ　　مژگاں وہ برچھیوں کو لئے قتل رہی پناہ
مہندی سے انگلیوں نے کئے خون بے گناہ　　آنکھوں میں کھنچ رہا تھا وہ کاجل غضب سیاہ
پڑ جائے جس سے دل میں فرشتوں کے ہڑبڑی

آخر کے مصرعے میں "ہڑبڑی" کا لفظ گو کسی قدر مبتذل اور سوقیانہ ہے لیکن اس سے مفہوم پورے طور پر ادا ہوتا ہے۔ مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ دوسرا لفظ یہ مفہوم ادا ہی نہیں کرسکتا۔ اگر یہ لفظ نہ ہوتا تو مصرع

تشنہ رہتا اور اس کا زور قطعی زائل ہو جاتا۔ سراپا کا ایک سماں اور دیکھئے :۔

زلفیں وہ مشک ناب سی چہرہ وہ چاند سا جگنو رہا گلے میں ستارہ سا جگمگا
گہنے کا وصف یا کہ بدن کی کہوں صفا جاتا تھا سرخ جوڑے میں تن یوں جھمک دکھا
گویا شفق میں آن کے بجلی چمک پڑی

یوں تو یہ بند کا بند بے مثال ہے لیکن اس کے چوتھے اور پانچویں مصرعوں کا جواب ناپید ہے۔ سُرخ جوڑے کو شفق سے تشبیہ دینا تو خیر کوئی ایسی عجیب بات نہیں معمولی شاعر بھی ایسا کر سکتا ہے لیکن " تن کی جھمک" میں بجلی کی مشابہت دیکھنا صرف نظیر کی نازک بصیرت و شاعرانہ نظر کا کام ہے۔

اب اس کے بعد اس ستم ایجاد مہ لقا کی صحبت کا سماں دیکھئے۔ حقیقت میں یہ وہ حالت ہے جب عنانِ صبر و استقلال انسان کے ہاتھ میں کسی طرح نہیں رہ سکتی۔ اس سے دنیا کے فریب مراد ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ طرح طرح سے لبھا کر انسان کو پہلے بے قابو کر دیتے ہیں پھر اس کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتے ہیں اور اس پر ستم یہ ہے کہ پھر بھی وفا نہیں کرتے۔ کم بخت، بدنصیب انسان کو محروم ہی رکھتے ہیں۔ خیر اس رنج کو چھوڑئیے اور اب یہ سماں دیکھئے :۔

آتے ہی اس کے دل کا مرے کھل گیا چمن عیش و طرب کے ابر کی پڑنے لگی بھرن
نازک کمر وہ صاف شکم اور وہ نرم تن گل سا ملا جو مجھ کو نیا گدگدا بدن
رگ رگ میں میری چھٹ گئی عشرت کی پھلجھڑی

لے کر بغل میں اس کو لگایا جو ہیں گلے سو عشرتوں کے دل پہ مرے کھل گئے دریے
حاضر ہوئے جب آن کے سب عیش اور مزے سینے سے سینہ مل گیا اور لب سے لب ملے
لٹنے لگی بہار مزوں کی دھڑی دھڑی

یہ اس عالم کا سماں ہے جب انسان مسرتوں میں محو اور عشرتوں میں چور ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں

یکایک یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے:۔

ان عشرتوں میں آہ نصیبوں کو کیا کہوں　　چاہا میں اس پری سے جو کچھ اور کچھ کہوں
اتنے میں ہائے یار مری آنکھ کھل گئی

یہ اس حالت کا سماں ہے جب عارضی مسرت و انبساط کے پردے آنکھوں سے ہٹ جاتے ہیں اور انسان پھر اپنی اصل حالت پر آجاتا ہے۔

آخر کا بند اس وقت کی حالت دکھاتا ہے جب عارضی عیش و نشاط کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان پھر ایک غیر دلچسپ اور سادہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کی حالت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ گزشتہ زمانے کے عیش و عشرت کا فراق اس کو بیحد مضطرب رکھتا ہے اور اس کا تمام وقت اسی کی یاد میں کفِ افسوس ملتے گزرتا ہے لیکن اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دیکھئے یہ وہی حالت ہے:۔

یہ حادثہ جو مجھ پہ پڑا آکے یک بیک　　آنکھوں سے میری اس گھڑی آنسو پڑے ٹپک
نیند اڑ گئی قرار گیا جل گئی پلک　　جاگا کیا نظیر میں پھر آہ صبح تک
مل مل کے ہاتھ رات کی کاٹی گھڑی گھڑی

ریچھ کا بچہ بظاہر تو ایک طفلانہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایک حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری ہے۔ ریچھ کے بچے سے انسان کا نفس شریر مراد ہے جو بمشکل رام کیا جا سکتا ہے اور قلندر سے مطلب خود حضرت انسان ہیں جو اس کو طرح طرح سے سدھا سدھا کر اپنا مطیع کر لیتے ہیں۔ ریچھ کے بچے کی تعلیم و تربیت سے مراد ریاضت نفس ہے جس میں بہت زمانہ صرف ہوتا ہے۔ ذیل کے بند میں اس کی طرف اشارہ ہے:۔

کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ　　لے آئے وہیں ہم بھی اٹھا ریچھ کا بچہ
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ　　جس وقت بڑھا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ
جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

اس نظم میں باطنی معانی و معنوی مطالب کے علاوہ ظاہری خصوصیات اور شعری لطافتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ دیکھئے ریچھ کے بچے کی کیا آرائش دکھائی ہے۔ واقعی پری معلوم ہوتا ہے:۔

جُھمکے وہ، جھمکتے تھے پڑے جن پہ کرن پھول ‏ ‏ مقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ او پر جھول
اور ان کے سوا کتنے بٹھائے تھے جو گل پھول ‏ ‏ یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پاؤں کی سُدھ بھول
گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچہ

ذیل کا بند اس چھوٹے سے تماشے کا مرقع اور فلسفۂ اجتماع کا ایک مختصر کرشمہ ہے۔ دیکھئے اس کے چوتھے مصرعے میں کس قدر خیالات کا مجموعہ ہے۔ اس مصرعے میں سات لفظ ہیں اور ہر لفظ سے ایک مستقل خیال اور جداگانہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ دریا کو زہ میں بند کرنا اسی کا نام ہے اور یہ صرف مجتہدین سخن ہی کا کام ہے ملاحظہ ہو:۔

اک طرف کو تھیں سینکڑوں لڑکوں کی پکاریں ‏ ‏ اک طرف کو تھیں پیر و جوانوں کی قطاریں
کچھ ہاتھیوں کی قیق اور اونٹوں کی ڈکاریں ‏ ‏ غل، شور، مزے، بھیڑ، ٹھٹھ، ابنوہ بہاریں
جب ہم نے کیا لا کے کھڑا ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کوئی ہم سے میاں آؤ قلندر ‏ ‏ وہ کیا ہوئے اگلے جو تمھارے تھے وہ بندر
ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ پیشہ ہے قلندر ‏ ‏ ہاں چھوڑ دیا بابا انھیں جنگلے کے اندر
جس دن سے خدا نے یہ دیا ریچھ کا بچہ

بندر سے ایام طفولت مراد ہیں جب تقلید کی قوت جوش پر ہوتی ہے۔ چوتھے مصرعے کے یہ معنی ہیں کہ بچپن اور بے فکری کا زمانہ ختم ہوگیا اب ذمہ داری کا وقت آگیا ہے اس لئے شریر نفس پر قابو پانے کی ضرورت ہے اس لئے اس کی تربیت میں مصروف ہیں۔

ذیل کے بند میں بڑا دقیق صوفیانہ راز مضمر ہے جس کا سمجھ لینا عارف ہی کا کام ہے۔ کوئی کتنا ہی

نفس کش اور مرتاض کیوں نہ ہو، نفس کی مخالفت آخر عمر تک جاری رہتی ہے۔ دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بعض اوقات نفس شریر غالب آ کر عمر بھر کی عبادت و ریاضت خاک میں ملا دیتا ہے۔ اس ضمن میں برصیصا زاہد کی مثال کس قدر دردناک اور عبرت انگیز ہے۔ پکا صوفی وہی ہے جو ہر وقت ہشیار رہے اور کسی وقت بھی نفس کے حملوں سے غافل نہ رہے۔ اس بند سے اسی کی تلقین فرماتے ہیں:۔

جب کشتی کی ٹھیری تو وہیں سر کو جو جھاڑا ۔۔۔ للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اُسے گہ اُس نے پچھاڑا ۔۔۔ اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا
گو ہم بھی نہ ہارے نہ ہٹا ریچھ کا بچہ

آخر کے مصرعے میں اپنا کسر نفس اور نفس کی سرکشی دکھائی ہے۔ "بھی" کا لفظ بتا رہا ہے کہ نفس سختی کے ساتھ مخالفت کر رہا ہے مگر پھر بھی اس کے مغلوب کرنے کی کوشش جاری ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو اپنی ریاضت کا کبھی غرہ نہ کرنا چاہیئے۔ ہمیشہ امید و بیم میں رہے۔ اپنے کو کمزور اور اپنے مخالف کو قوی سمجھے۔ اس وقت اُس کے لئے پوری فتح کا امکان ہو سکتا ہے۔

راکھی ایک ہندوانہ و عاشقانہ نظم ہے جو اپنے رنگ کی ایک نرالی چیز ہے۔ سلونوں کا تیوہار ہندوستان کا بڑا مشہور تیوہار ہے۔ اس میں ہر شخص راکھی باندھتا اور شکر لے کر اپنی سسرال جاتا ہے۔ راکھی کی مذہبی اہمیت کچھ بھی ہو لیکن شاعرانہ نقطۂ نظر سے اس میں بڑی لطافت اور جاذبیت ہے۔ جنس لطیف اور اس کے اس طبقے میں جو دوشیزگی سے ہمکنار ہے راکھی ایک مستقل حسن پیدا کر دیتی ہے، جس کی ستم آرائیاں کوئی نظیر کے دل سے پوچھے، کسی کی موتیوں کی اور زری کے تار کی راکھی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں:۔

ادا سے ہاتھ اُٹھنے میں گُل راکھی جو ہلتے ہیں ۔۔۔ کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ چھلتے ہیں
کہاں نازک یہ پہونچے اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں ۔۔۔ چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں
جو کچھ خوبی میں ہے اس شوخ گُل رخسار کی راکھی

ساری نظم عاشقانہ جذبات اور حسین تاثرات کا ایک پُرکیف وسکر حمیں ہے جس میں طرح طرح کے خوش رنگ پھول جا بجا کھلے ہوئے ہیں، جو ہر اہل دل کو متوالا بنائے دیتے ہیں۔ راکھی اور راکھی باندھنے والیوں کی فسوں پاشیاں جب نظیر سے ضبط نہ ہو سکیں تو آخر بیتاب ہو کر کہہ بیٹھے :۔

پھرے ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تارے   تو ان کی راکھیوں کو دیکھ اے جان چاؤ کے مارے
پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اُپر بارے   نظیر آیا ہے باھمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تیوہار کی راکھی

سخاوت اور عشرت ایک ناصحانہ نظم ہے جس میں دراصل بخل کی ہجو کرنی منظور ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے سخاوت کے باب میں کسی قدر مبالغہ کرنا ضرور تھا لیکن نہ اتنا کہ سخاوت خود ایک عیب کی شکل اختیار کر لے۔ اس مقام پر طبیعت کے زور اور اخلاق حسنہ کی حمایت کے جوش نے شاعر کے رواں قلم کو جادۂ اعتدال سے ہٹا دیا ہے کہتے ہیں :۔

زردار ہے تو ہر گز مت مار اپنے من کو   تن زیب تن سکھوں سے ترسا نہ اپنے تن کو
جو زر چلن چلیں ہیں تو بھی چل اُس چلن کو   مرشد کا ہے یہ نکتہ رکھ یاد اس سخن کو
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

اس بند کا پہلا مصرع عاقلانہ نصیحت سے کس قدر لبریز ہے۔ دوسرے مصرعے میں اسی کی تشریح ہے اور طبیعت نہ مارنے کا طریقہ بتایا ہے۔ تیسرے میں ایک شریفانہ پندار کا اظہار ہے جو قطعی قابل پذیرائی ہے۔ پانچویں میں بھی ایک معتدل روش کی تلقین ہے لیکن چھٹے مصرعے میں بڑی زیادتی پر کمر باندھی ہے۔ کوڑی کفن کو نہ رکھنے کی پُرتاکید تلقین فی نفسہ نہایت مذموم ہے۔ یہ دراصل ایک عامیانہ شیوہ ہے اور سنجیدہ طبائع کو اس قسم کے طرز زندگی سے گریز کرنا چاہیئے۔ آخر کے دونوں مصرعوں کی لے بھی قلندرانہ ہے

جس سے ان کی سنجیدگی میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے اور اس سے یہ بھی کسی قدر مترشح ہوتا ہے کہ یہ تلقین شریفانہ زندگی بسر کرنے والوں کے لئے نہیں ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نظم کا مدعا کوئی فضول خرچی یا روپیہ برباد کرنا سکھانا نہیں۔ کار خیر میں صرف کرنے اور دل کھول کر صرف کرنے کی ہدایت نہایت مبالغہ آمیز لفظوں میں کی ہے۔ بہ مرگش گیر تا بہ تپ راضی شود کا اصول پیش نظر رکھا ہے۔ اب دیکھئے یہ کتنا بلند اور عارفانہ خیال ہے :۔

جو جو بخیل کتنی زر چھوڑ کر مرے گا ۔۔۔ یا کھائے گا جنوائی یا خالصہ لگے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ راہ خدا میں دے گا ۔۔۔ کھاتا کھلاتا ہنستا تو بھی سدا رہے گا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مر دہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

قناعت، توکل اور خدا پر بھروسہ کرنے کی تلقین اس سے بہتر الفاظ میں اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس بند کا چوتھا مصرع اب ضرب المثل کا کام دیتا ہے :۔

جس نے یہ زر دیا ہے پھر وہی دھن بھی دیگا ۔۔۔ مال و مکاں حویلی باغ و چمن بھی دے گا
جیتا رہے گا جب تک کھانے کو ان بھی دیگا ۔۔۔ مر جاوے گا تو وہی تجھ کو کفن بھی دے گا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مر دہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

چاندنی رات ایک مصورانہ اور عاشقانہ نظم ہے جس میں نظیر کا شاعرانہ کمال نقطۂ اوج پر نظر آتا ہے۔ چاندنی رات پر اُردو اور دوسرے ادبیات میں اور بھی بہت سی نظمیں ہیں لیکن کوئی اس قدر کامیاب اور شگفتہ نہیں جس سے چاندنی کا سماں من و عن آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اور طبیعت میں غیر معمولی تازگی اور بشاشی پیدا ہو گئے ہیں :۔

صحنِ چمن میں واہ وا زور بچھی تھی چاندنی　　　　چاند ہلوریں لیتا تھا اور کھلی تھی چاندنی

نظیر کا ایک ادبی کرشمہ یہ ہے کہ وہ بحر ایسی مناسب حال اور مترنم چھانٹ کر لاتے ہیں جس سے مضامین کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور نظم میں جان سی پڑ جاتی ہے۔ اگر الفاظ خیال کو سماں بندی میں مدد دیتے ہیں تو ترنم سماں میں ایک مزید فسوں پیدا کر دیتا ہے۔ یہ نظم ذرا لحن میں پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ چاندنی رات کا منظر پیش نظر ہے اور دھیمی دھیمی موسیقی سامعہ نوازی کر رہی ہے۔ اس شعر میں چاند کا ہلوریں لینا بالکل اچھوتا خیال ہے اور اب تک کسی شاعر کو میسر نہیں ہوا۔ چاند کی غالباً یہی صفت ہے جو اس میں ایک خاص کیفیت و جاذبیت پیدا رکھتی ہے لیکن یہ کیفیت صرف محسوس کی جاتی تھی، اب تک اس کے بیان کے لئے الفاظ میسر نہ تھے۔ نظیر نے الفاظ مہیا کر کے فطرت کا ایک نازک و معصوم حسن ارباب ذوق و نظر تک پہونچا دیا۔ اب یار کے حسنِ گلگوں اور اس کے لباسِ زرنگار کی مصوری دیکھئے :-

آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلہ زری　　　　چمکے تھی تار تار میں مہ کی جھلک ذری ذری

ذیل کا شعر دیکھئے کس قیامت کا ہے۔ صبح کا منظر اتنے کم اور ایسے لطیف اور مترنم الفاظ میں اور کہیں نہ دیکھا ہوگا :-

صبح ہوئی گجر بجا، پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اُٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

صبح کا ہونا طرح طرح سے اور بہت طویل طویل طریقوں سے دکھایا گیا ہے لیکن صُبح کے ساتھ گجر بجنا، پھول کھلنا اور ہوا چلنا جو صبح کے لوازم خصوصی ہیں بہت کم دکھائے گئے ہیں۔ ان چند باتوں کے مجموعے نے ایک عجب پُر لطف و سکون کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس حسن کا خیالی نقشہ اگر کھینچا جائے تو بڑا دلکش ہوگا۔

اب چاندنی رات میں عیش و طرب کی صحبت کا ایک اور منظر دیکھئے :-

چاندنی واہ چاندنی کرتی تھی کیا جھلک جھلک　　　　چہک رہی تھیں بلبلیں، باغ رہا تھا سب مہک

جام کے لب سے ہر گھڑی نکلے تھی مے چھلک چھلک — یار بغل میں غنچہ لب، بوسوں کی سو لپک لپک
عیش و طرب کی لذتیں ہونے لگیں جو یک بیک — ایسے مزے میں عیش میں آہ کہیں سے ہک نہ دھک

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

یہ بند ایک طلسم مسرت و طرب ہے۔ اس کی کون کون سی خصوصیتیں اور کیا کیا لطائف بتائے جائیں۔ اور خوبیاں تو درکنار صرف جھلک جھلک، مہک، چھلک چھلک، لپک لپک، یک بیک، ہک نہ دھک، سے چاندنی کا سماں، باغ کی عطر پاشیاں، شراب کی شگفتگی، بوسوں کی پرلطف لذتیں، عیش و طرب کا اضطراب، اور پھر سب سے آخر میں دل کی اضطراری کیفیت کی مصوری میں جو کمال دکھایا ہے وہ نظیر ہی کا حصہ ہے۔ یوں تو ساری نظم سماں بندی میں اپنی مثال و نظیر نہیں رکھتی لیکن اس بند میں صرف ایک لفظ کی تکرار سے اصل سماں اور ساری کیفیت بلاکم و کاست آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نظم فی نفسہ بالکل بے تصنع ہے، زبان صاف اور شستہ ہے، متروکات کا استعمال بہت کم ہے لیکن جمع موصوف کے لئے فعل بھی صیغۂ جمع ہی میں لایا گیا ہے، جیسے :۔

ہم بھی نشے میں مست تھے ساقی کی پی کے پیالیاں — جل کے فلک نے اس میں ہائے آفتیں لا یہ ڈالیاں

اس قسم کی اور بھی اکثر مثالیں اس نظم میں موجود ہیں۔

ہولی ایک ہندوانہ اور مصورانہ نظم ہے اور شاعرانہ صناعی کی اختراع فائقہ ہے۔ ہولی میں مذہبی عنصر کے علاوہ ایک موسمی پہلو بھی ہے۔ اس لئے نظیر کو یہ تیوہار بہت مرغوب ہے۔ خود ہولی میں شعریت اس قدر ہے کہ نظیر اس سے کسی طرح قطع نظر نہیں کر سکتے تھے۔ نظیر کی پسندیدگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کلیات میں آٹھ نظمیں ہولی پر موجود ہیں۔ ہولی کی محفل کا سماں ملاحظہ ہو۔ ہولی کے جشن کی سماں بندی کے لئے کیسے مترنم الفاظ منتخب کئے ہیں :۔

رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیوجی کا میلا ہے

اناطول فرانس کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ اہل علم کا مصنف ہے۔ اگر محض دیومالا، روایات اور تلمیحات کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ خطاب نظیر پر بھی صادق آتا ہے لیکن نظیر نے اپنے نقطۂ نظر اور اپنی ہمہ دانی کو اس قدر سہل اور عام فہم بنا دیا ہے کہ وہ خواص کی جگہ عوام کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اس کو ہندو دیومالا سے پوری واقفیت اور بڑی محبت ہے۔ جس طرح اناطول فرانس کے افسانوں میں توریت وانجیل کے حوالوں اور مسیحی تلمیحات کی کثرت ہے، اسی طرح نظیر کے کلام میں ہندو دیومالا کے حوالے جا بجا پائے جاتے ہیں۔ تیسرے بند میں بشن کے بارہ اوتاروں کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ہے کہیں رام اور کہیں لچھمن　　کہیں کچھ، مچھ ہے اور کہیں راون
کہیں بارا، کہیں مدن موہن　　کہیں بلدیو اور کہیں سیکشن
سب سروپوں میں ہیں اسی کے جتن　　کہیں نرسنگھ ہے، وہ نارائن
کہیں نکلا ہے سیر کو بن بن　　کہیں پھرتا پھرے ہے یوں بن بن
رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیوجی کا میلا ہے

اس نظم کا ہر بند، اپنی جگہ مکمل اور زندگی کا سچا مرقع ہے۔ ہر بند سے ایک تصویر بنائی جاسکتی ہے، اور پوری نظم سے میلے کا ایک لاجواب فلم تیار ہو سکتا ہے۔ بارہویں بند کی حسین و پاکیزہ واقعیت رومان و شعر کی جان ہے۔ تیسرے شعر کا دوسرا مصرعہ خصوصیت کے ساتھ، حسنِ بیان اور ندرت تشبیہ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بند ملاحظہ ہو:۔

نازنیں ہیں وہ سانوری گوری　　جن کی نازک ہر اک پری پوری
کر کے چتون، نگاہ کی ڈوری　　دل کو کھینچے ہیں سب برا زوری

دھوم، ناز و ادا، جھکا جھوری — برج میں جیسے مچی رہی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری — چوری کیسی کہ صاف سر زوری
رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

زمانے کے امتداد اور مغربی تمدن کے روز افزوں اثر سے ہندوستان کا قدیم تمدن دم توڑ رہا ہے۔ پرانی سماجی زندگی کے تفریحات و مشاغل کے مزے پھیکے پڑ چکے ہیں تہواروں اور میلوں کی رنگینیاں ماند پڑ کر رہ گئی ہیں۔ نظیر نے اٹھارویں انیسویں صدیوں کی معاشرت کے بہت سے لطائف و کوائف کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ جب تک اس کا کلام زندہ ہے بلدیو جی کے میلے کی چہل پہل اور "برج کی ہوری" کی رنگ رلیاں زندہ ہیں۔ ہندوستان زندہ باد۔

پندرھویں بند میں دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ایک لفظ "ساکے" استعمال ہوا ہے۔ یہ ساکا کی تصریفی صورت ہے گر یہاں جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ناچ اور رنگ کے کھڑاکے ہیں — گھنگرو اور تال کے جھناکے ہیں
نقلیں، قصے، کہانی، ساکے ہیں — کفنڈ، دوہرے، کبت، اکھاکے ہیں
کہیں آغوش کے لپاکے ہیں — کہیں بوسوں کے سوجھاکے ہیں
تھرتھری، دانت پر کڑاکے ہیں — تس پہ جاڑے کے سو جھڑاکے ہیں
رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

اس لفظ سے پڑھنے والے کا ذہن فوراً انگریزی لفظ "ساگا" کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس لفظ کے معنی، سویڈن ناروے اور آئس لینڈ کی تاریخی داستان بالخصوص وہ داستانیں ہیں جن میں ہندستانی خاندانوں

یا شاہان نوروے کے کارنامے بیان ہوئے ہوں۔ مجازاً یہ لفظ رزمیہ داستان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں بھی یہ لفظ، بہادروں کے کارناموں کا مترادف ہے اور آلھا اودل کی لڑائی اور گنور بجے کے معرکوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ برج بھاشا کے یہ قصے داستان امیر حمزہ اور شاہنامے کی قسم کی تصانیف ہیں۔ اس بند کے قافیے نظیر کی زبان دانی کے معجزے ہیں۔

اکیسویں بند میں، ہندوستان کے اس طبقے کی معاشرت کا ایک منظر پیش کیا ہے جو عہد حاضر کی سیاسی زبان میں پرولتاریہ (پرولیٹیریٹ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نظیر کو اس طبقے اور اس کی معاشرت سے خاص محبت ہے۔ اس کی زبان اور اس کی زندگی کا بھی وہ بڑا مبصر ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

لاکھوں بیٹھے بساطی اور منہار — اپنا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی، بنگڑی کی اک طرف جھنکار — نورتن، پوتھ، انگوٹھی، چھلے ہار
ٹوٹے پڑتے گنواری اور گنوار — جس گنواری کو چلئے دھکا مار
گر کے دے گالی، یوں کہے ہے پکار — "کیسو! اٹھلا چلے ہے ڈاڑھی جار"

رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

شاعری کی فضا میں پرواز خیال کا نام عظمت، جذبات کی مصوری کا نام تغزل اور مرثیات کی مرقع کشی کا نام محاکات ہے۔ خیال آرائی کے ساتھ نظیر کو جذبات نگاری اور واقعات کی مصوری میں بھی ید طولیٰ ہے۔ اس کا کلام ان سب اجزا سے مل کر صورت پذیر ہوتا ہے۔ جاذبیت و اثر، سرشاری و مدہوشی کی جو کیفیت اس کی

تغزل — غزلوں میں سموئی ہوئی ہے وہ تغزل گوئی کی انتہا ہے۔ غزل کے احاطے کے باہر نظموں میں بھی وہ کہیں کہیں یہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ تہ میں ڈوب کر شعر کہتا ہے اور قلب میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے وجود پر ہمہ وقت ایک لذت و بیخودی، ایک سرمستی و سرخوشی طاری رہتی ہے اور یہی وجدانی عالم وہ

پڑھنے والے پر بہ درجہ اولیٰ طاری کر دیتا ہے۔ اس کے کلام کی یہ لذّت اردو زبان کی ایک لازوال ودائمی دولت ہے۔ جذبات کو برانگیختہ کرکے، روحانی سماں پیدا کرنے اور محویت کے عالم میں گم کر دینے میں بھی اس کو کمال حاصل ہے۔ لیکن یہ پہلو اس کے کلام کا ایک آنی و وقتی کرشمہ ہے۔ اس کی اس نوع کی رومانیت کو اس کی واقعیت سے مخلوط نہ کر دینا چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ نظیر کے یہاں تغزل نہیں ہے۔ یہ الزام قطعی غلط اور مطالعے کی کمی پر مبنی ہے۔ نظیر تھوک فروش تاجر کی قسم کا شاعر ہے اور غزل ایک قسم کی خردہ فروشی ہے۔ تھوک فروش کی دوکان میں وہ سارا مال، بڑی مقدار میں میسر آتا ہے جو خردہ فروش تھوڑا تھوڑا کرکے بیچتا رہتا ہے۔ جو شاعر نظیر کی طرح انسان کے تمام و کمال نفسیات کا ماہر ہو، وہ اس نوع کے جزدی نفسیات سے کیونکر آشنا نہ ہوگا جو غزل میں باندھے جاتے ہیں۔ جو شاعر انسان کے قلب کی جملہ کیفیات کو کتاب کی طرح پڑھ سکتا ہے، وہ اس کیفیت کا بھی نبض شناس ضرور ہوگا جس کا نام محبت ہے اور اس نوع کی محبت کا بھی جو عاشق کو معشوق سے ہوتی ہے۔ جب وہ بیان کے جملہ اصناف پر قدرت رکھتا ہے تو زبان کے ان لطیف و نازک، اشاروں اور کنایوں سے بھی خوب واقف ہوگا جن سے "راز گفتن بہ معشوق" کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ یونان قدیم کا وہ نامعلوم صنّاع جس نے وقار و تناسب کو اپنے لمس و نظر میں سمو کر، قلب مرمر سے مائلو وینس[۵] کا وہ ذی حیات پیکر تراشا جو آج بھی نسائی رعنائی کا معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور پہلی مرتبہ جمال کی پرستش کا مرئی موضوع خلق کیا، حقیقت میں نوع انسان کا سچا شفیق تھا۔ اس کے چند الہامی لمحوں نے، اپنی بیتاب روح کی اس دقیق و مبہم آرزو کی صورت گری کر دی، جس کو متشکل و مجسم دیکھنے کے لئے نوع انسان کی آنکھیں یوم خلقت سے ترس رہی تھیں۔ اس نے انکشاف ذات کی ایسی سیدھی سچی راہ نکالی جو نفس انسان سے اب تک پوشیدہ تھی۔ اس نے

---

[۵] مائلو ایک یونانی جزیرے کا نام ہے۔ سنہ ۱۸۲۰ء میں اس جزیرے کے صدر مقام مائلو کے کھنڈروں میں یونان کی مشہور دیوی وینس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جو وینس کا بہترین مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ مجسمہ مائلو وینس کہلاتا ہے اور اب پیرس میں ہے۔

جذبات پرستش کو خود اپنے وجود کے مطالبوں سے آگاہ کر دیا۔ اسی طرح وہ شاعر جو اپنے جذبات محبت کو صحت و رتغزل کا جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے بڑا اور سچا شاعر ہے۔ نظیر ایسا ہی شاعر ہے۔ اس کے تغزل میں صحت و خلوص کے ساتھ نقاشانہ نظر فریبی اور مصورانہ دلنوازی بھی ہے۔ جس وقت وہ مزے کی لطیف باتیں کرتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ چنبیلی میں بسی ہوئی نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے دماغ کو معطر اور روح کو مسرور کر رہے ہیں۔ اس کی غزلیں حسن و رنگ، مسرت و طرب، سرشاری و سرخوشی کی نوید ہیں جو ملول لمحوں کو مسرور بنا دیتی ہیں۔ اس نے مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسی ہی آسانی سے غزلیں کہی ہیں جیسی سادہ اور سہل ممتنع میں۔ بعض زمینیں اس نے خود پیدا کی ہیں۔ اس کی غزلوں میں بھی جگہ جگہ مکالمے کا التزام نظر آتا ہے۔ شوخی شرارت، چھیڑ چھاڑ، اور معاملہ بندی جو بعض کے نزدیک غزل کی جان ہے اس کے یہاں کافی مقدار میں موجود ہے۔ بوسے سے نظیر کو خاص محبت تھی۔ اس کا ذکر جگہ جگہ اور بالکل صاف صاف ہے۔ اس کے تغزل کے چند پاکیزہ نمونے ملاحظہ ہوں:-

بھلا ہوا جو نقاب تو نے اٹھایا چہرے سے ہے پری رُو   وگرنہ سینے سے دل تڑپ کر نگہ میں آکر مقام کرتا
ساقی نے سب کو بھر کے دئے جام بزم میں   ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا
یہ غنچہ جو بے درد گلچیں نے توڑا   خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا
گلے کا ہار جو اس گل بدن کے ٹوٹ پڑا   تو ڈر نظر کا دہیں اس کو ایک بار رہا

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا   بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا
مقابل اس کے مُنہ کے گل کو تو کس منہ سے کرتا ہے   کہاں گل اور کہاں وہ منہ تو دیکھ اے باغباں اپنا
اسی کی مہربانی سے سبھوں کی مہربانی ہے   ہوا جب وہ نظیر اپنا تو پھر ہے سب جہاں اپنا

ان اشعار میں اردو شاعری کا اعلیٰ ترین تغزل موجود ہے۔ بعض شعر ایسے ہیں جو میر کے کلام سے برابر

کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آخر کے تین اشعار میں زبان اور محاورے کی بیش از بیش لطافتیں میسر آتی ہیں۔ اور مثال ملاحظہ ہو:۔

چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے ۔۔۔ کہ مثل آتش افسردہ پھر کچھ دل چلا گھلا

اس غزل میں پھلا اور دہلا وغیرہ قافیے ہیں اور گھلا بھی ہے۔ یہ لفظ اس وقت نیا نیا سا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں سرد یا افسردہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ہزاروں قافلے جس شوخ نے کئے غارت ۔۔۔ نظیر کو بھی اسی بے وفا نے لوٹ لیا
طور کو پھونک دیا اس نے تمھاری خاطر ۔۔۔ چشم کے واسطے جب سرمے کا سامان کیا
دل یار کی گلی میں کر آرام رہ گیا ۔۔۔ پایا جہاں فقیر نے بسرام رہ گیا
دیا دل ہم نے تم کو اور تو اب کیا کہیں لیکن ۔۔۔ یہ ویرانہ تمھارا ہے اسے معمور رکھئے گا

یہ سارے اشعار تغزل کی نہایت پاکیزہ مثالیں ہیں لیکن آخر کے شعر میں محبت کا جذبہ انتہائی خلوص کے ساتھ کارفرما ہے۔ اس کے علاوہ، اس کے بیان کا لب ولہجہ اتنا سادہ اور بے ریا ہے کہ فوراً دل پر اثر کرتا ہے۔ اور دلچسپ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

آغوش تصور میں جب ہم نے اسے مسکا ۔۔۔ بہمائے نزاکت سے اک شور تھا بس بس کا
سو بار حسریراس کا مسکا نگۂ گل سے ۔۔۔ شبنم سے کب اے بلبل پیراہن گل مس کا
اس تن کو نہیں طاقت شبنم کے تلبس کی ۔۔۔ اے دست ہوس اس پر تو قصد نہ کر مس کا

ان اشعار میں میر تقی میر کا سا تغزل اور انیس کے کلام کی سی نزاکت و لطافت سموئی ہوئی ہے۔ اور حسین مثالیں یہ ہیں:۔

لڑی منہ سے، نہ بولی روٹھ بیٹھی جھڑکیاں دے لیں ۔۔۔ اسے سب کچھ بن آتا ہے مجھے کچھ بن نہیں آتا
تیشے کی کیا مجال تھی یہ جو تراشے بے ستوں ۔۔۔ تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا

کیا ہے کیا مہِ کنعاں پہ حسن نے احساں ... کہ اس کے دَور میں تجھ کو نہ آشکار کیا
بہار دیکھو اسے رشکِ ستے یہ آتی ہے ... کہ تھا یہ حسن تو پھر تجھ کو کیوں بہار کیا
نظیرؔ آج تصدق کو کچھ نہ تھا ہم پاس ... وہی جو باقی تھا اک جی، وہی نثار کیا

نہ جاؤں میں تو اس کے پاس لیکن کیا کروں یارو ... یکایک کچھ جگر میں آکے لگ جاتا ہے نشتر سا
نظیرؔ اک دو گلے کرنے بہت ہوتے ہیں خوباں سے ... چلو اب چپ رہو بس کھل بیٹھے تم تو دفتر سا

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا ... اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا

اس مطلع کا لب و لہجہ خسروؔ کے مقطعے سے بہت ملتا جلتا ہے جو یہ ہے :-

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی می کند ... آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

نظیرؔ کے تغزل کی اور دل آویز مثالیں ملاحظہ ہوں :-

سبھوں کو دیتے ہیں خوناب دل پلا ناتھا ... فلک بھی پیتے تجھے کیا یہ زہر کھانا تھا
شبِ فراق کی ادنیٰ سی اک یہ حالت ہے ... کہ تھا جو گھر سو ہمارا وہ قید خانا تھا
غرض یہ سر کی خبر تھی نہ پا کا ہوش نظیرؔ ... سرہانا پائنتی اور پائنتی سرہانا تھا

میں عشق کا جلا ہوں مرا کچھ نہیں علاج ... وہ پیڑ کیا ہرا ہو جو جڑ سے اکھٹ گیا

اُکھٹ اب متروک ہے ۔ یہ لفظ نظیرؔ کے زمانے میں اور انیسویں صدی کے آخر تک، اکبر آباد اور مضافات میں اُکھڑ کے معنی میں رائج تھا ۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

مر مر کے مجھے کہتا تھا سو مرتا ہوں میں یارو ... اب لاؤ کہاں ہے وہ مرا کوسنے والا
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں ... صدقے ترے پھر ایک نظر ہم کو دکھلا لا
شیریں کے در او پہ جو سے شیر نہ جانو ... فرہاد کے لوہو کا چھلکتا ہے پیالا
کیا جانے کس حال میں ہووے گا نظیرؔ آہ ... دل آج مرا اسلمہ اللہ تعالیٰ

نظیر کا مقطع عموماً قیامت ہوتا ہے۔ لیکن اس مقطعے کا تغزل بے پناہ ہے۔ اور اشعار ملاحظہ ہوں :۔

بے کلی آج بھی واں لے گئی مجھ کو تو نظیر　　میں نے ہر چند یہ چاہا تھا کہ کل جاؤں گا
بے صدا آ کر لگا اور ہو گیا سینے کے پار　　یہ خدنگ ناز تھا کس بے نشاں کی شست کا
بات کچھ کہتا ہے اور نکلے ہے کچھ منہ سے نظیر　　یہ نشہ ایسا ہوا کس کی نگاہِ مست کا

ایک نظر گر تجھے دیکھیں تو شادی سے پھر　　مہ کو لگیں چار چاند، مہر کو چار آفتاب
جیسے یہ ہیں مہر و مہ ایسے تو اس کے نظیر　　چمکیں ہیں سو ماہتاب اور ہزار آفتاب

ان دو شعروں میں سے پہلے میں "چار چاند" کا محاورہ بڑے حسن سے نظم ہوا ہے لیکن حسن بالائے حسن یہ ہے کہ نظیر نے اس کے مقابل "چار آفتاب" دوسرا محاورہ وضع کیا ہے۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیر　　ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک خشت نصیب
ساغر کے لب سے پوچھیے اب اس کی لذتیں　　کس واسطے کہ خوب سمجھتا ہے لب کی لب
جس دل کو چاہتا ہوں اُسے بھی خبر نہ ہو　　اپنے تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب
کیسا ہی وہ بُرا ہو تو لگ جائے جس سے دل　　لگتا ہے دل کو پھر وہی واللہ سب سے خوب

ان دو شعروں میں سے پہلے میں محبت کی رازداری کا معیار اور دوسرے میں محبت کی انفرادیت کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ دونوں شعر اپنی اپنی جگہ لاجواب ہیں۔ اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

جلد آ یار کہ اب ہم کو ستاتے ہیں بہت　　گوش گفتار طلب، دیدۂ دیدار طلب
کس کے لئے کیجئے جامۂ دیبا طلب　　دل تو کرے ہے مدام دامن صحرا طلب
ایک تمنا ہو تو یار سے کہیے نظیر　　دل سے ہے پُر از آرزو، کیجیے کیا کیا طلب

نظیر کے مقطعے سے، ذہن فوراً فارسی کے اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے :۔

کچھ طبلے کھڑکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی — کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھی اور منہ چنگ بجی — کچھ گھنگرو کھٹکے جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہردم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

اور دیکھئے ہولی کی رنگ رلیوں کی مصوری کیسے لطیف پیرائے میں کی ہے :-

ہر جاگہ تھال گلالوں سے، خوش رنگت کی گلکاری ہے — اور ڈھیر عبیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے — منہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ جمایا ہولی نے

پوشاکیں چھڑکی رنگوں کی اور ہردم رنگ فشانی ہے — ہر وقت خوشی کی جھمکیں ہیں پچکاری کی رخشانی ہے
کہیں ہوتی ہے دھینگا مشتی کہیں ٹھیری کھینچا تانی ہے — کہیں لٹیاں جھمکیں رنگ بھری کہیں جوتا کیچڑ پانی ہے
ہر چار طرف خوش حالی کا یہ جوش بڑھایا ہولی نے

ہولی کی یہ نظم حقیقت میں کسی تبصرے کی محتاج نہیں - ہر بات اس قدر رنگین، پُرکیف اور مؤثر ہے جس کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں -

جوگی نامہ اور جوگن نامہ دونوں ایک قسم کی نظمیں ہیں - انہیں بہ ظاہر عاشقانہ اور بہ باطن عارفانہ نظمیں کہہ سکتے ہیں - دونوں میں قریب قریب ایک سے مضامین ہیں اور جذبات بھی نوعیت میں یکساں ہیں - فرق اتنا ہے کہ ایک میں عاشق مرد ہے اور دوسری میں عورت - جوگن نامے کی ہیروئن عورت ہے، صرف اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں نزاکت اور رقت زیادہ ہے لیکن جہاں تک خالص عاشقانہ جذبات کا تعلق ہے وہ دونوں میں یکساں ہیں - اپنی معشوقہ کے فراق میں دیکھئے جوگی کہتا ہے :-

دشت اور کوہ میں وحشی سا پڑا پھرتا ہوں — برق کی طرح سے بیتاب سدا پھرتا ہوں
میں غرض تجھ سے صنم جب سے جدا پھرتا ہوں — رات دن ہجر میں جوگی سا بنا پھرتا ہوں

بے قراری سے ترے نام کی جپتا سمرن

اب دیکھیے اپنے دلدار کے ہجر میں جوگن دکھ کی ماری کہتی ہے:-

ہجر نے اب تو نہایت کیا بے دم مجھ کو   پھرتی ہوں شکل بگولے کی میں ویراں ہر سو

اے مرے ماہ جبیں اے مرے ہمدم گل رو   کون سے شہر میں ہے کون سی جا پر ہے تو

اے مرے ہمدم جاں لے گئے جان و تن من

دونوں بندوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوگی کے جذبات میں درد کے ساتھ کسی قدر کرختگی ہے لیکن جوگن کے جذبات میں درد کے ساتھ ایک قسم کی ملاحت ہے۔ یہ بالیقین اس کی نسائیت نے پیدا کی ہے۔ جوگی کے خیالات سے بیقراری اور اضطراب کا اظہار ہے جسے وہ کسی طرح ضبط نہیں کر سکتا۔ جوگن کی باتوں سے بہرچند غیر معمولی کرب و اضطراب ٹپک رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ انتہا درجے کے ضبط کو کام میں لا رہی ہے اور عاشقانہ خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ جوگن کی اس خصوصی کیفیت نے اس کے درد میں ایک علو اور اس کے عاشقانہ پندار میں ایک وقار پیدا کر دیا ہے جو جوگی کی عریاں بینائی پر بہت زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔

ان دونوں نظموں کو دیکھ کر لامحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نظیر پورے آرٹسٹ تھے۔ صرف جوگی نامہ لکھ کران کی سیری نہ ہوئی۔ لکھنے کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ جوگن نامے کے بغیر عشق کے محاکات ادا نہیں ہو سکتے نہ آرٹ کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ مجتہدین سخن ہی ایسا مکمل ذوق لیکر آتے ہیں۔ ان ہی کا مجددانہ ذہن اپنے ذوق لطیف کی پوری پوری داد دے سکتا ہے۔ اس ذوق کے لوگ آہ اس عہد میں ناپید ہیں۔ جوگی جوگن نامے میں انگلستان کے مشہور شاعر اور مصور درد شیلی کی معروف نظم ایلسٹورس کے سے مضامین ہیں۔ ان نظموں کو اردو میں ایلسٹورس کا یا ایلسٹورس کو انگریزی میں جوگی جوگن نامے کا مترادف کہا جائے تو بجا ہوگا۔ ان دونوں کو ساتھ پڑھنے میں عجب لطف آتا ہے۔ اسی

ضمن میں یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ نظمیں طول ہوجانے کی وجہ سے کسی قدر بدمزہ ہوگئی ہیں اور تفصیل کی کثرت نے بھی لطف میں کمی کردی ہے۔ کہیں تصنع بھی پیدا ہوگیا ہے جس نے نظم کے حسن کا ازالہ کردیا ہے۔ زبان بہت صاف ہے لیکن ہندو مذہب کی اصطلاحوں اور متروکات کے استعمال سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال اس حالت میں بھی نظم کا مجموعی اثر ایک خاص انداز رکھتا ہے جو کسی نوع دلچسپی اور جدت سے خالی نہیں۔

موتی ایک وصّافانہ نظم ہے جس میں موتی کی طرح طرح سے تعریف و توصیف کی گئی ہے ۔ موتی کی اس قدر رٹنا وصفت کرنا اور ہر زیور میں موتی ہی کے حسن پر نظر ڈالنا اور صرف اسی کی داد دینا بے معنی نہیں۔ شہباز اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ موتی نظیر کی معشوقہ کا نام تھا اور یہ نظم اسی کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ اب تو نظیر کے موتی کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔ نظیر کی 'موتی' ضرور گوہر یک دانہ ہوگی۔ اُن کا انتخاب ہی اُن کے ذوق کی پوری پوری داد ہے۔ موتی میں نظیر دیکھیے کیا کیا ادائیں دیکھتے ہیں۔ کیوں نہ ہو اپنی چیز ہے:-

کبھی وہ ناز میں ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہے　　　تو اک اک بات میں موتی کو پانی میں بہاتی ہے
ادا و ناز میں چنچل عجب عالم دکھاتی ہے　　　وہ سمرن موتیوں کی انگلیوں میں جب پھراتی ہے
تو صدقے اس کے ہوتے ہیں پڑے ہر پور پر موتی

غلط ہے اس لب رنگیں کو برگ گل سے کیا نسبت　　　کہ جن کی ہے عقیق اور پنّے اور یاقوت کو حسرت
اُداہٹ کچھ مسی کی اور کچھ اس پر پان کی رنگت　　　وہ ہنستی ہے تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت
ادھر لعل اور ادھر نیلم ادھر مرجان ادھر موتی

دوسرے بند کا چوتھا مصرع الہامی ہے اور اس دنیا کی چیز نہیں معلوم ہوتا۔
اکبر آباد ایک وصّافانہ نظم ہے جس میں نظیر نے اپنے شہر کی خصوصیات بیان کرکے وطن کی محبت

کا حق ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں :-

شہر سخن میں اب جو ملا ہے مجھے مکاں — کیونکر نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں
دیکھی ہیں آگرے میں بہت ہم نے خوبیاں — ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں جہاں تہاں
رکھیو الٰہی اس کو تو آباد جاوداں

پہلے مصرعے میں نظیر اکبرآباد کو شہر سخن فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں یہاں شعر و سخن کا بڑا چرچا تھا۔ کیوں نہ ہو نظیر کا زمانہ تھا۔ حیف صد حیف اب یہاں ذوق کی جنس کس قدر کم یاب ہے۔ اب ذرا اس بند کی شعری لطافتیں ملاحظہ کیجئے۔ مصرعے کس قدر بے ساختہ۔ زبان کس قدر پاکیزہ اور تشبیہیں کس قدر مکمل ہیں :-

ہر صبح اس کی رکھتی ہے وہ نور گستری — شرمندہ جس کو دیکھ کے ہو عارض پری
ہر شام بھی وہ مشک ملاحت سے ہے بھری — لیلیٰ کی جاند کر نہ سکے جس کی ہمسری
دن روئے مہر طلعت و شب زلف مہوشاں

اکبرآباد کی آب و ہوا ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ مشہور ہے کہ پہلے یہاں کوئی وبا نہ پھیلتی تھی۔ اسی خصوصیت پر ناز کرتے ہیں :-

آب و ہوا کے لطف کوئی کیا کیا اب کہے — دیکھو جدھر اُدھر گل عشرت ہیں کھل رہے
ایدھر کو جھکتے ہیں تو اودھر کو جھپے — اشجار باغ و شہر وہ سرسبز لہلہے
سبزوں کو جن کے دیکھ کے حیراں ہو آسماں

نظیر نے اپنے شہر میں جو جو خوبیاں دیکھیں وہ آپ کے سامنے کس خوبی سے بیان کی ہیں۔ اس نظم کی زبان کی صفائی اور شعری لطائف کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ سادگی اور شیرینی میں ادب قدما کی ہم پلہ ہے۔ یہ نظم شروع بھی نظیر نے دعا کے ساتھ کی تھی اور دعا ہی پر ختم بھی کرتے ہیں :-

یارو عجب طرح کا یہ دلچسپ ہے مقام ہوتے ہیں ایسے کتنے ہی خوبی کے اژدہام
ہر طور خوش رہے دل او رطبع شادکام میری نظیر دل سے یہی ہے دعا مدام
ہنستا رہے یہ شہر بصد امن اور اماں

ذیل کا حصّہ، دوسری اشاعت میں اضافہ کیا گیا ہے۔

پری کا سراپا ایک مصورانہ نظم ہے جس میں نظیر نے اپنا پورا شاعرانہ کمال صرف کیا ہے۔ یہ شاہ کار لفظی مصوری کا جیتا جاگتا معجزہ اور جزئیات نگاری کا زندۂ جاوید کرشمہ ہے۔ اردو زبان کے شعری سرمائے میں، یہ ایک عدیم النظیر جمال پارہ ہے، جسے دنیا کے کسی ادب کے، بہترین عہد کے کارناموں کے مقابلے میں آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں نظیر کا آرٹ اپنی پوری ندرت و قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کا لفظی سرمایہ، جس سے وہ ہر نوع کی صورت گری پر قادر ہے، ایک بے نہایت گنجینہ ہے جس کے علاوہ فطرت نے اسے انتخاب کا لازوال و بے خطا ذوق بھی عطا کیا ہے۔ چنانچہ اس نظم کی مرصع کاری کے لئے اس نے، اس ودیعے سے بیش از بیش مدد لی ہے اور اپنے بے حساب خزانے سے بہترین جواہر منتخب کر کے، صورت و معنی کی حیرت ناک طلسم بندی کی ہے۔ لفظوں کی ترتیب، ان کا توازن، ان کا ترنم، سارا اہتمام لاجواب و بے نظیر ہے۔ بحر کی موسیقیت ان محاسن پر مستزاد اور اپنی جگہ خود ایک لذت و مسرت ہے۔ پوری نظم اول سے آخر تک، انیسویں صدی کی ڈیرے دار بیسوا کی ہو بہو تصویر اور اس کے کردار کا سچا مرقع ہے۔ جس طرح چارلس کنگسلے (۱۸۱۹-۱۸۷۶) نے اپنی مشہور تصنیف ہائیپیشیا میں فریجا کے وجود اور اناطول فرانس (۱۸۴۴-۱۹۲۴) نے طاعس کے لباس میں مصر کی ماقبل و مابعد مسیح سوسائٹی کی طوائف کا کردار پیش کیا ہے،

اسی طرح نظیر نے اس نظم میں پری کے نام سے انیسویں صدی کی ڈیرے دار (طوائف) کے لباس، معاشرت اور کردار کی مصوری کی ہے۔ تاریخی اعتبار سے نظیر پہلے کا قدر سے معاصر اور دوسرے کا متقدم ہے۔ نظم کا مفاد صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ پری کے پردے میں، عورت کی فطرت کے بہت سے رموز بے نقاب کئے ہیں۔ نسوانی نفسیات کی مرقع کشی، اس دقت نظر کے ساتھ کی ہے کہ جگہ جگہ واقعیت کے ساتھ محاکات کا بھی پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ مصوری میں اتنی وضاحت و جامعیت ہے کہ حسن و شباب کی صوری آرائش و زیبائش اور دلستانی کے معنوی اسباب و ذرائع کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی نظر انداز نہیں ہوئی۔ عورت کے ناز و غمزے، عشوے اور کرشمے کے بیان کے ساتھ، عہد کے زنانہ فیشن، لباس اور زیوروں کا بھی مکمل جائزہ لیا ہے۔ انیسویں صدی کی ایک پرجمال نازنین، اپنے بھرپور شباب، اپنے قاتل الڑھپن اور دلربائی کے سارے فنون و لوازم سے آراستہ پیراستہ ہو کر، اس طرح سامنے آکھڑی ہوتی ہے کہ یکایک آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور بے اختیار دل پر بجلی سی گر پڑتی ہے۔ فیشن کی تبدیلی کے ساتھ، بہت سے پرانے زیور اور کپڑے موقت سماج کی مجبوری نے ترک کر دئے ہیں لیکن ان کے نام اور ان کی لفظی تصویریں اس نظم میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔ یہی حال اداؤں اور دل لبھانے کے بہت سے طریقوں کا بھی ہے۔ چنانچہ، اپنے حدود کے اندر، یہ نظم لباس اور زیوروں کے ناموں کی ایک قاموس اور عشوہ گری کے مرقعوں کی ایک البم ہے، جو معاشرت کی تاریخ کے ایک باب کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان محاسن سے بالاتر، صفت اور اسم صفت کا جیسا نادر و بدیع استعمال، اس نظم میں میسر آتا ہے وہ اردو ادب کا ایک لسانی اعجوبہ ہے۔ ملٹن کی طرح نظیر کو بھی دو صفتیں استعمال کرنے کا بڑا شوق ہے۔ چنانچہ، اس نظم کے مصرعے مصرعے میں ایک اسم کے لئے دو دو صفتیں نظر آتی ہیں۔ پہلے بند کے پانچوں مصرعوں اور پھر ہر بند کے پانچویں مصرعے میں، اسم صفت بہ طور قافیہ استعمال ہوا ہے اور لفظی حیثیت سے ہر محل پر نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ معنوی اعتبار سے، پانچواں مصرعہ، کیفیات و تاثرات کا نقطۂ عروج ہے جس کی بنیاد

لطافت و موسیقیت پر قائم ہے۔ اس نظم میں نظیر کے تصور کی نزاکت و شگفتگی نے، الہامی و ماورائی قوت کا مظاہرہ کیا ہے جو اس کے عظیم الشان فطن ہونے کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ نظم کا پہلا بند یہ ہے:۔

خوں ریز کرشمہ، ناز ستم، غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہے ۔۔۔ مژگاں کی سناں، نظروں کی انی، ابرو کی کھنچاوٹ ویسی ہے
عیار نظر، مکار ادا، تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہے ۔۔۔ قتال نگہ اور دشت غضب، آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہے
پلکوں کی جھپک، پتلی کی پھرت، سرمے کی گھلاوٹ ویسی ہے

اس بند میں تشبیہوں کے اہتمام نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ محبوبیت و عشوہ گری کے سارے لوازم کو، ایک نوع کی چیزوں سے تشبیہ دے کر، شاعر نے اپنی صناعانہ عظمت ظاہر کی ہے۔ تیسرے مصرعے میں "نگہ" کو "قتال" کہہ کر اس کی، بار بار قتل کرنے کی عادت بتائی ہے۔ یہ استعمال نظیر کی اختراع ذائقہ ہے لیکن غمزوں کی جھکاوٹ، ابرو کی کھنچاوٹ، تیوری کی چڑھاوٹ، آنکھوں کی لگاوٹ، پلکوں کی جھپک، پتلی کی پھرت، سرمے کی گھلاوٹ جیسے جملوں کی وضع و تراش اور ان میں اسم صفت کا نادر و پُر مغز استعمال، غائر پیکری و نفسی مطالعے کی شہادت اور نظیر کے حصے کی جدت طرازی ہے۔ ان جملوں میں دُنیائے معانی پنہاں ہے اور ان لفظوں کا یہ استعمال اردو میں کہیں میسر نہیں آتا۔ دوسرا بند ملاحظہ ہو:۔

جو کافر اس کا عالم ہے، وہ عالم حور کہاں پاوے ۔۔۔ گر پردہ مُنہ سے دور کرے، خورشید کو چکر آجاوے
جب ایسا حسن بُھبُھوکا ہو، دل تاب بھلا پھر کیا لاوے ۔۔۔ وہ مکھڑا چاند کا ٹکڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے
گالوں کی دمک، خوبی کی چمک، رنگوں کی گھلاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں "کافر" پہلی مرتبہ استعمال ہوا ہے اور آگے کے بندوں میں، مختلف تنوعات کے ساتھ بار بار سامنے آتا ہے۔ اس مصرعے میں "عالم" کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ، اس ایک لفظ میں، دلربائی کی وہ پوری کیفیت سمو دی ہے جو حسن، شباب، آرائش اور ناز و غمزے کے مجموعی اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "ایک نور صورت، ہزار نور کپڑا، لاکھ نور نخرا"۔ یہاں "عالم" کی معنویت وہمہ گیری صورت

آرائش اور دلستانی کے فنوں کی مجموعی کیفیت کو محیط ہے۔ دوسرے مصرعے میں "پردے" سے گھونگٹ مراد ہے۔ اس عہد کا یہ فیشن تھا کہ ہر عورت خواہ کسی طبقے کی ہو، قدرے قلیل گھونگٹ ضرور نکالتی تھی۔ اس نوع کا گھونگٹ اصطلاح میں کاناگھونگٹ کہلاتا ہے۔ یہ عوائد کا جزو اعظم تو تھا ہی لیکن اس سے عورت کی جاذبیت بہ مدارج بڑھ جاتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں 'پردے' کی جگہ نظیر نے گھونگٹ ہی استعمال کیا ہو اور کتابت کی حرفت سے بدل کر 'پردہ' ہو گیا ہو۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں "حسن" کے لئے "بھبھوکا" اور مکھڑے کے لئے "چاند کا ٹکڑا" کیسی ہو بہو، مفصل اور تام تشبیہیں ہیں۔ میں اپنی پسند کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتا، لیکن مجھے "چاند" کی جگہ "چاند کا ٹکڑا" کہنے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ پانچویں مصرعے میں "گالوں کی دمک"، "خوبی کی جھمک"، "رنگوں کی کھلاوٹ"، بڑے پُر مغز جملے اور بڑا پاکیزہ بیان ہے۔ گالوں کے لئے دمک اور رنگوں کے لئے کھلاوٹ کا انتخاب ایک دقیقہ رس مصور سے ممکن ہے لیکن "دمک" اور "کھلاوٹ" جیسی دو کیفیتوں میں خود امتیاز کرنا اور دوسروں کے پیش نظر کر دینا صرف نظیر کی نظر اور قوت بیان کا حصہ ہے۔ "خوبی کی جھمک" بھی اپنی جگہ نہایت نادر و بدیع ہے۔ تیسرا بند ملاحظہ ہو:۔

تھی زور ادا سے سر اوپر سنجاف دوپٹے کی اُلٹی — بلدار لٹیں، تصویر جبیں، جکڑی مینڈیں، نیچی کنگھی
دل پیچ نہ کھاوے اب کیونکر اور دیکھ نہ اُلجھے کیونکر جی — وہ رات اندھیری بالوں کی، وہ مانگ چمکتی بجلی سی
زلفوں کی کھلت، پٹی کی جمت، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں "زور" نظیر کا خاص لفظ ہے جسے وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ خوب، بڑے، عجیب وغیرہ وغیرہ الفاظ کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ یہاں زور عجیب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ دوپٹے کی سنجاف سر پر جس ادا سے اُلٹی ہوئی تھی، اُس کا کوئی نام ہی نہیں ہے۔ دوپٹے کی سنجاف اُلٹ کر یہاں شاعر نے بڑی مصوری کی ہے۔ بقیہ چار مصرعوں میں ربط و تسلسل صرف اس اشارے سے پیدا کیا ہے۔ سنجاف اُلٹنے سے سر کھل گیا ہے اور بل دار لٹیں، تصویر جیسی جبیں، جکڑی مینڈیں اور نیچی کنگھی

نمایاں ہوگئی ہے۔ کنپٹی کے چھتر سے بال زلف کہلاتے ہیں۔ اس بند میں نظیر نے زلف کی جگہ ہندی لفظ لٹ استعمال کیا ہے جو بلدار کے ساتھ ترکیب پاکر، اس سیاق میں زلف سے زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے۔ بل دار زلفیں اگر کہا جاتا تو بل دار لٹوں سے زیادہ حسین نہ ہوتا۔ انیسویں صدی اور بیسویں کے پہلے ربع تک مینڈیں گوندھنے کا رواج تھا۔ سنگھار کے وقت کنپٹی کے بال تو آزاد چھوڑ دیے جاتے تھے اور کانوں کے پیچھے کے کچھ بال گوندھ کر، باریک چٹیاں بنالی جاتی تھیں جو سر کے دونوں پہلوؤں پر سے گزر کر، چوٹی کے ساتھ گندھ جاتی تھیں۔ اس نوع کی گندھاوٹ کا نام مینڈیں تھا۔ جکڑی مینڈیں سے، یہاں کسی ہوئی مینڈیں مراد ہے۔ جبیں کو تصویر کہنا بھی بڑا پاکیزہ استعارہ ہے۔ مینڈیں گوندھنے کی طرح، اس عہد میں پٹی جھکانے کا بھی رواج تھا۔ مانگ کے دو طرفہ، پیشانی پر بال جھکا کر، اس طرح جمائے جاتے تھے کہ ماتھے پر، ابروؤں کے مقابل دو ہلالی شکلیں بن جاتی تھیں۔ اس کو پٹی جھکانا کہا جاتا ہے اور اسی کا نام نیچی کنگھی بھی تھا۔ تیسرے مصرعے میں بلدار لٹوں اور نیچی کنگھی کا قلب پر اثر دکھایا ہے۔ چوتھے مصرعے میں نیچی کنگھی یعنی جھکی ہوئی پٹی کو معناً اندھیری رات کے جھکاؤ سے مشابہ کیا ہے اور استعارہ بالکنایہ سے یہ لطیف پہلو پیدا کیا ہے۔ چمکتی بجلی سے مانگ کی تشبیہ بھی نہایت نادر ہے اور "سی" کے اضافے سے حسنِ بیان کا حق ادا کیا ہے۔ پانچویں مصرعے میں زلفوں کی ظلمت سے بلدار لٹوں، پٹی کی جمت سے نیچی کنگھی اور چوٹی کی گندھاوٹ سے جکڑی مینڈوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس اشارے سے، اس بند کا معنوی تسلسل اور مصورانہ کیف و اثر بہت بڑھ گیا ہے۔ اسمائے صفت کے بدیع استعمال کا جو التزام پہلے بند کے قافیوں سے شروع ہوا ہے، وہ اس بند میں بھی موجود ہے اور پوری نظم میں قائم ہے۔ اب چوتھا بند ملاحظہ ہو :-

بے درد، ستم گر، بے پرواہ، چنچل، بے کل، چٹکیلی سی
دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
ڈوروں کی بان رنگیلی سی، کاجل کی آن کٹیلی سی
وہ آنکھیں مست نشیلی سی، کچھ کالی سی پیلی سی
چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے دو مصرعوں میں پری کے کردار کے چند بیش بہا افادہ اور نمایاں اجزا پیش کئے ہیں۔ تیسرے میں جسمانی آرائش کا کچھ بیان ہے اور چوتھے اور پانچویں میں حسنِ صورت کے دلبرانہ عنوانات کی تفصیل ہے۔ پہلے مصرعے میں صوری اعتبار سے بائے موحدہ اور جیم فارسی کا مخلوط الیٹریشن (تواتر حروف) اور چنچل اور چٹکیلی جیسے لفظوں کا انتخاب اور حسنِ استعمال قابلِ داد ہے۔ تیسرا مصرعہ خصوصیت سے بڑا مصورانہ ہے۔ ڈوروں سے آنکھوں کے لال لال ڈورے مراد ہیں۔ ڈوروں کی صفت بان اور بان کی صفت رنگیلی ہے۔ اسی طرح کاجل کی صفت آن اور آن کی صفت کٹیلی ہے۔ بان کے مقابلے پر آن اور رنگیلی کے مقابلے پر کٹیلی لانا قادر الکلامی اور مصوری کے کمال کا ثبوت ہے۔ چوتھے مصرعے میں آنکھوں کی تعریف میں بھی ایسی ہی مصوری اور ایسے ہی متوازن الفاظ سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ ''سی'' کے استعمال نے اس پورے بند میں بڑی معنویت پیدا کر دی ہے۔ چار مصرعوں میں ''سی'' ردیف کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے درمیان میں بھی ''سا'' اور ''سی'' کے وجود نے ایسی ہی لذت پیدا کر دی ہے۔ الفاظ نظیر کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ پانچویں مصرعے میں چتون کے سلئے دغا کہنے کے بعد نظروں کے لئے کپٹ تلاش کر لینا قوت انتخاب و جویائی کا کارنامہ ہے۔ ''سینوں کی لڑاوٹ'' بالکل نیا اور انوکھا اندازِ بیان ہے اور نظیر کے اولیات میں سے ہے۔ اس سے شباب کے جارحانہ عالم کی عکاسی کی ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا مترادف ''ایگریسولی یوتھ فل'' موجود ہے مگر اردو میں اس کے وضع کرنے کا شرف نظیر کو حاصل ہے۔ اب پانچواں بند ملاحظہ ہو:۔

اس کافر بینی اور نتھ کے انداز قیامت شان بھرے — اور گھر سے چاند زنخداں میں سو آفت کے طوفان بھرے
وہ نخے صاف ستارہ سے اور موتی سے داماں بھرے — وہ کان نرے طوفان بھرے، کن پھولوں کے بالے جان بھرے

بندوں کی ہلت جھمکوں کی جھمکت، بالے کی ہلاوٹ ویسی ہے

اس بند میں ناک اور کان کے حسن اور ان کے زیوروں کی دلکشی کا ذکر ہے۔ ملٹن نے اپنے کلام میں جا بجا دو

صفتیں اس طور پر استعمال کی ہیں کہ ایک اسم سے پہلے آتی ہے اور دوسری بعد کو۔ اسی طرح نظیر کو بھی کئی کئی صفتیں استعمال کرنے کا شوق ہے اور اس نظم میں یہ التزام ہر بند میں موجود ہے۔ اس بند کے پہلے مصرعے میں، پہلے تو بینی اور نتھ کو کافر کہا ہے اور پھر ان کے انداز کو "قیامت" اور "شان بھرے" کہا ہے۔ "قیامت شان" کو اگر "ستم ظریف" کی قسم کی ترکیب سمجھا جائے تو معنی میں دوسری قسم کی ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ناک میں نتھ پہننے کا رواج، ہندی عوائد تزئین کا ایک اہم جزو ہے۔ اس لئے اس کو کافر کا لقب دینا، بڑا دلکش انداز بیان ہے۔ اس نظم میں جس عہد کا کردار پیش کیا گیا ہے، اس میں نتھ کا رواج عام تھا اور یہ زیور سہاگ کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہاں نتھ کو نتھنی سے ممیز کرنے کی ضرورت ہے۔ نتھنی کنواری لڑکیوں اور نتھ بیاہی عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔ دوسرے مصرعے میں، زنخداں کو چاہ کہا ہے جو اردو شاعری کا ایک عامتہ الورود استعارہ ہے لیکن اس کو "گہرا" اور سو آفت کے طوفان سے بھرا بتا کر، اپنے مخصوص انداز بیان کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ یہ بند چہرے کے بعض خاص اجزا کے حسن کی تعریف کے لئے مخصوص ہے، اس لئے زنخداں کا ذکر ہے، لیکن زنخداں چونکہ نتھ کے پس منظر کے طور پر بھی سامنے آتی ہے، اس لئے بھی اس کا ذکر ضروری تھا۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں کان کی لو اور کان کے زیوروں کا ذکر ہے۔ کانوں کی آرائش کن پھولوں سے کی ہے اور کن پھولوں میں بالے پڑے ہیں۔ یہ سب چیزیں گول ہوتی ہیں اور ہمیشہ کم و بیش جنبش کرتی رہتی ہیں۔ ان کی گولائی اور جنبش سے ذہن، چکر کی طرف منتقل ہوتا ہے اور چکر، طوفان کا لازمہ ہے۔ اس نسبت سے کان کو طوفان بھرا کہا ہے۔ استعارہ بالکنایہ کی یہ ایک نہایت لطیف و نازک مثال ہے جس کی بنا پر نظیر کو اعلیٰ فن کار تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ پانچواں بند بتاتا ہے کہ کن پھولوں اور بالوں کے علاوہ کانوں میں بُندے اور جھمکے بھی ہیں۔ چنانچہ بندوں، جھمکوں اور بالوں کی دلربائی کا طریقہ الگ الگ اسم صفت سے ظاہر کیا ہے۔ بُندوں کے لئے ہلت، جُھمکوں کے لئے جھمکت اور بالے کے لئے ہلاوٹ کہہ کر ان کے مخصوص انداز دلربائی کی مصوری کی ہے۔ الفاظ کی اس نوع کی فطرت شناسی، مصوری کے علاوہ، لسانی

بصیرت کا بھی معجزہ ہے۔ اب چھٹا بند ملاحظہ ہو:۔

چہرے پہ حسن کی گرمی سے ہر آن جھمکتے موتی سے
خوش رنگ پسینے کی بوندیں سو بار جھلکتے موتی سے
ہنسنے کی ادائیں پھول جھڑیں باتوں میں ٹپکتے موتی سے
وہ پتلے پتلے ہونٹ غضب، وہ دانت چمکتے موتی سے
پاؤں کی رنگاوٹ قہر ستم، دھڑیوں کی جماوٹ ویسی ہے

یہ بند نظیر کی خلاقانہ قدرت کا شاہکار ہے۔ حسن کی گرمی حسن کی شدت و فراوانی سے ہے اور چہرے پر پسینے کی بوندیں حسن کی گرمی نے پیدا کی ہیں۔ پسینے کی بوندیں گول اور چمکیلی ہوتی ہیں اس لئے موتی کی طرح جھمک رہی ہیں۔ یہ بوندیں پری کے چہرے کے پسینے کی بوندیں ہیں، اس لئے خوش رنگ ہیں اور ایک بار کی جگہ سو سو بار جھلک رہی ہیں۔ اس بند میں اگرچہ قوس قزح کا کہیں ذکر نہیں ہے مگر خوش رنگ پسینے کے موتیوں کی جھلک سے میرا ذہن خواہ مخواہ اس طرف منتقل ہوتا ہے۔ ہنسنے میں پھول جھڑنا، باتوں میں موتی ٹپکنا، ہونٹوں کا پتلاپن اور دانتوں کا موتی کی طرح چمکنا سب حسنِ صورت کے نہایت پاکیزہ اور دلفریب لوازم ہیں جن سے پری کے حسن کی شگفتگی و دل پذیری کی تصویر نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ پانچویں مصرعے میں پاؤں کی مہندی کو بجا طور پر قہر و ستم بتایا ہے۔ بیسویں صدی کے اول ربع تک ہونٹوں پر مسی کی دھڑی جمانے کا فیشن تھا۔ مسی کی سیاہی پان کی سرخی سے مل جل کر ہونٹوں پر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتی تھی جو قلب و نظر کو بہت متاثر کرتی تھی۔ اس کو لاکھا جمانا بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی ساری کیفیت، جماوٹ سے ظاہر کی ہے۔ اب ساتواں بند ملاحظہ ہو:۔

تقریر بیاں سے باہر ہے وہ کافر حسن اہا ہا ہا
کچھ آپ نئی، کچھ حسن نیا، کچھ جوشش جوانی کا ادما
لٹکیں، جھمکیں ان باہوں کی یا رو میں واہ کہوں کیا کیا
وہ بانکے بازو ہوش ربا، عاشق سے کھیلیں بانک پٹا
پہنچی کی پہنچ پھونچے پہ غضب، بانکوں کی بندھاوٹ ویسی ہے

اس بند میں حسن اور شباب کی مدح سرائی ہے۔ اٹھتی جوانی کا عالم ہے اور حسن میں شگفتگی ہے۔ پہلے مصرعے

میں "اہاہاہا" کے فجائیہ استعمال سے، قلب پر، حُسن اور شباب کا متحدہ اثر دکھایا ہے۔ دوسرے مصرعے میں "آپ نئی" سے جوانی کے اٹھان اور الڑھ پن کی طرف اشارہ ہے۔ "حسن نیا" سے تازگی و شگفتگی مراد ہے۔ ان دونوں جملوں کے ساتھ "کچھ" نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔ "اومکا" کے معنی میں تحقیق نہ کر سکا مگر قرینے سے "چھا جانا" معلوم ہوتے ہیں یعنی جوانی کا جوش چھایا ہوا تھا۔ تیسرے مصرعے میں جوانی کے جوش کے اثر و اقتضا کی مصوری کی ہے۔ باہوں کی لپک جھپک، طبیعت کی شوخی، چلبلے اور نچلے پن سے پیدا ہے۔ تیزی و طراری کے لئے لپک جھپک کا انتخاب نہایت موزوں ہے اور باہوں کی حسین اضطراری حرکات کی سچی مصوری ہے۔ "لپک جھپک" کے لفظ کو اپنی حرکت سے کچھ ایسی صوتی مناسبت ہے کہ اس کا تلفظ اپنے متلازم فعل کی خود بخود صورت گری کرنے لگتا ہے۔ ایسے الفاظ بروئے کار آنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان پر عُسرت و تہی مائیگی کا الزام بے بنیاد ہے۔ یہ زبان نوع بہ نوع تصورات و مفاہیم سے مالامال ہے اور کسی قسم کے اظہار و بیان سے عاجز و قاصر نہیں۔ تلاش و نظر کی شرط سے ہر قسم کا لفظ اور انداز بیان میسر آ سکتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں، نظیر نے پہلے لپک جھپک کی مصوری کی ہے اور پھر خود ہی "واہ" کہہ کر اس کی داد بھی دی ہے۔ چوتھا مصرعہ اعلیٰ شاعری اور اعلیٰ مصوری کی جان ہے۔ پری کی اُٹھتی جوانی ہے۔ اس کے بازو بھرے بھرے، جوش شباب سے صحت ور، تنومند اور گول گول ہیں۔ صحت وری عورت کا بڑا حسن ہے اور بعض کے نزدیک عین حُسن ہے۔ بانکا اس زمانے کا فیشن ایبل سا ہی تھا، اس لئے حسین اور تیکھی چیزوں کا بانکے سے استعارہ کیا جاتا تھا۔ نظیر نے بھی، پری کے بازوؤں کی صحت وری اور تنومندی کا بانکے سے استعارہ کیا ہے اسم کے دائیں بائیں، دو صفت لانے کا التزام و اہتمام یہاں بھی موجود ہے۔ بازو بانکے بھی ہیں اور ہوش ربا بھی ہیں۔ اپنے سڈول پن کے حسن اور اپنی صحت وری کے گداز دونوں سے ہوش ربائی کرتے ہیں۔ یہ تو ان کا ہر نظارگی کے ساتھ عام سلوک ہے لیکن عاشق سے بانک پٹا کھیلتے ہیں گویا جم کر برابر کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پانچویں مصرعے میں، پہنچی کی تقدیر کی رسائی پر بالکنایہ رشک کیا ہے۔

غضب کہہ کر، رشک و تحسین دونوں جذبوں کو ایک بیان میں سمویا ہے۔ اس مصرعے کا آخری ٹکڑا "بانکوں کی بندھاوٹ ویسی ہے" نظیر کے حصے کا مشاہدہ اور بیان ہے۔ ذوقِ حسن نگر کا یہ انتہائی کمال ہے کہ اُسے "بندھاوٹ" میں بھی حسن نظر آئے۔ نظیر کی حسن پرستی کا یہ نقطۂ عروج ہے کہ اُسے پری کے بازو پر بانک کی بندھاوٹ بھی ایک منفرد جمال، نظر آتی ہے۔ بانکے، بانک پٹا اور بانک میں جو تجنیس ہے وہ لطف بالائے لطف ہے اور چوتھے پانچویں مصرعوں میں بائے موحدہ اور بائے فارسی کا جو ایلٹریشن (تواترِ حروف) ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ اب آٹھواں بند ملاحظہ ہو:۔

وہ گورے گورے ہاتھ غضب وہ نرم کلائی ناز بھری
کچھ شوخ کڑوں کی جھنکاریں کچھ جھنکے چوڑی باہوں کی
یہ عالم دیکھ کے عاشق کا سینے میں نہ تڑپے کیونکر جی
وہ پیاری پیاری انگشتیں وہ پوریں نازک نازک سی
مہندی کی رنگت، فندق کی بنت چھلوں کی چھلاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں گورے گورے سے، صرف ہاتھوں کی فطری سادگی اور ستھراپن دکھایا ہے۔ پھر کلائی کو دو صفتوں سے موصوف کر کے، نرم اور ناز بھرا کہا ہے۔ یہاں پھر نظیر نے اپنی رمز شناسی اور زبان دانی کا ثبوت دیا ہے۔ کلائی بازو کے مقابلے میں نازک تر عضوِ بدن ہے اور عورت کی کلائی مخصوصیت سے، اپنی نزاکت کے لئے ضرب المثل ہے۔ ہاتھ کا حُسن یہ ہے کہ وہ بھری بھری اور تنومند ہو۔ کلائی کا کمال یہ ہے کہ وہ پتلی اور نازک ہو۔ دوسرے مصرعے میں کڑوں کے لئے جھنکار اور چوڑی کے لئے جھنک کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ان الفاظ کا صوتی فرق، فوراً جلبِ توجہ کرتا ہے۔ چوڑی کڑے کے مقابلے میں نازک زیور ہے اس لئے اس کی آواز، کڑے کی آواز سے زیادہ نرم اور شیریں ہے۔ جھنکار اور جھنک کا صوتی فرق سمجھنے والے، شاعر کی قوتِ امتیاز کی نزاکت کی داد دے سکتے ہیں۔ تیسرا مصرعہ خالص شاعرانہ ہے اور چوتھے میں انگلیوں اور پوروں کے حسن و محبوبیت کی تعریف کی ہے۔ پانچویں مصرعے کو چوتھے سے خاص ربط ہے۔ مہندی کی رنگت سے مراد یہ ہے کہ تلووں اور انگلیوں میں مہندی رچی ہوئی ہے۔ فندق، حنا بستہ سر انگشت کو کہتے ہیں۔

اس جزو کا ذکر علیحدہ کر کے یہ بتایا ہے کہ پور کا حُسن، انگلی کے حسن پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس فوقیت کی وجہ یہ ہے کہ پور پر چھلّے کی موجودگی نے، خاص جمال پیدا کر دیا ہے جو "بنت" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ پرانی آرائش میں انگلیوں کے پور پور پر چھلّا پہنا جاتا تھا۔ اس مصرعے میں نظیرؔ نے لسانی اجتہاد کیا ہے اور لفظ گر (نیولوجسٹ) کی سچی خدمت بڑی قدرت کے ساتھ انجام دی ہے۔ چھلّے سے چھلاوٹ اسم صفت بنا کر، اس نے چھلّے کی دلکشی کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وضع کر دیا ہے جو اصطلاح کے طور پر بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

اب نواں بند ملاحظہ ہو:۔

کچھ ناز و ادا کی مغروری، کچھ جور و جفا کا بانک پنا
کچھ آمدِ حُسن کے موسم کی، کچھ کافر جسم رہا گدرا
یہ شورِ جوانی اُٹھتی کا آتا ہے امنڈ کر جوں دریا
وہ سینہ اُبھرا جوش بھرا وہ حُسن کا عالم جھوم رہا
شانوں کی اکڑ، گردن کی تمرّت، مونڈھوں کی کھنچاوٹ دیسی ہے

اس بند کا لطف و کیف اپنی جگہ نرالا ہے۔ اس میں شباب اور لوازمِ شباب کی مصوری کی گئی ہے۔ پہلے مصرعے میں مغروری کا لفظ نمائش کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور "بانک پنا" تیکھے پن کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ شباب کی آمد کے وقت، خود نمائی کا جذبہ، عورت میں بہ شدت کار فرما ہوتا ہے اور اس نمائش میں ایک قسم کا تیکھا پن پیدا کر دیتا ہے جو نظارگی کے لئے اس عالم کو ناقابلِ برداشت بنا دیتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس عالم کو ایگریسو اور فارسی محاورے میں گلوسوز کہتے ہیں۔ دوسرے مصرعے میں "آمد" رسیدگی اور "حسن کا موسم" جوانی کا مترادف ہے۔ یہاں موسم کا استعمال لاجواب اور قابلِ داد ہے۔ چونکہ عنفوانِ شباب ہے، اس لئے جسم میں گدراہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ گدراہٹ کا مفہوم کسی شرح و وضاحت کا محتاج نہیں ہے لیکن جو جسم گدرا رہا ہو اسی کی صفت میں کافر لانا مشاہدے، محل شناسی اور مصوری کا انتہائی کمال ہے۔ گدراہٹ کے ساتھ جسم میں جو بھرا بھرا پن اور اعضا میں جو گولائی، تناسب اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے، وہ صنمیت کا لازمہ ہے۔ اس لئے اگر گوشت پوست کے جیتے جاگتے صنم کو، جو ایمان فریب و ہوش ربا ہو، کے اعتبار سے کفرِ مجسم ہے،

کافر کہا جائے تو اس کی ستایش میں مبالغہ نہ ہوا۔ تیسرے مصرعے میں "شور" کے انتخاب سے بڑی شاعرانہ قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ جوانی کے لئے "شور" کے استعمال سے، جوانی کی عالم آشوبی کا اعلان کیا ہے۔ جسمانی کیفیت یا عالم کے لئے، لفظ منتخب کرنے کے سلیقے کا ثبوت اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ جوانی کے جوش، اس کی بیباکی، اس کی بلند آہنگی کے مظاہرے کے لئے "شور" سے بہتر لفظ میسر نہیں آ سکتا تھا۔ اسی مصرعے میں اٹھتی جوانی کے شور کو امنڈ کر آنے والے دریا سے تشبیہ دی ہے جو تصوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ ہندی زبان کے کسی شاعر نے جوش شباب کو بھنور سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے:-

جیسے بھنور پڑے ندیا میں　　جوبن نائے ڈٹے انگیا میں

مگر یہ تشبیہ نظیر کی تشبیہ سے زیادہ جامع اور مکمل نہیں ہے۔ اس سے جوانی "پھٹی پڑنے" کا مفہوم تو پورا پورا ادا ہو جاتا ہے لیکن جوانی کے دوسرے لوازم و مفاہیم تشنہ رہ جاتے ہیں۔ دریا امنڈ کر آنا، خود ایک محاورہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ تشبیہ کے سلسلے میں ایک محاورے کا لطیف استعمال بھی پیش کر دیا ہے۔ چوتھے مصرعے کا پہلا حصہ، تیسرے مصرعے کی شرح و وضاحت کرتا ہے۔ اسی مصرعے کے آخر میں، "عالم جھوم رہا" لکھ کر یہ دکھایا ہے کہ حسن و شباب آپ اپنے نشے میں سرشار رہتے ہیں۔ یہاں تصویر کا تکملہ ہو جاتا ہے۔ پانچویں مصرعے میں حسن صورت کی مزید تفصیل دی ہے۔ اکڑ، تناؤ کے معنی میں ہے اور مڑت خم گردن کا مفہوم ادا کرتی ہے۔ یہ خم، وہ خم ہے جو گردن کو صراحی دار بنا کر مینا کا ہم شکل کر دیتا ہے۔ مونڈھوں کی کھنچاوٹ کے معنی گداز و تناؤ کے ہیں جو ایک صحت و ربدن کے حسن کے اہم اجزا ہیں۔ اب دسواں بند ملاحظہ ہو:-

یہ کافر گدی کا عالم گھبرائے پری بھی دیکھ جسے　　اور گورا صاف گلا ایسا، بہہ جاوے موتی دیکھ جسے
وہ گردن اونچی حسن بھری، کٹ جائے صراحی دیکھ جسے　　دل لوٹے تڑپے ہاتھ ملے اور غش کھاوے جی دیکھ جسے
دائیں کی مڑت، بائیں کی پھرت، کندھوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں، نہایت لطیف کنائے سے، گُدّی کی سفیدی کو پری کا ہمرنگ بتایا ہے۔ پانی پانی ہونا شرمندگی کے موقعے پر بولا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں گورے صاف گلے کی چمک کو موتی کی دمک سے تشبیہ دی ہے لیکن موتی، اس کے مقابلے میں، اپنے کو اتنا حقیر سمجھتا ہے کہ شرم سے پانی پانی ہوکر بہا جارہا ہے۔ تیسرے مصرعے میں عاشق کے قلب کی کیفیت ظاہر کی ہے۔ چوتھے میں اونچی، حسن بھری گردن کو صراحی سے مشابہ کیا ہے۔ صراحی سے، گردن کی تشبیہ، اگرچہ عامتہ الورود ہے لیکن، اس سے بہتر میسر بھی نہیں آتی۔ نظیر نے اس کی عمومیت کو اپنے انداز بیان سے زائل کیا ہے۔ پانچویں مصرعے کے قافیے میں، کتابت کی تحریف معلوم ہوتی ہے۔ قلمی نسخے اور شہباز ایڈیشن دونوں میں یہ مصرع ایک ہی طرح ہے، پھر بھی میرا خیال یہ ہے کہ یہاں "مونڈھوں" کی جگہ "کولھوں" ہونا چاہیے۔ مونڈھا، کندھے کو کہتے ہیں اور کولھا، چوتڑ کے اوپر کے حصّے کا نام ہے۔ اس مصرعے میں، دائیں اور بائیں کے ساتھ، مونڈھوں کے مقابلے میں کولھوں زیادہ قرین سیاق ہے۔ چنانچہ اس مصرعے میں چوتڑوں کی منضبط جنبش اور کولھوں کے بھاری پن کا بیان ہے۔ کولھوں کا گداز، عورت کی صحت کی علامت ہے اور پیکرِ حسن کا خاص جزو سمجھا جاتا ہے۔ اب گیارھواں بند ملاحظہ ہو:۔

اس سینے کا وہ چاک ستم، اس کرتی کا تنزیب غضب　　اس قد کی زینت قہر بلا، اس کافر چھب کا زیب غضب
اُن ڈبیوں کا آزار بُرا، اُن گیندوں کا آسیب غضب　　وہ چھوٹی چھوٹی سخت کچیں، وہ کچے کچے سیب غضب
انگیا کی بھڑک، گوٹوں کی چمک، بندوں کی کساوٹ ویسی ہے

اس بند کے پہلے مصرعے میں، سینے کے چاک سے، کرتی کا گریبان مراد ہے جس میں سے انگیا جھلک رہی ہے۔ نفاست پسند عورتیں ہمیشہ مہین سے مہین کپڑے کی انگیا پہنتی ہیں۔ بعض کپڑے، اس جزو لباس کے لئے مخصوص ہیں۔ ان میں سے ایک تنزیب بھی ہے۔ تنزیب نہایت باریک قسم کی ململ کا نام ہے۔ چاک کو ستم اور تنزیب کو غضب کہہ کر، دونوں مناظر کے اثر میں توازن پیدا کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں قد

کی موزونیت کو تھر بلا بتا کر رعنائی کا مجسمہ بنایا ہے۔ کافر کی طرح "چھب" بھی نظیر کا بڑا محبوب لفظ ہے اور کلام میں جگہ جگہ وارد ہوا ہے۔ چھب کے معنی میرے نزدیک یہاں حسن و شباب کا مجموعی اثر ہے۔ لطیف صاحب کے خیال میں چھب تختی کے معنی انگریزی الفاظ "پروفیل" کے مترادف ہیں۔ یہاں "چھب" کو کافر کہہ کر بیری کی دلربائی کو بہ مدارج بڑھا دیا ہے۔ تیسرے مصرعے میں ڈبیوں اور گیندوں سے پستانوں کا استعارہ کیا ہے اور ان کے کیف و اثر کو ایک جگہ آزار اور دوسری جگہ آسیب کہا ہے۔ آسیب آزار سے شدید تر آفت ہے اور قسم میں بھی اس سے جدا ہے۔ آزار کا تعلق مادیت سے بھی ہے مگر آسیب خالص غیر مادی بلا ہے۔ اس لئے دوسری تشبیہ پہلی کے مقابلے میں نہ صرف نئی ہے بلکہ قوی اور اہم بھی ہے۔ مقیاس الحرارت کے کیف و اثر کو اب تک آسیب سے تشبیہ نہیں دی گئی۔ یہ نظیر کے حصے کی بات ہے۔ چوتھے مصرعے میں تیسرے کی مفصل شرح و وضاحت کی ہے۔ چھوٹی چھوٹی "سخت" اور "کچے کچے" کے استعمال سے مصوری کا حق ادا کیا ہے۔ پانچواں مصرعہ تیسرے اور چوتھے سے لازمی طور پر پیدا ہے۔ پستانوں کی تعریف کے ساتھ انگیا کی ستائش لازمی ہے۔ "بھڑک" انتہائی دلکشی کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انگیا نہایت بھڑک دار ہے۔ عہد کے فیشن کے مطابق اس میں نظر فریب گوٹ بھی لگی ہوئی ہے جو اپنی بھڑک الگ دکھا رہی ہے۔ انگیا کے بند بہت کس کر باندھے گئے ہیں جو جوانی کا اقتضا ہے۔ جوان عورت عادتاً انگیا کے بند بہت کس کر باندھتی ہے۔ تیسرے چوتھے اور پانچویں مصرعوں [illegible] نقطۂ نظر سے مصوری کی گئی ہے۔ اس کا مطالبہ یہی ہے کہ [illegible] تمام و اہتمام کا عروج [illegible] "...اوٹ" سے ظاہر کیا جائے۔ اب بارہواں بند ملاحظہ ہو:-

اس گورے گورے سینے پر وہ گہنے کی گلزار کھلی
چمپے کی کلی، ہیرے کی جڑی، توڑے جگنو ہیکل بدّھی
دل لوٹے تڑپے ہاتھ لگے اور جائے نظر ہر دم پھسلی
وہ پیٹ ملائی سا کافر، وہ ناف چمکتی تارا سی
شوخی کی جھمک [illegible] اور ستم شرموں کی چھپاوٹ ویسی ہے

اس بند میں زیور کا بدن سے تعاون دکھا دیا ہے۔ ہیرے جڑی چمپا کلی، توڑے، جگنو، ہیکل اور بدھی نے مل کر گورے گورے سینے پر ایک باغ کھلا رکھا ہے۔ انواع و اقسام کے زیور ایک چمنستان ہیں اور گورا سینہ اس کا پس منظر ہے۔ اس عالم میں، دل کا لوٹنا، تڑپنا اور بے قابو ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ چوتھے مصرعے میں پیٹ کی ملائی اور ناف کی تارے سے تشبیہ نہایت نادر اور مکمل ہے۔ ملائی جیسی سفید، پاکیزہ، ملائم اور نرم سطح والی چیز سے پیٹ کو اور تارے جیسی گول، چمکیلی اور حسین چیز سے ناف کو تشبیہ دینا، اعلیٰ مصوری ہے۔ ان جمال پاروں سے مس ہو کر، نظارگی کی نگاہ اگر پھسلی جاتی ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ شعر میں، اتنی واقعیت اور مبالغے میں اتنی حقیقت باقی رکھنا نظیر ہی کے بلوغ نظر کا کام ہے۔ نظیر، سچا واقعہ نگار اور حقیقت طراز شاعر ہے، جب وہ مصوری کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو حق ادا کر دیتا ہے۔ کوئی تفصیل، قطع نظر اس سے کہ وہ کسی نوع کی ہو، نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ اس بند کا پانچواں مصرعہ، نظیر کے فنی نقطۂ نظر کا منطقی نتیجہ ہے۔ اب تیرہواں بند ملاحظہ ہو:۔

ہر آن نرالی ہر ایک سے، اس شوخ پری کی محبوبی — کچھ ناز و ادا کی مرغوبی، کچھ شرم و حیا کی محجوبی
اب کھنے کی تعریف کروں، یا کافر جوڑے کی خوبی — پوشاک سنہری عطر بھری، سر پاؤں جواہر میں ڈوبی
جگنوں کی دمک، سینے کی صفا، کرتی کی پھنساوٹ ویسی ہے

یہ بند اپنی خوبی اور دلکشی میں دوسرے بندوں کے برابر ہے۔ پہلے مصرعے میں پری کا جبلی نچلا پن دکھایا ہے۔ محبوبی یہاں عشوہ گری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہر لحظہ، اس سے ایک نہ ایک ایسی ادا ظہور پذیر ہوتی ہے، جو نہ صرف اسی کی پہلی ادا سے مختلف ہے بلکہ اور محبوبوں کی اداؤں سے بھی جدا ہے۔ وہ دلبری کے انداز و طریق میں لحظہ بہ لحظہ تنوع پیدا کرتی رہتی ہے۔ کبھی ناز و ادا سے دل لبھاتی ہے، کبھی شرم و حیا سے قلب کو متاثر کرتی ہے۔ ان دو مصرعوں میں، محبوبی، مرغوبی اور محجوبی تینوں لفظ جن میں دو قافیے ہیں، مغز و مفاہیم سے لبریز ہیں۔ اس بند میں دو گونہ مصوری کا التزام کیا گیا ہے۔ پہلے دو مصرعوں میں حسن صورت

سے جنم لینے والی اور نفسیاتی اداؤں کا ذکر ہے اور آخر کے تین مصرعوں میں جسمانی آرائش اور سنگھار کی دلکشی و دلفریبی کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے مصرعے میں "اب" کا استعمال بہت معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب کسی تعریف کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن اگر گنجائش نکالی بھی جائے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ پہلے گہنے کی تعریف کی جائے یا کافر جوڑے کی خوبی بتائی جائے۔ خوبی کا استعمال بھی نظیر کی زبان میں مخصوص ہے۔ وہ، اس لفظ کو جاذبیت کے مترادف کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں یہ بھی بتایا ہے کہ پری کی آرائشی محبوبیت کا راز گہنے اور جوڑے دونوں کے حسن میں مرکوز ہے مگر قوت انتخاب مجروح ہے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کس کو کس پر فوقیت ہے۔ جوڑا سنہرا ہے اور عطر میں بسا ہوا ہے۔ اس حد تک بسا ہوا ہے کہ عطر میں ڈوبا ہوا کہا جائے تو بجا ہے۔ سر سے پاؤں تک سارا زیور جڑاؤ ہے جس کو پہن کر، پری جواہر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس عہد میں سنہرا جوڑا اور مرصع زیور، خصوصیت کے ساتھ دولتمندوں اور امیرزادیوں کی پوشاک تھا۔ پانچواں مصرعہ حسب معمول، عروج تک رہبری کرتا ہے چمک اور دمک کے مفاہیم میں بیّن فرق ہے۔ گورے سینے میں اگر چمک ہے تو جگنو کو جو خود مرصع بھی ہے اس سے متمیز ہونے کے لئے دمکنا چاہیئے۔ چست لباس ہمیشہ کسی نہ کسی عنوان آرائش کا جزو رہا ہے اور سینے کا لباس ہر قوم و ملت میں، چست ہی پسند کیا جاتا ہے۔ پری کی کرتی اس کے بدن پر خوب چست ہے اور اس کی پھنساوٹ، جو کوشش کر کے پیدا کی گئی ہے، قیامت برپا کر رہی ہے۔ اب چودھواں بند ملاحظہ ہو:۔

وہ کافر دھج، جی دیکھ جسے سو بار قیامت کا لرزے
پازیب، کڑے، پایل، گھنگرو، کڑیاں، چھڑیاں گجرے توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں، ہر ایک قدم پر سو جھمکے
وہ چنچل چال جوانی کی اونچی ایڑی نیچے پنجے
کفشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ولیسی ہے

اس نظم میں "کافر" بار بار استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ نیا لطف رکھتا ہے۔ نظیر کو یہ لفظ اس لئے بہت عزیز ہے کہ فارسی اور اردو زبانوں میں، یہ معشوق کی صنمیت کے اظہار کے لئے بہت موزوں اور بڑے

وسیع مفاہیم کا حامل ہے۔ پہلے مصرعے میں یہ لفظ دھج کی تعریف کرتا ہے۔ دھج یہاں "عالم" یا "سبھاؤ" یا قامت یا انگریزی لفظ بیرنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "کافر دھج" کہہ کر خوش قامتی کی تعریف کی ہے۔ اردو اور فارسی شاعری میں چال کا قیامت سے استعارہ کیا جاتا ہے۔ اس بند میں چونکہ پاؤں، پاؤں کے زیور، جنبش، قدم، چال، ایڑی، پنجے، کفش، ٹھوکر کا ذکر ہے، اس لئے اول ہی سے قیامت کا دل لرز رہا ہے اور سو بار لرزتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں پاؤں کے زیوروں کا ذکر ہے۔ نظیر کو بیان پر یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک قسم کے سارے زیوروں کے نام بے تکان ایک ہی مصرعے میں گنوا دئے ہیں۔ جس طرح پانچویں بند میں کانوں اور ناک کے زیوروں، ساتویں میں بازو اور پہنچے کے زیوروں، اور آٹھویں میں کلائی اور انگلیوں کے زیوروں کا ذکر ہے اسی طرح بارھویں اور چودھویں بندوں کے دوسرے مصرعوں میں گلے اور پاؤں کے زیوروں کا ذکر ہے۔ پاؤں میں انواع و اقسام کے گہنے کی موجودگی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جنبش میں سو جھنکاریں اور ہر قدم پر سو جھمکے پیدا ہوتے ہیں۔ جھمکے سے یہاں کمر کی لچک مراد ہے۔ جوانی کی چال میں مستی اور شوخی فطرتاً موجود ہوتی ہے لیکن پری کی چال میں چنچل پن بھی ہے اور وہ ایڑی اونچی اور پنجے نیچے کر لینے سے پیدا ہوا ہے۔ اونچی ایڑی اور نیچے پنجے کا فیشن بیسویں صدی کی ابتدا میں فرانس میں پیدا ہوا اور عورتوں کی دنیا میں بہت مقبول ہوا۔ چوتھے مصرعے سے ثابت ہے کہ نظیر کو اس نوع کی رفتار کے حسن و دلربائی کا احساس بداہتاً ڈیڑھ صدی پہلے سے تھا۔ ایران اور ہندوستان کے شعرا نے چال کی طرح طرح سے تعریف کی ہے لیکن اس پہلو سے کسی نے روشناس نہیں کرایا۔ جس دلدار کی رفتار کی شوخی و طراری کا یہ عالم ہو کہ زمین پر بہ مشکل پاؤں ٹکائے وہ دامن جھٹک کر الگ ہی الگ رہنا پسند کرتی ہے۔ دامن کی جھٹک سے حسن کی نخوت و تمکنت اور ٹھوکر کی لگاوٹ سے شباب کے پندار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محبوبہ کی ٹھوکر سے 'مردہ زندہ ہو جانا' مشہور بات ہے۔ اب بند ۱۳ وا بند ملاحظہ ہو:۔

قاتل ہر آن نیا عالم، کافر ہر آن نئی جھمکیں　　　بانکی نظریں، ترچھی پلکیں، بھولی صورت، میٹھی باتیں
دل بس کرنے کے لاکھوں ڈھب، جی لینے کی سو گھاتیں　　　ہر آن پھبن، ہر آن سجن، ہر دم میں بدلے لاکھ دھجیں
آنکھوں کی لگاوٹ، قہر ستم، باتوں کی رکھاوٹ ویسی ہے

اس بند میں پری کی نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے۔ پہلے مصرعے میں "عالم" اور "جھمک" کا تقابل ہے۔ ہر لمحہ اس کا حسن ایک نیا روپ بھرتا ہے جو عاشق کو قتل کر دیتا ہے اور ہر لمحہ اس کے پیکر پر ایک نئی صنمیت طاری ہوتی ہے جو ایمان میں خلل ڈال دیتی ہے۔ یہ عشوہ گری وہ اپنی بانکی نظروں، ترچھی پلکوں، بھولی صورت اور میٹھی باتوں سے کرتی رہتی ہے۔ نظیر مغلیہ آرٹ کا سچا پرستار ہے۔ جس طرح مغلوں کو اپنی عمارت میں جواب بنانے کا شوق ہے، اسی طرح نظیر کو اپنے کلام میں مترادفات و متقابلات جمع کرنے کا شوق ہے۔ بانکی نظر کے مقابل ترچھی پلک اور بھولی صورت کے مقابل میٹھی بات لانا، اس کا شعری و لسانی ایمان ہے۔ اس سے اس کی تلاش کی قوت اور انتخاب کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے کے پہلے ٹکڑے کو قاتل اور دوسرے کو کافر سے شروع کیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کو علی الترتیب دوسرے مصرعے کے دونوں ٹکڑوں سے نسبت ہے۔ بانکی نظریں اور ترچھی پلکیں قاتل اور بھولی صورت اور میٹھی باتیں کافر ہیں۔ یہ ہر لمحہ نیا عالم پیدا کر کے قتل کرتی ہیں اور وہ ہر لمحے نئے جھمکوں سے دین و ایمان ہر لیتی ہیں۔ تیسرے مصرعے میں "دل بس کرنے" کے بعد "جی لینے" کہنا نظیر کا حصہ ہے۔ دوسرا شاعر ایسا متوازن جملہ پیدا کرنے سے قاصر رہتا۔ چوتھے مصرعے میں "پھبن" اور "سجن" جیسے مترادف اسمائے صفت کا استعمال لفظی جادوگری کا معجزہ ہے۔ پانچواں مصرعہ ہر بند کی طرح، اس بند میں بھی عروج پیدا کرتا ہے۔ اس مصرعے میں عورت کے کردار کا ایک اہم راز بے نقاب کیا ہے۔ آنکھیں عورت کی فتحمندی کا بڑا کامیاب و مؤثر ذریعہ ہیں۔ سارے وار خالی جانے کے بعد بھی، ان کا وار حتماً نشانے پر پڑتا اور بار ور ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ پری اس

ہتیار کا بھرپور وار نہیں کرتی۔ محض لگاوٹ سے کام لیتی ہے۔ لگاوٹ، نگاہوں کے تبسم کا دوسرا نام ہے۔ یہ تبسم ہی اپنی جگہ قہر و ستم کی اہمیت رکھتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک طرف نگاہوں سے لگاوٹ کرتی ہے اور دوسری طرف باتوں کی رکھائی سے، اس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ سادہ لوح عاشق اقرار انکار کی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے اشاروں پر ناچنے لگتا ہے۔ اب سولھواں بند ملاحظہ ہو:-

تصویر کا عالم نکھ سکھ سے، چھب تختی صاف پری کی سی   کچھ چین جبین کے اینٹھ رہے اور ہونٹوں میں کچھ گالی سی
بیدردی سختی بہتیری اور مہر محبت تھوڑی سی   بھولی عیاری ناک چڑھی، بھولی سیانی، پکی بیسی
ٹھٹھوں کی اڑاوٹ اور غضب قہقہ کی ہنساوٹ ویسی ہے

اس بند میں ڈیرے دار کا نوعی کردار پیش کیا ہے۔ پہلا مصرعہ سنگھار کے بیان سے شروع ہے۔ پری، خوب بن ٹھن کر، نوک پلک سے درست ہو کر دل ستانی پر آمادہ ہے۔ اس کی نکھ سکھ میں تصویر کا عالم ہے۔ جسمانی آرائش بہ تفصیل کے اعتبار سے، تصویر کے حسن کی طرح بے عیب ہے۔ تصویر تکملے کا نمونہ سمجھی جاتی ہے اس لئے تصویر سے تشبیہ دے کر ہر طرح مکمل اور بے عیب دکھانے کی کوشش ہے۔ اس بناؤ سنگھار کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر بالمقابل نظر پڑے تو ایک پیکر تصویر معلوم ہوتی ہے اور اگر پہلو سے دیکھی جائے یعنی چھب تختی (پروفیل) سامنے ہو تو پری نظر آتی ہے۔ اس مصرعے میں، مرئیات کے ایک اہم مسئلے کی حیرت ناک شرح کی گئی ہے۔ مصوری کے فن میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مقابل اور پہلو کی تصویروں میں فرق ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ فرق اتنا نمایاں ہوتا ہے کہ ایک ہی فرد کی دو طرح کی تصویریں، دو الگ الگ آدمیوں کی تصویریں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ نظیر کی اعلیٰ مصورانہ قدرت کا ثبوت ہے کہ اس نے اس نکتے کی مدد سے، پری کی دو رخی تصویر پیش کی ہے۔ بہر عنوان پری اس طرح بن ٹھن کر سامنے آتی ہے کہ جس طرف سے نظر ڈالو ایک نیا عالم نظر آتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ابروؤں پر بل بھی ڈالے

رکھتی ہے تاکہ تیوری چڑھی دیکھ کر کوئی حرف مدعا لب تک نہ لانے پائے۔ اس خشونت کی تصویر دوسرے مصرعے میں پیش کی ہے۔ ابروؤں کے بل سے خفگی و بیزاری ظاہر ہوتی ہے اور ہونٹ بُرا بھلا کہنے پر آمادہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ آخر کے تین مصرعوں میں کردار کی خوب وضاحت کر دی ہے۔ تیسرے میں بتایا ہے کہ بیدردی اور سختی کا عنصر اس میں بہت زیادہ اور مہر و وفا کا بہت کم ہے۔ چوتھے میں بتایا ہے کہ جھوٹی مکاریاں کرتی ہے' رو کھی ہے' خوب سیانی ہے مگر بھولی بنتی ہے اور بے مروتی میں کامل ہے۔ چوتھے مصرعے میں پکی پیسی کا سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ یہ اکبر آباد اور مضافات اکبر آباد کا خاص محاورہ ہے۔ ڈھیٹ اور بے مروت انسان کو پکے پیسے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہاں نظیر نے پکے پیسے سے مؤنث کا صیغہ بنایا ہے۔ اس نواح کے روزمرہ کے کاروبار میں کسی زمانے میں پکا پیسہ چلتا تھا۔ پکے پیسے کی اہمیت یہ تھی کہ اس کے قبول کرنے سے کسی حالت میں انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پکی پیسی سے نظیر نے یہاں یہ مفہوم رکھا ہے کہ وہ اپنی حرفت میں اتنی کامل ہے کہ جس طرح پکا پیسا' رائج الوقت سکے کی حیثیت سے ہر جگہ اور ہر وقت نافذ ہے' اسی طرح' اس کے فنون ہر جگہ اور ہر وقت کامیاب ہیں۔ اگرچہ عمر کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ اس میں اس نوع کی عیاری اور مکاری پیدا ہو جائے مگر ماحول اور معاشرت نے اس کو سب کچھ سکھا پڑھا کر پکا کر دیا ہے۔ اس خشونت اور پکے پن کے علاوہ اس میں یہ بھی وصف ہے کہ عاشقوں کو ٹھٹھے میں اُڑاتی ہے۔ ٹھٹھے میں اڑانا ایک محاورہ ہے جس کے معنی' مذاق میں بات ٹال دینے کے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بات مذاق میں ٹال دیتی ہے بلکہ اس کے ٹھٹھوں میں بھی سچی ہنسی نہیں ہے۔ اس کی ہنسی بناوٹی ہنسی ہے جو صرف وقت گزارنے اور بات ٹالنے کے لئے طاری کی جاتی ہے۔ اب سترھواں بند ملاحظہ ہو:-

نظروں میں صاف اڑالے دل اس طور کی کافر عیاری
اور ہٹ جاوے سو کوس پرے گر بات کہو کچھ مطلب کی
کہنی مارے' ہچکی لے لے' پھیرے' جھڑکے' دیوے گالی
ہر آن چہ خوش' ہر دم اچھا' ہر بات ہنسی کی پھلجھڑی

رمزوں کے ضلعے، غمزوں کے جگت، پھبتی کی پھباوٹ ویسی ہے،

اس بند میں بھی ڈیرے دار کا کردار ہے۔ پہلے مصرعے میں بتایا ہے کہ پری، دلبری کے فن میں اتنی طاق ہے کہ نظروں سے دل چھین لیتی ہے۔ "صاف" سے عیاری کا کمال ظاہر کیا ہے۔ "نظروں ہی نظروں میں اڑا نا" بھی ایک محاورہ ہے جس کے معنی "کھلم کھلا" یا "سب کے سامنے" ہیں۔ لیکن اس مصرعے میں چونکہ نظروں کی تکرار نہیں ہے اس لئے، یہ معنی قرین قیاس نہیں ہیں۔ دوسرے مصرعے میں کردار کا ایک اور دقیق رمز بے نقاب کیا ہے۔ اس طبقے کے افراد کو دل لینے میں جیسی مہارت ہوتی ہے، ویسا ہی امیدیں بندھانے اور ترسانے میں بھی کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں، انیسویں صدی کی ڈیرے دار کو فن کی حیثیت سے سکھائی جاتی تھیں۔ چنانچہ، پری سے، جب مدعا بیان کیا جاتا ہے تو وہ اتنی بیگانی بن جاتی ہے کہ گویا کوئی واسطہ ہی نہیں۔ "پرے" اِس زمانے میں آگرے میں نہیں بولا جاتا لیکن اس مصرعے میں اس لفظ کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ نظیر کے زمانے میں، یہ لفظ یہاں رائج تھا۔ تیسرے مصرعے میں بتایا ہے کہ وہ اس حد تک بے تکلف ہو جاتی ہے کہ جسمانی چھیڑ چھاڑ بھی شروع کر دیتی ہے لیکن یہ اس کی حد بھی ہے۔ وہ اس سے آگے ہرگز نہیں بڑھتی۔ اس نوع کی ہمت افزائی سے اگر کوئی کچھ اور اقدام کرتا ہے تو پھر اس کو بنانے کی کوشش کرتی ہے اور بات بات پر اس کا مذاق اڑاتی ہے۔ چوتھے مصرعے میں مذاق اڑانے کے طریقے بتائے ہیں۔ لحمہ بہ لحمہ "چہ خوش" اور "اچھا" کہہ کر بات ٹالنے اور سوال کو ہنسی میں اُڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ پانچویں مصرعے میں بتایا ہے کہ وہ ضلعے اور جگت میں بھی طاق ہے اور بات ٹالنے کے لئے اس تدبیر سے رمز و غمزے کی نمائش شروع کر دیتی ہے اور آخر کار نوبت یہاں تک پہونچتی ہے کہ کھل کر پھبتی کہنے لگتی ہے۔ انیسویں صدی کی طوائف کو خصوصیت سے ان باتوں کی تربیت دی جاتی تھی۔ وہ امرا کی دربار داری کے قرائن اور محفل آرائی کے آداب سے خوب واقف ہوتی تھی۔ اس میں اتنا ادبی سلیقہ بھی ہوتا تھا کہ ادبی لطائف کو سمجھے اور

ان میں برابر کا حصہ لے سکے۔ اب اٹھارواں بند ملاحظہ ہو :۔

یہ ہوش قیامت کافر کا جو بات کہوں وہ سب سمجھے روٹھے، مچلے، سو سوانگ کرے، باتوں میں لڑے نظروں میں ملے

یہ شوخی پھرتی، بیتابی، ایک آن کبھی نچلی نہ رہے چنچل اچپل، مٹکے، چمکے، سر کھولے ڈھانپے، ہنس ہنس کے

باہوں کی جھٹک گھونگھٹ کی ادا جوبن کی دکھاوٹ ویسی ہے

اس بند میں دوسرے پہلو سے، پھر کردار کی مصوری کی ہے۔ پہلے مصرعے میں ہوش سے ہوش مندی مراد ہے۔ یعنی وہ اس قدر بیدار و ہوش مند ہے کہ کوئی بات کیسے ہی پیچ سے کہی جائے مگر فوراً سمجھ لیتی ہے۔ نہ صرف بات تاڑنے میں اتنی کامل ہے بلکہ طرح طرح کے جتروں سے بھی خوب واقف ہے۔ کبھی روٹھ جاتی ہے کہ آپ منائیں، کبھی مچل جاتی ہے کہ آپ خوشامد کریں۔ بہرحال عاشق کو اپنی ذات میں ہر وقت مصروف رکھنے کے لئے قسم قسم کی تدبیریں کرتی ہے۔ باتیں کرتے کرتے لڑنے لگتی ہے کہ عاشق کہیں زیادہ بے تکلف نہ ہو جائے۔ اس دوران میں یکایک اس کو یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ عاشق کہیں اس برتاؤ کا برا نہ مان جائے، تو قبل اس کے کہ یہ کسی نتیجے پر پہونچ کر کوئی فیصلہ کرے، وہ خود التفات کی نگاہوں سے مداوا شروع کر دیتی ہے اور اس کا دل لبھانے لگتی ہے۔ تیسرے مصرعے میں جسمانی حرکات کی شوخیوں کو اجاگر کیا ہے اور چوتھے میں نفسی کیفیات کی مصوری سے ایک فلم سا دکھایا ہے۔ وہ اپنی شوخی اور چلبلے پن، اپنی مٹک چمک سے لبھاتی ہے، بار بار سر کھولتی اور ڈھانپتی ہے اور ساتھ ساتھ ہنستی بھی جاتی ہے۔ "سر کھولے ڈھانپے" لکھ کر نظیر نے بتایا ہے کہ وہ عورت کی فطری نمایش پسندی کا دقیق مطالعہ کر چکا ہے۔ عورت کی یہ ایک خلقی عادت ہے کہ وہ سر ڈھکنے اور آنچل سنبھالنے کے بہانے سے بار بار اپنی نمایش کرتی رہتی ہے۔ عموماً یہ نمایش غیر ارادی ہوتی ہے لیکن جب اس میں اہتمام اور تواتر و تسلسل بھی نظر آئے تو اس کی بنیاد میں ارادے کی موجودگی کا یقین سا ہونے لگتا ہے۔ بہرحال اس لمحے میں، جب وہ کسی طرح یہ محسوس کر لے کہ اس کے گلشن حسن و شباب کی نظاری خوشہ چینی کی جا رہی ہے، اس کے

وجود میں، اضطرار کی ایک برقی رَو دوڑ جاتی ہے اور یہ مشقِ ستم تیز تر ہو جاتی ہے۔ نظیر نے اپنے عہد میں عورت کی اس دلکش ادا کا مطالعہ کیا تھا اور عہد حاضر کی سوسائٹی میں بھی یہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ نظیر نے جس پری کا سراپا نظم کیا ہے اس میں، یہ ادا مستزاد ہے کہ وہ سر کھولنے ڈھانپنے کے وقت ہنستی بھی جاتی ہے۔ ''ہنس ہنس کے'' سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس کو اپنی کوشش کا احساس اور اپنی فتحمندی پر ناز ہے۔ باتوں باتوں میں لڑ لینے کے بعد، دوبارہ مسرور و بے تکلف نظر آنے کے دوران میں جن جن اداؤں کی نمائش ہوتی ہے، ان کا ذکر پانچویں مصرعے میں ہے۔ سر کھولنے، ڈھانپنے کے لئے، اس کی باہیں بار بار اور مختلف انداز میں جنبش کرتی ہیں۔ یہ جنبش کبھی ہلکی ہوتی ہے اور کبھی جھٹک کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔ اس خودنمائی کے ڈرامے کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ وہ یکایک گھونگٹ نکال لیتی ہے اور یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ اب بالکل ہی چھپ رہنا مقصود ہے لیکن یہ غمزہ بھی آنی اور آتش شوق کے تیز تر کرنے کی ایک نئی تدبیر ہے۔ مختصر یہ ہے کہ چھپنے اور سامنے آنے کی اداؤں کے دوران و تسلسل میں اس کے جوبن کی خوب خوب نمائش ہوتی رہتی ہے اور یہی اس کا مقصد ہے۔ اب انیسواں بند ملاحظہ ہو :-

اِک شور قیامت ساتھ چلے نکلے کافر جس دم بن ٹھن　　　بل دار کمر، رفتار غضب، دل کی قاتل، جی کی دشمن
مذکور کروں میں اب یارو اس شوخ کے کیا کیا چنچل پن　　　کچھ ہاتھ ہلیں، کچھ پاؤں ہلیں، اچھلیں بازو، مٹکے سب تن
گاتی وہ بلا، تالی دہ ستم، انگلی کی نچاوٹ ویسی ہے

یہ بند چال کی تعریف میں ہے۔ پہلے مصرعے میں قیامت کے شور سے رفتار کا استعارہ کیا ہے۔ جس وقت وہ آراستہ پیراستہ ہو کر نکلتی ہے تو دُہائی پڑ جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں لف و نشر مرتب ہے۔ بل دار کمر کو ''دل کی قاتل'' اور رفتار کو ''غضب'' اور ''جی کی دشمن'' کہا ہے۔ کمر اتنی نازک ہے کہ بار بار لچکتی ہے اور لچکنے میں بار بار بل کھاتی ہے۔ کمر کی نزاکت کا بیان، اس سے حسین تر الفاظ میں دشوار ہے۔ تیسرے مصرعے میں اشارہ ہے کہ خرام ناز کے وقت سارے بدن میں ایک لطیف دلچسپ ل

رقصندگی سی پیدا ہو جاتی ہے جس کو لفظوں میں ظاہر کرنا دشوار ہے۔ چوتھے میں اعلیٰ مصوری کی مدد سے چنچل پن کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ ہاتھ، پاؤں، بازو، غرض سارا جسم مائل بہ رقص نظر آتا ہے۔ ایسی چال جس کے یہ لوازم ہوں ہر عنوان رقص کی مترادف ہے۔ ہاتھ اور پاؤں کے لئے ہلنا، بازو کے لئے اُچھلنا اور تن کے لئے پھڑکنا کہہ کر نظیر نے پھر کنہ زبان سے واقفیت اور حسن بیان کی قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ پانچواں مصرعہ رقص کے عالم کی، بے نقاب تصویر ہے۔ سینے اور کمر کے درمیانی حصے یعنی پیڑو کو گاتی بھی کہتے ہیں۔ رقص کے عالم میں، عورت کے بدن کا یہ حصہ، خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ گاتی کی انتہائی جاذبیت و دلفریبی کو "بلا" کہا ہے۔ ناچنے میں تالی عموماً بجائی جاتی ہے اور ایک خاص انداز سے بجائی جاتی ہے، انگلیاں نچانے کا بھی ایک خاص انداز ہے۔ نظیر نے گاتی کے حسن و جمال کے ساتھ، ان دونوں اداؤں کی بھی داد دی ہے۔ اب بیسواں اور آخری بند ملاحظہ ہو:۔

جو ایسا حسن کا دریا ہو کس طور نہ لہروں میں بہیئے
گر مہر و محبت ہو بہتر اور جور و جفا ہو تو سہیئے
دل لوٹ گیا ہے غش ہو کر بس اور تو آگے کیا کہیئے
مل جائے نظیر ایسی جو پری چھاتی سے لپٹ کر سو رہیئے
بوسوں کی چپک، بغلوں کی لپٹ، سینوں کی ملاوٹ ویسی ہے

اس بند میں نظیر کے مزاج کی فطری شوخی بدرجۂ اتم کارفرما ہے۔ ایک سچے واقعیت نگار کی طرح اس نے اپنے جذبات کی سچی تصویر پیش کر دی ہے۔ پہلے مصرعے میں حُسن کو بہتے ہوئے دریا سے تشبیہ دی ہے جو نہایت نادر ہے۔ زندگی کو بھی دریا سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن حسن و شباب کو دریا کی روانی سے زیادہ اور قوی تر مناسبت ہے۔ اس تشبیہ کے بعد، اس دریا کی لہروں میں بہنے اور بہ جانے کی خواہش بھی بڑی دلچسپ بات ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی حقیقت در جائیت پسندی کی سچی ذہنیت کا مرقع ہے۔ عاشق صادق کی طرح یہ قبول کر لیا ہے کہ محبت میں جو کچھ پیش آئے سہنا چاہیئے۔ محبت کا جواب اگر محبت سے دیا جائے تو فبہا ورنہ جور و جفا برداشت کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیئے۔ تیسرے مصرعے میں، ہر نوع کا سلوک، قبول کرنے

کی وجہ بھی صاف صاف بتا دی ہے۔ دل کا لوٹ جانا نظیر کا خاص محاورہ ہے۔ چوتھے مصرع میں اپنی انتہائی آرزومندی اور فطری شوخی کا اظہار ہے۔ پانچویں میں جو تین اسمائے صفت چیک، لپٹ اور ملاوٹ نظیر نے استعمال کئے ہیں، ان میں پہلا خاص اسی کا وضع کردہ ہے۔ دوسرے اور تیسرے کا استعمال بالکل نیا ہے۔ بہرحال یہ تینوں الفاظ، اردو کے انداز بیان میں نئے اسالیب کا اضافہ اور ایک مستقل و معتد بہ سرمایہ ہیں۔

آئینہ ایک فلسفیانہ تمثیل ہے جس میں نظیر نے انسان اور نفس انسان کی عظمت کا گیت گایا ہے۔ کیٹس (۱۷۹۵ - ۱۸۲۱) حیات کا شاعر اور جمالیات کا والہ و شیدا ہے۔ وہ مرئیات کے جذب و سحر پر مفتوں نظر آتا ہے۔ نظیر پر بھی واقعیت کے ردِعمل کی حیثیت سے اکثر جمال پرستی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس نظم میں اس نے واقعیت و مرئیات، رومان و رومانیات، سب سے قطع نظر کر کے ذہنیات کے بحرِ ذخار میں غوطہ لگایا ہے۔ اس کے عہد کا موقت مغربی معیار جس نے آخر کار روسو (۱۷۱۲ - ۱۷۷۸) کے سیاسی عقائد و تلقین کی صورت اختیار کی اور جس سے وہ ایک نظریے کی حیثیت سے قطعی نابلد تھا، نظیر پر بداہتاً مؤثر ہوا۔ وہ روح حیات سے جو کائنات پر ساری و طاری ہے متاثر ہو کر، خود انسان کو مخاطب کرتا اور کہتا ہے:-

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ　　صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
خال سیاہ اور خط مشک بار دیکھ　　زلف دراز و طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشہور انگلستانی شاعر ورڈسورتھ (۱۷۷۰ - ۱۸۵۰) کی طرح جو نظیر کا معاصر ہے، نظیر کے نزدیک بھی ساری مخلوق میں انسان سب سے زیادہ اہم اور محترم ہے۔ ورڈسورتھ میں انسان کی محبت، اس کے

ذہنی نشوونما کے تیسرے دَور میں پیدا ہوئی۔ اس بیداری کے دو محرک بتائے جاتے ہیں۔ پہلا فرانس کا انقلاب اور دوسرا کولرج (۱۷۷۲-۱۸۳۴) سے ملاقات جس کے واسطے سے وہ جرمن معیاریین کے فلسفے سے روشناس ہوا۔ ہمیں نظیر کی زندگی کے حالات تفصیل بتسلسل کے ساتھ معلوم نہیں ہوئے۔ جو واقعات جستہ جستہ میسر آئے ہیں، ان کا اب تک اس نظر سے مطالعہ نہیں کیا گیا کہ اُن سے شاعر کے ذہنی نشوونما کے مدارج پر روشنی ڈالی جائے۔ بہرحال اس کے دل میں انسان کی محبت وعظمت کے پاکیزہ جذبات موجود ہیں اور اس وقت موجزن ہیں جب مغرب میں ان کی نمایش پر فخر کیا جاتا ہے۔ آئینے میں نظیر نے بتایا ہے کہ انسان کائنات کی اہم ترین حقیقت ہے اور دنیا اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ خود اپنا مطالعہ کرے۔ مقطع کے بند میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مظاہر کی خارجی خوبیوں سے چوندھیا کر، ان پر مفتوں ہو جانا غلط طریقۂ کار ہے۔ کائنات میں مفتون کرنے کی اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف انسان ہے:-

باغ جہاں کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر   قمری کی سن نفیر نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیسا ہے بے نظیر   ہیں حرف مَن عَرَف کے یہی معنی اے نظیر
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے ... کی آپ ہی بہار دیکھ

اس نظم میں دل کو آئینے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تلاش خود نہایت بصیرت افروز اور قابل داد ہے۔ اس کے علاوہ، اس میں اور بھی بہت سی لسانی، ادبی اور فلسفیانہ خوبیاں ہیں جو مطالعے سے بروئے کار آسکتی ہیں۔ کسی شاعر کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے اس کے داخلی حقائق پر بار بار غور کرنے کی ضرورت ہے۔

روٹی نامہ ایک طنز ہے جس کی تفسیر نئے پہلو سے ہو سکتی ہے اور اشتراکی اصولوں کی روشنی میں بھی ممکن ہے۔ یہ نظم خالص اقتصادی اور معاشری قدروں سے لبریز ہے۔ اس سے کارل مارکس (۱۸۱۸-۱۸۸۳)

کے فلسفے کا بنیادی اصول بھی مستنبط ہوتا ہے۔ نظیر، حقائق کے علاوہ، جزویات کا شاعر بھی ہے اور ادنیٰ ادنیٰ اور پیش پا افتادہ باتوں سے اہم نتائج اخذ کرنے کی قدرت و بصیرت رکھتا ہے۔ بادی النظر میں، خصوصاً ان کے نزدیک جن کو بے فکری سے میسر آتی ہے روٹی ایک حقیر و فرومایہ چیز ہے۔ ان کا ذہن اس کے حصول کی دشواری و اہمیت کی طرف کبھی منتقل نہیں ہوتا۔ لیکن، اگر ایک مفکر کی نظر سے دیکھا جائے تو روٹی کے حصول کی کشمکش سے اہم تر کام، دنیا میں کوئی نہیں۔ زندگی کی ساری تگ و دو اور تنازع للبقا کی ساری جد و جہد، اسی کے لئے ہے۔ لطف یہ ہے کہ صاحبان ثروت پر جب اس کا نشہ چڑھتا ہے تو انہیں دور کی سوجھنے لگتی ہے۔ نظیر نے کیا خوب کہا ہے:۔

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا　　کرتا پھرے ہے کیا وہ اُچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اُچھل گیا　　ٹھٹھا، ہنسی، شراب، صنم، ساقی، اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

خلوص مقصد کے ساتھ سچائی، نظیر کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جب وہ کہنے پر آتا ہے تو لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ کھُل کر کہہ گزرتا ہے۔ اس نے آخر کار صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ لوگ جو روحانیت اور تصوف کا مکر گانٹھے بیٹھے ہیں، یہ اصل میں روٹی کمانے کا ڈھونگ ہے اور بس۔ جو فقیر حقیقت میں کامل ہے وہ اس راز سے خوب واقف ہے۔ کیا خوب کہا ہے ملاحظہ ہو:۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا، بابا، خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا، ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا، اس نے، کہیے یہ ہے دل کا نور کیا　　اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے، شعور کیا　　کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا

جتنے ہیں کشف، سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی میں یہ قوت ہے کہ اس کے بغیر، زندگی کا کوئی کام یہاں تک کہ عبادت بھی ممکن نہیں۔ سعدیؒ نے اسی فلسفے کو، دوسری طرح بیان کیا ہے:۔

شب چو عقد نماز بر بندم ۔۔۔ چہ خورد بامداد فرزندم

نظیر نے اسی حقیقت کو ذرا شرح و وضاحت سے بیان کیا ہے:۔

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو ۔۔۔ میلے کی سیر، خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی، خدا سے لگن نہ ہو ۔۔۔ سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

نظیر نے اس نظم کے چھٹے بند کے پہلے مصرعے میں "روٹی کا ناچ" باندھا ہے۔ یہ اسلوب بیان خود اس کا پیدا کردہ ہے۔ اسی معنی کا ایک محاورہ "ڈانس اٹینڈینس" یا رقص حاضر باشی، انگریزی زبان میں بھی ہے، جس میں اتنا ہی ذم ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ حصول منفعت کے لئے جو اصل میں روٹی کمانے کا دوسرا نام ہے، ذلیل قسم کی حاضر باشی کی جائے۔ ساتویں بند کے چوتھے مصرعے میں رنڈی کے کردار پر قدرے قلیل روشنی ڈالی ہے۔ ساری نظم، اجتماعی زندگی کی مالی کشمکش کا سچا تبصرہ ہے۔ ہندوستان کا موجودہ فرقہ وارانہ تنازعہ، اصل میں روٹیوں ہی کا رونا ہے اور بس۔ نظم کی موضوعی خوبیوں کی یہ کثرت ہے کہ لسانی اور ادبی خوبیوں پر، جو دب کر رہ گئی ہیں، نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ملتی۔

آندھی ایک رندانہ نظم ہے جس میں نظیر نے دل پھینک عاشق کی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ مزاح کا عنصر، نظم کے اور محاسن پر غالب ہے۔ آندھی میں انیسویں صدی کے بانکے کی تصویر ہے جو شکسپیر کے ڈرامے ہنری چہارم کے ایک کردار فولسٹاف سے بہت مشابہ ہے۔ ساری نظم رجائیت کا ایک حسین و پرجمال مرقع ہے۔ بانکے کے کردار کے پہلو بہ پہلو آندھی کے خصوصیات و

جزویات کی تفصیل بھی نہایت پرلطف انداز میں پیش کی ہے۔ جمالیات کا یہ ایک اہم مسلمہ ہے کہ کوئی منظر اپنے پس منظر کی مدد کے بغیر حسین و نظر فریب نہیں بنتا۔ نہ خود اس کے وجود کی مستور جاذبیت بروئے کار آتی ہے نہ وہ اپنی فطرت کا حقیقی جمال بے نقاب کر سکتا ہے۔ چنانچہ آندھی کے سماں کو بانکے کی فریب کارانہ چھل اور دل لگی بازی کی آماجگاہ کا پس منظر بنایا ہے۔ نظیر کے آرٹ کی خلاقی اور کمال بالائے کمال یہ ہے کہ ایک شوخ و شنگ اور طبعاً خودنما فطرت کی نمائش کا پس منظر بنانے کے لئے آندھی کو منتخب کیا ہے جو کارگاہ فطرت کا خود ایک خودنما اور طوفانی مظاہرہ ہے۔ اس التزام سے شاعر کے ذہن کے توازن تناسب اور اس کی فطنت کی یکسانی و ہمواری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آندھی کے محاکات اور ذی حیات ہیجان و اضطراب کی تفصیل قریب قریب ہر بند میں موجود ہے۔ ساتویں بند میں آندھی کا اپنی ذات پر داخلی اثر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اسی آندھی نے گلشن کر دیا یار دمرے گھر کو | بچھایا شاد ہو میں نے پلنگ پر جھاڑ بستر کو
صراحی کی خبر لی اور سنبھالا جا کے ساغر کو | اٹھا کر طاق سے شیشہ لگا چھاتی سے دلبر کو
نشوں میں عیش کے کیا کیا کیا دل سیر آندھی میں

نظیر کی دقیقہ رسی کا یہ عالم ہے کہ کوئی ضروری تفصیل اس سے نظر انداز نہیں ہوتی۔ آندھی میں بستر پر خاک پڑ جانی لازمی بات ہے۔ چنانچہ دوسرے مصرعے میں جب وہ شاد ہو کر پلنگ پر بستر بچھاتا ہے تو پہلے اس کو جھاڑ لیتا ہے تاکہ خاک نکل جائے۔ اس کی رجائیت پسندی کی حد ہے کہ فطرت کا آندھی جیسا غیر دلکش مظاہرہ جو دوسرے انسانوں کے لئے آلام و مصائب کا پیش خیمہ ہے، اس کے لئے مسرت کی نوید لاتا ہے۔ چنانچہ کہا ہے :۔

یہ دن آندھی کے یار دیوں تو سب کے ہوش کھوتے ہیں | جنہیں ہے عیش وہ آندھی میں موتی سے پروتے ہیں
مزا ہے جن کو ہنستے ہیں، جنہیں غم ہے سو روتے ہیں | نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں

میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

داخلی محاسن کے علاوہ، اس نظم میں زبان، محاورے اور حسن بیان کی بھی بے شمار خوبیاں ہیں ۔
اژدہے کا بچہ ایک فلسفیانہ تمثیل ہے۔ اس میں اژدہے کے بچے سے فطن کی انفرادیت مراد ہے۔ یہ نظم نظیر کے خیال کی عظمت اور فکر کی گہرائی کی ایک اختراع فائقہ ہے۔ اس میں زندگی کی ایک اہم حقیقت سے ایک پرمغز نسبت پیدا کر کے جدت طرازی کا حق ادا کیا ہے۔ معنوی محاسن کے علاوہ صوری حیثیت سے بھی یہ نظم ایک کارنامہ ہے۔ قلندر کے پیشے کو خیال کے اظہار کا ذریعہ اور اس کے لب و لہجے کو بیان کا عنوان بنایا ہے جس سے نظم میں ایک خاص کیفیت و ندرت پیدا ہوگئی ہے ۔ صاحب فطنت کی عظیم انشا ذہنیت زندگی کے میدان عمل میں ہمیشہ سربلند نظر آتی ہے۔ اس کا انوکھا انداق اپنی نوعیت میں جداگانہ اور اس کا رویہ اپنے انداز میں بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی و اخلاقی بے راہ روی کی وجہ سے سوسائٹی عموماً اس کی مخالف رہتی ہے ۔ پہلے بند میں عام ذہنیت کی فرومایگی اور فطن کی شخصیت کے وقار کی طرف اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

بیچے ہے اب تو کوئی بلبل بئے کا بچہ ۔۔۔ اور بیچتا ہے کوئی، طوطے ہرے کا بچہ
مینا، بیا، لٹورے اور ابلقے کا بچہ ۔۔۔ تیتر، بٹیر، سارس، شکرے، لوے کا بچہ
سب بیچتے ہیں آکر جیتے کھرے کا بچہ
ہم بیچتے ہیں یارو لو اژدہے کا بچہ

فطن کی وہ امتیازی خصوصیت جو اس کو سماج کے عام ذہن سے متمیز کرتی ہے اور جس کے سمجھنے سے اجتماعی ذہن ابتدا میں عموماً قاصر رہتا ہے، بسا اوقات خود اس کے لئے وبال جان بن کر رہ جاتی ہے۔
دوسرے بند میں نظیر نے صاحب فطنت کی روشنی طبع کا چالیس من کی ڈلیا سے استعارہ کیا ہے ۔ جس طرح قلندر چالیس من کی ڈلیا کے بوجھ سے عاجز آجاتا ہے اسی طرح صاحب فطنت کی فطنت، عموماً اس کے

لئے بلا ہو جاتی ہے۔ تیسرے بند میں پرانے اژدہے سے قدیم زمانے کے ارباب عظمت مراد ہیں۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ مغلوں کے ابتدائی دور میں اہل کمال کی جو قدر تھی، وہ اس دور میں نہیں ہے۔ نظیر کا زمانہ، مغلیہ دور کا وہ زمانہ ہے جب یہ حکومت روز بہ روز تنزل کی طرف مائل تھی۔ اس زمانے کے نام نہاد بادشاہوں کو اپنے ذاتی عیش و عشرت اور روزمرہ کے خانگی اور سیاسی جھگڑوں سے، اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ کمال اور اہل کمال کی طرف اعتنا کریں۔ چھٹے بند میں سو من گیہوں اور سو کھال پانی سے، فطن کی ذہنی و اخلاقی ضروریات مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ فطن کے عہد میں اس کی ناز برداری نہیں کی جاتی۔ نویں بند میں سماج کے ذہنی و اخلاقی تنزل پر افسوس کیا ہے:۔

سب اُٹھ گئے جہاں سے وہ تھے جو لوگ جیا　　　وہ رہ گئے ہیں جن کے گھر میں نہیں ہے ہنسیا
اس بات کو تو عمدہ ہو بھوگ کا بلسیا　　　جو اژدہے کو پالے ایسا ہے کون رسیا
سب بیچتے ہیں آ کر چیتے کھرے کا بچہ
ہم بیچتے ہیں یارو لو اژدہے کا بچہ

آخر بند میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ دورِ انحطاط میں اہل کمال کی پرداخت خدا کرتا اور وہی اس کی آبرو رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

آگے تو گھر بہ گھر تھے اکثر تمام داتا　　　سیمرغ پالتے تھے کرنے کو نام داتا
اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا　　　سچ ہے نظیر آخر، اجگر کے رام داتا
سب بیچتے ہیں آ کر چیتے کھرے کا بچہ
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچہ

ککڑی ایک مصورانہ نظم ہے جو خالص شاعرانہ قدروں سے لبریز ہے۔ اس کے بیان کی لطافت و سادگی اور تشبیہوں کی ندرت و تازگی نگاہوں کے سامنے، جمال کا ایک عالم پیدا کر دیتی اور

قلب پر خاص اثر کرتی ہے۔ اس نظم میں بیان کے سارے اسالیب اور قافیے خاص نظیر کے مذاق اور حصے کے ہیں۔ پہلے بند کے دوسرے مصرعے میں "چھم کو خوبی بھرا" کہہ کر بیان کی پاکیزگی اور قافیے کی خلاقی کا ثبوت دیا ہے۔ تیسرے بند میں پرے اور درے کے استعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر کے عہد میں یہ الفاظ آگرے میں بھی رائج تھے۔ دوسرے بند کے پہلے اور دوسرے مصرعوں میں پتلی پتلیاں اور ریشم کی لکلیاں نہایت حسین ترکیبیں ہیں اور زبان کی شیرینی سے لبریز ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں فرہاد و شیریں اور مجنوں و لیلیٰ کے افسانوں سے تشبیہ پیدا کرنے میں مدد لی ہے اور تیسرے بند میں یہی کام ہیر اور رانجھے کی روایت سے لے کر وطنیت کا ثبوت دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کوئی ہے زردی مائل، کوئی ہری بھری ہے　　　پکھراج منفعل ہے، پنے کو تھرتھری ہے
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے　　　سیدھی ہے سو وہ یارو رانجھے کی بانسری ہے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

پانچویں بند میں ککڑی کو "آنکھوں سکھ"، "کلیجے ٹھنڈک" اور "پری" کہہ کر بیان کے نہایت حسین و دلنشیں اسالیب پیدا کئے ہیں لیکن چھٹا بند اپنی مصورانہ نوعیت کے لحاظ سے لاجواب اور داد سے مستغنی ہے:۔

بیل اس کی ایسی نازک جوں زلف پیچ کھائی　　　بیج ایسے چھوٹے چھوٹے خشخاش یا کہ رائی
دیکھا اس کی ایسی نرمی باریکی اور گلائی　　　آتی ہے یاد ہم کو محبوب کی کلائی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

نظیر زندگی کا شاعر ہے۔ ہر چیز کی معاشرتی اہمیت اسے خصوصیت سے متاثر کرتی ہے۔ ککڑی سے معاشرت میں جو دلچسپیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

لیتے ہیں مول اس کو گل کی طرح سے کھل کے　　　　معشوق اور عاشق کھاتے ہیں دونوں مل کے
عاشق تو ہیں بجھاتے شعلوں کو اپنے دل کے　　　　معشوق ہیں لگاتے ماتھے پر اپنے چھلکے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

چھٹے بند میں "زلف پیچ کھائی" اور "گلائی"، ساتویں میں "گل کی طرح سے کھل کے" اور آٹھویں کا یہ مصرعہ

کڑوی ہیں سو بھی گویا خوباں کی گالیاں ہیں

حسن بیان اور شاعرانہ لطائف کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

بھونچال ایک بیانیہ نظم ہے جس میں جزدیات کی مصوری سے محاکات کا حق ادا کیا گیا ہے اور فطرت کے ایک عظیم الشان مظاہرے سے انسان کو عبرت دلائی ہے۔ یہ بھونچال محض خیالی یا رومانی نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے جس کا سنہ، تاریخ، دن اور وقت خود نظیر نے تیسرے بند میں نظم کیا ہے۔ نظیر واقعات و حیات کا شاعر ہے۔ اس کا اتنے بڑے حادثے سے متاثر ہو کر نظم لکھنا، کوئی تعجب کی بات نہیں اگر نہ لکھتا تو ضرور تعجب کیا جا سکتا تھا۔ نظم کا انداز بیان اور قافیے، خصوصیت سے نظیر کے رنگ کے ہیں اور جا بجا ایسے الفاظ اور جملے نظر آتے تھے جو اب متروک ہیں لیکن جن کا نعم البدل زبان اب تک پیدا نہیں کر سکی۔ ان کو پھر سے زبان میں شامل کر لینا اور رواج دینا ضروری ہے تاکہ بہت سے وہ مفاہیم جو اس وقت الفاظ کی کمی کی وجہ سے ظاہر نہیں ہو سکتے، ادا ہونے لگیں۔ چوتھے بند میں طوفان کی شدت و عالمگیری کی طرف اشارہ ہے اور پانچویں میں، حیات پر اس کا اثر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اجزائے ارض قاف سے تا قاف ہل پڑے　　　　اجگر اچھل اٹل کے کلیجے اُگل پڑے
انسان گھر سے دشت سے وحشی نکل پڑے　　　　طائر بھی آشیانوں میں اپنے اُچھل پڑے

دریا و کوہ، شہر و جنگل، سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

پہلے مصرعے میں "قاف سے تا قاف" کے معنی ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہیں۔ انگریزی زبان میں "فروم پول ٹو پول" اس جملے کا مترادف موجود ہے۔ اس مصرعے کے قافیے میں ہائے ہوز کی حرکت، موجودہ تلفظ کے خلاف فتحہ ہے۔ نظیر کے عہد میں، اس فعل کا یہی تلفظ تھا اور اب بھی خال خال سننے میں آتا ہے۔ دوسرا مصرعہ اپنے بیان کے اعتبار سے لاجواب ہے۔ اجگر کی تعریف، اچل اور اٹل سے کی ہے۔ یعنی ایسے دیو پیکر اژدہوں کے بھی کلیجے نکل پڑے جو اپنے قامت کی بزرگی و ثقل کی وجہ سے نہ جنبش کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ اچل اور اٹل دونوں الفاظ مفاہیم سے لبریز ہیں۔ ان میں اٹل تو اب بھی رائج ہے مگر اچل متروک ہے جس کو پھر رائج کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے کے قافیے "اوگل" سے اضطرار کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ اژدہوں نے، اپنے کلیجے خود نہیں اوگلے۔ طوفان کی شدت نے، غیر محسوس طریقے پر انھیں خود بخود ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا ہی اضطرار تیسرے اور چوتھے مصرعوں کے قافیوں نکل اور اوچھل سے ظاہر ہے۔ چھٹے بند میں بھونچال کا اثر غیر ذی حیات پر دکھایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

گڑھ، کوٹ، قلعہ، روئے زمیں پر ڈہل گئے — کانپیں النگیں، برج کے کنگورے ہل گئے
سنگین محل، مکان تھے سو وہ بھی اوسل گئے — اینٹوں کے زہرے پھٹ گئے پتھر پگھل گئے

دریا و کوہ شہر و جنگل، سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

اس بند کے دوسرے مصرعے میں النگ کے معنی سلسلے یا قطار کے ہیں مگر ان دونوں سے النگ کا پورا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ تیسرے مصرعے میں اوسل بہت معنی خیز ہے۔ سَلنا، مرتب کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اکثر پلنگ کے ساتھ آتا ہے۔ یہ لفظ بڑھئی اور لکڑی کا کام کرنے والوں کے زبان زد ہوتا ہے۔ پلنگ سلنے کے معنی، پلنگ مرتب کرنے کے ہیں۔ جس طرح سلنے کے معنی جوڑنے اور

مرتب کرنے کے ہیں، اس کے خلاف، اوسلنے کے معنی بگاڑنے اور اکھاڑنے کے ہیں۔ بہر حال اوسلنا، سلنے کا متخالف ہے اور بس۔ ان میں، سلنا اب بھی بولا جاتا ہے لیکن اوسلنا، کم سے کم ثقات اور اہل علم و ادب کی زبان پر نہیں ہے۔ اس قسم کے الفاظ اور جملے اس نظم میں جا بجا میسر آتے ہیں۔ ان محاسن کے علاوہ یہ نظم بہت سی خالص شاعرانہ قدروں سے لبریز ہے۔ گیارھویں، چودھویں، پندرھویں، سولھویں، سترویں اور انیسویں بندوں میں قدیم عقائد اور مذہبی روایات کی تلمیحیں ہیں۔ تیئیسویں بند میں، حکیمانہ خیالات و محسوسات کو شاعری کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

سب حکم تھا یہ حضرت ایزد تعال کا بھونچال میں کہاں تھا یہ عالم مجال کا

ایک دم میں یوں دکھا دیا جھمکا جمال کا ایک دم میں یوں بڑھا دیا شعلہ جلال کا

دریا و کوہ، شہر و جنگل، سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

کوڑی نامہ: ایک طنز ہے جو روٹی نامے کی طرح اقتصادی نقطۂ نظر سے پیدا ہے۔ نظیر نے اس قسم کی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ روٹی نامے، کوڑی نامے کے علاوہ پیسے نامہ بھی ہے۔ یہ سب ایک ہی خیال کے نئے نئے پہلو اور ایک ہی قسم کے مطالعے کے مختلف نتیجے ہیں۔ دنیا میں مدارج کی ناہمواری اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو نظیر بہت ناپسند کرتا ہے۔ سماج کے اس غلط نظام پر، اس نے اپنے کلام میں جگہ جگہ طنز کیا ہے۔ کہیں یہ طنز بالکنایہ ہے، کہیں بالراست ہے اور کہیں زیادہ قوی ہو کر بیزاری کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں، مسلمانوں کی ذہنی و اخلاقی پستی نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ اہل ثروت کو اہل دل اور اہل وجاہت کو اہل باطن بھی تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس مفروضہ بزرگی کی بنا پر، پیری مریدی کے واسطے بھی پیدا کر لیے جاتے تھے، دست بوسی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ نظیر نے پہلے بند کے پہلے مصرعے میں اسی قومی تنزل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہل یقین ہیں　　کھانے کو ان کے نعمتیں سو، بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن کے نہایت مہین ہیں　　سمجھے ہیں اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

مریدوں میں کشف و کرامت کی شہرت ہو جانے پر پیر صاحب کے لئے تحفے اور سوغاتیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کھانے کے لئے نعمتیں اور پہننے کے لئے مہین کپڑے، آسانی سے میسر آنے لگتے ہیں لیکن وہ لوگ جو اہل نظر ہیں ان تدبیروں کو خوب سمجھتے ہیں۔ نکتہ چیں، اس بند کے چوتھے مصرعے میں، ذی فہم و دقیقہ رس کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تیسرے بند کے دوسرے مصرعے میں، اپنے عہد کے پیشہ ور فوجی جنرلوں اور ہرجائی فوج کی طرف اشارہ ہے۔ چوتھا بند بڑا معنی خیز ہے اور اس کا چوتھا مصرعہ خصوصیت کے ساتھ نہایت بلیغ ہے۔ یہاں سائیں کے میلے کے معنی بہت وسیع ہیں اور زندگی کے ہر پہلو پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو　　رتھ خانہ، فیل خانہ، طویلا کہاں سے ہو
منڈوا کے سر فقیر کا چیلا کہاں سے ہو　　کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میلا کہاں سے ہو
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

پانچویں بند میں زر کی محبت کی حد دکھائی ہے اور ساتویں میں بتایا ہے کہ یہ عقائد و ایمان تک میں خلل ڈال دیتی ہے۔ انگلستان کے مشہور وزیر اعظم والپول (۱۶۷۶ - ۱۷۴۵) کا مقولہ ہے کہ ہر آدمی خریدا جا سکتا ہے۔ نظیر نے بھی بالکنایہ اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ قبرستان بیچنے اور مسجد کھدوانے کا الزام، اسی عہد کے بعض ایمان فروش مسلمانوں پر نہیں، نظیر کے زمانے میں بھی اس قسم کے زر پرست موجود

تھے جو ذاتی منفعت کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے۔ بہر حال، یہاں کسی خاص فرد کی طرف اشارہ نہیں، محض زر کی قوت و کارفرمائی دکھانی مقصود ہے۔ نویں بند میں کوڑیوں کے جھاڑ کا حوالہ ہے۔ یہ آگرے کی ایک خاص تلمیح ہے۔ ذاتی اغراض کی بنا پر، ایک خاص طبقے کے لوگوں نے کسی زمانے میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ گیارہ سڈھی کے کنویں میں پیسے کوڑی کا جھاڑ آویزاں ہے۔ جمنا کے بائیں کنارے پر، ایک امرود کا باغ ہے جو گیارہ سڈھی کہلاتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہ نورجہاں کا امرودوں کا باغ ہے اور اس کے درخت گلاب اور کیوڑے سے سینچے جاتے تھے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک سالم پتھر سے گیارہ سیڑھیاں تراش کر، یہاں ایک جگہ نصب کر دی گئی ہیں۔ یہاں ایک باؤلی بھی ہے جو اپنی قدامت اور طرز عمارت سے اپنے مغلیہ ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان سیڑھیوں کا نجوم و فلکیات سے کوئی تعلق ہے۔ چنانچہ نوعمر اور ناتجربہ کار لڑکوں کو بہلا پھسلا کر، کوڑی پیسے کا جھاڑ دکھانے کے بہانے سے، فریب دے کر، یہاں لایا جاتا تھا۔ نظیر اپنے سماج کی رگ رگ سے واقف ہے۔ اس نے اپنے عہد کی اس مذموم شرمناک عادت پر طنز کیا ہے۔ دسویں بند میں دکھایا ہے کہ دولت چند ہی روز میں انسان کا معاشری درجہ کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

بن کوڑی، خُردئے کے برابر بھی پت نہ تھی کوڑی جب آئی پاس تو بن بیٹھے سیٹھ جی
آگے گماشتوں کے کھُلی ہر طرف بہی پھر وہ جو کچھ کہیں تو وہی بات ہے، سہی
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں،

اس بند کے چوتھے مصرعے میں "سہی" کا استعمال نہایت غیر معمولی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظیر کو چونکہ عامۃ الناس کا تلفظ پسند ہے اس لئے صحیح کو "سہی" نظم کر دیا ہے۔ یہ خیال اگر قائم ہو تو غلط ہے۔ یہاں "سہی" اپنی اصل حیثیت اور قبول کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جو لوگ زبان کے رموز و حکم سے واقف ہیں وہ خوب

جانتے ہیں کہ "سہی" قبول کے معنی میں مستعمل ہے۔ "اچھا تو یوں سہی" میں "سہی" قبول کا مترادف ہے۔ اس نظم میں بند کے آخری دو مصرعوں میں زندگی کے تجربوں کی روح، حلول کر دی گئی ہے اور چھٹا مصرعہ تو اتنا فلسفیانہ ہے کہ ضرب المثل بن کر رہ گیا ہے۔

وجد و حال ایک عارفانہ نظم ہے جس میں حقیقت آشنا شاعر نے خلقت و کائنات کے رموز و حکم پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں تصوف کے اسرار و مسائل کو موسیقی کی زبان میں نظم کیا ہے۔ نظم کی زبان، انداز بیان اور لب و لہجہ تلسی داس کی رامائن سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ بحر کا ترنم، موضوع کی پُر رمزی سے پوری پوری مطابقت کرتا ہے۔ اس میں یہ راز آشکارا کیا ہے کہ ترکِ علائق کے بعد، انسان کے لئے، فطرت کی حقیقی موسیقی سننے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ انسان اگر اپنے داخلی وجود کو نشو و نما دینا چاہے تو خارجی وجود سے قطع نظر کر لینا ضروری ہے۔ تصفیۂ نفس کے لئے تزکیۂ باطن پہلی شرط ہے۔ جسم و جسمانیات سے مبرّا ہونے کے بعد، دلِ آگاہ سے واسطہ پیدا ہوتا اور فطرت کے مستور حقائق کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ مشرقی ریاضت و پرہیزگاری کا فلسفہ جس نے روح کی بقا کو جسم کی فنا پر منحصر کر کے، ایثار و ضبطِ نفس کا پرچار کیا ہے نظیر نے نہایت حسن و خوبی اور بڑی شرح و وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے مگر یونان کا نظریہ اس فلسفے کے خلاف ہے۔ اہل یونان کی تلقین یہ ہے کہ روح کی قوت جسم کے حسن و صحت پر منحصر ہے اس لئے جسم کی پرداخت بیش از بیش ضروری ہے۔ ورڈسورتھ جس کے کلام میں مشرقی تصوف و روحانیت کا بڑا عنصر موجود ہے، نظیر سے ہم آہنگ ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"میں اس متبرک کیفیت نفس کا جویا ہوں۔ جس میں اس رمز کا بار اس سارے ناقابل فہم عالم کا تھکا دینے والا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ وہ پُر سکون اور متبرک کیفیت جس میں محبت بہ شفقت ہماری رہ نمائی کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس جسمانی ڈھانچے کی سانس اور رہا۔ سے بشری خون کی حرکت بھی قریب قریب معطل ہو جاتی ہے، ہم جسمانی طور پر سلا دیئے جاتے ہیں اور ایک پُر حیات روح بن جاتے ہیں اور اس آنکھ سے جسے ہم آہنگی کے

زور اور انبساط کی راسخ قوت نے ساکت کر دیا ہے، ہمیں اشیاء کی ماہیت نظر آنے لگتی ہے۔

انہی مفاہیم کو، دوسری طرح، نظیر نے وجد و حال کے دوسرے اور تیسرے بندوں میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کل باجے بج کر ٹوٹ گئے، آواز لگی جب لہرانے
اور چھم چھم گھنگرو بند ہوئے، تب گت کا انت لگے پانے
سنگیت نہیں یہ سنگت ہے نٹوے بھی جس سے نٹ مانے
یہ ناچ کوئی کیا پہچانے، اس ناچ کو ناچے سو جانے
ہیں راگ انہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت نبے سُرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

جب ہاتھ کو دھویا ہاتھوں سے جب ہاتھ لگے تھرکانے کو
اور پاؤں کو کھینچا پاؤں سے جب پاؤں لگے گت پانے کو
جب آنکھ اٹھائی ہستی سے جب نین لگے مٹکانے کو
سب کاچھ کچھے، سب ناچ نچے، اس رسیا چھیل رجھانے کو
ہیں راگ انہیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سُرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

شیب وشباب، ایک مصورانہ نظم ہے جس میں بڑھاپے اور جوانی کے امتیازی خصوصیات کی محاکات نگاری کی گئی ہے۔ نظیر کی بہت سی نظمیں کائناتی قدروں کی حامل ہیں اور یہ اسی قسم کا ایک تہیارہ اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔ انسانی زندگی کے یہ دو دور، حیات کی دو تلخ حقیقتیں ہیں جن سے دنیا کے بیشتر انسانوں کو لازماً سابقہ پڑتا ہے۔ ان حقائق کے کیف و مزاج میں ازل سے آج تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا اور آج سے ابد تک بھی کسی تغیر کا امکان نہیں۔ بوڑھاپے اور جوانی کے لوازم ہر زمانے، ہر ملک ہر قوم پر یکساں صادق آتے ہیں۔ جوانی کا زمانہ، گزرنے پر بوڑھاپے کی فراست، شباب کی خامیوں کا جائزہ لیتی اور نوجوانوں کو حذر کی ہدایت کرتی نظر آتی ہے مگر ایسی بے شمار مساعی کے باوجود جوانی کی خامیاں اور بوڑھاپے کی اس نوع کی ناکام کوششیں، جہاں سے شروع ہوئی تھیں، آج بھی وہیں ہیں۔ جوانی اور بوڑھاپا، اپنے

حدود کے دائرے میں محصور اپنی جبلت کے تقاضے پر ہنوز کاربند ہیں۔ اسی کا نام فطرت ہے۔ نظیر نے اسی واقعیت کی مصوری کی ہے۔ پوری نظم اول سے آخر تک فطرت کا وسیع دغائر، مفصل دقیقہ رس مطالعہ ہے۔ حُسن بالائے حُسن یہ ہے کہ ہندوستان کی معاشرت کے لوکل کلر کی آمیزش سے موضوع کے آب و رنگ کو ملکی مذاق کے مطابق بھی بنا دیا ہے۔ ماحول سے مطابقت نظیر کے بیان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے بوڑھاپے اور جوانی کے منفرد تصورات کو ان کی مخصوص وہم رنگ زبان اور اصطلاحوں کے جامے میں ملبوس کر کے پیش کیا ہے جس سے بیان کا کیف و اثر دوبالا ہو گیا ہے۔ کردار نگاری پر نظیر کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جب وہ اس فن کی طرف مائل ہوتا ہے تو زندگی کے جیتے جاگتے افراد بنا کر کھڑے کر دیتا ہے۔ اس نظم میں جوانی اور بڑھاپا اپنے اصل رنگ روپ میں سامنے آجاتے ہیں۔ سیدھی سادھی، بے ریا اور بے تصنع واقعیت اس نظم کی دوسری اہم خصوصیت ہے۔ اس خوبی نے، قوت کے ساتھ، اثر بھی، اس نظم میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ موضوع کے جذباتی و رومانی پہلو سے قطع نظر کر کے، روزمرہ زندگی کا عملی و واقعاتی پہلو پیش کیا ہے جو اعلیٰ سے ادنیٰ تک ہر ذہنیت کے لئے دلچسپ اور قابل فہم ہے۔ اس کے بیان کی ایک ندرت یہ بھی ہے کہ بندوں کو مکالمے کے ڈھنگ پر مرتب کیا ہے۔ اس انداز نے، نظم میں ایک ڈرامائی حسن بھی پیدا کر دیا ہے جو اسٹیج کے ماحول سے بھی پوری مطابقت کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کی سادگی اور صفائی، بے مثال اور حسب حال محاوروں، ترکیبوں اور ضرب الامثال کا استعمال لاجواب ہے۔ پہلا بند خصوصیت کے ساتھ انسانی فطرت کی سچی مصوری ہے۔ پہلے دو مصرعوں میں زندگی کا ایک اہم مشاہدہ مرکوز ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جہاں میں یارو خدا کی عجب خدائی ہے — کہ ہر کسی کو تکبر ہے خودنمائی ہے
ادھر جوانی، بوڑھاپے پہ چڑھ کے آئی ہے — اُدھر بوڑھاپے کی اُس پہ ہوئی چڑھائی ہے
عجب جوانی، بوڑھاپے کی اب لڑائی ہے

انسان اپنی نوع کے اعتبار سے، مکمل مخلوق ہے مگر اکثر اس کا غرۂ کمال، تکبر کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

مجھے اس سلسلے میں مشہور فرانسیسی مصنف پیسکل (۱۶۲۳-۱۶۶۲) کا ایک قول یاد آگیا جو حسب ذیل ہے:۔

"انسان ایک سرکنڈے کے سوا کچھ نہیں۔ فطرت کا سب سے ناتواں سرکنڈا، لیکن وہ مفکر سرکنڈا ہے۔
کیا ضرور ہے کہ ساری ہی کائنات اُسے پامال کرنے کو مسلح ہو جائے، ایک ابخرہ، پانی کا ایک قطرہ، اُسے فنا
کرنے کو کافی ہے۔ لیکن جب کائنات اُسے پامال کر دیتی ہے تو انسان پھر بھی اُس چیز سے کہیں افضل
رہتا ہے جس نے اُسے فنا کیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں مر رہا ہوں اور یہ بھی جانتا ہے کہ کائنات مجھ
سے کہیں زیادہ قوی ہے، کائنات کو اس سب کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا۔"

پیسکل کا مشاہدہ ایک دقیق فلسفیانہ حقیقت ہے اور انسان کی عظمت و برتری کی ایک اہم اور اٹل دلیل ہے۔ نظیر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بتاتا ہے کہ انسان کا احساس عظمت، کبھی تکبر و خود نمائی کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ نظیر نے اوپر کے بند میں، اسی تکبر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسرے اور تیسرے بندوں میں جوانی اور بڑھاپے کے مزاج کا تقابل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جوانی اپنی جوانی میں ہو رہی سرشار — بوڑھاپا، اپنے بوڑھاپے کا ہو رہا دم مار
ہوئے ہیں دونوں جو لڑنے کے واسطے تیار — ادھر جوانی نے کھینچی ہے آ سپر تلوار
بوڑھاپے نے بھی ادھر لاٹھی ایک اٹھائی ہے

ادھر ہے تیر سا قامت ادھر ہے پشت کماں — ادھر ہے کبڑی کمر اور ادھر اکڑ کی شاں
جوانی کہتی ہے بڑھ کر سن لے بوڑھاپے میاں — تری ہے خیر اسی میں کہ جا سرک اب ہاں
وگرنہ تیری اجل، میرے ہاتھ آئی ہے

ان بندوں میں متقابل الفاظ اور جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ جوانی، سرشار ہے اور بوڑھاپا دم مارتا ہے، جوانی سپر تلوار، کھینچتی ہے اور بوڑھاپا لاٹھی اٹھاتا ہے، جوانی کا قامت تیر کی طرح سیدھا ہے اور بوڑھاپے کی پیٹھ کمان کی طرح خم ہے، جوانی میں اکڑ کی شان ہے، بوڑھاپے کی کمر کبڑی ہے۔ ان اسالیب اور محاوروں

کے استعمال سے جوانی کے جوش وخروش اور بوڑھاپے کی متانت وسنجیدگی کی سچی مصوری کی ہے۔ چوتھے بند میں خالص جوانی کا کردار پیش کیا ہے اور چھٹے میں "کان مروڑنا" لکھ کر بوڑھاپے کی بزرگانہ اعتدال پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ساتویں میں جوانی، بوڑھاپے کی ڈاڑھی پر طنز کرتی ہے اور آٹھویں میں بوڑھاپا، جوانی کو مونچھ اکھاڑنے کی دھمکی دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں، مونچھ، جوانی اور آبرو کی علامت وطرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے بوڑھاپا، مجبور ہو کر، اسی خصوصیت پر حملہ کرتا ہے جس پر جوانی کو سب سے زیادہ ناز وغرور ہے۔ نویں بند میں، جوانی، بوڑھاپے کے جینے کو بے حیائی بتاتی ہے۔ دسویں میں بوڑھاپا اس کا جواب دیتا ہے اور اپنی دلیل کو ضرب الامثال سے قوی اور قابل قبول بنا کر پیش کرتا ہے۔ گیارھویں بند میں، بوڑھاپے نے، جوانی کے متعلق، ایک نہایت دل شکن حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

تری جو پوچھو تو ہے چار دن کی سب کو چاہ جہاں تو ہو چکی، بس ہے گا تیرا حال تباہ
ہمیں ہیں وہ جو کریں ہیں تمام عمر نباہ تو ٹک تو دیکھ، گریبان میں ڈال کر منہ آہ
کہ اب ہے کس میں وفا، کس میں بے وفائی ہے

بارھواں بند لاجواب ہے۔ ملٹن نے اپنی مشہور نظم کومس میں، بدی کی طرف سے، جو دلائل، خود کومس کی زبان سے پیش کئے ہیں وہ بادی النظر میں، نیکی کے دلائل سے زیادہ قوی ہیں۔ ایسی ہی دلیل، نظیر نے، جوانی کی طرف سے، اس بند میں پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

جوانی جب تو یہ بولی بوڑھاپے سے سن کر تیری وفا سے، مری بے وفائی ہے بہتر
میں جب تلک ہوں بہاریں مزیں ہیں سرتاسر جو سلطنت ہو گھڑی بھر تو وہ بھی ہے خوش تر
مزے تو لوٹ لئے گو کہ پھر گدائی ہے

جس طرح بارھویں بند کی بنیاد، ابیقورس کے فلسفے کے سطحی مفاہیم پر قائم ہے، اسی طرح تیرھواں بند رواقیوں کے نقطۂ نظر سے متاثر ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کہا بوڑھاپے نے سن کر وہ سلطنت ہے کیا — کہ جس کے سات لگا ہو زوال کا دھڑکا
ہمیں ملی ہے بزرگی کی وہ سند اس جا — کہ جب تلک ہے، رہے گی ہمارے ساتھ سدا
خدا نے ایسی ہی دولت ہمیں دلائی ہے

ٹھارویں بند میں بوڑھاپے کی خلقی فراست وزیرکی، مصلحت اندیشی و تجربہ کاری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس صرعے سے کہ:-

ہم اپنی دھوکے کی ٹٹی میں کھیلتے ہیں شکار

سعدی کا یہ مشہور مصرعہ:-

جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

دآجاتا ہے۔ بیسویں اور اکیسویں بندوں میں ہندوستان کی بازاری لڑائی کا سماں کھینچا ہے۔ بائیسویں بند میں ں بحث و تکرار کا نتیجہ نکالا ہے۔ اس بند کا تصور، خاص نظیر کے حصے کی بات ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور عملی ملوؤں سے بیحد متاثر ہے اور درمیانی راستے کو زندگی کی مشکلوں کا حل سمجھتا ہے۔ جس طرح دو عالموں کے میان برزخ اور بہشت و دوزخ کے مابین اعراف کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے، اسی طرح جوانی اور بوڑھاپے کے میان ادھیڑپن کا وجود مسلم ہے۔ نظیر نے خود اپنے آپ کو، ادھیڑپن کے روپ میں پیش کیا ہے، یہ جوانی کو روکتا ر بوڑھاپے کو سمجھاتا ہے اور معاملے کو رفع دفع کر دیتا ہے۔ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ جوانی اور بوڑھاپا، نوں، اپنی اپنی جگہ زندگی کی اہم منزلیں ہیں اور ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں۔

بلدیوجی کا میلہ، ایک بیانیہ شاہکار ہے جس میں نظیر کی حاکیانہ فطنت، اپنی پوری قوت، سادگی اور تنوع ے ساتھ کارفرما ہے اور جس میں رسوم و رواج، کردار و خصائل، جذبات و تصورات اور مناظر و شواہد کی صورت گری ا معاشری مواد سے کی گئی ہے۔ یہ نظم برنس کی بعض نظموں سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں بھی ہندوستانی ندگی کی سادہ اور بے رنگ تصویریں، واقعاتی صحت اور شاعرانہ نزاکت و لطافت کے پس منظر میں، نظر آتی ہیں۔

بلدیو، ایک قصبہ ہے جو متھرا کے قریب ہندوؤں کا ایک مشہور تیرتھ ہے۔ بلدیو، کرشن جی کے بڑے بھائی بلرام کا لقب ہے اور انہی کے نام پر اس قصبے کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ میلے کے تنوعات کا ذہنی جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ چھوٹے پیمانے پر ایک دنیا تعمیر کرکے، زندگی کی کشمکش، گوناگونی، رواروی، نفسی نفسی اور "ہر کسے بہ خیال خویش خبطے دارد" کے جیتے جاگتے مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ میلے کی بھیڑ بھاڑ، ہجوم و انبوہ میں، ہر قسم ہر مذاق، ہر معاشرت کا انسان، اپنے رنگ میں رنگا، اپنے خیال میں گم اور اپنے حال میں مست نظر آتا ہے۔ حیات و مشاغل حیات سے شاعر کی محبت کا پورا ثبوت اس نظم میں موجود ہے۔ میلے کی چہل پہل اور وہاں کی آزاد و بشاش زندگی کو مصورانہ کے علاوہ، فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ صوفیانہ رموز کی وضاحت سے حقائق و معارف بھی بے نقاب کئے ہیں۔ سرسری نظر ڈالنے والے کو تعجب ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان شاعر، ہندو مذاق کے میلے کا حال ایسے شغف و انہماک، ایسی تفصیل و تشریح اور اتنی محبت و عقیدت سے کیونکر قلم بند کر سکا۔ لیکن یہ سمجھ لینے کے بعد کہ نظیر کا قلب صرف اسلامی قلب نہیں، انسانی قلب ہے اور اس کی ہمدردیاں مذہبی یا فرقہ وارانہ نہیں کائناتی ہیں، یہ تعجب بہت جلد دور ہو جاتا ہے۔ زبان کی سادگی و لطافت اور محاورے کی صحت و شیرینی، اس نظم میں عروج پر ہے۔ بعض لفظوں اور محاوروں کے استعمال پر نظیر کی انفرادیت کی مہر ثبت ہے۔ نظم کی بحر، مصرعوں کی بیساختگی اور بے تکلفی سے شیر و شکر ہو کر ایسی موسیقیت پیدا کر دیتی ہے جس کا اثر داخلی اور دائمی ہے۔ پہلا بند صوفیانہ ہے اور کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے ... ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے چنبیلی، بیلا ہے ... بھیڑ، انبوہ ہے، اکیلا ہے
شہری، قصباتی اور گنویلا ہے ... زر اشرفی ہے، پیسا، دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے ... بھیڑ ہے خلقتوں کا ریلا ہے

یک دل وخیل آرزو دل بہ چہ مدعا برم — تن ہمہ ریش ریش شد پنبہ کجا کجا نہم

تغزل کی یہ مثالیں کیسی لاجواب ہیں۔ مطلع میں شوق کی دنیا پنہاں نظر آتی ہے:۔

ہے اب تو وہ ہمیں اُس سرو سیم بر کی طلب — کہ طائران ہوا سے ہے بال و پر کی طلب

خواب کرجاتا ہے رم یک لخت آنکھوں سے نظیر — یاد آجاتی ہے جب ساقی کی چشم نیم خواب

جو کچھ ہے حسن میں ہر مہ لقا کو عیش و طرب — وہی ہے عشق میں ہر مبتلا کو عیش و طرب

اس مطلع میں معشوق و عاشق کے متبائن قلبوں کی کیفیت کے تقابل سے ان کے مطمئن بالذات ہونے کا کیسا اچھا ثبوت دیا ہے۔ تغزل کی اور لاجواب مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

بہ قول حضرت صائب ہزار حیف نظیر — کہ در بہار ندارم بہ کف بہائے شراب

جو اپنے یار کے جور و جفا میں ہیں مسرور — انھیں پھر اور کے جور و جفا سے کیا مطلب

دل سا در یتیم بکا اک نگہ کے مول — کیا کہیے خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

غش تھے معانقے کی تمنا میں ہم و لے — وہ بھی سُنا کہ اب کے ہوا ہار کے نصیب

کوچے سے اس کے آتا ہوں یوں ہو کے نا امید — نوکر شکستہ حال کو جیسے ملا جواب

ہیں گو کہ یوں تو اور بھی محبوب خوب خوب — لیکن اسی کو کہتے ہیں سب خوب خوب خوب

نظیر بھی تمھیں اب دیکھ کر یہ کہتا ہے — الٰہی خلق ہو اور میں ہوں اور مرا محبوب

یاد آتا ہے ہمیں جب وطن اپنا تو نظیر — سر کو حسرت سے پٹک کہتے ہیں ہم ہائے نصیب

تمھارے ہاتھ سے کل ہم بھی رو لئے صاحب — جگر کے داغ جو دھونے تھے دھو لئے صاحب

نظیر محفل میں گل رخوں کی جو ہم نے دیکھا تو ان سبھوں میں
فدا ہوا ہے دل اپنا جس پر اسی کی ہم کو خوش آئی صورت

آ گئے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کم بخت — اور تس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت

یارو ہمیں تکلیف نہ دو سیرِ چمن کی — آنے دو بلا سے جو بہار آئی ہے کم بخت

ان اشعار میں دل کو دُرِ یتیم بتانا، معانقے کی تمنا میں غش ہونا، نوکرِ شکستہ حال کی ترکیب مشرقی شعرا کے مزاج کے خلاف وطن کی محبت کا جذبہ اور بہار کو کم بخت کہنا تغزل اور حسن بیان کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ اور دلچسپ اشعار جن میں تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ملاحظہ ہوں :۔

وہ دیکھ جھڑکتا ہے ہم کو کر غصہ ہر دم اور ہمیں — ہے چین اسی کے ملنے سے زنہار نہیں گل اور طرح

ہمارے آگے نہ لو نام گل کوئی ورنہ — وہ گل بدن ہمیں آوے گا گل کے نام سے یاد

مے پرستوں میں ہے یوں ساغر و مینا کا وقار — جیسے اسلام میں ہے محتسب و صدر کی قدر

جوشؔ کا سارا رندانہ کلام اس ایک شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ تغزل کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

داغ مرنے کا وہی محروم جانے جس کو آہ — موت آ پہونچی شتاب اور یار آیا دیر کر

اتنا ہوں جائے رحم جو کرتے ہیں وہ جفا — تو اس سے رو کے کہتے ہیں اغیار بس جی بس

ہوں نا امید وصل سے یوں جیسے وقت نزع — رو کر کہے طبیب سے بیمار بس جی بس

ابھی تازہ حلقۂ زلف میں جو پھنسا ہے طائر دل بھلا — اُسے رنج پہونچے ہے اے صبا تو گھڑی گھڑی نہ ہلا قفس

لگا کے ٹھوکر ہمارے سر پر بلا تمھاری کرے تاسف — کہ ہم تو سمجھے ہیں اس کو دل سے تمھارے سر کی قسم نوازش

اٹھاویں ناز ان کے ہم نہ کیونکر نظیرؔ دل سے کہ جن کے ہوویں — جفا تلطف، عتاب شفقت، غضب توجہ، ستم نوازش

چھد گیا دل زباں تلک آتے — ہم نے جب کی نگہ کے تیر کی عرض

آفریں ہے دل پروانہ کو جس نے جل کر — حسن کی گرمیٔ بازار میں مشہور کی شمع

مستی کے سوا دور میں اس چشم سیہ کے — کافر ہو جو ہو گردشِ ایام سے واقف

مر کر بھی تہ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ — اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف

صیاد کی الفت میں پھنسے آن کے ورنہ — تھے کا ہے کو ہم اس قفس و دام سے واقف

جب سے مُوا ہے کوہکن کرتے ہیں اس کا غم سدا — کوہ سے کوہ، جُو سے جُو، سنگ سے سنگ، سل سے سِل

آوے اگر بتاں کے تئیں رسمِ دلبری — تو تو جہاں میں پھر کہیں ڈھونڈا نہ پائے دل
شیدا ہوں میں تو لیلیٰ و مجنوں کی چاہ پر — خالق نے کیا ہی خوب تھے ان کے بنائے دل
تھے اس کے پا کے آبلے چھاتی پہ اس کی آہ — کیا اتحادِ جسم تھا اور کیا صفائے دل
ہیں یہاں بڑے جو اہلِ دل اکثر یہ کہتے ہیں — چھوٹا سا اک نظیر بھی ہے خاکِ پائے دل

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم — بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم
مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں — دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مےخانے کو ہم
طاقِ ابرو میں صنم کے کیا خدائی رہ گئی — اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بت خانے کو ہم
کیا ہوئی تقصیر ہم سے تو بتا دے اے نظیر — تا کہ شادیِ مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم

ان اشعار میں جابجا میر کا سا تغزل جھلکتا نظر آتا ہے۔ "ہم" کی ردیف والی غزل اس قدر مشہور ہوئی کہ اکبرآباد اور قرب و جوار میں آج بھی خلائق کے زبان زد ہے۔ ذیل کی پوری کی پوری غزل تغزل کا ایک بے مثل گنجینہ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کبھو دیکھوں نہ سنبل باغ کو میں مجھے اس خمِ زلفِ دوتا کی قسم،
نہ نگہ کروں عارضِ گل کی طرف مجھے اس رخِ مہر و وفا کی قسم
یوں پھرے ہے چمن کی فضا میں ہوا، وہ ہزار طرح سے ہو نافہ کشا
مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا مجھے کوئے صنم کی ہوا کی قسم
جونہی آیا ادھر کو وہ چشمِ سیہ، وہیں لے گیا دل کو بہ سیرِ نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بتِ ہوش ربا کی قسم
بدن اس کا ہے روکشِ برگِ سمن، مرے بر میں جو آوے وہ رشکِ چمن

کھلے غنچۂ دل مرا گل کے تن تجھے اس کھلے بند قبا کی قسم

ترے عشق نے دل میں درد دیا تو کچھ اس سے مزا میں ایسا پایا
نہ کروں نہ کروں نہ کروں میں دوا میں نے کھائی ہے اب تو دوا کی قسم

لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ فشاں
وہ شفق ہے جو صبح کو ہووے عیاں سو وہ کھائی ہے اس کی حنا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں تو شرم حیا سے وہ سرد قریں
لیا نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں میں کہوں کیا اب اس کی حیا کی قسم

یہاں ایک اور پوری غزل نقل کرنے کو جی چاہتا ہے جس کی ردیف "بیچتا ہوں" ہے۔ اس ردیف سے مجھے فارسی کی ایک ردیف نی فروشم یاد آتی ہے جس میں خسرو یا حافظ کی غزل موجود ہے۔ نظیر نے اپنی غزل غالباً یہ غزل دیکھ کر کہی ہے۔ اس لئے اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو:-

بہ تیغ ادائے تو سر می فروشم   بہ نوکِ سنانت جگر می فروشم

اب نظیر کی غزل ملاحظہ ہو:-

نہ میں دل کو اب ہر مکاں بیچتا ہوں   کوئی خوب رو ہو تو ہاں بیچتا ہوں
وہ مے جس کو سب بیچتے ہیں چھپا کر   میں اس مے کو یارو عیاں بیچتا ہوں
یہ دل جس کو کہتے ہیں عرشِ الٰہی   سو اس دل کو یارو میں یہاں بیچتا ہوں
ق
ذرا میری ہمت تو دیکھو عزیزو   کہاں کی ہے جنس اور کہاں بیچتا ہوں
لئے ہاتھ پر دل کو پھرتا ہوں یارو   کوئی مول لیوے تو ہاں بیچتا ہوں
وہ کہتا ہے جی کوئی بیچے تو ہم لیں   تو کہتا ہوں لو ہاں میاں بیچتا ہوں
میں اک اپنے یوسف کی خاطر عزیزو   یہ ہستی کا سب کارواں بیچتا ہوں

جو پورا خریدار پاؤں تو یارو میں یہ سب زمین و زماں بیچتا ہوں
زمین آسماں عرش کرسی بھی کیا ہے کوئی لے تو میں لامکاں بیچتا ہوں
جسے مول لینا ہو لے لے خوشی سے میں اس وقت دونوں جہاں بیچتا ہوں
بکی جنس خالی دکاں رہ گئی ہے سو اب اس دکاں کو بھی ہاں بیچتا ہوں
محبت کے بازار میں لے نظیر اب میں عاجز غریب اپنی جاں بیچتا ہوں

اب جوش کی غزل ملاحظہ ہو، جو نظیر کے بعد لکھی گئی ہے :-

لئیموں میں داغ جگر بیچتا ہوں بہ نرخ خزف تاج زر بیچتا ہوں
جہاں سنگ ریزوں پہ گرتے ہیں گاہک وہاں جنس لعل و گہر بیچتا ہوں
جہاں قدرداں جمع ہیں تلخیوں کے وہاں قند و شہد و شکر بیچتا ہوں
جہاں خار و خس کی خریداریاں ہیں وہاں موج گلہائے تر بیچتا ہوں
پرستاریاں ہیں جہاں ظلمتوں کی وہاں نور شمس و قمر بیچتا ہوں
جہاں درد دل کا مخالف ہے عالم وہاں درد دل کا اثر بیچتا ہوں
جہاں جستجوئے سکون حضر ہے وہاں آرزوئے سفر بیچتا ہوں
جہاں سات پردوں میں رہتی ہے جرأت وہاں جذبۂ پردہ در بیچتا ہوں
جہاں پستیٔ بام و در ہے گوارا وہاں رفعت بام و در بیچتا ہوں
جہاں ہر کبوتر ہے قانع قفس میں وہاں دولتِ بال و پر بیچتا ہوں
جہاں برف و شبنم سے وابستگی ہے وہاں ذوقِ برق و شرر بیچتا ہوں
جہاں سست و پا شل ہیں پسپائیوں سے وہاں تیغ فتح و ظفر بیچتا ہوں
جہاں ترک یک مو بھی ممکن نہیں ہے وہاں خواہشِ ترکِ سر بیچتا ہوں

جہاں اُنس ہے تنگ دامانیوں سے ۔۔۔ وہاں وسعتِ بحر و بر بیچتا ہوں
چھپا کر ردیف و قوافی کے اندر ۔۔۔ میں دل بیچتا ہوں جگر بیچتا ہوں
گدا ہوں مگر وہ گدائے غنی ہوں ۔۔۔ کہ تاج و کلاہ و کمر بیچتا ہوں
صدا دو کہ بازارِ نوعِ بشر میں ۔۔۔ تمنائے روحِ بشر بیچتا ہوں
نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت ۔۔۔ کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں
کوئی مشتری ہو تو آواز دیدے ۔ ۔۔۔ میں کم بخت جنسِ ہنر بیچتا ہوں

سخن کے ہیں یوں تو بہت جوش تاجر
مگر میں بہ نوعِ دگر بیچتا ہوں

میں ان تینوں غزلوں کے مشترکات و مختلفات پر فیصلہ دے کر قارئین کو ایک نقطۂ نظر سے مرعوب کرنا نہیں چاہتا فیصلہ ایک داخلی کیفیت ہے جس کا انفرادیت سے بیش از بیش تعلق ہے اور جو اگر بطونِ ذات و بطونِ موضوع کے تعاون سے پیدا نہ ہو تو ذہن کے صحت و رنشو و نما میں معین نہیں ہوتا۔ اس لئے خارجی فیصلے سے متاثر کرنا مفاد و دیانت دونوں کے خلاف ہے چنانچہ میں سلامت ذوق پر اس کا حصر کرتا ہوں مگر اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری نظر میں نظیر کی غزل کے تیسرے، چوتھے، آٹھویں، نویں اور دسویں شعروں کے درجے کا شعر فارسی استاد اور جوش دونوں کی غزلوں میں میسر نہیں آتا۔ تغزل کے اور اعلیٰ نمونے ملاحظہ ہوں :۔

چاہت کے اب افشا کن اسرار تو ہم ہیں ۔۔۔ کیوں دل سے جھگڑتے ہو گنہگار تو ہم ہیں

کہیں بیٹھے دیئے دل اب مجھے جو اس ٹک میں بچا کروں ۔۔۔ نہیں تاب مجھ میں کہ جب تلک تو بچھرے تو میں بھی پھرا کروں
جو نہی بوسہ میں نے طلب کیا تو کہا تجھے تو نہیں ہے ڈر ۔۔۔ مجھے خوف ہے کہ مبادا اگر کوئی دیکھ لے تو میں کیا کروں
مجھے مدتوں سے ہے درد دل جو کہا کچھ اس کا علاج کر ۔۔۔ تو کہا کہ اس کی دوا یہ ہے تو کہا کرے میں سنا کروں

ان تین شعروں میں میر کا رنگ ہے۔ دوسرے میں عورت کی فطرت کی سچی مصوری ہے۔ اب تغزل میں خالص نظیر کے رنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں :۔

عبث چمن میں نہیں گل عذار آتے ہیں / گلوں کو اپنی دکھانے بہار آتے ہیں
جو سادی وضع میں کل لے گئے تھے ہوش و دل / سنا ہے آج وہ کر کر سنگھار آتے ہیں

قسم ہے چشم گلابی کی تیری اے گل رو / کہ یہاں کھنچے ہے بڑا انت گلاب آنکھوں میں
خدا کی بات جنھیں بات بھی نہ آتی تھی / وہ اب کریں ہیں سوال و جواب آنکھوں میں

قدرت کہاں جو اس سے کہوں میں یہ بات آہ / صاحب تم ہی تو ڈال گئے ہو عذاب میں

لطف جو چاہت کے ہیں سو وہ جتانے نہیں / چاہ چھپی کیجئے تا کوئی جانے نہیں

قتل پر باندھ چکا وہ بت گمراہ میاں / دیکھیں اب کس کی طرف ہوتے ہیں اللہ میاں

جب سنتا ہے احوال مرا یوں کہتا ہے عیاری سے / ہے کون وہ اس سے ہم کو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں
دل پھنس کر اس کی زلفوں میں تدبیر رہائی کی مت کر / کب چھوٹے اس کے دام سے تو وہ دانا ہے نادان نہیں

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں / مے کہیں شیشہ کہیں، ساقی کہیں، جام کہیں

تلا نہ حسن تمھارا وگر نہ میزان نے / فلک کی، شمس و قمر لاکھ بار تولے ہیں

عافیت کی گر ہوا خواہی تمھیں ہے تو نظیر / تم ہوا میں، ہم سے بے دردوں کی مت برباد ہو

ڈر ہم کو بناوٹ کی اداؤں کا نہیں ہے / وہ آن غضب ہے جو خدا داد کوئی ہو

الفت کا تار توڑ کے جوڑا تو کیا ہوا / خوبی تبھی تلک ہے کہ جب تک نہیں گرہ
ڈوری کی یہ گرہ نہیں جو لے تو اس کو کھول / ناصح ہے میرے اُس کے تو اب ریشمیں گرہ

رفتار سے دلوں کو کچلتے ہیں وہ جو آہ / اپنا یہ بد چلن دل انھیں کا ہے خاک راہ
سچ پوچھئے تو اس میں خطا دل کی کچھ نہیں / خوباں کی شوخیاں ہی بڑھاتی ہیں دل کی چاہ

کُہنی کے التماس کا رہتا ہے جاں کو عزم ٹھوکر کے اشتیاق میں پھرتا ہے دل تباہ

ٹھوکر کا شعر میں ذکر ایک پُرانی بات ہے لیکن کُہنی کا ذکر نظیر کی ایجاد ہے۔ عرفی کی طرح، نظیر کو متوازن الفاظ اور جملوں کا بڑا شوق ہے۔ پہلے مصرعے میں "کہنی کا التماس" ہے تو دوسرے میں ٹھوکر کا اشتیاق موجود ہے۔ تغزل کی اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ہیں جو وہ کشتۂ شمشیر نگاہِ قاتل جاکے ان گنج شہیداں سے کہو عشق اللہ

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

پہلے شعر میں "عشق اللہ" نظیر کی ترکیب ہے اور دوسرے شعر میں "دل پانا" نہایت دلنشیں محاورہ ہے۔ تغزل کی اور اعلیٰ مثالیں ملاحظہ ہوں :-

کیوں نہ لالے کی طرح دل ہو ہمارا داغ دار کس مزے میں چھوڑ کر گلزار رخصت ہو چلے

آئنے کی قسم کھا کر پھر منہ بھی نہ دکھلایا سادہ جنھیں سمجھے تھے سو ان میں یہ فن نکلے

اب روئیے الفت کو یا ٹھوکیے قسمت کو جو قول کے پورے تھے، وہ عہد شکن نکلے

خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو مجھے بو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی

کہا جو تم نے کہ منکا ڈھلا تو آؤں گا ہے بات کچھ نہ کچھ اس میں بھی مکر و فن کی سی

ہنسے روئے پھرے رُسوا ہوئے جاگے بندھے چھوٹے غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

تفاوت کچھ نہیں گل چیں میں اور بے درد خوباں میں جو اس کے ہاتھ گل ٹوٹے تو ان کے ہاتھ دل ٹوٹے

جو تم زور آوری کرتے ہو ہم سے دل لگانے میں کسی نے دل لگایا ہے کہیں لوگو زبردستی

نظیر اب تو ہمارے بس میں ہے کچھ کہہ نہیں سکتا کرو جو ہو سکے تم سے زبردستو، زبردستی

جو تم نے پوچھا تو حرف الفت بر آیا صاحب ہمارے لب سے — سو اس کو سن کر ہوئے خفا تم نہ کہتے تھے ہم اسی سبب سے
جو ایک دلبر سے دل چھڑایا تو دوسرے سے وہیں لگایا — نظیر ہم تو رہیں خوشی سے جو چین لینے دے عشق بازی

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہش خون ہے — کچھ دیر نہیں لگنے کی یہاں صید زبون ہے
عشاق سے ملنے کی عبث پوچھو ہو ساعت — جب دل ادھر آجاوے وہی نیک شگون ہے

کاکل مشکیں کا تجھ کو شوق بیتابانہ ہے — اے دل صد چاک سچ کہہ دل ہے تو یا شانہ ہے
حال دل ہم نے کہا جس دم تو بولا سچ کہو — یہ کوئی قصہ نیا ہے یا کہن افسانہ ہے

ناگن ہے نئی زلف کی دل کیونکہ نہ ڈر جائے — یہ کاٹ بھی کھاوے سے جو کسی کو تو مکر جائے
شکل و بدن و زیور و پوشاک سب اس کی — اک عالم تصویر ہے جس جس پہ نظر جائے
ہے حسن پرستی بھی عجب چیز وفا کیش — دل پیر بھی ہو جائے تو اس کا نہ اثر جائے

پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو بڑے لوٹتے — اتنے میں ساقی نے دی اس سے کڑی اور بھی
عشق بھلا ہے تجھے زلف بتاں کی قسم — ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی

ان اشعار میں سے پانچویں شعر میں ''منکا ڈھلا'' بڑا حسین محاورہ ہے اور آخر شعر میں ''بھلا'' کا استعمال بڑا نادر اور نظیر کے حصے کی چیز ہے۔ نظیر کی غزلوں میں لگاوٹ، چوچلے اور چھیڑ چھاڑ کا مزہ بھی موجود ہے۔ معاملہ بندی میں بھی اسے پورا کمال حاصل ہے۔ راز و نیاز کا بھی وہ سچا مصور ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ سارے جزئیات بلا کسی تصنع اور خارجی آمیزش کے فطری سادگی کے ساتھ غزل کے قالب میں ڈھلے ہوئے میسر آتے ہیں۔

''سوجھی'' کی ردیف میں نظیر کی غزل کو جرأت اور انشا کی غزلوں پر کھلی ہوئی فوقیت ہے

شہباز[1] کے قول کے مطابق، جرأت خود اس زمین کا موجد ہے۔ اس سے پہلے ان قافیوں اور ردیف میں غالباً کسی استاد کی غزل موجود نہیں ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا بھی لطف سے خالی نہیں کہ جرأت

[1] زندگانیٔ بے نظیر صفحہ ۲۹۲۔

آخر عمر میں نابینا ہو گیا تھا ۔ مشہور ہے کہ ایک روز انشا سے ملاقات ہوئی تو جرأت نے کہا کہ سید صاحب، میں نے ایک مطلع کہا ہے، سنیئے، ابھی وہ اتنا ہی پڑھنے پایا تھا کہ :۔

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی

کہ انشا نے جو بےحد ظریف اور طبّاع انسان تھا بیساختہ کہا :۔

اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سوجھی

اس پر جرأت مارنے کو اٹھا اور مذاق یہیں ختم ہو کر رہ گیا ۔ اس واقعے کے بعد غالباً انشا نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہو ۔

انشا کی غزل ملاحظہ ہو :۔

پھبتی ترے مکھڑے پہ مجھے حور کی سوجھی
لا ہاتھ ادھر دے کہ بہت دور کی سوجھی

ٹک دیکھیے گا جبّہ و عمامۂ زاہد
ہے اس پہ مجھے بلعم باعور کی سوجھی

کیوں میں دل پر آبلہ پر تاک نہ باندھوں
ہے اس پہ مجھے خوشۂ انگور کی سوجھی

ہے شیخ سیہ چہرہ جو مجلس میں پھُدکتا
یاروں کو یہاں ردئی کے لنگور کی سوجھی

واعظ جو پڑھا جن بجتر ہے نہایت
اس پر مجھے شیطان کے ہے پور کی سوجھی

ہاتھ اپنے سے جب چھٹ گئی اس ڈنڈ کی مچھلی
تب اس کے تڑپنے پہ سقنقور کی سوجھی

ہاں لے شفق صبح تری دیکھ کے رنگت
شنجرف کی سوجھی مجھے کافور کی سوجھی

جب پھول جھڑے نور کے اس آہ سے میری
اس پر مجھے انشا شجرِ طور کی سوجھی

اب نظیر کی غزل ملاحظہ ہو :۔

دیکھ عقد ثریا ہمیں انگور کی سوجھی — کیوں بادہ کشو، ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی
موسیٰ کے تئیں گو شجر طور کی سوجھی — پر ختم رسالت کو بہت دور کی سوجھی
ہم نے تو اسے دیکھ کے جانا کہ پری ہے — پریوں نے جو دیکھا تو انھیں حور کی سوجھی
غش کھا کے گرا پہلے ہی شعلے کی جھلک سے — موسیٰ کو بھلا کہئے تو کیا دور کی سوجھی
دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا — بلور کی چوکی پہ جھلک نور کی سوجھی
سر پاؤں سے جب پھنس گئے اس زلف سیہ میں — تب ہم کو سیاہی شب دیجور کی سوجھی
جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت — کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سوجھی

مصنوع میں صانع نظر آوے تو نظیر آہ
نزدیک ہی کیا ہے کہ جہاں دور کی سوجھی

اتفاق سے دونوں غزلیں آٹھ آٹھ شعروں کی ہیں اور دونوں میں کئی کئی قافیے مشترک ہیں۔ دو استادوں کا تقابل کچھ بہت زیادہ مفید اور خوش آیند بات نہیں ہے، لیکن یہاں فرق اس قدر نمایاں ہے کہ خود زبان حال سے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

انشا کی غزل اول سے آخر تک ذہنی ورزش کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ الفاظ اور قوافی نہایت غیر شاعرانہ ہیں اور تغزل کا دور دور پتہ نہیں۔ آخر شعر کے دوسرے مصرعے اور مقطع میں قدرے قلیل تغزل ہے مگر وہ اتنا بھونڈا اور دور از کار ہے کہ قلب کو متاثر نہیں کرتا۔ ساری غزل کا لب و لہجہ نہایت عامیانہ ہے اور تعقید تو اتنی پیش پا افتادہ ہے کہ خاص توجہ دلانے کی بھی ضرورت نہیں۔ بلعم باعور، لنگور، تور اور شقنقور کے قافیے والے شعر تو تغزل کیا معنی خود شعریت سے اتنے دور ہیں کہ صرف موزونیت کی بنا پر شعر کہے جا سکتے ہیں۔ اس غزل کو آورد و تصنع کی شاعری کی سچی مثال کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

نظیر کی غزل، آمد و بیساختگی، سلامت و روانی، تازگی و شگفتگی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے

انداز بیان کو انشا کے بیان پر نمایاں فوقیت ہے۔ اس کے مصرعے، اتنے صاف اور سیدھے، ایسے بے تکان اور بے تصنع ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ ان کو گھڑنے یا موزوں کرنے میں کسی جد و جہد سے کام نہیں لیا گیا۔ ہر مصرع اتنا چُست ہے کہ کانٹے کا تُلا معلوم ہوتا ہے۔ سادگی اور صفائی کا یہ عالم ہے کہ نثر کرنے کے لئے الفاظ کی نشست میں کوئی تغیر نہیں کرنا پڑتا۔ شاعری کا یہ انتہائی کمال ہے کہ شعر، نثر کی ترتیب میں کہا جاسکے۔ ان محاسن کے دوش بدوش، غزل میں، تغزل کٹ کٹ کر بھرا ہے۔ کوئی شعر اس سے خالی نہیں۔ لیکن یہ شعر:۔

دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا　　　بلور کی جو کی پہ جھلک نور کی سوجھی

اپنے تخئیل کی ندرت، تشبیہ کی تکمیل، کیفیت کی لطافت، بیان کی شگفتگی اور مصوری کی قوت کے اعتبار سے، دنیا کے بہترین ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ذیل کا شعر:۔

جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت　　　کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سوجھی

بھی اپنی قسم کا لاجواب شعر ہے۔ ایسے اہم مسئلے کو اس مزے سے بیان کردینا، نظیر ہی کا کام ہے۔ مقصدی زہد پر دوسرے شعرا نے بھی طنز کیا ہے مگر ایسا لطیف طنز بہ مشکل میسر آتا ہے۔ غالب کا یہ شعر:۔

کیوں زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی　　　پاداش عمل کی طمعِ خام بہت ہے

اور عمر خیام کی یہ رباعی:۔

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست　　　تاریک دلم نورِ صفائے تو کجاست

مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی　　　ایں مزد بود لطف و عطائے تو کجاست

اسی مسئلے سے متعلق ہیں لیکن بیان میں یہ سادگی اور طنز میں یہ لطافت نہیں ہے۔ ان حالات میں، اس کا سخت تعجب ہے کہ آزاد کو یہ غزل نظر نہ آئی۔ آب حیات میں جہاں جرأت، انشا اور مصحفی کے کلام کا تقابل کیا گیا ہے وہاں اس غزل کا بھی حوالہ دیا جاسکتا تھا۔ اگر تقابل کیا جاتا تو آزاد غالباً یہ دکھانے پر مجبور ہوتا کہ نظیر جس پر عمومیت و ابتذال کا الزام لگایا جاتا ہے، انشا جیسے مسلّم الثبوت استاد کے مقابلے میں ان معائب سے کتنا بری ہے۔

نظیر کے تغزل کے اور نمونے ملاحظہ ہوں :۔

ہے تو مختار جو کچھ چاہے سو کر ناز و غرور — کشور دل میں پھری اب تو دہائی تیری
کل جو گلشن میں گیا میں کہ ذرا غم بھولے — وہاں بھی ہر گل نے مجھے یاد دلائی تیری

ہے سب سے تو ایما و اشارات و لیکن — رہتی ہے پھری ابروئے خمدار ہمیں سے
محفل میں جو دیکھا تو ادھر تم ہو خفا اور — ساقی کو بھی ہے حجت و تکرار ہمیں سے
سمجھے گا جو رتبے کو نظیرؔ اہل وفا کے — تو ملنے لگے گا وہ طرح دار ہمیں سے

گو میں جفا سے مر گیا رگ رگ کے روسیاہ — پر شکر ہے وفا تو ہوئی سرخ رو مری
اس کی جبین پاک پر اس دم تک لے نسیم — کافر ہوں گر پڑی ہو نظر بے وضو مری

نظیرؔ کے کلام میں جا بجا بڑی شیریں زبان اور نہایت پاکیزہ محاورے میسر آتے ہیں۔ آخر سے پہلے کے شعر میں رگ رگ کے معنی آہستہ آہستہ اور رگ رگ کر مرنے کے معنی گھل گھل کر مرنے کے ہیں۔ نظیرؔ پر مبتذل نسبت کا اتہام لگایا جاتا ہے۔ آخر شعر میں جس محبت کا معیار سامنے ہے، وہ نفس انسان کی پاک سے پاک تر محبت پر فوقیت رکھتی ہے۔ ذیل کی غزل، غالب کا سہل ممتنع یاد دلاتی ہے ملاحظہ ہو :۔

کیا ادا کیا ناز اور کیا آن ہے — یہاں پری کا حسن بھی حیران ہے
حور بھی دیکھے تو ہو جاوے فدا — آج اس عالم کا یہ انسان ہے
اس کے سبز رنگ کی ہے چین میں دھوم — کیوں نہ ہو آخر کو ہندوستان ہے
جان و دل ہم نذر کو لائے ہیں آج — لیجئے یہ دل ہے اور یہ جان ہے
دل بھی دل سے ہے تصدق آپ پر — جان بھی سو جان سے قربان ہے
دل کہاں پہلو میں جو ہم دیں تمھیں — یہ تو گھر اک عمر سے ویران ہے
عقل و صبر و ہوش سب جاتے رہے — ہاں میاں اک ادھ موئی سی جان ہے

وہ اگر لینی ہو تو لے جائیے　　　خیر یہ بھی آپ کا احسان ہے
آن کر مل لو نظیر اپنے سے جان
اب وہ کوئی آن کا مہمان ہے

ان چند اشعار میں خاص نظیر کے تغزل کا لطف ہے۔ ملاحظہ ہوں:۔

سرشک چشم سے موتی بہت پروئے گئے　　　ولے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے
نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم　　　گئے تھے یار سے ملنے سو آپ کھوئے گئے

ہمیں اس غنچہ لب کی بات کیا دل سے لگی پیاری　　　کہ جس کو بے کلی لینی ہو وہ ہم سے کرے یاری
جو دل کے پینے والے ہیں وے ہی جاتے ہیں آخر　　　دھری رہتی ہے سب اپنی نگہبانی و ہشیاری
غرض میں تو نظیر اس سے یہ سمجھا ہوں کہیں شاید　　　کسی کا نیل بگڑا ہے کہ یہ طوفان جوڑا ہے

نظیر کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ کسی میں زبان کی شیرینی ہے، کسی میں محاورے کا لطف ہے، کسی میں لفظی رعایت، کسی میں کوئی نہ کوئی اور نکتہ موجود ہے۔ آخری شعر میں "نیل بگڑنا" محاورہ نظم کیا ہے۔ یہ محاورہ ذوق کے ایک قصیدے میں نظم ہوا ہے اور پرستاران ذوق کی طرف سے اس پر بڑا فخر کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کوئی فخر کی بات ہے تو نظیر اس کا بدرجۂ اولیٰ مستحق ہے۔ ذیل کی غزل میں کھرے تغزل کے دوش بدوش زبان اور محاورے کی نزاکتوں اور لطافتوں نے بیان کو نہایت دلنشیں و پُر اثر بنا دیا ہے۔

ملاحظہ ہو:۔

بنا کے منہ جو سراسر ہمیں بُرا کہیئے　　　تمھارا ہم نے بگاڑا ہے کیا، بھلا کہیئے
غرض تھی چاہ سے ہم کو سو ہم نے کی آگے　　　گناہ اس کو سمجھ لیجئے، خطا کہیئے
وفا جو ہم میں ہے کم سینکڑوں میں نکلے گی　　　اگر ہزار طرح ہم کو بے وفا کہیئے
صریح خوش تھے، ہمیں دیکھ کر ہوئے ناخوش　　　یہ اختلاط میں ہے کون سی ادا کہیئے

جو چاہے آپ کو دل سے، اُسے خفا کیجئے ... یہ ناروا ہے محبت میں، یا روا، کہئے
رہو خوشی سے تم اپنی، تو ہے مراد مری ... تمھارے دل کا جو کچھ ہو وہ مدعا کہئے
ہم آویں جاویں بھلا کیا خوشی سے آپ کے پاس ... نہ جانکا لئے لب سے کبھی نہ آ کہئے
جو لے کے دل کو کریں رات دن ستمگاری ... تو ننصفوا انھیں پھر کچھ نہ کہئے کیا کہئے

گلے کی داد نزاکت سے دیتے ہم بھی نظیر
پر اس صنم کا ہے نازک مزاج کیا کہئے

دوسری غزل کا گہرا تغزل ملاحظہ ہو:۔

جان بھی بہ جان ہے ہجر میں اور دل فگار بھی ... تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب کا تار تار بھی
طرفہ فسوں سرشت ہے چشم کرشمہ سنج یار ... لیتی ہے اک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی
کوچے میں اس کے بیٹھنا، حسن کو اس کے دیکھنا ... ہم تو اسی کو سمجھے ہیں باغ بھی اور بہار بھی
دیکھئے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گھات میں ... عشوۂ پُر فریب بھی غمزۂ سحر کار بھی
زلف کو بھی ہے دمبدم عزم کمند افگنی ... دام لئے ہے مستعد طرۂ تابدار بھی

گننے لگی وہ اپنے جب چاہنے والوں کو نظیر
اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کہ یار بھی

تغزل کے اور چند اعلیٰ نمونے ملاحظہ ہوں:۔

نہ کر پہلو تہی اس کے جفا و جور سے لے دل ... مزا کیا عشق کے آفات کا جب عافیت چاہی
بتوں کو دل دیا تھا تو نے اب دین کو بھی دے بیٹھا ... ارے کچھ تو خدا سے ڈر نظیر اتنی بھی گمراہی
جس مُنہ پہ جوشِ حُسن سے تل بھر بھی جا نہ ہو ... وہاں تل بھی آ پڑے تو یہ تل کا کمال ہے
شوق دیدار ہے یا جذبۂ الفت ہے غرض ... کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

یہ کس نے آج چمن میں قبا اُتاری ہے　　کہ جس کی بو سے ہر ایک گل کو بیقراری ہے
نہ برق میں ہے نہ سیماب میں نہ شعلے میں　　الٰہی دل کو کہاں کی یہ بے قراری ہے

کہہ کے اس قاتل نے آج ایک بات میرے سامنے　　دل کے دو ٹکڑے کیے ہیہات میرے سامنے
میں تو اس غماز کو کیا کیا سزا دیتا مگر　　کیا کروں منکر ہوا بد ذات میرے سامنے

گئی فلک تئیں پر اس کے دل میں راہ نہ کی　　ہماری آہ نے پیدا یہ دستگاہ نہ کی
ق
کہا میں یار سے اک دن کہ اے مہ تاباں　　ہماری شام کبھی تم نے صبح گاہ نہ کی
نہ ہم سے پیار نہ الفت نہ مہر نہ اخلاص　　جو سرسری سی نگہ گاہ کی تو گاہ نہ کی
یہ سن کے مجھ سے کہا یہاں بھی کچھ اجارہ ہے　　نہ کی تو چل بے نہ کی، واہ خواہ مخواہ نہ کی

یہ شعر نظیر کی زبان دانی کا معجزہ ہے۔ اس کی زبان اور بیان ٹھیٹ کوٹھے سے متعلق ہے۔ عاشق جب اپنی محبوبہ سے توجہ نہ کرنے کی شکایت کرتا ہے تو وہ اس کو ڈانٹتی ہے۔ پہلے مصرعے میں بڑے تیکھے پن اور منہ زوری سے یہ جتاتی ہے کہ مجھ پر کسی کا زور نہیں چلتا، میری خوشی ہے کہ توجہ کروں یا نہ کروں۔ پھر دوسرے مصرعے کے پہلے حصے میں بے مروتی کو تلخ تر بناتی اور ڈھٹائی سے اعتراف کرتی ہے کہ ہاں نہ کی۔ لیکن دوسری سانس میں، اسی لب و لہجے میں بات بدلتی اور عاشق کو جھٹلاتی اور بناتی ہے۔ واہ اور خواہ مخواہ کا استعمال یہاں بڑا معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو مجھے اختیار ہے کہ التفات کروں یا نہ کروں لیکن اس موقعے پر تو حماقت کر رہا ہے۔ میں نے ضرور تجھ پر توجہ کی نگہ کی مگر تو ہی اپنی حماقت سے نہ سمجھا۔ لفظوں کے الٹ پھیر اور لہجے کے تغیر و تبدل سے، اس شعر میں، پورے مکالمے کا لطف آتا ہے۔ یہاں دریا کو کوزے میں بند کر کے نظیر نے اپنی زبان دانی کا کمال دکھایا ہے۔ اب تغزل کے چند اور نمونے ملاحظہ ہوں:-

چھوڑ کے مجھ کو نیم جاں اب تو چلے ہو تم مگر　　دیر نہ کیجیو مہرباں، پھر یو ذرا شتاب سے
نہ بولا منہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری　　مگر کچھ کچھ، تبسم کی شکر، لب سے لگا ملنے

بہم ہوا تھا جو کچھ یاں طواف کعبے سے　　کرشمے نے وہ بتوں کے تباہ کی گٹھری
اب تو ٹک منہ کو دکھا یار کہ نرگس بن کر　　نکلے ہیں خاک چمن سے ترے حیران کئی
اس کے دامن سے لگوں پاؤں پڑوں ساتھ چلوں　　خاک ہوں تو بھی مرے دل میں ہیں ارمان کئی
جان کر گور غریباں میں قیامت نہ مچا　　ابھی سوتے ہیں ترے بے سر و سامان کئی
ہو چرب زباں سے نہ پری رویوں کی تسخیر　　یہ لوگ جو ملتے ہیں تو دل کششوں سے
مدت میں نظیر اس نے کیا، دل کے تئیں قتل　　صد شکر کہ ہم آج چھٹے سب خلشوں سے
ناز اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں لیکن　　لطف بھی ایسا اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے
زخم اس تیغ نگہ کا مرے دل نے ہنس کر　　اس مزے داری سے کھایا ہے کہ جی جانے ہے
ہم اشک غم ہیں اگر تھم رہے رہے نہ رہے　　مژہ پہ آن کے ٹک جم رہے رہے نہ رہے
یہی ہے عزم کہ دل بھر کے آج رو لیجے　　کہ کل یہ دیدۂ پُرنم رہے رہے نہ رہے
ہاتھ ٹوٹیں تیرے گل چیں تو نے کیوں توڑے وہ گل　　حیف کیا گلشن ہوا برباد، تیرے ہاتھ سے
میں دست و گریباں ہوں دم بازپسیں سے　　ہمدم اُسے لانا ہے تو لا جلد کہیں سے
گئی گزری وہ اپنی مے کشی، لگی آگ جب سے فراق کی　　یہ جلے ہے دل سو کباب ہے، یہ سرشک چشم شراب ہے

نظیر کی غزلیہ شاعری میں مسلسل اور موضوعی غزل بھی میسر آتی ہے۔ اردو زبان میں نظیر سے پہلے، مسلسل غزل کسی نے نہیں کہی۔ اس کے قدما اور معاصرین کی غزلوں میں قطعے میسر آتے ہیں جن کی صورت یہ ہے کہ چند درمیانی یا آخری اشعار مربوط کر دئیے جاتے ہیں۔ نظیر کی اس نوع کی غزلوں میں قطعات کا بھی التزام ہے جو قدیم طرز بیان سے مطابقت کرتا ہے مگر اس کی مسلسل غزل بالکل دوسری چیز ہے۔ اس نے مطلع سے مقطعے تک تسلسل پیدا کر کے بالکل ایک نئی صنف اردو زبان میں پیدا کی ہے جس کا انداز بیان جداگانہ ہے، اور جو بہر نوع روایتی غزل سے متمیز کی جا سکتی ہے۔ اس صنف میں، اس نے قطعوں کے علاوہ، عشق

کی واردا تیں برملا پیش کی ہیں، معاملہ بندی کی ہے محبت کے چوچلوں کی تصویریں بنائی ہیں اور راز و نیاز کی حقیقی فطرت بے نقاب کی ہے۔ ان سب سے بالاتر یہ ہے کہ کردار اور سراپے نقش کئے ہیں۔ اکثر کوئی نہ کوئی ضرب المثل یا کہاوت بھی نظم کر دی ہے۔ ان غزلوں میں جگہ جگہ مکالمے اور ڈرامے کا لطف بھی موجود ہے۔ مسلسل غزل کے علاوہ، نظیر کے کلام میں موضوعی غزل بھی میسر آتی ہے۔ یہ اول سے آخر تک ایک موضوع پر ہوتی ہے۔ اس کا پیکر تمام و کمال غزل کا پیکر ہے اور غزل کے خلاف یہ ایک موضوع کی حامل ہوتی ہے۔ مسلسل غزل سے، اس صنف کو متمیز کرنے کے لئے، یہ نام وضع کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی میں اقبال نے چند اور جوش نے بہت سی مسلسل اور موضوعی غزلیں کہی ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ جوش اس صنف کا موجد ہے لیکن یہ خیال تاریخ ادب کے بدیہات کے سراسر خلاف ہے۔ اردو میں مسلسل اور موضوعی غزل کا موجد نظیر ہے۔ یہ دونوں اصناف صحیح معنی میں فطری عاشقانہ شاعری ہیں۔ جذبات کی لطافت و سادگی اور خیالات کی تازگی و شگفتگی نے ان میں طرفہ جاذبیت و اثر پیدا کر دیا ہے۔ ان میں امید و رجائیت کا عنصر نمایاں طور پر غالب ہے۔ یاس و قنوطیت اتنی کم ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان دونوں قسم کی غزلوں میں داخلی و معنوی کے علاوہ بہت سی خارجی و پیکری خوبیاں بھی ہیں۔ چنانچہ بلاغت کے بہت سے دقیق محاسن کے ساتھ جن پر یہاں بحث نہیں کی جا سکتی، صنعت لف و نشر جابجا پائی جاتی ہے۔ ان غزلوں میں تشبیہیں اور استعارے بھی بڑے پُر کیف اور اکثر بالکل نئے ہیں۔ وہ مسی آلود لب کو نیلم سے تشبیہ دیتا ہے اور حقیقت سے کس قدر قریب ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کھُلی رُخ پہ زلف پُرخم، مسی رشکِ رنگ نیلم غرض اس طرح کا عالم کہ پری کہے اہا ہا

بعض مثالیں خالص تغزل کی لاجواب ہیں ملاحظہ ہوں:۔

ہزاروں گل، ہزاروں گل بدن تو تے بنا ڈالے کوئی مٹی سے ایسے گل کھلا سکتا ہے کیا قدرت
پہلے جس آن تمہاری نے لیا دل ہم سے اب تلک مانگتے ہیں دل سے ہم اُس آن کی خیر

قصرِ نرگس سے گزر باغ و گلستاں سے نکل ہے وفا پیشہ تو مت کوچۂ جاناں سے نکل

مسلسل غزلوں کے سلسلے میں، دو غزلیں، نہایت دلچسپ ہیں۔ یہ دونوں مل کر، ایک مکالمہ بن جاتی ہیں اور ان کو پڑھتے وقت ایک ایسا سماں بندھ جاتا ہے جو بہترین قسم کے ڈرامائی منظر کا نعم البدل بن سکتا ہے۔

پہلی غزل جس کا مطلع یہ ہے :-

ہر آن تمھارے چھپنے سے ایسا ہی اگر دکھ پائیں گے ہم تو ہار کے آخر اس کی کبھی تدبیر کوئی ٹھہرائیں گے ہم

عاشق کی زبان سے کہی گئی ہے۔ دوسری غزل جس کا مطلع یہ ہے :-

تدبیر ہمارے ملنے کی جس وقت کوئی ٹھہراؤ گے تم ہم اور چھپیں گے یہاں تک جی، جو خوب ہی پھر گھبراؤ گے تم

معشوق کا جواب ہے۔ ذیل میں دو اور غزلوں کے مطلعے درج کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہوں :-

نہ لذتیں ہیں وہ ہنسنے میں اور نہ رونے میں جو کچھ مزا ہے ترے ساتھ مل کے سونے میں

گر کسی صورت سے وہ صورت دکھا جاتے ہیں تو غم و درد آج یہ صورت نہ دکھلاتے ہمیں

ان غزلوں میں معاشرت اور کردار کی مصوری کے پہلو بہ پہلو، زبان کی شیرینی، محاورے کی ندرت اور حسنِ بیان کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور غزل کا مطلع ملاحظہ ہو :-

کہا جو ہم نے "ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو" کہا کہ "اس لئے تم یاں جو غل مچاتے ہو"

یہ غزل بھی مکالمہ ہے۔ اس کا التزام یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں عاشق کا سوال اور دوسرے میں معشوق کا جواب نظم کیا گیا ہے۔ ذیل کی غزل زبان کی سادگی اور محاورے کی لطافت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو :-

انداز کچھ اور ناز و ادا اور ہی کچھ ہے جو بات ہے وہ نام خدا اور ہی کچھ ہے

تغزل کی ایک اور اعلیٰ مثال سامنے آتی ہے۔ پوری غزل ایک کیفیت کی تصویر ہے اور اول سے آخر تک رجائیت سے لبریز ہے۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں "تو" کا استعمال توجہ طلب ہے۔ غزل

ملاحظہ ہو:-

پھڑکتی چشم ہے اور شوق بیتابی جتاتا ہے　　خوشی ہے جان بھی اور دل بھی نہیں پھولا سماتا ہے
نگہ بھی لحظہ لحظہ سوئے در آتی ہے سرعت سے　　خیال گوش بھی ہر دم طرف کھٹکے کے جاتا ہے
تو ہم مضطرب ہو دوڑتا ہے دمبدم کہہ کر　　چلیں دیکھیں کوئی تو حلقۂ در کھٹکھٹاتا ہے
نجومی خود بہ خود آ کہہ گیا خوش وقتیاں ہوں گی　　اُدھر کچھ زاغ بھی پیہم صدا اپنی سناتا ہے
شگوں جتنے معین ہیں جہاں میں شاد ہونے کے　　ہر ایک اُن سے بھی ہر ساعت بروئے کار آتا ہے
نگار خوش دلی کرتا ہے وا بند نقاب اپنا　　طرب سے دست عشرت بھی تکدر کو مٹاتا ہے

نظیر ایسی تو باتوں سے عیاں یہ ہے کہ وہ گل رو
کوئی دم یا کوئی پل میں ابھی تشریف لاتا ہے

ایک اور حسین مطلع ملاحظہ ہو:-

وہ صنم جو مہر عذار ہے اُسے ہم سے ملنے میں عار ہے　　ولے اپنا جو دل زار ہے وہ ہزار جان سے نثار ہے

نظیر، ہندوستان کے آب و گل کا فرزند ہے۔ وہ یہاں کے مناظر قدرت کا والہ و شیدا ہے۔ دھانی کرتی، اپنی محبوبہ کے گلے میں دیکھ کر، اُس کو دھان کا کھیت یاد آجاتا ہے۔ اس کا ایک نام انگریزی بلاغت میں لوکل کلر بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی　　دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

تغزل اور حسن بیان کی یہ مثالیں بھی لاجواب ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

ایام شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے　　کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اس وقت ہنر تھے

کل دیکھ کے اس کے عالم کو، ایک عالم کے اوسان گئے　　واللہ عجب کچھ عالم تھا، جو جان گئے سو جان گئے

موضوعی غزلوں میں بسنت، ہولی، برسات، پری، سمدھن، موتی، بے نظیر غزلیں ہیں۔ بسنت والی غزل تازگی اور شگفتگی میں لاجواب ہے۔ اس کا ہر ہر مصرع عاشق کے جذبات کی سچی تصویر اور لطافت و طراوت میں ڈوبا ہوا ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:۔

جوشِ نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا　　ہے طرفہ روزگار، طرب زا بسنت کا

نظیر کی بعض تشبیہوں سے وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ "پری" کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

پشت گلبرگ، شکم سیم، کمر تار نگاہ　　شانِ بلور، گلاوٹ میں ہر ایک ران پری

ہندوستانی شاعری میں، کم وبیش، سارے اعضائے جسم کی تشبیہ موجود ہے، لیکن پُشت کی کمیاب ہے۔ اس تشبیہ میں نظیر کو اختراع کا شرف بھی حاصل ہے۔ پُشت کو گلبرگ اور ران کو بلور سے تشبیہ دینا، نفاست پسندی اور نازک خیالی کی انتہا ہے۔ دونوں مثالوں میں، مشابہت ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ ایسی ہی تشبیہ کو تشبیہ تام کہا جاتا ہے۔ نظیر کا تغزل، نظیری، عرفی، بیدل، شیلی، کیٹس، ٹینی سن اور ٹیگور کے تغزل سے بہت مشابہ ہے۔ اس کے منتخب اشعار کا ان شعرا کے منتخب کلام سے، خوب مقابلہ ہوسکتا ہے۔

اس کی تضمینوں اور مستزادوں بھی اس کا "تغزل" پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔

فلسفیت

زندگی کے واقعات وحوادث کے مطالعے کے دوران میں، نظیر پر ایسے لمحے بھی طاری ہوجاتے ہیں جب وہ شواہد سے گہرے نتائج اخذ کرنے لگتا ہے۔ اس تگ ودو میں وہ حجابات کی تاریکی میں در آکر حقیقت کی کنہ تک پہونچتا ہے اور ایسی بنیادی بات ڈھونڈھ نکالتا ہے جو اعلیٰ فلسفی کی دور رس ودقیقہ رس نگاہوں سے ہی ممکن ہے۔ اس کے ضخیم کلام میں کوئی غزل یا نظم ایسی نہیں ملتی جو کوئی نہ کوئی دقیق فلسفیانہ نکتہ پیش نہ کرتی ہو۔ اس پر لطف یہ ہے کہ سارے نکات عام فہم انداز اور سادہ زبان میں پیش کئے گئے ہیں تاکہ عامۃ الناس کی سمجھ میں بھی آسکیں۔ جابجا اس نوع کے اشعار ملتے ہیں، جن میں شعری محاسن و لطائف کے ساتھ روزمرہ زندگی کا فلسفہ، بڑی قدرت وسہولت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ یہ کلام بیش از بیش

معلمانہ قدروں کا حامل ہے اور دنیا کے اعلیٰ ترین حقیقی و معیاری کلام کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعض اجزا یہ ہیں:-

گردوں نے ہم کو کیا نہ دیا اور کیا دیا — سب کچھ دیا اگر دل بے مدعا دیا
خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر — سوتے تھے لیکن عشق نے آ کر جگا دیا

دل بے مدعا کی خواہش اس نفس میں پیدا ہو سکتی ہے جس نے زندگی کے سارے مراحل و منازل طے کر کے، سکون و طمانیت کی منزل میں قدم رکھ لیا ہو۔ مقطعے میں "فراغت" کی بلاغت و وسعت داد سے مستغنی ہے۔ شعور حیات کو عشق کا مترادف قرار دینا، بصیرت کی انتہا ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے مفکرانہ اشعار، ذہن کو اہم فلسفیانہ مسائل کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ مثلاً:-

تن مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا — گیا وہ تو جس کا مزین بدن تھا
نظیر آ گئے ہم کو ہوس تھی کفن کی — جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

یہ مقطع ایک مشہور فلسفی کا قصہ یاد دلا دیتا ہے۔ اس کے خیالات سے اس کا سماج نفرت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ معاشری مقاطعے (سوشل بائیکوٹ) یعنی حقہ پانی بند کرنے کی دھمکی دی گئی۔ اس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ آخر لوگوں نے پوچھا کہ جب مرو گے تو دفن کون کرے گا۔ اس نے جواب دیا کہ تم ہی لوگ کرد گے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم سے یہ توقع نہ کرنا، ہم پاس بھی نہ کھڑے ہوں گے۔ اس نے ہنس کر کہا کہ جب مر کر سڑنے لگوں گا اور عفونت پھیلے گی تو وبا کے اندیشے سے تم ہی مجبوراً دفن کرو گے۔ اس نوع کے معارف کے علاوہ واجب الوجود اور ہمہ اوست کے مسائل پر بھی گہری نظر ڈالی ہے اور نتائج کو جگہ جگہ عام فہم انداز اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے۔ شعر کی اصل غایت اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا پیغام زیادہ سے زیادہ ذہنوں تک پہونچ سکے۔ ملاحظہ ہو:-

یہ کچھ بہروپ ہیں دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی — بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا، پھر سمٹ جانا
یہ یکتائی یہ یک رنگی تس اوپر یہ قیامت ہے — نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

نظیرؔ ایسا جو چنچل دلربا مہرو پیا ہووے ۔۔۔ تماشا ہے پھر ایسے شوخ سے سو دے کا پٹ جانا

اول کے دو شعروں کے کوزے میں مسائل و معانی کے سمندر بند کئے ہیں۔ ان سے وحدت الوجود، ہمہ اوست اور جزو کل کے قدیم مسائل پر جس طرح روشنی پڑتی ہے، اسی طرح ارتقا، انتخاب طبیعی، جہد للبقا اور خلافت الاوفق کے جدید مسائل کی بھی شرح و وضاحت ہوتی ہے۔ مقطعے کا بیان بہ ظاہر عامیانہ ہے لیکن اگر زندگی کے وسیع و طویل دوران، اس کی مشکلوں اور ان کے حل کا جائزہ لیا جائے تو اس شعر کی معنویت کے دفتر کھلنے لگتے ہیں۔ فلسفیت کی اور مثال ملاحظہ ہو:۔

ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آوے ۔۔۔ کہ ہم کو راہ میں ایک آشنا نے لوٹ لیا

اس شعر میں حیات کی ایک ایسی بالغ حقیقت اور زندگی کا ایک ایسا اٹل تجربہ بیان کیا ہے جس کی صداقت و اہمیت پوری زندگی بسر کر دینے کے بعد خود ہی واضح ہو جاتی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکروں نے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ شیکسپیر نے اپنے مشہور ڈرامے ہینری پنجم میں لورڈ اسکروپ نامی ایک کردار پیش کیا ہے۔ بادشاہ کو اس پر بڑا اعتماد تھا مگر آخر میں اس نے غداری کی۔ بادشاہ اسے مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

"لیکن آہ، میں اب تجھ سے کیا کہوں، اے لورڈ اسکروپ، تجھ ظالم، احسان فراموش، خونخوار غیر انسانی مخلوق سے، تو میرے سارے مشوروں کا رازداں تھا، تو میری روح کے سارے بھیدوں سے واقف تھا، میں تیرے لئے روؤں گا، کیونکہ تیری یہ بغاوت، میرے نزدیک انسان کی دوسری معصیت کے مماثل ہے۔"

سعدیؔ نے اسی خیال کو اس طرح باندھا ہے:۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند ۔۔۔ سعدیؔ از دست خویشتن فریاد

سعدیؔ نے، اپنی ذات کے علاوہ، خویشتن سے اقارب و آشنا کی ذات بھی مراد لی ہے۔ نظیرؔ کے شعر کا خیال تو زندگی کا ایک پرانا تجربہ ہے لیکن اس کے انوکھے بیان نے شعر کو ایک ادبی نادرہ بنا دیا ہے۔ زندگی کے لئے راہ کا استعارہ بہت پر معنی ہے اور اس راہ میں، آشنا، جیسے محبوب و معتمد کا لوٹ لینا قیامت ہے لیکن مصیبت

بالائے مصیبت یہ ہے کہ کوئی اس حادثے کا یقین کرنے کو تیار نہیں - ایک اور مثال ملاحظہ ہو :-

ٹھہرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیر
کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا

عشق کو نظیر زندگی کا مترادف سمجھتا ہے - مشرقی شاعری میں عموماً زندگی کے مصائب کی بڑی بڑی شکائتیں کی جاتی ہیں مگر وہ اس انداز بیان کا خوگر نہیں ہے - وہ زندگی کو دشوار گزار ضرور سمجھتا ہے، دوبھر نہیں سمجھتا - ساتھ ہی ساتھ اس پر اعتماد رکھتا ہے کہ اگر پامردی سے مقابلہ کیا جائے تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں - اور نادر مثالیں ملاحظہ ہوں :-

کس کس نے اس کے عشق میں مارا نہ دم ولے
سب چل بسے مگر وہ دل آرام رہ گیا

جس کام کو جہان میں آیا تھا تو نظیر
خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

پہلے شعر میں حسن کی ازلیت و ابدیت اور دوسرے میں عشق کی ناتمامی و نارسائی کی طرف اشارہ ہے - صوری اعتبار سے پہلے میں "دم مارنا" اور "دل آرام" اور دوسرے میں "کام" اور "خانہ خراب" حسن بیان کی پاکیزہ مثالیں ہیں - ایک اور فلسفیانہ شعر ملاحظہ ہو :-

میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اس کے ہاتھ میں
چاہا ادھر گھٹا لیا، چاہا اُدھر بڑھا دیا

اس شعر میں جبر و قدر کے مسئلے کو کیسی سہولت سے اور کیسے دل نشین و عام فہم انداز میں بیان کر دیا ہے - لطف یہ ہے کہ زندگی کو ایک ایسی معروف چیز سے تشبیہ دی ہے جس سے ہر اعلیٰ اور ادنیٰ واقف ہے اور تشبیہ کا حسن یہ ہے کہ تام ہو کر رہ گئی ہے - دوسرا شعر ملاحظہ ہو :-

دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیر
پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

اس شعر میں زندگی کو رجائیانہ نظر سے دیکھنے اور اس سے پورا پورا استفادہ کرنے کی تلقین ہے - زندگی کو ایک عذاب الیم بنا کر اس پر رونا دھونا اور گریہ و بکا کرنا نہیں سکھایا گیا - یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک قلیل مدت کا نام ہے اور ایک کاروباری انسان کی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے - یہ ایک نئی قسم کا شعر ملاحظہ ہو :-

دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیرؔ — پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہو گا

اس شعر میں زندگی کو رجائیانہ نظر سے دیکھنے اور اُس سے پورا پورا استفادہ کرنے کی تلقین ہے۔ زندگی کو ایک عذاب الیم بنا کر اس پر رونا دھونا اور گریہ و بکا کرنا نہیں سکھایا گیا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک قلیل مدت کا نام ہے اور ایک کاروباری انسان کی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ایک نئی قسم کا شعر ملاحظہ ہو:۔

آپ ہی سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا — آپ ہی کیا ہے اپنے گریبان کو ہم نے چاک

نظیرؔ کے کلام میں محبت اور جنسی محبت ہی کی ہر جگہ بھرمار نہیں۔ نفس انسان کے دوسرے اہم جذبوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ اس شعر میں حریت اور خود داری کا بلند معیار نہایت سادہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ فلسفیانہ کلام کی اور چند مثالیں یہ ہیں:۔

وصف اس کے حسن کا کس سے ہوا کُلّی مگر — جس کے جتنا فہم میں آیا کہا اچھا کہا

گزرے جو سوئے خانقاہ واں بھی بہ شکل جانماز — اہلِ صلاح و زہد کو فرش کیا، بچھا دیا

محو تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے — کون سا گل ہے پسِ پردۂ تقدیر کھلا

سنگ دل محبوب کو کہنا غلط تھا پر نظیرؔ — ہم نے جب جانا جب اس بے درد سے پالا پڑا

نیست رہتے ہم تو یہ سیریں کہاں سے دیکھتے — یہ فقط احسان ہے اس ذاتِ پاکِ ہست کا

ان اشعار میں بالترتیب، فہم انسان کے عجز، عشق کی نیازمندی، تدبیر کی عظمت، عملی زندگی کی اہمیت اور حیات کے سرور و انبساط کی طرف اشارہ ہے۔ اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں:۔

ساقی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب — پھر بزم ہو گی جب تو سمجھ لیجو جب کی جب

اس شعر میں زندگی کے ہر عالم کو اہم سمجھنے، اس میں دلچسپی لینے اور "آج جب سُو راج ہے" کے زریں و پُرمنفعت اصول پر عمل کرنے کی ہدایت کی ہے۔ دوسرے مصرعے سے کنایتاً حیات بعد الممات کا یقین دلایا ہے اور اگر معنی کو زیادہ وسیع کیا جائے تو تناسخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

بوسہ اس دل سے نہ کر لے دلِ افگار طلب
یہ زیادہ طلبی ہے نہ ہو دشوار طلب

آرزو خوب ہے موقع سے اگر ہو ورنہ
اپنے مقصود کو کم پہونچے ہیں بسیار طلب

ان اشعار میں جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کی تلقین کی ہے۔ روزمرہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے کیسا سچا اور کتنا عملی طریقہ ہے۔

کس سے کہیں کیا کریں یہ ہے تماشے کی بات
وہ تو ہے پردہ نشیں ہم ہیں تماشا طلب

غیر مفکر ذہن میں حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی خواہش اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان تعینات کے دائرے میں محصور ہے اور اس کے میلانات اسی دائرے میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس کی تشنگی اگر بجھ سکتی ہے تو حواس کے ذریعے بجھ سکتی ہے۔ چنانچہ غیر مفکر قسم کا انسان، خدا کو اپنے وجود پر قیاس کرتا ہے اور مجسم دیکھنا چاہتا ہے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ ذاتِ حقیقی، جسم سے منزہ اور غیر مرئی ہے۔ اس کو مجسم دیکھنے کی خواہش حماقت ہے۔

کمالِ عشق بھی خالی نہیں تمنا سے
جو ہے اِک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب

یہ شعر، نظیر کے معیاری اشعار میں سے ہے اور شاعر کے نفس کی طمانیت اور قلب کے سکون کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ نظیر کے نزدیک انسانیت کا کمال، عشق ہے اور عشق کا منتہیٰ یہ ہے کہ کوئی تمنا باقی نہ رہے۔ آہ میں اثر کی طلب دیکھ کر اس کو تعجب ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک عشق جب ہی کامل ہے جب آہ میں بھی اثر کی طلب باقی نہ رہے۔ یہ شعر طنز بالکنایہ کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب
دیکھا جو خوب ہم نے دنیا ہے جائے مطلب

جب حرف آبرو تک پہونچا نظیر تو پھر کیا کہئے ایسی جاگہ جز یہ کہ ہائے مطلب

ان دونوں شعروں میں مطلب کے فلسفے کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا کے سارے تعلقات کی بنیاد مطلب پر قائم ہے۔ مقطعے میں انسان کے نفس کی اس پستی پر ماتم کیا ہے کہ وہ مطلب برآری کے لئے بسا اوقات آبرو بھی قربان کر دیتا ہے۔ معیاریت کا دعویٰ یہ ہے کہ آبرو انسان کی اہم ترین دولت ہے۔ اس کے بچانے کے لئے جان بھی قربان کر دینی چاہیئے۔ لیکن نظیر حقیقت نگار شاعر ہے۔ وہ دنیا میں روزمرہ یہ ہوتے دیکھتا ہے کہ مطلب کے لئے آبرو کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی۔ نظیر کی بعض غزلیں پوری کی پوری فلسفیانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہ غزل ملاحظہ ہو:۔

بحر ہستی میں صحبتِ احباب یوں ہے جیسے بہ روئے آب حباب
بادۂ ناب کیا ہے خونِ جگر زردیٔ رنگ ہے شب مہتاب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں وہ بھی ہے ایک ہوائے خانہ خراب
حسن اور عشق جن کو کہتے ہیں شعلۂ برق و قطرۂ سیماب
گردش آسمان میں ہم کیا ہیں پر کاہ ہے میانۂ گرداب
عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے مثل تحریر موج، نقش بر آب
جسم کیا، روح کی ہے جولاں گاہ روح کیا ایک سوار پا بہ رکاب
زندگانی و مرگ بھی کیا ہیں ایک مثل خیال و دیگر خواب
فرصتِ عمر قطرۂ شبنم وصل محبوب، گوہر نایاب
قفس غم ہے مسکن وادی اشک حسرت بجائے دانۂ آب

سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیر دل کی کتاب

یہ غزل، فارسی اور اُردو کے قدیم وجدید سرمائے کے بہترین فلسفیانہ کلام کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے اور نظیر کی غزلیہ شاعری کا ایک شاہکار ہے۔ جو شاعر رقص و سرود کو ہوائے خانہ خراب، حسن کو خنطۂ برق، عشق کو قطرۂ سیماب، عمر کو تحریرِ موج، روح کو سوار پابہ رکاب، زندگی کو خیال، مرگ کو خواب اور فرصتِ عمر کو قطرۂ شبنم کہہ سکتا ہے وہ نہ صرف بہت بڑا شاعر ہے بلکہ دقیقہ رس فلسفی بھی ہے۔ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے کہ میکشی اور عبادت، ثروت اور عسرت، نظیر کی فلسفیانہ نظر میں ایک درجہ رکھتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

جو خانقاہ میں ہے پارسا کو عیش و طرب — وہ میکدے میں حلاوت ہے رند میکش کو
جو شاہ کو ہے وہی ہے گدا کو عیش و طرب — کمالِ قدرتِ حق ہے نظیر کیا کہیے

ذیل کے اشعار میں طمانیتِ نفس کے حقائق کو بے نقاب کیا ہے۔ نقطۂ نظر کی اہمیت اور انفرادیت کی قوت کی معجز نمائی کی طرف بے حد سادہ اور نہایت لطیف انداز میں توجہ دلائی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جو تشنہ دوالا ہے تری چاہ میں یارب — ہر چاہ میں ملتا ہے اُسے یوسف اقبال
وہ عیش نہیں خیمہ و خرگاہ میں یارب — جو خانہ بدوشی میں ہے طالب کو ترے عیش
ہر طور میں، ہر رسم میں، ہر راہ میں یارب — اپنا ہی طلبگار نظیر اپنے کو رکھیو

نظیر کے کلام میں کہیں کہیں معیاریت کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ جمالِ مطلق کی پرستش کا معیار کیسے حسین الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

انھیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب — فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے

بے مدعا ہو جانا غالباً انسانیت کے کمال کا منتہا ہے۔ نظیر نے جگہ جگہ نفس کی اس معیاری کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ تصور خالص مشرقی ممالک کے لئے مخصوص ہے۔ اہلِ مغرب کے لئے اس فلسفے کا سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا، بہت دشوار ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

درخت خشک کو نشو و نما سے کیا مطلب — نہال تازہ رہیں نامیہ کے منت کش

مشرقی شعرا اور فلسفیوں نے زندگی کو اکثر عالم خواب سے تشبیہ دی ہے، لیکن نظیر نے اس کو خواب درخواب کہہ کر نیا لطف اور بڑی جدت پیدا کی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل　　عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

زندگی کے حوادث کے جبر و تشدد اور حیات کی اٹل واقعیت کو کیسی دیانت، بے تلخی اور سادگی سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

الم میں چاہت کے اب ہماری بدل گئی ہے جو شکل ہمدم　　کسی کو پھر یاد کیا رہے جب ہمیں نے اپنی بھلائی صورت

آنی و وقتی یاس و ناامیدی، نظیر کے رجائیانہ نفس میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ خوشی اور رنج دونوں فطری جذبے ہیں۔ خوشی کی طرح، رنج بھی انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے لیکن اس کا خوگر ہو جانا اور اسے زندگی کا شعار بنا لینا قنوطیت اور غیر فطری ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اس جام نگوں سے مے راحت نہ طلب کر　　یہاں بادہ نہیں بادیہ پیمائی ہے کم بخت
توڑے ہیں بہت شیشۂ دل جس نے نظیر آہ　　یہ چرخ وہی گنبد مینائی ہے کم بخت

فلسفیانہ اشعار کے اور چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

نہ ہووے دل کی تکل کٹ کے برباد　　اگر ڈالے نہ وہ تار نظر پیچ

اس شعر کا انداز بیان خاص نظیر کے حصے کا ہے۔ تکل، اکبر آباد کی ایک خاص قسم کی پتنگ کا نام ہے۔ نظیر نے لفظ کئی مرتبہ استعمال کیا ہے۔ مشرق کے مفکر، زندگی کے تنوعات کو خدا کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر اس قدر عام ہے اور ایسی جڑ پکڑ گیا ہے کہ مشرق کے تمدن کا جزو اعظم بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ تصوف اور شعر کی دنیا میں بھی اس کو پورا دخل ہے۔ نظیر نے بارہا، اس طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر ملاحظہ ہو:۔

ہے کتنے دنوں سے عشق نظیر اس یار کا ہم کو جس کے ہیں　　صبح اور برن، شام اور پھبن، آج اور روش کل اور طرح
بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا　　صد شکر کہ ہے کاتب تقدیر کوئی اور

نظیر واقعیت کا شاعر ہے۔ وہ فطرت کے جمال و کمال کو جتنا محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے جبر و قہر سے بھی متاثر ہے۔ وہ اس کے اٹل اور ناگزیر قانون پر محض واقعے کی حیثیت سے نظر ڈالتا ہے اس پر آہ و زاری نہیں کرتا۔ ملاحظہ ہو:

پڑی ہے خاک گورستان میں کیا کیا قد موزوں پر　　اُگی ہے گھاس کس کس گل بدن کے روئے گل گوں پر

اپنے وسیع مشاہدے کے دوران میں نظیر کو طرح طرح کے آدمیوں سے سابقہ پڑا ہے۔ قسم قسم کے مزاج والوں سے واسطہ رہا ہے۔ وہ نہ اچھائی کی تعریف کرتا ہے نہ برائی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ نفس انسان کے تنوعات کی سچی تصویریں کھینچتا ہے۔ ملاحظہ ہوں :-

نظیر حضرت دل کا نہ کچھ کھلا احوال　　میں کس سے پوچھوں یہ ندرت آب ہے کیا چیز
جو سخت ہووے تو ایسا کہ کوہ آہن کا　　جو نرم ہووے تو برگ گلاب ہے کیا چیز
گھڑی میں سنگ، گھڑی موم اور گھڑی فولاد　　خدا ہی جانے یہ عالی جناب ہے کیا چیز

نفس کے تنوعات کی اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ہے تو کہنے کو ہر کہیں اخلاص　　لیک مشکل ہے ہم نشیں اخلاص
اس کی باریکیاں وہی جانے　　ہووے جس شخص کے تئیں اخلاص

اب تلک ذہن ہے حسن دنداں کی　　دیکھ اس پوپلے نظیر کی غرض

کیا تماشا ہے یارو کل تو نظیر　　تھا بہت خانقاہ سے محفوظ
آج بیٹھا ہے میکدے کے بیچ　　مغبچے کی نگاہ سے محفوظ

نظیر کی جمالیاتی حس نہایت دقیقہ رس ہے۔ وہ جمالیات میں در آتی ہے اور حسن مطلق کو بے نقاب دیکھتی ہے۔ اس کا حسن بیان بسا اوقات شعر میں پر لگا دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

چشم بد دور اسی رخ سے ہوئی تھی روشن　　مشعل وادیٔ ایمن شجر طور کی شمع

شرافت نفس کا اقتضا ہے کہ وہ انسان کو خود اپنے نفس کی عزت اور دوسرے سے اس کی توقع کرنا سکھاتی ہے۔

نظیر کو اپنی آبرو کا بڑا خیال ہے۔ وہ جناب امیر المومنین کی خدمت میں، صرف ایک التجا لے کر جاتا ہے۔ وہ یہ ہے:۔

آبرو رکھیو نظیر اپنے کی تم　　　یا امیر المومنیں شاہ نجف

عشق کی ازلیت و ابدیت اور جبر محبت کو کیسے لطیف کنایے میں ظاہر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کوئی نہیں کرتا جو کیا تو نے نظیر آہ　　　دل اس کو دیا جس کے نہیں نام سے واقف

انگریزی زبان میں ایک مشہور کہاوت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "کوئی بات کامیابی سے زیادہ کامیاب نہیں"۔ اردو میں بھی ایک مثل "چلتے کا نام گاڑی ہے" کم و بیش اس کی مترادف ہے۔ اس کہاوت کی روشنی میں، معاشرت کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے مسائل لایعنی اور بہت سے عقائد بے بنیاد نظر آنے لگتے ہیں۔ اتفاقیہ کامیابی بعض اوقات، اس حد تک پہونچ جاتی ہے کہ معمولی آدمیوں کو حکیم حاذق، مرشد کامل، صاحب کشف و کرامت کا لقب دیدیتی ہے۔ نظیر کی دقیقہ رس نگاہیں اس نکتہ کی حقیقت تک پہونچی ہیں۔ کہتا ہے:۔

جب دوستی میں قول کے پورے ہوں دونوں شخص　　　ہوتی ہیں پھر تو کیا ہی ملاقاتیں ٹھیک ٹھیک
جب بن پڑی تو شیخ جی شیخی نہ ماریں کیا　　　ہم سے بھی پھر تو ہو دیں کراماتیں ٹھیک ٹھیک
سچ ہے یہ قول حضرت سید نظیر آہ　　　بن آتی ہے تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

چند اور اشعار، جن میں فلسفیانہ جھلک ہے، ملاحظہ ہوں:۔

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل　　　اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم
دیوانگی میری سکے کیا تھم سے زنجیر سے شب و روز　　　ہے حلقۂ زنجیر سے زنداں ہمہ تن چشم
یہ ناز ہے یا استغنا ہے یا طرز تغافل ہے یارو　　　جو لاکھ کوئی تڑپے سسکے فریاد کرے کچھ دھیان نہیں

ذیل کے شعر میں محبت کی ازلیت کی طرف کیسا لطیف و عام فہم اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ہم تو اس کے چاہنے والے ہیں مدت سے نظیر
اور نیا کہتا ہے، اب تک وہ صنم چنچل ہیں

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں "اب تک" خصوصیت سے توجہ کے قابل ہے۔ اس جملے کی معنویت و وسعت نے اس شعر کو بیحد بلیغ بنا دیا ہے۔

نظیر نے زندگی کے فوائد و نعائم کی طرف متوجہ کر کے بار بار زندگی کی اہمیت سمجھانے پر اصرار کیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے کلام میں روایتی قنوطیت کے بھی کچھ اجزا موجود ہیں، لیکن یہ خال خال ہیں۔ اس کے کلام میں رجائیت کی روح سموئی ہوئی ہے اور وہ عام طور پر اسی کا جلوہ دکھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

جس قدر پینا ہو پی لے پانی ان کے ہاتھ سے
آب جنت تو بہت ہوگا، یہ پانی پھر کہاں

لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گی وہاں
پر یہ میٹھی گالیاں خوباں کی کھانی پھر کہاں

واں تو ہاں حوروں کے گہنے کے بہت ہوں گے نشاں
ان پری زادوں کے چھلوں کی نشانی پھر کہاں

الفت و مہر و محبت سب ہیں جیتے جی کے ساتھ
مہرباں ہی اٹھ گئے تو مہربانی پھر کہاں

واعظ و ناصح بکیں تو ان کے کہنے کو نہ مان
دم غنیمت ہے میاں، یہ نوجوانی پھر کہاں

جا پڑے چپ ہو کے جب شہر خموشاں میں نظیر
یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں

اس غزل میں اس نے کھل کر بتا دیا ہے کہ زندگی کو شادمانی پر ترجیح ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ زندگی خود سب سے بڑی شادمانی ہے۔ اس کو جنت میں جانے کا یقین ہے لیکن اس کے نزدیک محبوب کے ہاتھ کا پانی، آب جنت سے، خوباں کی میٹھی گالی، جنت کے لذیذ میوے سے اور پریزاد کا چھلا، حور کے گہنے سے کہیں بہتر ہے۔ وہ حاضر کو غائب پر اور حال کو مستقبل پر ترجیح دیتا ہے۔ زندگی کو جینے کے لئے سمجھتا ہے اور آیندہ کی

امید میں اس زندگی کو آزار نہیں بنانا چاہتا۔ اس غزل میں اس نے زندگی کی اہمیت اور حیاتِ بعد الممات پر، زندگی کی فوقیت کا گیت گایا ہے۔ اب ایک اور فلسفیانہ غزل ملاحظہ ہو:۔

لیتا ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں — اے یار میں تو کشتۂ روزِ الست ہوں
اک دم کی زندگی کے لئے مت اٹھا مجھے — اے بے خبر میں نقشِ زمیں کی نشست ہوں
مت مست کر شراب سے اے گلبدن مجھے — ظالم میں تیری چشمِ گلابی سے مست ہوں
دور از طریق مجھ کو سمجھ نہ زاہدا — گر تو خدا پرست ہے، میں بت پرست ہوں
ان سنگ دل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیرؔ — میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

اس غزل کا دوسرا شعر خصوصیت سے جلبِ توجہ کرتا ہے۔ بادی النظر میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ زندگی کو آنی و عارضی بتایا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیرؔ زندگی کے دوام کا معترف ہے اور نقشِ زمین کی نشست کی طرح اُس کو محکم و اُستوار سمجھتا ہے۔ چند اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں:۔

ہمارے قطرۂ اشک اُس کی سرد مہری سے — کسی زمانے میں موتی تھے، اب تو اولے ہیں

منظور ہوا دام میں جب دل کو پھنسانا — پھر وسوسہ کیا چاہیے صیاد کوئی ہو

مر کر بھی اپنا عقدۂ مشکل نہ وا ہوا — سچ پوچھیے تو کہتے ہیں اس کے تئیں گرہ

تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جور سے — بلبلِ تصویر و طاؤسِ خیال آئینہ

ہے اگر منظور سیرِ عالمِ حیرت نظیرؔ — تو دل اپنا کر تو محبوسِ خیال آئینہ

ذیل کے اشعار میں زندگی کو ایک سیر اور محبوب کی ملاقات کو آنی خوش وقتی بتایا ہے۔ اندازِ بیان نہایت لطیف و دلکش ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

آ گئے تھے سیر کرتے تم کو دیکھا خوش ہوئے — اب خدا حافظ ہے، ہم اے یار رخصت ہو چلے
گل رُخوں کی بزم میں کیا بیٹھتے ہو اے نظیرؔ — تم بھی رخصت ہو کہ اب سب یار رخصت ہو چلے

نظیر کی معاشرتی حس بہت قوی ہے۔ وہ بزم سے اس لئے رخصت ہونا چاہتا ہے کہ اس کے سب یار رخصت ہو گئے اور اب اس کے لئے بزم کے قیام میں کوئی لطف نہیں رہا۔ زندگی کی کوئی تلخ حقیقت جب اس کے سامنے آجاتی ہے تو اس کو ناگزیر سمجھ کر وہ قبول کر لیتا ہے مگر کوئی آہ وزاری، نالہ وبکا نہیں کرتا۔ نظیر کی واقعیت پسندی کی ایک اور فلسفیانہ مثال ملاحظہ ہو:۔

مر بھی جاویں گے تو جز پیرہن عریانی　　　آپ سے ہم نہیں لینے کے کفن یاد رہے

محبت کی ازلیت وابدیت کی ایک اور مثال جس میں حُسن بیان نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

یہ کہتے ہیں کہ عاشق چھوٹ جاتا ہے اذیت سے　　　جب اس کی عمر کو شکر اجل کا آن کر لوٹے
ہماری روح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں　　　نظیر اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

فراست اور دور بینی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

دست صیاد سے چھوٹے تو اُچھل پہلے بے　　　ورنہ کیا فائدہ اے آہوئے دل جستوں سے

زندگی خوشی خوشی بسر کرنے کا کیا اچھا انداز ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

جام نہ رکھ ساقیا شب ہے پڑی اور بھی　　　پھر جہاں کٹ گئے چار گھڑی اور بھی

چند اور اہم فلسفیانہ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں　　　وہ کہتے ہیں غافل یہ فنا ہے یہ بقا ہے

یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوش زد　　　آواز پا ہوئی نہ صدا سے درا ہوئی
جو شکل دور باش تھی روز نخست کی　　　اب بھی جو ہم گئے تو وہی بر ملا ہوئی

آخری شعر میں، نظیر نے یہ بتایا ہے کہ حقائق، ازل سے تعینات کے حجاب میں پوشیدہ ہیں اور ازل تک پوشیدہ رہیں گے۔ اس لئے اُن کے ڈھونڈھنے کی کوشش عبث ہے۔ حقائق سے یہاں مابعد الطبیعاتی

حقائق مراد ہیں، سائنٹفک حقائق مراد نہیں۔ چنانچہ زندگی کے واقعات سے دل لگانا اور زندگی کی جدوجہد کو مسرور و تابناک بنانا، رموز و حقائق کی تلاش سے بہتر و افضل ہے۔ چند اور فلسفیانہ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

هم اظہار تاسف سے نہ کرتے آج جاں کا ہی — اگر بے درد کے طرزوں سے ہوتی کچھ بھی آگاہی
گل سے کوئی کہے کہ شگفتن سے باز آ — اس کو تو پھولنا ہے نہ پھولے تو کیا کرے
جو نا قبول شے کے بنا یا قبول کو — پھر اس کو وہ بھلا نہ قبولے تو کیا کرے

ان دو شعروں میں، فطرت کی اصل قوت کو، شاعر کی طرح نہیں بلکہ ایک ماہر طبیعات کی طرح بیان کیا ہے۔ ان مقامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نظیر کو حقیقت و واقعیت سے کتنا شغف تھا۔ ذیل کے شعر میں جبر حیات کی طرف اشارہ ہے:-

جاگتا ہوں تو یہ کہتا ہے کہ جا سو بھی کہیں — اور جو سوتا ہوں تو ٹھوکر سے جگاتا ہے مجھے

ذیل کے پہلے شعر میں معاشرت کا ایک نکتہ بتایا ہے اور دوسرے میں کامرانوں کو ہدایت کی ہے کہ ناکاموں کو فراموش نہ کریں۔ ملاحظہ ہو:-

جاتی ہے قدر اس میں کچھ اچھا نہیں نظیر — گھر میں کسی کے دوڑ کے جانا گھڑی گھڑی
جلد اتنا نہ چل اے جلوہ دکھانے والے — ہیں نقاہت زدہ پیچھے ترے آنے والے

چند اور فلسفیانہ حقائق ملاحظہ ہوں:-

کہتے ہیں جس کو زندگی دم کی ہوا ہے اے نظیر — ہم کو تو آج کھل گیا عقدہ یہ اک حباب سے
اتنا نہ ہنس دل اس سے ایسا نہ ہو کہ خجل — لڑنے کو تجھ سے ہو وے تیار ہنستے ہنستے
کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں — آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے
ہے آج تو خوش پر نہیں بلبل کو یہ معلوم — کل سر کو پٹکنا ہے چمن کی روشوں سے
کوئی حجاب نہیں تجھ میں اور صنم میں نظیر — مگر تو آپ ہی پردہ ہے آپ ہی ٹٹی ہے

مسلسل اور موضوعی غزلوں میں فلسفیانہ اشعار کی گنجایش کم ہوتی ہے لیکن نظیر کی مسلسل غزلوں میں بھی کہیں کہیں فلسفیت کی جھلک موجود ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں :۔

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ　　سب ارض و سما کی ہے گلستان تماشا

ذیل میں ایک غزل کا مطلع درج کیا جاتا ہے :۔

وہ رشک خور جو وقت سحر بے نقاب تھا　　دیکھ اس کے رخ کو رو بہ زمیں آفتاب تھا

اس غزل کا بقیہ حصہ ایک قطعے پر مشتمل ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

ایک دن دل اپنا عیش گزشتہ کو یاد کر　　رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا

یہ پورا کا پورا قطعہ مشرقی فلسفیانہ شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ چند اور نمونے پیش کئے جاتے ہیں :۔

جدھر کو دیکھے ادھر آپ ہی بھٹکتا ہے　　مزا پڑے نہ اسے کیونکہ شیش محلوں کا

تو ہستی کی گرہ پر عقل کا ناخن نہ تو ڑے دل　　کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمہ را

ذیل میں ایک مسلسل غزل کا مطلع درج کیا جاتا ہے :۔

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب　　اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب

یہ ساری غزل بڑے حقائق و معارف کی حامل ہے اور پوری کی پوری فلسفیانہ رنگ میں ہے۔ ذیل کی غزل کا بھی یہی پرواز ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو :۔

کیا کاسۂ مے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں　　دور فلک سے کیا خبر پہونچے گا لب تک یا نہیں

فلسفیانہ رنگ کی ایک اور مسلسل غزل کا مطلع ملاحظہ ہو :۔

کیا کاسۂ مے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں　　دور فلک سے کیا خبر پہونچے گا لب تک یا نہیں

شعر کے سلسلے میں جب فلسفے کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ کوئی مربوط و منضبط نظریہ مدلل و مشرح

اندازبیان کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ اشعار جو حقائق و معارف کا جائزہ لیں، زندگی کی بنیاد پر نظر ڈالیں اور فکر کو بیدار کریں فلسفیانہ کہے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ چنانچہ نظیر کے بھی وہ اشعار جو فکر کے پہلو بہ پہلو، عبرت، غفلت، دور بینی، مآل اندیشی وغیرہ، نفس کے سنجیدہ جذبوں کو متاثر کرتے ہیں فلسفیانہ کہے گئے ہیں۔ ان میں کسی نوع کا مابعد الطبیعاتی فلسفہ تلاش کرنا بجا نہ ہوگا۔

فارسی ترکیب

فارسی ترکیب کی خلاقی کا فخر مومن اور غالب کی ذات سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ خیال تاریخی غلطی ہے اور عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ مرکبات بنانے اور انھیں مناسب موقعوں پر اردو شعر میں استعمال کرنے کا رواج نظیر نے پیدا کیا ہے۔ اس کے یہاں ترکیب کی وضع و قطع، اتنی خوش گوار اور دل پسند ہے کہ بار بار یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ خود ہی اس انداز بیان کا موجد ہے اور مومن و غالب نے اس کے کلام کے غائر مطالعے سے یہ فن حاصل کیا ہے۔ نظیر کی ساری فارسی ترکیبیں ایک جگہ جمع کی جائیں تو ان کا ذخیرہ مومن اور غالب کے مشترکہ سرمائے سے زیادہ ہوگا۔ لطف یہ ہے کہ ترکیبوں کا بیشتر التزام غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ چند ترکیبوں اور ان کے استعمال کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:۔

شورِ افگن جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا — رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبط آہ کرنا

شرمندۂ رفو نہیں عاشق کا چاک جیب — کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا

ذیل کی غزل کے سارے قافیے فارسی ترکیب کے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ نظیر کو اردو میں، فارسی ترکیب کا پیوند لگانے کی کیسی قدرت ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

زیرِ فلک وہ خلق ہوئے ماہ پارہا — دیکھے ہے جن کو رشک سے چشم ستارہا
ہے تو وہ مہرِ حُسن کہ ہر دم تری طرف — کل اخترِ سپہر ہیں گرم نظارہا
یوں سنگ ہجر توڑے ہے آئینۂ ہائے دل — مینا کے ٹکڑے کرتے ہیں جوں سنگ خارہا

پوری غزل کا یہاں نقل کرنا طوالت ہے۔ دوسری غزل کے چند شعر جو اسی نوع کے قافیوں میں ہیں نئی لذت کے حامل ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

ہیں دم کے ساتھ عشرت و عسرت ہزارہا — وابستہ ایک تارِ نفس سے ہیں تارہا
کچھ صید زخم خوردۂ جاناں ہمیں نہیں — ہر صید گہ میں اس کی ہیں بسمل ہزارہا
اس گل کے چاک جیب کی حسرت سے باغ میں — ہر صبح چاک ہوتی ہیں جیب و کنارہا
اس سوزنِ مژہ کے تصور میں شانہ سال — ٹوٹے ہیں ایک خلق کے پہلو میں خارہا
کس کس کی دیکھیے چمنِ صنع میں بہار — ہیں فقط دو چشم ہیں اور یہاں بہارہا

ان اشعار کا فارسی مزاج اور ان ترکیبوں کا نادر استعمال آپ اپنی شرح ہے۔ لیکن "صید زخم خوردۂ جاناں" اور "بہارہا" سے ثابت ہے کہ نظیر کو فارسی زبان اور محاوروں پر بھی کتنا عبور ہے۔ اور ترکیبیں ملاحظہ ہوں :-

دل فدا تجھ پہ جو اے سروِ گل اندام ہوا — حلقۂ زلفِ بتاں پھر اسے کب دام ہوا
ہو گیا دیکھتے ہی مشرقِ خورشید خجل — اس کفِ پا سے مشرف جو سرِ بام ہوا

اس ابروئے خمدار کی صورت سے عیاں ہے — خنجر کی شباہت، دمِ شمشیر کا نقشا
کیا گردشِ ایام ہے اے آہ جگر سوز — اب نظر آیا تری تاثیر کا نقشا

ذیل کے اشعار میں، ترکیبوں اور مرکب ترکیبوں کے علاوہ دوسرے شعر میں "رہے" کا استعمال بڑا شیریں ہے :-

عشق کا جو گلِ زخمِ دمِ شمشیر کھلا — رہ گیا جسم پہ مثلِ گلِ تصویر کھلا
طفلِ اشک اے مژہ چاہے کہ رہے تک تو اُسے — پیار سے مہر سے الفت سے بہ تدبیر کھلا
محو تدبیر ہیں ہم لیک خدا ہی جانے — کون سا گل ہے پسِ پردۂ تقدیر کھلا

ذیل کے اشعار کی بندش میں کس قدر فارسیت ہے :-

اک پردۂ ہستی نہ رہا جوں نظر آیا　　وہ پردہ براندازہمیں کیوں نظر آیا

جو وصفِ زلف کو پوچھا تو حلقے حلقے کو　　آب دمرجع وملجائے صد اسیر کہا

تو حُسن میں وہ مہر سپہر جمال ہے　　ہر روز جبہہ سا ہے ترے در پہ آفتاب

ہر لحظہ تیرے چہرۂ انور کے وصف میں　　یہ بیت پڑھ رہا ہے فدا ہو کر آفتاب

از بہر دفع چشم بد از روئے خوب تو　　سیارہا سپند شود، مجمر آفتاب

ذیل کی غزل پوری کی پوری فارسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ غزل اگر ان حضرات میں سے کسی کے سامنے پڑھی جائے جنھیں نظیر سے سرسری واقفیت یا سوئے ظن ہے تو ہرگز نہیں بتا سکتے کہ یہ اس اعجوبۂ روزگار شاعر کا کلام ہے جسے ہر طرح بات کہنے پر قدرت ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کچھ اسے شرم کچھ ہے ہم کو حجاب　　ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب

کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے　　یارمہ چہرہ اور شب مہتاب

زور کیفیتیں دکھاتے ہیں　　ساقیٔ گل عذار و بادۂ ناب

کرتے ہیں تار تار جیب الم　　تار قانون و بین و چنگ و رباب

وقت خلوت یہ ہم نے اس سے کہا　　اب تو ٹک منہ سے دور کیجیے نقاب

بولی ہم تو ابھی اٹھا دیں مگر　　لائیں کب آپ دیکھنے کی تاب

اور جب آجائے غش تمھیں تو نظیر
پھر چھڑکنا پڑے گا ہم کو گلاب

یہ غزل اپنے لب و لہجے اور پیکر کے اعتبار سے اعلیٰ فارسی شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہوئی اور معنوی اعتبار سے نظیر کی غزلیہ شاعری کا ایک شاہکار ہے۔ جو شاعر طرفہ عذاب، عشرت دو چند، یار مہ چہرہ، ساقی گل عذار، جیب الم، تار قانون و مین و چنگ و رباب، جیسے جملے وضع کر سکتا ہے اس کی فارسی دانی میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی ضرورتوں کے لئے فارسی جملے خود تراشے اور ترکیبیں خود وضع کی ہیں۔ بعض اور دلکش ترکیبیں ملاحظہ ہوں:-

پروانے سے عاشق کے تئیں شمع جلا کر ۔۔۔ پھر آپ بھی روتی ہے کھڑی بخت جلی چپ

ہے جو اس محبوب کی انگشتری در دست چپ ۔۔۔ رکھتی ہے کیا کیا نزاکت پروری در دست چپ
جس کماں کو کھینچتا ہے وہ بتِ ابرو کماں ۔۔۔ اس کے قبضے میں ہے سو زینت وری در دست چپ

ہو گئی باغ میں عطریت سنبل برباد ۔۔۔ نکہت اس زلف کی لے کر جو صبا آئی آج
جگر میں جوش تپش اور بہ لب ہجوم فغاں ۔۔۔ ہوئی ہے آج یہ کچھ اس کی ازدہام سے یاد
اس لطف سے جو مو قلم مانیٔ تقدیر ۔۔۔ کیا تاب جو کھینچے تری تصویر کوئی اور
اے شوخ ہر گھڑی نہ ہوس آشنا کو چھیڑ ۔۔۔ ایسا ہی چھیڑنا ہے تو اہل وفا کو چھیڑ
کتنا تنک صفا ہے کہ پائے نگاہ کا ۔۔۔ ہلکا سا اک غبار ہے چہرے کے رنگ پر
نظیر حضرت دل کا نہ کچھ کھلا احوال ۔۔۔ میں کس سے پوچھوں یہ ندرت مآب ہے کیا چیز

ان اشعار میں، بخت جلی، نزاکت پروری، بت ابرو کماں، زینت پروری، عطریت سنبل، بہ لب ہجوم فغاں، مو قلم مانیٔ تقدیر، ہوس آشنا، تنک صفا، ندرت مآب، لاجواب ترکیبیں ہیں اور مومن و غالب کی بہت سی ترکیبیں انہی سانچوں میں ڈھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فارسی ترکیب بنانے کا اسلوب غالب نے نظیر

سے سیکھا ہے۔ نظیر کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

گردہ مژہ ہو مائل جنگ پر طاؤس — تو سہم کے بے پر ہو، خدنگ پر طاؤس
یوں زلف عنبر کے خط سبز ہے نزدیک — گویا پر طوطی ہے بہ چنگ پر طاؤس
دیکھے جو ترے عاشق گل خوردہ کی تصویر — حیرت زدہ ہو دیدۂ تنگ پر طاؤس

نظیر کے اس نوع کے اشعار سے غالب کے وہ مغلق اشعار یاد آتے ہیں جو اس کا ابتدائی کلام بتائے جاتے ہیں:۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا
جراحت تحفہ، الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ — مبارکباد اسدؔ غم خوار جان دردمند آیا

یا

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے — داغ دل بیدرد نظر گاہ حیا ہے
قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ — اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

یا

نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب — پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نظیر کا یہ کلام، اس وقت کی پیداوار ہے جب غالبؔ، اس کے مکتب میں پڑھتا تھا اور اس کے ذہن پر اس نوع کے کلام کا نقش اول مرتسم ہوا۔ بچپن کے اثرات ہمیشہ قوی اور دیرپا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اس نے خود کہنا شروع کیا تو پہلے اسی انداز میں کہا اور پھر منجھتے منجھتے کلام نے وہ رنگ پکڑ لیا جو نظیر کے فارسی آمیز کلام میں پایا جاتا ہے۔ چند اور نادر ترکیبیں ملاحظہ ہوں:۔

اُٹھا دیں ناز اُن کے ہم نہ کیونکر نظیر دل سے کہ جن کے ہوویں
جفا تلطف، عتاب شفقت، غضب توجہ، ستم نوازش

جب تو اس گل بدن شکر لب نے — یوں کہا سن کے اس حقیر کی عرض

قد کو ہے سرو سہی سے ہم قدی — تن کو ہے نازک تری سے ارتباط

ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی — تن کو غارت گری سے ارتباط

نظیر کو مصرعوں میں توازن و تقابل کا بڑا شوق ہے۔ قد کو سرو سہی کا ہم قد بتانا اور ہم قدی کی ترکیب وضع کرنا کمال ہے لیکن ہم قدی کے مقابل تن کے لئے نازک تری وضع کرنا کمال بالائے کمال اور نظیر کا حصہ ہے۔ دوسرا شعر بھی اسی درجے کا ہے یہی وہ مقامات ہیں جو اسے بڑا انسانی مرتبہ بخشتے ہیں اور دنیا کے ہومر، کالیداس، شیکسپیر، انیس اور ٹالسٹائے جیسے بڑے فن کاروں کی صحبت میں لا بٹھاتے ہیں۔ اور مثال ملاحظہ ہو:۔

آفریں ہے دل پروانہ کو جس نے جل کر — حسن کی گرمی بازار میں مشہور کی شمع

نظیر کی اس غزل کا لب ولہجہ غالب کے بہت سے کلام میں پایا جاتا ہے۔ غزل یہ ہے:۔

اے صف مژگاں تکلف برطرف — دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف

دیکھ وہ گورا سا مکھڑا رشک سے — پڑ گئے ہیں ماہ کے منہ پر کلف

آبرو رکھیو نظیر اپنے کی تم — یا امیر المومنین شاہ نجف

حسین ترکیبوں کی اور چند مثالیں یہ ہیں:۔

جونہی آیا ادھر کو وہ چشم سیہ، وہیں لے گیا دل کو بہ سیر نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بت ہوش ربا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں تو وہ شرم وحیا سے ہو سر بہ زمیں
لئے نیچی نگاہوں سے جان دل ودیں میں کہوں کیا، اب اس کی حیا کی قسم

کیا کبک کو دکھلاتے ہو انداز خرام آہ — حسرت زدۂ شوخی رفتار تو ہم ہیں

بوسہ لیجے جو ہو کے دست و کمر — اتنی ہم میں کہاں ہے تاب و تواں

جوشؔ نے ایک جگہ کہا ہے:-

تجھے کیا فصل گل ہے یا زمان خار ہے ساقی — تو خود اپنی جگہ ایک دولتِ بیدار ہے ساقی

مرا خیال تھا کہ یہ ترکیب جوش کی خلقت ہے مگر نظیرؔ نے اسی غزل میں پہلے "پُر دلی" کہا ہے اور پھر "دولتِ بیدار" استعمال کیا ہے:-

ہر زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ — کیا پُر دلی ہے اس دلِ خانہ خراب میں

لگتے ہی آنکھ شب کو نظر آ گئی وہ شکل — پائی یہ ہم نے دولتِ بیدار خواب میں

یہیں نہیں نظیرؔ نے ایک اور جگہ بھی یہ ترکیب استعمال کی ہے اس لیے یہ ترکیب اسی کی ملک ہے۔ ملاحظہ ہو:

قاصد اس دولتِ بیدار سے کہیو کہ کبھی — دو گھڑی آ کے ہمارے بھی جگا جائے نصیب

بعض اور ترکیبیں یہ ہیں:-

وہ منتظر کہ آویں، ہم پُر تپش کہ جاویں — اس ڈھب کی ہر دو جانب بے اختیاریاں تھیں

نہ ضبط ہے نگہ کا نہ رُک سکے نظارہ — کیا شوق و رزیاں تھیں کیا بیقراریاں تھیں

جب کہ اُلٹی ہم نے تکرارِ نظر پر آستیں — کھینچ لی اس نے رخِ رشکِ قمر پر آستیں

اس پری رو کے دوانے کی یہ ہے شکل اب — تارِ دامن خار پر، شاخِ شجر پر آستیں

گر عار ہے کچھ اس میں تمھیں تو میاں نظیرؔ — لے جاؤ اپنے اس دلِ عزت پناہ کو

دل میں چمن کے ہے تری حسرت کی گُلجھڑی — باور نہیں تو دیکھ یہ غنچہ نہیں گرہ

بھر عمر میرے دل کا یہ غنچہ کھلا نہ آہ — ایسی فلک نے کس کے زمی میرے تئیں گرہ

آئینہ کی ردیف میں نظیر نے مطلع اور مقطع سمیت سات شعر کی غزل کہی ہے۔ پوری غزل جا بجا فارسی ترکیبوں سے لبریز ہے۔ لیکن ہر شعر کا دوسرا مصرعہ خصوصیت کے ساتھ داد طلب ہے۔ غالب کے کلیات میں اس ردیف کا صرف ایک مطلع میسر آتا ہے۔ نظیر کی غزل یہ ہے :-

بس کہ دل اس کا ہے مانوس خیال آئینہ ۔۔۔ ہے وہ مالک حسن مغرور خیال آئینہ
تھا وہ پشت بام پر عکس آرسی میں ہم نے بھی ۔۔۔ زد حکمت سے لیا بوس خیال آئینہ
تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جور سے ۔۔۔ بلبل تصویر و طاؤس خیال آئینہ
دل جفا سے اس کی آزردہ ہو سو ہوتا نہیں ۔۔۔ بے خطر ہے زنگ سے روس خیال آئینہ
کل اسے آئینہ خانے میں جو تھی مشق خرام ۔۔۔ تھا وہ صد جا ہم کو پابوس خیال آئینہ
صافیٔ دل کا لطف اس سے نہ کچھ پنہاں رہے ۔۔۔ یک نظر دیکھے جو تو موس خیال آئینہ

ہے اگر منظور سیر عالم حیرت نظیر
تو دل اپنا کر تو محبوس خیال آئینہ

غالب کا مطلع ملاحظہ ہو :-

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ ۔۔۔ طوطی کو شش جہت کے مقابل ہے آئینہ

اور مثالیں ملاحظہ ہوں :-

مقابل اس چشم کے ہوں کیونکر کہ دیتی فرصت نہیں ہے پل بھر
ادھر نگاہوں کی ترک تازی، ادھر کو مژگاں کی نیزہ بازی

بھولتی دل سے نہیں ہوش ربائی تیری ۔۔۔ دلبری عشوہ گری، جلوہ نمائی تیری

ذیل کی پوری غزل کا لب و لہجہ، مزاج اور رنگ فارسی ہے، مگر اس کے قطعے میں دو محاورے

ہلکا ہونا بہ معنی سبک ہونا اور بھاری ہونا بہ معنی دوبھر ہونا۔ تقابل کے طور پر بڑے حسن سے نظم ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

اظہار ہم بھی کرتے احوال دلفگاری — شرم وفا گر اک دم دیتی زباں کو یاری
جن میں فریب وفن کی سوختہ کاریاں ہیں — ہم ان کے مبتلا ہیں اے وائے خام کاری
شکوہ فراموشی کا کیا ان سے کیجئے جن کو — صورت ہی بھول جاوے پھر کیسی یادگاری
یک بار ملتے جلتے رک جاؤ تم تو اے جاں — دل بستگاں کی پھر ہو کیونکر نہ اشک باری
وعدے پہ گل رخوں کے مت کھا فریب اے دل — ان کے قرار میں ہیں صد عار بے قراری
لیتی ہے ہم سے بدلہ اب صبح حشر اس کا — جو شام مومن ہم نے کی تھی سیاہ کاری

گر گر نظیر ہم اس محبوب کی نظر سے
ایسے ہوئے ہیں ہلکے جو زندگی ہے بھاری

اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-

جس وقت خواب ناز سے وہ چشم وا ہوئی — صد خستۂ نہ خفتہ کی حاجت روا ہوئی
جو شکل دور باش تھی روز نخست کی — اب بھی جو ہم گئے تو وہی بر ملا ہوئی

یہ غزل بھی سرتاپا فارسی رنگ میں رنگی اور میر وغالب کے تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جاں بھی بہ جان ہے ہجر میں اور دل فگار بھی — تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب کا تار تار بھی
طرفہ فسوں سرشت ہے چشم کرشمہ سنج یار — لیتی ہے اک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی
کوچے میں اس کے بیٹھنا حسن کو اس کے دیکھنا — ہم تو اسی کو سمجھے ہیں باغ بھی اور بہار بھی
دیکھئے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گھات میں — عشوۂ پر فریب بھی، غمزۂ سحر کار بھی
زلف کو بھی ہے دم بہ دم عزم کمند افگنی — دام لئے ہے مستعد طرۂ تابدار بھی
گننے لگی وہ اپنے جب چاہنے والوں کو نظیر — اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کہ یار بھی

اس غزل کا مطلع میر کے رنگ کا، چوتھا شعر غالب کے رنگ کا اور مقطع ٹھیٹ نظیر کے رنگ کا ہے۔ فارسی ترکیبوں کی چند اور مثالیں یہ ہیں :۔

خیال شوخی چشم اس کا اپنے دیدۂ تر میں — پھرے ہے یوں کہ جیسے ہو شناور بحر میں ماہی

اے مردمانِ چشم بتاں یہ وہ حال ہے — تم سب کے آج خال کو یہاں جائے حال ہے

اب تو ہر لحظہ وہ بے دردی دکھاتا ہے مجھے — بے نہایت ستم و ظلم دکھاتا ہے مجھے

یک سرِ مو نہ پریشان ہو تو اے کاکل یار — ہم ترے دام میں آکر نہیں جانے والے

نقطۂ حسن اس کے رخ کا ایک کتاب حسن ہے — ہو چکی اس کی بھی تحقیقات میرے سامنے

اس کی ابرو کی صفت میں ہر کماں ابروئے رات — بزم میں کیا کیا پڑھیں ابیات میرے سامنے

زیادہ اس سے اب اٹھائے درد کیا ہوگا — کہ جان آنکھوں میں آ ہی گئی پر آہ نہ کی

غنچہ لب، مہر جبیں، عارض گلفام پری — گلشنِ حسن ہے اب وہ گل اندام پری

زمین نظیر نہیں گرم اس میں ہے کیا خاک — مگر بہ زور طبیعت نباد کی گٹھری

فارسیت اور فارسی ترکیبوں کا التزام، غزلوں کی طرح مسلسل اور موضوعی غزلوں میں بھی بہ کثرت پایا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

خد و خال خوبی آگیں لبِ لعل پان سے رنگیں — نظر آنٹ دل و دیں مژہ صد مضرت افزا

اس شعر میں "صد مضرت افزا" خاص طور پر توجہ کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ خط کی جگہ "خد" کے استعمال نے شعر کی دلکشی کس قدر بڑھا دی ہے۔ ذیل میں ان مسلسل غزلوں کے مطلعے درج کیے جاتے ہیں جن میں یا تو فارسیت کی کثرت ہے یا جو اول سے آخر تک فارسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں :۔

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب — اہل صورت کا ہے دریا، اہل معنی کا سراب

درپے ہیں دل اپنے کے ادھر عشوہ گرے چند — خواہندۂ یک جان ہیں ادھر موکمرے چند

سحر ہم نے چمن اندر عجب دیکھا کل اک دلبر — سہی قامت، پری پیکر، مقطع وضع، خوش منظر

دنیا ہے اک نگار فریبندہ جلوہ گر — الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت و ضرر

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشکِ چمن — گل رخ و گلگوں قبا و گل عذار و گل بدن

کیا کاسۂ مے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں — دورِ فلک سے کیا خبر، پہنچے گا لب تک یا نہیں

کیا دل لگاویں مہرباں ہم حسنِ صورت سے کہیں — نہ وہاں ثبات اس سے بہم نہ یہاں قیام اپنے تئیں

گل رنگی و گل پیرہنی، گل بدنی ہے — وہ نام خدا، حُسن میں سچ مچ کی بنی ہے

موضوعی غزلوں میں فارسیت کے چند نمونے ملاحظہ ہوں ۔ برسات کا مطلع ہے :۔

ساقیا موسم برسات ہے کیا روح فزا — دیکھ ٹک تازگیٔ صنعت بیچون و چرا

پری کا مطلع ملاحظہ ہو :۔

رخ پری، چشم پری، زلف پری، آن پری — کیوں نہ اب نام خدا ہو ترے قربان پری

بسنت کا مطلع ملاحظہ ہو :۔

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دلکشائی — ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جاں بسنت آئی

سمدھن کا مطلع ملاحظہ ہو :۔

سراپا حُسن سمدھن کا گویا گلشن کی کیاری ہے — پری بھی اب تو بازیٔ حُسن میں سمدھن سے ہاری ہے

دوسرا ملاحظہ ہو :۔

کروں کس منہ سے اب یارو بیاں میں شان سمدھن کی — لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمدھن کی

موتی کا مطلع ملاحظہ ہو :۔

پریزادوں میں ہے نام خدا جس شان پر موتی — کوئی ایسا نہیں موتی مگر موتی مگر موتی

ان ساری موضوعی غزلوں میں فارسیت کی ہلکی چاشنی موجود ہے ۔

اردو زبان میں غالب کا کلام اپنی نوع کی یکتائی اور اپنے رنگ کے اچھوتے پن کے لئے مشہور ہے۔

نظیر کا پرتو غالب پر

کسی دوسرے شاعر کے کلام پر غالب کا دعوٰی نہیں ہو سکتا۔ نظیر کے کلام میں شعر کے شعر اور غزلیں کی غزلیں ایسی میسر آتی ہیں جنھیں شاعر کا نام بتائے بغیر پڑھا جائے تو اہل ذوق ونظر کو غالب کے کلام کا دھوکا ہو جائے۔ تاریخی اعتبار سے نظیر متقدم ہے۔ اس لئے کسی دوسری دلیل کے بغیر یہ ماننا پڑتا ہے کہ غالب پر نظیر کا گہرا پرتو پڑا۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اُس نے نظیر کے فلسفیانہ کلام سے بیش از بیش استفادہ کیا ہے۔ ایک معنوی توارد ملاحظہ ہو:۔

نظیر نے کہا ہے:۔

اس مہر پر انوار سے شبنم کی طرح ہم　　　گم ہوتے گئے ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا

غالب نے کہا ہے:۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　　ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

غالب کا شعر نظیر کا چربہ ہے لیکن اگر غائر نظر ڈالی جائے تو نظیر کا شعر، غالب سے بہ مراتب بلند ہے۔ غالب عنایت کی نظر کا محتاج ہے اور نظیر پہلی نظر پڑتے ہی جمال مطلق میں جذب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ "جوں جوں" لکھ کر نظیر نے تسلسل و تواتر کا جو تصور پیش کیا ہے وہ غالب کے شعر سے پیدا نہیں ہوتا۔

نظیر کے غزلیہ کلام کا، غالب کے رنگ طبیعت پر گہرا اثر ہے۔ بعض مقامات نظیر کے کلام میں ایسے نظر آتے ہیں جنھیں بلا خوف تردید، غالب کے تصور کا ماخذ اور تخیل کا سرچشمہ کہا جا سکتا ہے۔ نظیر نے کہا ہے:۔

تھے کل یہ خط عارض خوباں سبزہ رنگ　　　کہتے ہیں آج خلق جنھیں سبزہ زار ہا
تھے کل یہ شاہدان سہی سرو وسیم تن　　　شاہد ہیں آج مرگ کے جن کے مزارہا
سب کو نظیر ہونا ہے اک دن بہ زیر خاک　　　سنگ مزار اس کے ہیں آئینہ دار ہا

ان اشعار میں بندش کی چستی، تصور کی بلندی، فکر کی گہرائی، نقاد کی فکر ونظر کے لئے تحقیق و تفتیش کا

ایک وسیع میدان کھول دیتی ہے۔ ان میں اور فارسی ترکیبوں کے علاوہ، سبزہ رنگ، سہی سرو اور آئینہ دار اس کیف و مزاج کی ترکیبیں ہیں جن کی ایجاد و اختراع کا فخر غالب کی ذات سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ ترکیبیں پہلے نظیر اور پھر غالب نے استعمال کی ہیں۔ اب پیکری مماثلت سے قطع نظر کر کے، معنی کی طرف توجہ کی جائے تو بار بار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ :۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کا ماخذ نظیر کے مذکورہ بالا اشعار ہیں جن سے غالب نے اپنے مطلعے کے لئے خام مواد حاصل کیا ہے۔ نظیر کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو :۔

جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل　　　عجب بہار کا دیکھا ہے ہم نے خواب میں خواب

غالب کا یہ شعر :۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

بہت مشہور ہے۔ یہ اس کے فلسفیانہ نوادر اور اردو کے اہم شعری سرمائے میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس کا ماخذ دریافت ہونے سے بڑی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ نظیر کا ایک مطلع ملاحظہ ہو :۔

ساقی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب　　　پھر بزم ہو گی جب تو سمجھ لیجیو جب کی جب

غالب نے بھی اسی معنی کا ایک مطلع کہا ہے جو یہ ہے :۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں　　　یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

دونوں کے تقابل سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسرا پہلے سے ماخوذ ہے۔ "عربدہ جو" کی ترکیب عموماً غالب کی اختراع سمجھی جاتی ہے۔ فارسی سے اردو میں لانے کا شرف کم سے کم اسی کے نامۂ اعمال میں لکھا گیا ہے۔ نظیر کہتا ہے :۔

ربط اس عربدہ جو سے ہمیں کس طور سے ہو　　　ہم تو ہیں صلح طلب اور وہ ہے پیکار طلب

نظیر کے بعد غالب نے کہا ہے :-

حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی
صد حیف وہ ناکام جو اک عمر سے غالب

دو بڑے شاعروں کے کلام میں ہم قافیہ غزلیں میسر آنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور نہ محض اس اشتراک سے کوئی خاص نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن جب بحر عامتہ الورود نہ ہو اور قافیے شاہراہ سے ہٹے ہوئے اور غیر مانوس ہوں، یہاں تک کہ خاص خاص استادوں کے کلام میں بھی نظر نہ آتے ہوں تو لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ متقدم کی تقلید کی گئی۔ اولیت کا فخر و شرف متقدم کو حاصل ہے اور متاخر نے استفادہ کیا ہے۔ نظیر کی غزل ملاحظہ ہو :-

خدا نے ہم کو اسی جا کیا بہشت نصیب
ہوا جو ہم کو وہ کوچہ چمن سرشت نصیب

ہے وہ تو خوب پہ اپنے ہی کچھ ہیں زشت نصیب
جدا جو اس سے ہوئے ہم تو اپنی قسمت سے

ہوئی قلم کو ہمارے یہی نوشت نصیب
لکھیں نہ حرف وفا کیا کریں کہ اول سے

کریں گے دیکھئے سرسبز کب یہ کشت نصیب
زمینِ دل میں گرایا ہے تخم تو لیکن

یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعدِ مرگ نظیر
ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک خشت نصیب

اب ان ہی قافیوں میں مگر ردیف کے تغیر کے ساتھ غالب کی غزل ملاحظہ ہو :-

بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو
کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں

دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ

ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے

ابر اہی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو
آئی اگر بلا تو جگر سے نہیں ٹلی

خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو
غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے

نظیر کی غزل میں مطلع اور مقطع ملا کر پانچ شعر ہیں۔ غالب کو اس زمین میں مطلع میسر نہیں آیا۔ اس کے یہاں بھی مقطعے سمیت پانچ شعر ہیں۔ نظیر نے چھ قافیے استعمال کئے ہیں اور غالب کے یہاں ایک قافیے کی تکرار کی وجہ سے صرف چار ہیں۔ ان چار میں تین، بہشت، نوشت اور گشت اس نے غالباً، نظیر سے مستعار لئے ہیں۔ غالب کی غزل میں گذشت ایک نیا قافیہ ہے جس پر نظیر کی نظر نہیں پڑی۔

مضامین کے قرب و یک رنگی کی یہ دو مثالیں بہت دلچسپ ہیں۔ نظیر نے کہا ہے :۔

حاضر جوابی دیکھو کہ لب سے مرے ہنوز نکلا نہیں سوال کہ وہاں ہو گیا جواب

غالب نے کہا ہے :۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نظیر نے کہا ہے :۔

یار دیکھ اس کو لگے رکھنے عداوت مجھ سے دوست بھی ہو گئے دشمن مرے اے وائے نصیب

غالب نے کہا ہے :۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ان دونوں مثالوں میں متقابل شعروں کا مطلب بالکل تو ایک نہیں ہے مگر بہت قریب قریب ہے اور غالب کے اشعار نظیر کے شعروں کا اقتباس سمجھے جا سکتے ہیں۔ توارد کی ایک اور عمدہ اور صریح مثال ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے :۔

آئینہ ایک دم نہیں رکھتا ہے ہاتھ سے ایسا وہ اپنے رخ کا تماشا طلب ہے اب

غالب کا شعر ہے :۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ ہر دم نقاب میں

نظیر کی غزل جس کا مطلع یہ ہے :۔

بحرِ ہستی میں صحبت احباب　　یوں ہے جیسے بہ روئے آب حباب

ایک اہم فلسفیانہ کارنامہ ہے۔ جب یہ غزل غالب کی اس مشہور غزل کے ساتھ مطالعہ کی جائے جس کا مطلع یہ ہے:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

تو دونوں ستادوں میں صوری اور معنوی اشتراک کے بہت سے پہلو نظر آنے لگتے ہیں۔ ان دونوں غزلوں کی بحر ایک ہے۔ اس کے علاوہ زبان و بندش، لب ولہجہ اور مغز و موضوع بھی بہت کچھ یکساں ہے۔

نظیر اکثر اپنی غزلوں کے بعض اشعار میں فعل حذف کر دیتا ہے یہ شعر کا ایک حسن ہے اور اس سے بیان میں ایک خاص لطف و لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ نظیر نے کہا ہے:-

ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی　　آن کو غارت گری سے ارتباط

یہ انداز بیان غالب کے کلام کا ایک خاص حسن سمجھا جاتا ہے مگر یہ اس نے غالباً نظیر سے سیکھا ہے۔ نظیر کے کلام میں بہت سے وہ جملے بھی موجود ہیں جو غالب کی جدت سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً نظیر نے کہا:-

اے صف مژگاں تکلف برطرف　　دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کی صف

تکلف برطرف کا استعمال نظیر کے بعد غالب نے اس طرح کیا ہے:-

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے　　تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

ایک اور دلچسپ توارد ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے:-

ان سنگ دل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیر　　میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

غالب نے کہا ہے:-

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ان اشعار کے دوسرے مصرعوں کی صوری و معنوی ہم آہنگی بڑے لطف کی بات ہے۔ نظیر کی بہت سی

زمینوں میں غالب نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ دو عمدہ مثالیں حسب ذیل ہیں۔ نظیر نے کہا ہے:۔

نہ ادا میں مزا نہ لذتِ ناز　　　آہ کا ہے کو خط ہوا آغاز

غالب نے کہا ہے:۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نظیر نے کہا ہے:۔

وہ بے نشاں دہن رُخ خورشید تاب میں　　　ذرہ سما گیا ہے دل آفتاب میں

غالب نے کہا ہے:۔

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں　　　کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذت عذاب میں

ایک اور معنوی توارد ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے:۔

عشق بھلا ہے تجھے زلفِ بتاں کی قسم　　　ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی

غالب نے کہا ہے:۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں　　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گا حساب میں

نظیر نے کہا ہے:۔

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہش خوں ہے　　　کچھ دیر نہیں لگنے کی یاں صید زبوں ہے

غالب نے فرمایا ہے:۔

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے　　　مرے دام تمنا میں ہے ایک صیدِ زبوں وہ بھی

مسلسل غزلوں میں بھی توارد کی بعض مثالیں میسر آجاتی ہیں۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔ نظیر نے کہا ہے:۔

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ　　　سب ارض و سما گی ہے گلستان تماشا

غالب نے کہا ہے:۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اب نظیر کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:۔

اک دن دل اپنا عیش گزشتہ کو یاد کر رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا
یعنی وہ کیا زمانۂ عشرت تھا اے نظیر جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا
اب زار و ناتوان و نحیف و ضعیف ہوں نقش طلسم تھا وہ کوئی یا حباب تھا
اک جنبش مژہ میں وہ برہم ہوا طلسم کیا کہیے اس کو اور، مگر یہ کہ خواب تھا
جب ہم نے دل سے بھر کے دم سرد یوں کہا جس میں مئے طرب سے تو مست و خراب تھا
ہیہات کیا بتائیں ہم اس عیش و نوش کا نام اے غفلت انتہا وہی عہد شباب تھا
تھی باغ زندگی کی اسی سے ہی آب و رنگ دیوان عمر کا بھی وہی انتخاب تھا
اپنی تو فہم میں وہی ہنگام دل فروز مجموعۂ حیات کا لب لباب تھا

اب غالب کا مشہور قطعہ ملاحظہ ہو:۔

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب سریر خامہ نوائے سروش ہے

نظیر اور غالب دونوں کے قطعے پیش نظر ہیں۔ غائر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے قطعے کا لب و لہجہ، نظیر کے قطعے کے لب و لہجے سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ بار بار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ متاخر کا کلام، متقدم کا چربہ ہے۔ لب و لہجے کے علاوہ، دونوں کا رنگ، خیال کا انداز، زبان کا پرداز، بندشیں، ترکیبیں، سب ایک ہی طرح کی ہیں۔ موضوع بھی کم و بیش ایک ہی ہے۔ نظیر کے قطعے میں جوانی کا ماتم ہے اور غالب نے عیش رفتہ پر نوحہ کیا ہے جو جوانی کے ماتم کا مترادف ہے۔ یہ یگانگت و ہم رنگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بہ ظاہر یہ ہم طرحی، نہ صرف وطن کے اشتراک سے پیدا ہے بلکہ ہم ذوقی سے بھی ہے اور ہم ذوقی کی بنیاد تلمذ پر قائم ہو سکتی ہے۔ حکیم قطب الدین باطن نے، اپنی تصنیف گلستان بیخزاں میں غالب کو نظیر کا شاگرد بتایا ہے۔ اور شہباز سے مراسلت میں، حالی نے بھی دبی زبان سے، غالب کا نظیر کے مکتب میں پڑھنا تسلیم کیا ہے۔ بہر حال کلام کے رنگ کے اشتراک سے یہ بہت قرین قیاس ہے کہ غالب کے ذوقِ سخن نے نظیر کے ذوقِ سخن کی آغوش میں تربیت پائی، اس کا اتباع کیا اور وہ شاعری میں اس کا معنوی شاگرد ضرور ہے۔ نظیر کی طرح غالب بھی اکبرآباد کا سپوت، اُردو کے گھر کا چشم و چراغ اور اس زبان کی شاعری کا مسلم الثبوت استاد اور امام ہے۔ نظیر کا شاگرد قرار پاکر نہ اس کی حرمت میں کوئی کمی ہو سکتی ہے، نہ نظیر کی عظمت میں کوئی زیادتی۔ بہر حال یہ مسئلہ خالص اکبرآبادی مسئلہ ہے اور اس پر محض ایک واقعے کی حیثیت سے نگاہ ڈالنی چاہیئے۔

ان چند نظموں اور غزلوں کے منتخب اشعار پر تبصرہ کرنے اور کلام کے چند بیش بہا افتادہ محاسن نمایاں کرنے کے بعد نظیر پر تبصرے کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ نظیر کا کلام ایک بحرِ زخار ہے جس میں شناوری کے لئے کم سے کم ایک پوری حیات کی ایک طویل مدت درکار ہے۔ یہاں تبصرے کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک سرسری اور سطحی کوشش ہے جس کو زیادہ وسیع کرنے اور غائر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہاں نظیر کی زبان اور محاورے اور اِن کے عالمگیر اثر، عروض اور بہت سے دوسرے اہم مسائل پر مفصل توجہ

نہیں کی گئی۔ اس مختصر صحیفے میں، فی الحقیقت، اتنی گنجائش نہ تھی کہ اس میں دقیق مسائل پر بحث کی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں نظیرؔ کی شاعرانہ فطنت کا بھی جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس موضوع پر "نظیر نامے" کے نام سے ایک دوسری کتاب مرتب ہو چکی ہے جو انشاءاللہ جلد پیش کی جائے گی۔

روحِ نظیرؔ کی پہلی اشاعت میں بعض نظموں کے بعض حصے حذف کر دئے گئے تھے لیکن وہ حصے اس اشاعت میں شامل کر دئے گئے ہیں۔ بعض حضرات ان حصوں کو فحش اور غیر مہذب بتائیں گے اور یہ اعتراض غلط نہ ہوگا لیکن شاعر کا کلام صرف اخلاق و عوائد ہی کی بنا پر نہیں جانچا جاتا اور نظیرؔ کا کلام بالخصوص اس معیار سے نہیں پرکھنا چاہیے۔ ایک واقعہ نگار شاعر کے کلام میں، اخلاق و عوائد کی بنا پر، جن کا معیار خود ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، دخل اندازی کرنا ناانصافی ہے۔ ان مقامات کو جب خود نظیرؔ نے لکھنا جائز سمجھا تو کسی دوسرے کو انھیں حذف کر دینے کا اختیار نہیں۔

رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ هَدَا اِلَیَّ عُیُوْبِیْ

کلامِ نظیر

[illegible]

(۱) الٰہی نامہ

دنیا میں نہ خاص اور نہ کوئی عام رہے گا — نے صاحب مقدور نہ ناکام رہے گا
زردار نہ بے زر نہ بد انجام رہے گا — شادی نہ غم گردشِ ایام رہے گا
نے عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ چرخ جو دکھاتا ہے بڑا گنبدِ ازرق — یہ چاند یہ سورج یہ ستارے ہیں معلق
لوح و قلم و عرشِ بریں ثابت و مطلق — سب ٹھاٹھ یہ اک آن میں ہو جاوے گا ہو حق
آغاز کسی شئے کا نہ انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

لے عالمِ ارواح سے تا عالمِ جنات — انسان و پری حور و ملک جن و خبیثات

کیا ابر و ہوا کوہ و جنگل ارض و سماوات — اک پھونک میں اُڑ جاویں گے جوں نقش طلسمات
ہشیار نہ پختہ نہ کوئی خام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

گر علم و ہنر سے ہے کوئی خلق میں مشہور — یا کشف و کرامات میں ہے صاحب مقدور
یا ایک کا بے نام و نشاں خلق میں مشہور — اک دم میں پلک مارتے ہو جاویں گے سب دور
مستور نہ مشہور نہ گمنام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

مختاری کے غرّے سے جو کرتے ہیں سدا کام — یا جبر سے مجبوری کے رکھتے ہیں کئی کام
جب آکے فنا ڈالے گی اک گردش ایام — اک آن میں اُڑ جائے گا سب چیز کا الزام
مختار نہ مجبور نہ خود کام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اب دل میں بڑے اپنے جو کہلاتے ہیں عیار — سو مکر و دغا کرتے ہیں اک آن میں تیار
جب آکے فنا سر کے اوپر مارے گی آن دار — اک وار کے لگتے ہی یہ ہو جاویں گے سب آر
نے مکر نہ حیلہ نہ کوئی دام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

کرتے ہیں جو بے دل سے ریاضات و عبادات — یا عمر کو کھوتے ہیں بہ رندی و خرابات
جب آکے فنا پھاڑے گی شمشیر کا اک ہات — پھر صاف ہیں دونوں کی گنہگاری و طاعات
نے رند نہ عابد نہ مے آشام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں　　جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنّار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں　　عاشق تو قلندر رہیں نہ ہندو نہ مسلماں
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جو شاہ کہاتے ہیں کوئی ان سے یہ پوچھو　　دارا و سکندر وہ گئے آہ کدھر کو
مغرور نہ ہو شوکت و حشمت پہ وزیرو　　اس دولت و اقبال پہ مت پھولو امیرو
نے ملک نہ دولت نہ سر انجام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

بیوپار جو کرتے ہیں ہر اک چیز کا زردار　　آگے بھی دکانیں تھیں کئی اور کئی بازار
جس طور کا اب چاہئے کر لیجئے بیوپار　　پھر جنس نہ دلّال نہ مالک نہ خریدار
نے نقد نہ کچھ قرض نہ کچھ وام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اب جتنی کھڑی دیکھو ہو عالم میں عمارات　　یا جھونپڑے دو کوڑی کے یا لاکھ کے محلات
کیا پست مکاں کیا یہ ہوا دار مکانات　　اک اینٹ بھی ڈھونڈے کہیں آنے کی نہیں ہات
دالان نہ حجرہ نہ در و بام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ باغ و چمن اب جو ہر اک جا ہیں رہے پھول　　یہ شاخ یہ غنچہ یہ ہرے پات یہ پھل پھول
آجاوے گی جب بادِ خزاں ان کے اوپر بھول　　ہر خار کی ہر پھول کی اڑ جاوے گی سب دھول
نے زرد نہ سرخ اور نہ سیہ فام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

میخوار بھی کتنے ہوئے یاں مے کے مذاقی ‏ ساقی بھی کئی ہو گئے محبوب وشاقی
لا جام کوئی بھر کے جو ہو ور بھی باقی ‏ فرصت ہے غنیمت کوئی دم کو اے ساقی
نے مے نہ صراحی نہ ترا جام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ عاشق و معشوق جو کرتے ہیں ہم چاہ ‏ آگے بھی بہت عاشق و معشوق تھے واللہ
وہ شخص کہاں جاتے رہے سب مرے اللہ ‏ اس بات سے معلوم ہوا اب تو یہی آہ
نے عشق نہ عاشق نہ دل آرام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

جو حسن کے ہیں گلبدن اور چاند سے رخسار ‏ آگے بھی اسی طرح بہت گل تھے نمودار
کیا جانے کدھر جاتے رہے ہائے وہ گلزار ‏ یہ حسن یہ صورت بھی غنیمت ہے مرے یار
گل رنگ نہ گل رو نہ گل اندام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

ٹک غور کرو اب کہاں مجنوں کہاں فرہاد ‏ لیلیٰ کہاں شیریں کہاں وہ نازدہ بیداد
جو پھول کھلے آہ وہ جب ہو گئے برباد ‏ ہم تم بھی غنیمت ہیں سنو یار دپری زاد
واں حسن نہ یاں عشق کا ہنگام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

محبوب بنا جس نے تمھیں حسن دیا ہے ‏ اس نے ہی ہمیں عاشق جانباز کیا ہے
ملنا ہے تو مل لو یہی جینے کا مزا ہے ‏ سب ناز دنیاز آہ یہ اک دم کی ہوا ہے

پھر ہجر نہ کچھ وصل کا پیغام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

ملنے سے ہمارے جو تمہیں آتا ہے الزام
آنے دو یہ تم ہم سے ملے جاؤ سحر شام
پھر حسن کہاں اپنے رکھو کام سے تم کام
جھک مارتے ہیں وہ جو تمہیں کرتے ہیں بدنام
طوفان نہ بہتان نہ الزام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

یہ شعر و غزل اب جو بناتے ہیں زبانی
آگے بھی بہت چھوڑ گئے اپنی نشانی
دیوان بنایا کوئی قصہ کہ کہانی
کچھ باقی نظیر اب نہیں سب چیز ہے فانی
خمسہ نہ غزل فرد نہ ایہام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

(۲) برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مارے ہیں موج ڈابر دریا ڈونڈ رہے ہیں   مور و پپیہے کوئل کیا کیا رمنڈ رہے ہیں
جھڑ کر رہی ہیں جھڑیاں نالے امنڈ رہے ہیں   برسے ہے مینہ جھڑا جھڑ بادل گھمنڈ رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں   گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں   اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل لگا ٹکوریں نوبت کی گت لگا دیں   جھینگر جھنگار اپنی سرنائیاں بجا دیں
کر شور مور بگلے جھڑیوں کا مینہ بلا دیں   پی پی کریں پپیہے مینڈک ملار گا دیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے   قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے   بچھوا دیئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ کچھ ابر کی سیاہی   اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بہ ماہی   یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہے یارب سامان تیری قدرت   بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت   تیتر پکارتے ہیں سبحان تیری قدرت
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئل کی کوک میں بھی تیرا ہی نام ہے گا   اور مور کی زٹل میں تیرا پیام ہے گا

یہ رنگ سو مزے کا جو صبح و شام ہے گا　　یہ اور کا نہیں ہے تیرا ہی کام ہے گا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بولیں بئے بٹیریں قمری پکارے کوکو　　پی پی کرے پپیہا بگلے پکاریں تو تو

کیا ہدہدوں کی حق حق کیا فاختوں کی ہوہو　　سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو مست ہوں اُدھر کے کر شور ناچتے ہیں　　پیارے کا نام لیکر کیا زور ناچتے ہیں

بادل ہوا سے گھر گھر گھنگھور ناچتے ہیں　　مینڈک اُچھل رہے ہیں اور مور ناچتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پھولوں کی سیج اوپر سوتے ہیں کتنے بن بن　　سوہیں گلابی جوڑے پھولوں کے ہار ابرن

کتنوں کے گھر ہے کھانا سونا لگے ہے انگن　　کونے میں پڑ رہی ہے سر منہ لپیٹ سوگن

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو خوش ہیں وہ خوشی میں کاٹے ہیں رات ساری　　جو غم میں ہیں انھوں پر گزرے ہے رات بھاری

سینوں سے لگ رہی ہیں جو ہیں پیا کی پیاری　　چھاتی پھٹے ہے اُن کی جو ہیں برہ کی ماری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو وصل میں ہیں اُن کے جوڑے مہک رہے ہیں　　جھولوں میں جھولتی ہیں گہنے جھمک رہے ہیں

جو دکھ میں ہیں سو اُن کے سینے پھڑک رہے ہیں　　آہیں نکل رہی ہیں آنسو ٹپک رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اب برہنوں کے اوپر ہے سخت بیقراری　　ہر بوند مارتی ہے سینہ اوپر کٹاری

بدلی کی دیکھ صورت کہتی ہیں باری باری　　ہے ہے نہ لی پیا نے اب کے بھی سدھ ہماری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جب کوئل اپنی ان کو آواز ہے سُناتی　　سُنتے ہی غم کے مارے چھاتی ہے اُمڈی آتی
پی پی کی دُھن کو سُن کر بیکل ہیں کہتی جاتی　　مت بول اے پپیہے پھٹتی ہے میری چھاتی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کی سیج سونی اور خالی چارپائی　　رو رو انھوں نے ہر دم یہ بات ہے سنائی
پردیسی نے ہماری اب کے بھی سُدھ بھلائی　　اب کے بھی چھاونی جا پردیس ہی میں چھائی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں نے اپنے غم سے اب ہے یہ گت بنائی　　میلے کچیلے کپڑے آنکھیں بھی ڈبڈبائی
نے گھر میں جھولا ڈالا نے اوڑھنی رنگائی　　پھوٹا پڑا ہے چولھا ٹوٹی پڑی کڑھائی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گاتی ہے گیت کوئی جھولے پہ کرکے پھیرا　　مارو جی آج کیجے یاں رین کا بسیرا
ہے خوش کوئی کسی کو ہے درد و غم نے گھیرا　　منہ زرد بال بکھرے اور آنکھوں میں اندھیرا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اور جن کو اب میسر حسنوں کی ڈھیریاں ہیں　　سرخ اور سنہرے کپڑے عشرت کی گھیریاں ہیں
محبوب دلبروں کی زلفیں بکھیریاں ہیں　　جگنوں چمک رہے ہیں راتیں اندھیریاں ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو بھنگ پی پی کپڑے بھگو رہے ہیں　　باہیں گلوں میں ڈالیں جھولوں میں سو رہے ہیں
کتنے برہ کے مارے سدھ اپنی کھو رہے ہیں　　جھولے کی دیکھ صورت ہر آن رو رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بیٹھے ہیں کتنے خوش ہو اونچے چھوا کے بنگلے　　پیتے ہیں مے کے پیالے اور دیکھتے ہیں جنگلے
کتنے پھرے ہیں باہر خوباں کو اپنے سنگ لے　　سب شاد ہو رہے ہیں عمدہ غریب کنگلے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا　　یا سائبان ستھرا یا بانس کا اُسارا
کرتا ہے سیر کوئی کوٹھے کا لے سہارا　　مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے　　دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی والا ہر آن رو رہا ہے　　مفلس تو جھونپڑے میں دلشاد سو رہا ہے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکاں پرانا　　اٹھ کے ہے ان کو مینہ میں ہر آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا　　کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہو گیا دوانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا　　گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا　　باقی تھا اک اُسارا سو وہ بھی آن ٹپکا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اونچا مکان جس کا ہے بیچ گھنا سوایا　　اوپر کا کھن ٹپک کر جب پانی نیچے آیا
اس نے تو اپنے گھر میں ہے شور غل مچایا　　مفلس پکارتے ہیں جانے ہمارا .....
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں پہ بیر بہوٹی ٹیلوں اوپر بھتورے　　پسوے مچھڑوں سے روئے کوئی بسورے

بچھو کسی کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے   آنگن میں کنسلائی کونوں میں کنکھجورے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پھنسی کسی کے تن میں سر پر کسی کے پھوڑے   چھاتی پہ گرمی دانے اور پیٹھ میں ددوڑے
کھا پوریاں کسی کو ہیں لگ رہے مروڑے   آتے دست جیسے دوڑیں عراقی گھوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

پتلی جہاں کسی نے دال اور کڑھی پکائی   مکھی نے وو ہیں بولی آ اونٹ کی بلائی
کوئی پکارتا ہے کیوں خیر تو ہے بھائی   ایسے جو کھانستے ہو کیا کالی مرچ کھائی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جس گلبدن کے تن میں پوشاک سوسنی ہے   سو وہ پری تو خاصی کالی گھٹا بنی ہے
اور جس پہ سرخ جوڑا یا اودی اوڑھنی ہے   اس پر تو سب گلاوٹ برسات کی چھنی ہے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بدنوں میں کھب رہے ہیں خوبوں کے لال جوڑے   جھمکیں دکھا رہے ہیں پریوں کے لال جوڑے
لہریں بنا رہے ہیں لڑکوں کے لال جوڑے   آنکھوں میں چبھ رہے ہیں پیاروں کے لال جوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اور جس صنم کے تن میں جوڑا ہے زعفرانی   گلنار یا گلابی یا زرد سرخ دھانی
کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی   جھولوں میں جھولتی ہیں اوپر پڑے ہے پانی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی تو جھولتی ہے جھولے کی ڈور چھوڑے   یا ساتھنوں میں اپنی پاؤں سے پاؤں جوڑے
بادل کھڑے ہیں سر پر برسے ہیں تھوڑے تھوڑے   بوندوں سے بھیگتے ہیں لال اور گلابی جوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو ہو رہی ہے اس عیش کی نشانی　　سوتے ہیں ساتھ جس کے کہتی ہے وہ دیانی
اس وقت تم نہ جاؤ اے میرے یار جانی　　دیکھو تو کس مزے سے برسے ہے آج پانی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے شراب پی کر ہو مست جھک رہے ہیں　　مے کی گلابی آگے پیالے چھلک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر گھنگرو جھنک رہے ہیں　　پڑتا ہے مینہ جھڑا جھڑ طبلے کھڑک رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہیں جن کے تن ملائم میدے کی جیسے لوئی　　وہ اس ہوا میں خاصی اوڑھے پھرے ہیں لوئی
اور جن کی مفلسی نے شرم و حیا ہے کھوئی　　ہے اُن کے سر پہ سرکی یا بورئے کی کھوئی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے پھرے ہیں اوڑھے پانی میں سرخ پٹو　　جو دیکھ سرخ بدلی ہوتی ہے ان پہ لٹو
کتنوں کی گاڑی رتھ ہیں کتنوں کے گھوڑے ٹٹو　　جس پاس کچھ نہیں ہے وہ ہم سا ہے نکھٹو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں　　ہے ان کے سر پہ چھتری ہاتھی اوپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں　　ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پلیچے چڑھے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیا پکا پکایا کھانا　　اُن کو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا حظ اُڑانا
ہے جن کو اپنے گھر میں یاں نون تیل لانا　　ہے سر پہ اُن کے پنکھا یا چھاج ہے پُرانا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے خوشی سے بیٹھے کھاتے ہیں خوش محل میں　　کتنے چلے ہیں لینے بنیے سے قرض پل میں
کاندھے پہ دال آٹا ہلدی گرہ کے مل میں　　ہاتھوں میں گھر کی پیالی اور لکڑیاں بغل میں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو کسبیاں جوانیں سنوں میں پرتیاں ہیں　　سینوں میں لال انگیا اور لال کرتیاں ہیں
نظریں بھی بدلیاں ہیں دل میں بھی شرتیاں ہیں　　اک اک نگہ میں کافر بجلی کی پھرتیاں ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو نوجواں ہیں ان کی تیاریاں بڑی ہیں　　ہاتھوں میں لال چھڑیاں کوٹھوں اوپر کھڑی ہیں
اور وہ جو آشنا سے جھگڑی ہیں یا لڑی ہیں　　مُنہ کو چُھپا پلنگ پر پُھلی ہوئی پڑی ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی اپنے آشنا سے کر ناز کا جھپٹا　　کہتی ہے ہنس کے کافر چُٹکی لے یا نُہٹّا
تم سے تو دل ہمارا اب ہوگیا ہے کھٹّا　　تم آج بھی نہ لائے رنگوا مرا دوپٹا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتی ہے کوئی مجھ کو جوڑا سوہا بنا دو　　یا ناٹ بانی جوتا یا کفش سرخ لا دو
کوئی کہے ہے میری کرتی ابھی رنگا دو　　یا گرم سے اندرسے ایک سیر بھر منگا دو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اُن کے مبتلا ہیں سب چیز لا رہے ہیں　　کرتی بنا رہے ہیں انگیا رنگا رہے ہیں
جو جو ہیں ان کی باتیں سب کچھ اٹھا رہے ہیں　　باہیں گلے میں ڈالے عشرت منا رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

زردار کی تو ان میں ہے بچھ رہی پلنگڑی　　دلبر پری سی بیٹھی جھمکائے جوڑی بنگڑی

مفلس کو ٹوٹی پٹی یا ٹاٹ کی جھلنگڑی　　رنڈی ملی تو کالی، یا گنجی، لولی، لنگڑی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو بیگمی ہیں گھر میں آرام کر رہی ہیں　　پردوں میں دوستوں سے پیغام کر رہی ہیں
چتون لگا دوٹوں سے سو دام کر رہی ہیں　　چپکے ہی چپکے اپنا سب کام کر رہی ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی اپنے محبوب سیمبر سے　　اس مینہ میں نہ جاؤ پیارے ہمارے بر سے
کوئی کہے ہے اپنے دلدار خوش نظر سے　　ہاتھوں سے میرے جانی کھا لو یہ دو اندر سے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی پیاری جو کچھ کہو سو لا دیں　　زردوزی ٹاٹ بافی جوتہ کہو پنھا دیں
پیڑا جلیبی لڈو جو کھاؤ سو منگا دیں　　چیرا دوپٹہ جامہ جیسا کہو رنگا دیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جن دلبروں کے تن پر ہیں گرمی دانے آ لے　　کہتے ہیں ان کو عاشق یوں پیار سے بلا لے
کیا مینہ برس رہا ہے پیارے ذرا نہا لے　　چھاتی نہیں تو پیارے ٹک پیٹھ ہی ملا لے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اس رت میں ہیں جہاں تک گلزار بھیگتے ہیں　　شہر و دیار کوچہ بازار بھیگتے ہیں
صحرا و جھاڑ بوٹے کہسار بھیگتے ہیں　　عاشق نہا رہے ہیں دلدار بھیگتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو دلبروں کی دہلی پہ بھیگتے ہیں　　کتنے پریرخوں کی پولی پہ بھیگتے ہیں
اور کتنے..... کی ڈیوڑھی پہ بھیگتے ہیں　　کتنے طوائفوں کی موری پہ بھیگتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتی ہے جب وہ سن کر یہ بات بھیگ احمق　　ماروں گی تیرے آ کر اک لات بھیگ احمق
مجھ کو بھی ضد چڑھی ہے دن رات بھیگ احمق　　یونہی تو اب کے ساری برسات بھیگ احمق

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

زردار کی تو سن کر آواز دو پری رو　　کہتی ہے لونڈیوں سے جلدی کواڑ کھولو
مفلس کوئی پکارے تو اس سے کہتی ہے وہ　　ہرگز کوئی نہ بولو احمق کو بھیگنے دو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہ سن کے گر وہ مفلس کچھ شور و غل مچاوے　　بیٹھک میں اینٹ پھینکے یا کنڈی کھڑکھڑاوے
کھڑکی میں ڈال سر کو جب ناگہ سناوے　　کیا غل مچا رہا ہے سن پیٹھے مالزادے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی یار سے کہے ہے اے دلستان آؤ　　بدلی بڑی اٹھی ہے، کہنے کو مان آؤ
کیا مینہ برس رہا ہے ہر اک مکان آؤ　　راتیں اندھیریاں ہیں اے میری جان آؤ

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی رات کو پکارے پیارے میں بھیگتی ہوں　　کی تیری الفتوں کے مارے میں بھیگتی ہوں
آئی ہوں تیری خاطر آ رے میں بھیگتی ہوں　　کچھ تو ترس تو میرا کھا رے میں بھیگتی ہوں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتی ہے دل سخت بھیگتی ہوں　　کانپے ہے میری چھاتی یک لخت بھیگتی ہوں
کپڑے بھی تر بتر ہیں اور سخت بھیگتی ہوں　　جلدی بلا لے مجھ کو کم بخت بھیگتی ہوں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

شیشہ کہیں گلابی بوتل جھمک رہی ہے   رابیل موتیا کی خوشبو مہک رہی ہے
چھاتی سے چھاتی لگ کر عشرت چھلک رہی ہے   پائے کھٹک رہے ہیں پٹی چٹک رہی ہے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی پکارتی ہے کیا کیا مجھے بھگویا   کوئی پکارتی ہے کیسا مجھے بھگویا
ناحق قرار کرکے جھوٹا، مجھے بھگویا   یوں دور سے بلاکر اچھا مجھے بھگویا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جن دلبروں کی خاطر بھیگے ہیں جن کے جوڑے   وہ دیکھ ان کی الفت ہوتے ہیں تھوڑے تھوڑے
لے ان کے بھیگے کپڑے ہاتھوں میں دھر نچوڑے   چیرا کوئی سکھادے جامہ کوئی نچوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہو رہی ہے جس جا زمیں پھسلنی   مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی   جوتی گری تو واں سے کیا تاب پھر نکلنی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو کیچڑوں کی دلدل میں پھنس رہے ہیں   کپڑے تمام گندی دلدل میں بس رہے ہیں
کتنے اٹھے ہیں مرمر کتنے اکس رہے ہیں   وہ دکھ میں پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی گر کر یہ اے خدائے لیجو   کوئی ڈگمگا کے ہر دم کہتا ہے وائے لیجو
کوئی ہاتھ اٹھا پکارے مجھ کو بھی ہائے لیجو   کوئی شور کر پکارے گرنے نہ پائے لیجو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اکثر جو مرد عورت پھسلے ہیں ناگہانی   تو ان کی یہ ہوئی ہے گرنے کی واں نشانی

یا اس کا ہاتھ اُن کے پاجامے کی میانی　　یا ان کا منہ ہوا ہے اور اس کی وہ میانی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر　　پھسلا کوئی کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر　　ہوتے ہیں سینکڑوں کے سر نیچے پاؤں اوپر
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

یہ رت وہ ہے کہ جس میں خورد و کبیر خوش ہیں　　ادنیٰ غریب مفلس شاہ و وزیر خوش ہیں
معشوق شاد و خرّم عاشق اسیر خوش ہیں　　جتنے ہیں اب جہاں میں سب اے نظیرؔ خوش ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(۳) بنجارہ نامہ

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا　　قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا　　کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے　　اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپا
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے　　کیا داکھ منقا سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا　　یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاو
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا　　دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبا کام نہ

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے   زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے   پھر ہانڈا ہے نے بھانڈا ہے نے حلوا ہے نے مانڈا ہے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی   اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی   دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی   اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کھپنی
کیا تھال، کٹورے چاندی کے، کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی   کیا برتن سونے روپے کے کیا مٹی کی ہنڈیا چپنی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ دھوم دھڑکا ساتھ لئے کیوں پھرتا ہے جنگل جنگل   اک تنکا ساتھ نہ جاوے گا موقوف ہوا جب ان اور جل
گھر بار اٹاری چوپاری، کیا خاصہ نن سکھ اور ململ   کیا چلمن پردے، فرش نئے، کیا لال پلنگ اور رنگ محل

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل زمرد سیم و زر   جب پونجی باٹ میں بکھرے گی پھر آن بنے گی جاں اوپر
نوبت نقارے، بان نشان، دولت حشمت فوجیں لشکر   کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھپر

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اُٹھاتا ہے اِن گونوں بھاری بھاری کے   جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے   کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے — سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے — کیا بغچے تاش تمامی کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکان بنواتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا — تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا — گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن — ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن — کیا مندر مسجد تال کنواں کیا کھیتی باڑی پھول چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا — کوئی تاج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سیئے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا — اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۴) عاشق نامہ

تنہا نہ اُسے اپنے دل تنگ میں پہچان — ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بیرنگ میں بارنگ میں نیرنگ میں پہچان — منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان — ہر راہ میں ہر ساتھ میں ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان — ہر دھوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

پھل پات کہیں شاخ کہیں پھول کہیں بیل   نرگس کہیں سوسن کہیں بیلا کہیں ہرا بیل
آزاد کوئی سب سے کسی کا ہے کہیں میل   ملتا ہے کوئی راکھ، چنبیلی کا کوئی تیل
کرتا ہے کوئی ظلم کو لیتا ہے کوئی جھیل   باندھے کہیں تلوار اُٹھاتا ہے کہیں سیل
ادنیٰ کوئی اعلیٰ کوئی سوکھا کوئی ڈنڈ پیل   جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں یہ سب کھیل

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

گاتا ہے کوئی شوق میں کرتا ہے کوئی حال   پھانکے ہے کوئی خاک اُڑاتا ہے کوئی مال
ہنستا ہے کوئی شاد کسی کا ہے بُرا حال   روتا ہے کوئی ہو کے غم و درد میں پامال
ناچے ہے کوئی شوخ بجاتا ہے کوئی تال   پہنے ہے کوئی چیتھڑے اوڑھے ہے کوئی شال
کرتا ہے کوئی ناز دکھاتا ہے کوئی بال   جب غور سے دیکھا تو اُسی کی ہے یہ سب چال

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار   کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کے سماچار
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار   بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی خوار
عاجز کوئی بیکس کوئی ظالم کوئی لٹھ مار   مفلس، کوئی ناچار، تونگر، کوئی زر دار
زخمی، کوئی ماندہ، کوئی اچھا، کوئی بدکار   جب غور سے دیکھا تو اُسی کے ہیں سب اسرار

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان

عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

ہے کوئی دلی دوست کوئی جان کا دشمن　　بیٹھا ہے پہاڑوں میں کوئی پھرتا ہے بن بن
مالا کوئی جپتا ہے کوئی شوق میں سمرن　　چھوٹے ہے کوئی مال سمیٹے ہے کوئی دھن
نکلے ہے جواہر کی کوئی پہن کے ابرن　　لوٹے ہے کوئی خاک میں رو رو کے ملا تن
جوگی کوئی بھوگی کوئی سوگی کوئی سوگن　　جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب فن

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

سردی کہیں گرمی کہیں جاڑا کہیں برسات　　دوزخ کہیں بیکنٹھ کہیں ارض و سماوات
حوریں کہیں غلماں کہیں پریاں کہیں جنات　　اوجڑ کہیں بستی کہیں جنگل کہیں دیوات
سختی کہیں راحت کہیں گردش کہیں سکنات　　شادی کہیں ماتم کہیں نور اور کہیں ظلمات
تارے کہیں سورج کہیں برج اور کہیں دن رات　　جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں طلسمات

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

بیچے ہے جواہر کوئی زر سیم طلا رانگ　　مارے کوئی پارے کو بناوے کوئی مرگانگ
دیتا ہے کوئی ہاتھ سے لیتا ہے کوئی مانگ　　محتاج کوئی قوت کا رکھتا ہے کوئی دانگ
ٹھیرا ہے کوئی جور لگاتا ہے کوئی تھانگ　　ملتا ہے کوئی پوست کو چھانے ہے کوئی بھانگ
گھنٹا ہے کہیں جھانجھ کہیں سنکھ کہیں بانگ　　جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب سوانگ

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

ناری کوئی بادی کوئی خاکی کوئی آبی — صوفی کوئی زاہد کوئی بدمست شرابی
باتیں کوئی بیٹھا ہوا کرتا ہے کتابی — پیتا ہے کوئی کیف کوئی مے کی گلابی
مارے ہے زٹل کوئی کہیں جیب ہے دابی — سچّا کوئی جھوٹا ہے کوئی رند خرابی
کالا کوئی گورا کوئی پیلا کوئی آبی — ہیں اس کی ہی قدرت کے یہ سب لعل گلابی

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

کیا حسن کہیں پایا ہے اللہ ہی اللہ — کیا عشق کہیں چھایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا رنگ یہ رنگوایا ہے اللہ ہی اللہ — کیا نور یہ جھمکایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا دھوپ ہے کیا سایہ ہے اللہ ہی اللہ — کیا مہر ہے کیا مایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا ٹھاٹھ یہ ٹھیرایا ہے اللہ ہی اللہ — کیا بھید نظیرؔ آیا ہے اللہ ہی اللہ

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

۵ آدمی نامہ

دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی — اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بےنوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ابدال و قطب و غوث و لی آدمی ہوئے — منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے

کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کئے   حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا   شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا   یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور   یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور   شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں   بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نماز یاں   اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی   اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اُتارے ہے آدمی   چلّا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سُن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ناچے ہے آدمی ہی بجا تالیوں کو یار   اور آدمی ہی ڈالے ہے اپنی ازار اُتار
ننگا کھڑا اُچھلتا ہے ہو کر ذلیل و خوار   سب آدمی ہی ہنستے ہیں دیکھ اس کو بار بار
اور وہ جو مسخرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو لے کے مال   اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال   سچا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال

اور جھوٹ کا بھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے اور آدمی بیاہ ۔۔۔ قاضی وکیل آدمی اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں خواہ مخواہ ۔۔۔ دوڑے ہیں آدمی ہی مشعالیں جلا کے واہ
اور بیاہنے چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو بولے ہے بار بار ۔۔۔ اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ صراحی جوتیاں، دوڑیں بغل میں مار ۔۔۔ کاندھے پہ رکھ کے پالکی ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دوکانیں لگا لگا ۔۔۔ اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا
کہتا ہے کوئی لو کوئی کہتا ہے لا رے لا ۔۔۔ کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی قہر سے لڑتے ہیں گھور گھور ۔۔۔ اور آدمی ہی دیکھ انہیں بھاگتے ہیں دور
چاکر غلام آدمی اور آدمی مزدور ۔۔۔ یاں تک کہ آدمی ہی اُٹھاتے ہیں جا ضرور
اور جس نے وہ پھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

طبلے مجیرے دائرے سارنگیاں بجا ۔۔۔ گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جا بہ جا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا ۔۔۔ وہ آدمی ہی ناچیں ہیں اور دیکھو یہ مزا
جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل جواہر ہیں بے بہا ۔۔۔ اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے کہ اُلٹا ہے جوں توا ۔۔۔ گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا سا چاند کا
بدشکل و بدنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کی یہ کچھ زرق برق ہیں　　روپے کے اُن کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں　　کمخواب تاش شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ جن کے بچھے ہیں نئے پلنگ　　پھولوں کی سیج ان پہ جھمکتی ہے تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے معشوق شوخ و شنگ　　سو سو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اور خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

حیراں ہوں یارو دیکھو تو کیا یہ سوانگ ہے　　آپ آدمی ہی چور ہے اور آپ تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی اور کہیں مانگ تانگ ہے　　دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے
فولاد سے کڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار　　نہلا دُھلا اُٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار　　سب آدمی ہی کرتے ہیں مرنے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینہ سے لے شاہ تا وزیر　　ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مُرید ہیں اور آدمی ہی پیر　　اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

(۶) ہنس نامہ

دنیا کی جو الفت کا ہوا مجھ کو سہارا　　اور اس نے خوشی کو مری خاطر میں اتارا

دیکھی جو یہ غفلت تو مرا دل یہ پکارا   آیا تھا کسی شہر سے اک ہنس بچارا
اک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اس کا گزارا

چنڈول اگن ابلقے جھیاں بنے ڈھیتر   مینا اُدبے کِلکلے بگلے بھی سمنبر
طوطے بھی کئی طور کے ٹوئیاں کوئی لہبر   رہتے تھے بہت جانور اس پیڑ کے اوپر
اس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا

بلبل نے کیا اس کی محبت میں خوش آہنگ   اور کوکلے کویل نے بھی الفت کو لیا سنگ
کھنجن میں گلنکوں میں بھی چاہت کے بجے چنگ   دیکھا جو طیوروں نے اسے حسن میں خوش رنگ
وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا

سیمرغ بھی سو دل سے ہوئے ملنے کے شائق   گدھ سنکھ بھی پنکھوں کے ہوئے جھلنے کے لائق
سارس بھی حواصل بھی ہوئے اس کے موافق   باز و لگڑ و جرہ و شاہیں ہوئے عاشق
شکروں نے بھی شکر سے کیا اس کا مدارا

کچھ سبزک و بڑ نکے، وکچھ منٹن و بزے   پنڈخی سے لگا لوٹڑ و قمری و ہریوے
غوغائی بگیری و لٹورے و پپیہے   کچھ لال چڑے پودنے پِدّے ہی نہ غش تھے
پدڑی بھی سمجھتی تھی اسے آنکھ کا تارا

چاہت کے گرفتار بٹیریں لوے تیتر   کبکوں کے تدروں کے بھی چاہت میں بندھے پر
ہُدہُد بھی ہوئے ہٹ کے بڈھیا ادھر ادھر   زاغ و زغن و طوطی و طاؤس کبوتر
سب کرنے لگے اس کی محبت کا اشارا

شکل اس کی وہیں جی میں کھبی شام چڑی کے   دی چاہ و چتا کھر کُھمی جھانپو نے بھی جھپ سے
ہریل بھی ہوئے اُس کی ہری چاہنے والے   جتنے غرض اس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے

اس ہنس پہ اُن سب نے دل و جان کو وارا

خواہش یہ ہوئی سب کی کہ ہر دم اُسے دیکھیں اور اس کی محبت سے ذرا منہ کو نہ پھیریں
دن رات اسے خوش دیکھیں نت سکھ اسے دیویں صحبت جو ہوئی ہنس کی اُن جانوروں میں
یک چند رہا خوب محبت کا گزارا

سب ہو کے خوش اس کی مئے الفت لگے پینے اور پیت سے ہر ایک نے واں بھر لئے سینے
ہر آن جتانے لگے چاہت کے قرینے اس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے
اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

یاں لطف و کرم تم نے کئے ہم پہ ہیں جو جو تم سب کی یہ خوبی ہے کہاں ہم سے بیاں ہو
تقصیر کوئی ہم سے ہوئی ہو وے تو بخشو لو یارو اب ہم جاویں گے کل اپنے وطن کو
اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

اب تک تو بہت ہم رہے فرحت سے ہم آغوش اب یاد وطن دل کی ہمارے ہوئی ہمدوش
جب حرف جدائی کا پرندوں نے کیا گوش اس بات کے سنتے ہی جو ہر اک کے اُڑے ہوش
سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا

بن دیکھے تمہارے ہمیں کب چین پڑیں گے اک آن نہ دیکھیں گے تو دل غم سے بھریں گے
گر تم نے یہ ٹھیرائی تو کیا سکھ سے رہیں گے ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جاوے گا سہارا

پھر ہنس نے یہ بات کہی ان سے کئی بار کچھ بس نہیں اب چلنے کی ساعت ہے ہیں ناچار
آنکھیں ہوئیں اشکوں سے پرندوں کی گہربار اس میں جو شب کوچ کی ہوئی صبح نمودار
پر اپنا ہوا پر وہیں اس ہنس نے مارا

وہ ہنس جب اس پیڑ سے واں کو چلا ناگاہ — منہ پھیر کے ادھر سے وطن کی جو ہیں لی راہ
دیکھا جو اسے جاتے ہوئے واں سے تو کر آہ — سب ساتھ چلے اس کے وہ ہمراز ہوا خواہ
ہر ایک نے اڑنے کے لئے پنکھ پسارا

اور ہنس کی واں سب کو رفاقت ہوئی غالب — جب واں سے چلا وہ تو ہوئی بے لبسی غالب
کلفت تھی جو فرقت کی وہ سب پر ہوئی غالب — دو کوس اڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا

پر اُن کے ہوئے تر جو ہیں دوری کی پڑی اوس — روئے کہ رفاقت کی کریں کیونکہ قدم بوس
تھک تھک کے لگے گرنے تو کرنے لگے افسوس — کوئی تین کوئی چار کوئی پانچ اڑا کوس
کوئی آٹھ کوئی نو کوئی دس کوس میں ہارا

کچھ بن نہ سکے اُن سے رفیقی کے جو واں کار — اور اتنے اڑے ساتھ کہ کچھ ہووے نہ اظہار
جب دیکھی وہ مشکل تو پھر آخر کے تئیں ہار — کوئی یاں رہا کوئی واں رہا کوئی ہو گیا ناچار
کوئی اور اُڑا آگے جو تھا سب میں کرارا

تھی اس کی محبت کی جو ہر ایک نے پی مے — سمجھے تھے بہت دل میں وہ الفت کو بڑی شے
جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے — چیلیں رہیں کوے گرے اور باز بھی تھک کے
اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارا

دنیا کی جو الفت ہے تو اُس کی ہے یہ کچھ راہ — جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیونکہ ہو نرباہ
ناچاری ہو جس جا میں تو واں کیجئے کیا چاہ — سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

(۷) روضۂ تاج گنج

یارو یہ تاج گنج جو یاں آشکار ہے — مشہور اس کا نام بہ شہر و دیار ہے
خوبی میں سب طرح کا اسے اعتبار ہے — روضہ جو اس مکاں میں دریا کنار ہے
نقشہ میں اپنے یہ بھی عجب خوش نگار ہے

روئے زمیں پہ یوں تو مکاں خوب ہیں میاں — پر اس مکاں کی خوبیاں کیا کیا کروں بیاں
سنگِ سفید سے جو بنا ہے قمر نشاں — ایسا چمک رہا ہے تجلی سے یہ مکاں
جس سے بلور کی بھی چمک شرمسار ہے

گنبد ہے اس کا زور بلندی سے بہرہ مند — گرد اس کے گمٹیاں بھی جھمکتی ہوئی ہیں چند
اور وہ کلس جو ہے سرِ گنبد سے سربلند — ایسا ہلال اس پہ سنہرا ہے دل پسند
ہر ماہ جس کے خم پہ مہ نو نثار ہے

گنبد کے نیچے اور مکاں میں جو آس پاس — وہ بھی برنگ سیم چمکتے ہیں خوش اساس
برسوں تک اس میں رہیے تو ہووے نہ جی اداس — آتی ہے ہر طرف سے گل یاسمن کی باس
ہوتا ہے شاد اس میں جو کرتا گزار ہے

ہیں بیچ میں مکان کے وہ دو مرقدیں جو یاں — گرد اُن کے جالی اور محجر ہے درفشاں
سنگین گل جو اس میں بنائے ہیں تہ نشاں — پتے کلی سہاگ رگ و رنگ ہے عیاں
جو نقش اس میں ہے وہ جواہر نگار ہے

دیواروں پر ہیں سنگ میں نازک عجب نگار — آئینے بھی لگے ہیں مجلی و تابدار

دروازے پر لکھا خطِ طغرا ہے طرفہ کار   ہر گوشے پر کھڑے ہیں جو مینار اس کے چار
چاروں سے طرفہ اوج کی خوبی دوچار ہے

پہلو میں ایک برج بسی کہتے ہیں اُسے   آتے نظر ہیں اُس سے مکاں دور دور کے
مسجد ہے ایسی جس کی صفت کس سے ہو سکے   پھر اور بھی مکان ہیں ادھر اور اُدھر کھڑے
دروازۂ کلاں بھی بلند استوار ہے

جو صحن باغ کا ہے وہ ایسا ہے دلکشا   آتی ہے جس میں گلشن فردوس کی ہوا
ہر سو نسیم چلتی ہے اور ہر طرف ہوا   ہلتی ہیں ڈالیاں سبھی ہر گل ہے جھومتا
کیا کیا روش روش پہ ہجوم بہار ہے

سرو سہی کھڑے ہیں قرینے سے نسترن   کوکو کریں ہیں قمریاں ہو کر شکر شکن
رابیل بیوتی سے بھرے ہیں چمن چمن   گلنار لالۂ و گل و نسرین و نسترن
فوارے چھٹ رہے ہیں رواں جوئبار ہے

وہ تاجدارِ شاہجہاں صاحبِ سریر   بنوایا ہے انھوں نے لگا سیم و زر کثیر
جو دیکھتا ہے اس کے یہ ہوتا ہے دلپذیر   تعریف اِس مکان کی میں کیا کیا کروں نظیر
اِس کی صفت تو مشتہرِ روزگار ہے

(۸) تندرستی نامہ

ہیں مرد اب وہی کہ جنھوں کا ہے فن درست   حرمت انہوں کے واسطے جن کا چلن درست
رہتا نہیں کسی کا سدا مال دھن درست   دولت رہی کسی کی نہ باغ و چمن درست

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

دنیا میں اب انہوں کے تئیں کہیۓ بادشاہ — جن کے بدن درست ہیں دن رات سال و ماہ
جس پاس تندرستی و حرمت کی ہو سپاہ — ایسی پھر اور کون سی دولت ہے واہ واہ

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

جو گھر میں اپنے میری و حشمت پناہی ہے — بن تندرستی سب وہ خرابی تباہی ہے
یہ تندرستی یارو بڑی بادشاہی ہے — سچ پوچھئے تو عین یہ فضل الٰہی ہے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

گر دولتوں سے اس کا بھرا ہے تمام گھر — بیمار ہے تو خاک سے بدتر ہے سب وہ زر
ہو تندرست گرچہ یہ مفلس ہے سر بسر — پھر نے کسی کا خوف نہ ہرگز کسی کا ڈر

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

عاجز ہو یا حقیر ہو پر تندرست ہو — بے زر ہو یا امیر ہو پر تندرست ہو
قیدی ہو یا اسیر ہو پر تندرست ہو — مفلس ہو یا فقیر ہو پر تندرست ہو

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

اس میں تمام ختم ہیں عالم کی خوبیاں — ہو تندرستی اور سلے حرمت سے آب و ناں

قسمت سے جب یہ دونوں میسر ہوں پھر تو ہاں — پھر ایسی اور کونسی نعمت ہے میری جاں

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

پرواہ نہیں اگرچہ لکھا یا پڑھا نہ ہو — محتاج حق سوا یہ کسی اور کا نہ ہو
حسن و جمال و علم و ہنر گو ملا نہ ہو — اک تندرستی چاہئے کچھ ہووے یا نہ ہو

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

بیمار گرچہ لاکھ طرح سے ہو بادشاہ — تو اس کو جانئے یہ گدا سے بھی ہے تباہ
ہم تو اُسی کو شاہ کہیں اور جہاں پناہ — اب جس کا تن درست ہو حرمت سے ہو نباہ

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

ہوں گرچہ لاکھ دولتیں بیمار کے کنے — اور نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوں بنے ٹھنے
بہتر ہیں مفلسی کے میاں چابنے چنے — جو تندرست ہیں وہی دولھا ہیں اور بنے

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

جب تندرستیوں کی رہیں دل میں بستیاں — پھر سو طرح کے عیش ہیں اور مے پرستیاں
کھانے کو نعمتیں ہوں کہ ہوں فاقہ مستیاں — سب عیش اور مزے ہیں جو ہوں تندرستیاں

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

چاہا جو دل نشہ کو تو وہیں منگا لیا　　محبوب دلبروں کو گلے سے لگا لیا
آیا جو عیش دل میں خوشی سے اڑا لیا　　جو مل گیا سو پی لیا چاہا سو کھا لیا
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

آیا جو دل میں سیر چمن کو چلے گئے　　بازار چوک سیر تماشے میں خوش ہوئے
بیٹھے اٹھے خوشی سے ہر اک جا چلے پھرے　　جاگے مزے میں رات کو یا خوش ہو سو رہے
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

قدرت سے یہ جو تن کی بنی ہے ہر ایک کل　　جب تک یہ کل بنی ہے جبھی تک پڑے ہے کل
گر ہو خدا نخواستہ ایک کل بھی چل بہ چل　　پھر نے خوشی نہ عیش نہ کچھ زندگی کا پھل
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

ادنیٰ ہو یا غریب تونگر ہو یا فقیر　　یا بادشاہ شہر کا یا ملک کا وزیر
ہے سب کو تندرستی و حرمت ہی دلپذیر　　جو تو نے اب کہا سو یہی سچ ہے اے نظیر
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

(۹) چڑیوں کی تسبیح

وقت سحر کی روحیں کیا کیا ہوں ہوں ہوں ہوں کرتی ہیں — ہوں ہوں ہوں ہوں کر کر ذکر کن اور فیکوں کرتی ہیں
مرغے بولے ککڑوں کوں اور مرغیاں کوں کوں کرتی ہیں — طوطیاں بھی سب یاد میں اُس کی بھتوں بھتوں کرتی ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

پنکھ بڑھا گرڑ پنگھ اسی کے غم کی تپ میں تپتے ہیں — عنقا اور سیمرغ اسی کی فرقت بیچ تڑپتے ہیں
سارس، گدھ، حواصل، تیترے، بگلے، پنکھ کلپتے ہیں — پنکھ پکھیرو جتنے ہیں سب نام اسی کا جپتے ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں، چونچوں، چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

قمری بولے حق سرّہٗ بلبل بولے بسم اللہ — کبک، ٹیٹری، چاروں قل اور تیتر بھی سبحان اللہ
دادر، مور، پپیہے، کویل، کوک رہے اللہ اللہ — فاختہ کوکو، تیہو ہو ہو، طوطے بولیں حق اللہ

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں، چونچوں، چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

شکرا چیخ اور لگھڑ، باشے اور ترمتی باز کوئی — کونج، کبوتر، سبزک، جھانیو، کلکل، سارو، مار جوئی
لعل پڑھے ہے صُمّ بکم، جب پہنے پوشاک سوئی — پدڑی، پدّی، پودنے، شکر خورے، بولیں تو ئی تو ئی

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں، چونچوں، چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

چیل کلی السجل کہے ہے چلوں چلوں مت جان میاں ‏ کوّے قاں قاں کرتے ہیں الا آن کما کان میاں
مرمر بولے مرغابی کُل من علیہا فان میاں ‏ جتنے پنکھ پکھیرو ہیں سب پڑھتے ہیں قرآن میاں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

ہنس ہما سرخاب تدروین بولیں یا رحمان میاں ‏ سارو، ہریل اور لٹورے دہیڑ یا حنان میاں
ققنس، تیتر، چکوہ، چکوی، بولیں یا منان میاں ‏ ہدہد بولیں احد احد کچھ تو بھی تو کر دھیان میاں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

بوم چغد اور سبزک ابابیل اور چکوریں شام چڑی ‏ کھنجن جھنیاں بوے کلنگ اور غوغائی کی دھوم پڑی
تلی ٹڈی ڈانس بھنبھیری کتری بھونری اور بڑی ‏ مکھی جھینگر بھونگے بول رہے سب گھڑی گھڑی

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

تن تن اور لم ڈھیک مولا حق حق تار پروتے ہیں ‏ اُن سب کے چنڈول ابلقے یاد میں اُس کی روتے ہیں
طائر تو سب تخمِ محبت اس کا دل میں بوتے ہیں ‏ پنچھی اس کی یاد کریں ہم پاؤں پسارے سوتے ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں
چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

کس کس کا لوں نام غرض ہیں جتنے طائر خورد و کبیر ‏ کوئی کہے یا حیّ توانا کوئی کہے یا رب قدیر
پنکھی تو سب یاد کریں اور ہم غفلت میں رہیں اسیر ‏ ہم سے غافل دنیا میں اب کوئی نہ ہوگا آہ نظیر

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چونچوں چونچوں کرتی ہیں

چونچوں چونچوں چونچوں کیا سب بیچوں بیچوں کرتی ہیں

(۱۰) فنا نامہ

گر شاہ سر پر رکھکر افسر ہوا تو پھر کیا
اور بحر سلطنت کا گوہر ہوا تو پھر کیا
ماہی علم مراتب پُر زر ہوا تو پھر کیا
نوبت نشاں نقارہ در پر ہوا تو پھر کیا
سب ملک سب جہاں کا سرور ہوا تو پھر کیا

یا رکھ کے فوج و لشکر کی سلطنت پناہی
پھیری دُہائی اپنی لے ماہ تا بہ ماہی
جب آن کر فنا کی سر پر پڑی تباہی
پھر سر رہا نہ لشکر نے تاج بادشاہی
دارا و جم سکندر اکبر ہوا تو پھر کیا

یا ذات میں کہائے نامی اصیل ذاتی
جمشید فر کے پوتے نوشیرواں کے ناتی
تھے آپ مثل دولھا اور فوج تھی براتی
جب چل بسے تو کوئی پھر سنگ تھا نہ ساتی
ملک و مکاں خزانہ لشکر ہوا تو پھر کیا

یا راج بنسی ہوکر دنیا میں راج پایا
چتوڑ گڈھ ستارا کالنجر آ بنایا
جب توپ نے اجل کی آ مورچہ لگایا
سب اُڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا
گڈھ کوٹ توپ گولہ سنگر ہوا تو پھر کیا

کتنے دنوں یہ غل تھا نواب ہیں یہ خاں ہیں
یہ ابن پنجہزاری یہ عالی خانداں ہیں
جاگیر و مال و منصب سب آج ان کے ہاں ہیں
دیکھا تو اک گھڑی میں نے نام نے نشاں ہیں
دو دن کا شور چرچا گھر گھر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی دیکھو یہ ہیں امیر خاں جی ‏ اور یہ ہیں خانخاناں اور یہ شیر خاں جی
پنجہ اٹھا قضا کا جب آئے شیر خاں جی ‏ پھر کس کے میر خاں جی کس کے وزیر خاں جی
عمدہ غنی تونگر بازر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی گھوڑا ہے نامدار خاں کا ‏ یہ پالکی یہ ہاتھی ہے ذوالفقار خاں کا
آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں کا ‏ خر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہسوار خاں کا
جھپاں میگ ڈنبر در پہ ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی یہ ڈیوڑھی ہے خاں مہرباں کی ‏ یہ باغ یہ حویلی ہے مخلدار خاں کی
جب راج نے قضا کے کرنی بسولی ٹانگی ‏ اک اینٹ بھی نہ پائی ہرگز کسی مکاں کی
رنگیں محل سنہرا گھر در رہا تو پھر کیا

کتنوں نے بادشاہی کیا کیا خطاب پایا ‏ مہریں بڑی کھدائیں سکہ بڑا بنایا
جب آن کر فنا نے نام و نشاں مٹایا ‏ وہ نام اور وہ سکہ ڈھونڈھا کہیں نہ پایا
دو دن کا مہر چھاپا در پر ہوا تو پھر کیا

جاگیر میں کسی نے زر ریز ملک پایا ‏ کر بندوبست اپنا نظم و نسق بٹھایا
لیکن سند اجل کا جب فوجدار آیا ‏ اک دن میں حکم حاصل سب ہو گیا پرایا
ہانسی حصار ٹھٹھا بھکر ہوا تو پھر کیا

کہتا تھا کوئی یہ لشکر ہے طرہ باز خاں کا ‏ یہ خیمہ شامیانہ ہے شہنواز خاں کا
آیا کٹک اجل کے جب یکہ تاز خاں کا ‏ سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز خاں کا
سردار میر بخشی بڑھ کر ہوا تو پھر کیا

ہاتھی پہ چڑھ کے نکلے یا خاصے گھوڑے اوپر ‏ یا نالکی سنبھالی یا پالکی کی جھالر

یا لے صراحی حقہ دوڑے جلیب اندر — جب آ اجل پکاری صاحب رہا نہ نوکر
آقا ہوا تو پھر کیا نوکر ہوا تو پھر کیا

یا لے کے اک قلمداں اور رکھ قلم کو سر پر — جوڑے حساب لاکھوں چہرے لکھے سراسر
جب عمر کی کچہری جھانکی قضا نے آکر — پھر آپ نے قلمداں کاغذ رہا نہ دفتر
منشی وکیل دیواں مرمر ہوا تو پھر کیا

یا لے قضا کی خدمت ہو بیٹھے آپ قاضی — محضر قبالہ لکھے قضیے چکائے شرعی
اعلام لے قضا کا جب آ فنا پکاری — پھر محکمہ نہ جھگڑا قاضی رہا نہ مفتی
کوڑا، لبیدہ درہ در پر ہوا تو پھر کیا

کُتوال بن کے بیٹھا یا صدر ہو مقرر — فاسق ڈرے ہزاروں اور چور کانپے تھر تھر
آیا قضا کا مردہا جس دم چھڑی اُٹھا کر — کُتوالی اور صدارت سب ہو گئی برابر
دو دن کا خوف خطرہ در در ہوا تو پھر کیا

کہتے تھے کتنے ہم تو ہیں ذات میں کلاں جی — ہم شیخ ہم مغل ہیں ہم ہیں پٹھان ہاں جی
جس دم قضا پکاری اب اُٹھ چلو میاں جی — پھر شیخ جی نہ سید مرزا رہے نہ خاں جی
ذات و حسب نسب کا جوہر ہوا تو پھر کیا

یا لے کے زر جہاں میں کرنے لگے تجارت — یا سیٹھ بن کے بیٹھے خاصی بنا عمارت
کھولیں قضا نے بہیاں جب کر کے اک اشارت — سب کوٹھی اور دُکانیں کر ڈالیں دم میں غارت
مال اور مکاں جواہر اور زر ہوا تو پھر کیا

یا ہو سپاہی بانکا ترچھا، بڑا اکھایا — بلدار باندھ چیرا اکڑے کو جگمگایا
کھیتوں میں جا کے کُودا لاکھوں کے تئیں بھگایا — جب مُنہ اجل کا دیکھا پھر کچھ بھی بن نہ آیا

یکت شجاع بہادر صفدر ہوا تو پھر کیا

گھوڑا اُٹھا کے ڈپٹا فوجوں میں ہو دلاور — مارے طمنچے بھالے کھائے کٹار جمدھر
مارا قضا نے بھالا جس دم فنا کا آکر — پھر مردمی شجاعت سب ہو گئی برابر
خود و سلاح جلتہ بکتر ہوا تو پھر کیا

یا خانہ جنگی لڑ کر کھایا بدن میں ٹانکا — مونچھوں کو تاؤ دے کر سو سو دوات ہانکا
جب گھوڑا قضا کے بانکے نے آکے جھانکا — ٹیڑھا رہا نہ ترچھا گنڈا رہا نہ بانکا
تیغا سپر قرابیں جمدھر ہوا تو پھر کیا

یا ہو حکیم حاذق کرنے لگے طبابت — مُردوں کے تئیں جلایا عیسیٰ کی کی کرامت
کھوئے مرض ہزاروں ڈھونڈی ہر اک کی رمت — جب سر پہ آئی اپنے پھر کچھ چلی نہ حکمت
لقمان یا فلاطوں آکر ہوا تو پھر کیا

یا ہو نجومی کامل تاروں کو چھان ڈالا — سورج گہن بچارے چندر گہن نکالا
بیچ دستار سے باندھے احکام کو سنبھالا — جب وقت اپنا آیا اُس وقت کو نہ ٹالا
جوتش نجوم پنڈت پڑھ کر ہوا تو پھر کیا

یا پڑھ کے دو کتابیں ازبر کرکے علم حاصل — یا بھوت جن اُتارے مشہور ہو کے کامل
جب دیو کا اجل کے سایہ ہوا مقابل — تو رہا نہ سیانا عالم رہا نہ فاضل
تعویذ فال جب دو منتر ہوا تو پھر کیا

ماتھے پہ کھینچ ٹیکا یا ہاتھ لے کے مالا — پوتھی بغل میں دابی زنار کو سنبھالا
پوجا کتھا کہانی کیا کیا سبد نکالا — کچھ بن سکا نہ آیا جب جان لینے والا
دید و پران پڑھ کر مصر ہوا تو پھر کیا

یا زہد بندگی میں سوکھا ہو کوئی عابد   بیٹھا مصلوں اوپر ہو مسجدوں میں ساجد
حاضر ہوا قضا کا جب آن کر مجاہد   پھر بوریا نہ بدھنا عابد رہا نہ زاہد
روزہ نماز چلہ اکثر ہوا تو پھر کیا

یا پی کے مے کسی نے کی عیش کامیابی   لوٹا نشے میں بھر جا کر دل سے بے حجابی
جس دم قضا نے اپنی جھمکائی اک گلابی   پھر مے رہی نہ مینا نے مست نے شرابی
اک دم لبوں پہ مے کا ساغر ہوا تو پھر کیا

حسن و جمال پاکر یا خوبرو کہایا   یا عشق میں کسی نے جی جان کو گھٹایا
آکر پڑا سروں پر جس دم اجل کا سایا   دونوں میں پھر کسی کو ڈھونڈھا کہیں نہ پایا
عاشق ہوا تو پھر کیا دلبر ہوا تو پھر کیا

یا ہو کے پیرزادے کرنے لگے فقیری   کر کر مرید کتنے کی اُن کی دستگیری
جب پیرہن کی کفنی آکر اجل نے چیری   سب اُڑ گئی ہوا پر دم میں مریدی پیری
مرشد فقیر ہادی رہبر ہوا تو پھر کیا

یا سر منڈا کے بیٹھے آزاد ہو نویلے   یا خود منڈے کما کر سو روپ رنگ کھیلے
میلے کئے ہزاروں مونڈے فقیر چیلے   جب آ قضا پکاری جا سو رہے اکیلے
تکیہ ہوا تو پھر کیا بستر ہوا تو پھر کیا

جوگی اتیت جنگم یا سیوڑا کہایا   یا کھول کر جٹا کو یا گھونٹ سر منڈایا
ترسول لے قضا کا جب وقت سر پہ آیا   نے بالکے کو تھا نبا نے آپ کو بچایا
نانک کبیر پنتھی بھرتھر ہوا تو پھر کیا

یا نیک بن کے بیٹھے اچھے لگے کہانے   یا ہو کے بد ہر اک کے دل کو لگے ستانے

آ کر بجے اجل کے جب سر پہ شادیانے ‌ ‌ ‌ تھے نیک و بد جہاں تک سب لگ گئے ٹھکانے
بہتر ہوا تو پھر کیا بدتر ہوا تو پھر کیا

کیا ہندو اور مسلماں کیا رند و گبر و کافر ‌ ‌ ‌ نقاش کیا مصور کیا خوشنویس شاعر
جتنے نظیرؔ ہیں یاں اک دم کے ہیں مسافر ‌ ‌ ‌ رہنا نہیں کسی کو چلنا ہے سب کو آخر
دو چار دن کی خاطر یاں گھر ہوا تو پھر کیا

(۱۱) طفلی نامہ

کیا دن تھے پر وہ بھی تھے جب کہ بھولے بھالے ‌ ‌ ‌ نکلے تھی دائی لے کر پھرتی کبھی دوا لے
چوٹی کوئی رکھا لے بدھی کوئی پہنا لے ‌ ‌ ‌ ہنسلی گلے میں ڈالے منت کوئی بڑھا لے
موٹے ہوں یا کہ دبلے گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم نے حیا ہے ‌ ‌ ‌ آگا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے ننگے پھرے تو کیا ہے ‌ ‌ ‌ یاں یوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے
کچھ کھا لے اس طرح سے کچھ اس طرح سے کھا لے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

مر جاوے کوئی تو بھی کچھ ان کا غم نہ کرنا ‌ ‌ ‌ نے جانے کچھ بگڑنا نے جانے کچھ سنورنا
ان کی بلا سے گھر میں ہو قید یا کہ چھٹنا ‌ ‌ ‌ جس بات پر یہ مچلے پھر وہ ہی کر گزرنا
ماں اوڑھنی کو، بابا پگڑی کو بیچ ڈالے

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جو کوئی چیز دیوے نت ہاتھ اوٹھتے ہیں　　گڑ بیر مولی گاجر لے منہ میں گھونٹتے ہیں
بابا کی مونچھ ماں کی چوٹی کھسوٹتے ہیں　　گردوں میں اٹ رہے ہیں خاکوں میں لوٹتے ہیں
کچھ مل گیا سو پی لے کچھ بن گیا سو کھا لے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جو ان کو دو سو کھا لیں پھیکا ہو یا سلونا　　ہیں بادشہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا
جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہے ان کو سونا　　پروا نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیئے بچھونا
بھونپو کوئی بجا لے پھرکی کوئی نچا لے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے　　یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشا ہے
اور سچ اگر یہ پوچھو تو بادشہ بھی کیا ہے　　اب تو نظیر میری سب کو یہی دعا ہے
جیتے رہیں سبھوں کے آس و مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

۱۲ جوانی

کیا عیش کے رکھتی ہے سب آہنگ جوانی　　کرتی ہے بہاروں کے تئیں دنگ جوانی
ہر آن پلاتی ہے مے اور بنگ جوانی　　کرتی ہے کہیں صلح کہیں جنگ جوانی
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی

عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

اللہ نے جوانی کا وہ عالم ہے بنایا ہر ہر کہیں عاشق کہیں رسوا کہیں شیدا
پھندے میں کہیں جی ہے کہیں دل ہے تڑپتا مرتے ہیں سسکتے ہیں بلکتے ہیں اہا ہا
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

نے مے کا نہ معجون کے منگوانے کا کچھ غم نے دل کے لگانے کا نہ گل کھانے کا کچھ غم
گالی کا نہ آنکھوں کے لڑ آنے کا کچھ غم ہنسنے کا نہ چھاتی سے لپٹ جانے کا کچھ غم
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

لڑتی ہے کہیں آنکھ کہیں دست کہیں سین چھوٹا ہے کہیں پیار کسی سے ہیں لگے نین
وعدہ کہیں اقرار کہیں سین کہیں نین نے جی کو فراغت ہے نہ آنکھوں کے تئیں چین
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

الفت ہے کہیں مہر و محبت ہے کہیں چاہ کرتا ہے کوئی چاہ کوئی دیکھ رہا راہ
ساقی ہے صراحی ہے پری زاد ہیں ہمراہ کیا عیش ہیں کیا عیش ہیں کیا عیش ہیں واللہ
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

چہرے پہ جوانی کا جو آ کے ہے چڑھا نور رہ جاتی ہیں پریاں بھی غرض اس کے تئیں گھور
چھاتی سے لپٹتی ہے کوئی حسن کی مغرور گودی میں پڑی لیٹے ہے چنچل سی کوئی حور

اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

گر رات کسی پاس رہے عیش میں غلطاں   اور واں سے کسی اور کے ملنے کا ہوا دھیاں
گھبرا کے اُٹھے جب تو گری پاؤں پہ ہر آں   کہتی ہے ہمیں چھوڑ کے جاتے ہو کدھر جاں
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

رستے میں نکلتے ہیں تو ہوتی ہیں یہ چاہیں   وہ شوخ کہ ہوں بند جنھیں دیکھ کے راہیں
کھاتے ہے کوئی ہنس کے کوئی بھرتی ہیں آہیں   پڑتی ہیں ہر اک جا سے نگاہوں پہ نگاہیں
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

تنتے ہیں اگر اینٹھ کے چلتے ہیں عجب چال   جو پاؤں کہیں راہ کہیں سیف کہیں ڈھال
کھینچے ہیں کہیں بال کہیں توڑ لیا گال   چڑھ بیٹھے کہیں ہاتھ کہیں منہ پہ دیا ڈال
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

جاتے ہیں طوائف میں تو واں ہوتے ہیں یہ چاؤ   کہتی ہے کوئی ان کے لئے پان بنا لاؤ
کوئی کہتی ہے یاں بیٹھو کوئی کہتی ہے یاں آؤ   ناچے ہے کوئی شوخ بتاتی ہے کوئی بھاؤ
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

ہنس ہنس کے کوئی حسن کی چھل بل ہے دکھاتی   مستی کوئی سرمہ کوئی کاجل ہے دکھاتی

چتون کی لگاوٹ کوئی چنچل ہے دکھاتی — کرتی کوئی انگیا کوئی آنچل ہے دکھاتی
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

کہتی ہے کوئی رات مرے پاس نہ آئے — کہتی ہے کوئی ہم کو بھی خاطر میں نہ لائے
کہتی ہے کوئی کس نے تمھیں پان کھلائے — کہتی ہے کوئی گھر کو جو جائے ہمیں کھائے
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

گر دل کو کسی شوخ پری کی ہوئی ٹک چاہ — اور نازنیں کرنے لگی اس وقت وہ اکراہ
جوں باز کہ چڑیا کو کہیں داب لے ناگاہ — مچوا دی لپٹ کر وہیں ننڈی سے اوئی آہ
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

آیا جو کوئی حسن کا بوٹا یا کوئی جھاڑ — جا شوخ سے جھپ لپٹے یہ پنجوں کے تئیں جھاڑ
انگیا کے تئیں چیر کے کرتی کو لیا پھاڑ — اخلاص کہیں پیار کہیں مار کہیں دھاڑ
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

کیا تجھ سے نظیر اب میں جوانی کی کہوں بات — اس پن میں گزرتی ہے عجب عیش سے اوقات
محبوب پری زاد چلے آتے ہیں دن رات — سیریں ہیں بہاریں ہیں تواضع ہے مدارات
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

(۱۳) بُڑھاپا

کیا قہر ہے یارو جسے آجائے بڑھاپا — اور عیش جوانی کے تئیں کھائے بڑھاپا
عشرت کو ملا خاک میں غم لائے بڑھاپا — ہر کام کو ہر بات کو ترسائے بڑھاپا
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جو لوگ خوشامد سے بٹھاتے تھے گھڑی پہر — چھاتی سے لپٹتے تھے محبت کی جتا لہر
اب آکے بڑھاپے نے کیا ہائے یہ کچھ قہر — اب جن کے کنے جاتے ہیں لگتے ہیں اُنہیں زہر
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

آگے تو پری زاد یہ رکھتے تھے ہمیں گھیر — آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی ذرا دیر
سو آکے بڑھاپے نے کیا ہائے یہ اندھیر — جو دوڑ کے ملتے تھے سو اب لیتے ہیں منہ پھیر
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بُڑھاپا

تھے جب تلک ایام جوانی کے ہرے روکھ — محبوب وہ ملتے تھے نہ ہو دیکھ جنہیں بھوکھ
بیٹھے تھے پرند آن کے جب تک تھا ہرا روکھ — اب کیا ہے جو پت جھڑ ہوا اور جڑ بھی گئی سوکھ
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

آگے تھے جہاں گل بدن و یوسف ثانی — دیتے تھے ہمیں پیار سے چھلّوں کی نشانی
مرجائیں تو اب مُنہ میں نہ ڈالے کوئی پانی — کس دُکھ میں ہمیں چھوڑ گئی ہائے جوانی
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

یاد آتے ہیں ہم کو جو جوانی کے وہ ہنگام — اور جام دلارام مزے عیش اور آرام
ان سب میں جو دیکھو تو نہیں ایک کا اب نام — کیا ہم پہ ستم کر گئی یہ گردشِ ایام
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

مجلس میں جوانوں کی تو ساغر ہیں چھلکتے — چہلیں ہیں بہاریں ہیں پری رو ہیں جھمکتے
ہم ان کے تئیں دور سے ہیں رشک سے تکتے — وہ عیش و طرب کرتے ہیں ہم سر ہیں پٹکتے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب پاؤں پڑیں ان کے تو ہرگز نہ بلادیں — جا بیٹھیں تو اک دم میں خفا ہو کے اٹھا دیں
اتنا تو کہاں اب جو کوئی جام پلا دیں — گر جان نکلتی ہو تو پانی نہ چوا دیں
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جب عیش کے مہمان تھے اب غم کے ہوئے ضیف — اب خونِ جگر کھاتے ہیں جب پیتے تھے کیف
جب اینٹھ کے چلتے تھے سر باندھ اٹھا سیف — اب ٹیک کے لاٹھی کے تئیں چلتے ہیں صد حیف
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلا سے بڑھاپا

تھے ہم بھی جوانی میں بہت عشق کے پورے — وہ کون سے گل رو تھے جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے نے کئے ایسے ادھورے — پر جھڑ گئے دُم اُڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلا سے بڑھاپا

کیا یار اُلٹ ہم سے گیا ہائے زمانا — جو شوخ کہ تھے اپنی نگاہوں کا نشانا
چھیڑے ہے کوئی ڈال کے دادا کا بہانا — ہنس کر کوئی کہتا ہے کہاں جاتے ہو نانا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلا سے بڑھاپا

دیکھیں جسے کہتا ہے وہ کیا پوچھے ہے بڈھے — آویں تو یہ غل ہو کہ کہاں آوے ہے بڈھے
بیٹھیں تو ہو یہ دھوم کہاں بیٹھے ہے بڈھے — دیکھیں جسے کہتا ہے وہ کیا دیکھے ہے بڈھے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا یار دکھیں گو کہ بڑھاپا ہے ہمارا — پر بوڑھے کمانے کا نہیں تو بھی سہارا
جب بوڑھا ہمیں ہائے جہاں کہہ کے پکارا — کافر نے کلیجے میں گویا تیر سا مارا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

خوباں میں اگر جاویں تو ہوتی ہے یہ پھکڑی — کھینچے ہے کوئی ہاتھ کوئی پکڑے ہے لکڑی
پٹے کہیں اور مونچھیں کہیں جاتی ہیں پکڑی — ڈاڑھی کو پکڑ کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کہتا ہے کوئی چھین لو اس بوڑھے کی لاٹھی کہتا ہے کوئی شوخ کہ ہاں کھینچ لو ڈاڑھی
اتنی کسی کافر کو سمجھ اب نہیں آتی کیا بوڑھے جو ہوتے ہیں تو کیا ان کے نہیں جی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اک وقت وہ تھا ہم بھی مزے کرتے تھے گن گن محبوب پریزاد نہ رہتے تھے ملے بن
اک وقت یہ ہے ہائے جو سب کرتے ہیں اب گھن یا ایک وہ ایام تھے یا ایک یہ ہیں دن

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

بوڑھوں میں اگر جاویں تو لگتا نہیں واں دل واں کیونکہ لگے دل تو ہے محبوبوں کا مائل
محبوبوں میں جاویں تو وہ سب چھیڑے ہیں مل مل کیا سخت مصیبت کی پڑی آن کے مشکل

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

نکہت کو ہماری اگر اسواری گئی ہے تو واں بھی لگی ساتھ یہی خواری گئی ہے
سنتے ہیں کہ کہتی ہوئی بھٹیاری گئی ہے لو دیکھو بڑھاپے میں یہ مت ماری گئی ہے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

پگڑی ہو اگر لال گلابی تو یہ آفت کہتا ہے ہر ایک دیکھ کے کیا خوب ہے رنگت

ٹھٹھے سے کوئی کہتا ہے کہ نکل یہ رحمت — لاحول ولا دیکھئے بوڑھے کی حماقت

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر بیاہ میں جاویں تو یہ ذلت ہے اٹھانا — چھٹتے ہی بنے باپ نکاحی کا نشانا
رندوں میں اگر جاویں تو مشکل ہے پھر آنا — افسوس کسی جا نہیں بوڑھے کا ٹھکانا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہے جھانولی تالی کا زنانوں میں جو چرچا — گر ان میں کبھی جاویں تو ہے یہ ستم آتا
ڈاڑھی کی جگت بولے کوئی آنکھ کو مٹکا — ٹھٹھے سے کوئی کہتا ہے آ مرے دادا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

دریا کے تماشے کو اگر جائیں تو یارو — کہتا ہے ہر اک دیکھ کے جاتے ہو کہاں کو
اور ہنس کے شرارت سے کوئی پوچھے ہے بدخو — کیوں خیر ہے کیا خضر سے ملنے کو چلے ہو

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر آج کو ہوتے وہ جوانی کے زمانے — قدرت تھی جو یوں چھیڑتے بھڑوے و زنانے
مشکل ابھی پڑ جاتی انہیں پیچھے چھڑانے — اک دم میں ابھی لگتے اوئی ہائے مچانے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر ناچ میں جاویں تو یہ حسرت ہے ستاتی — جو ناچ ہے کافر وہ نہیں دھیان میں لاتی
اوروں کی طرف جاوے تو آنکھیں ہے لڑاتی — پر ہم کو تو کافر وہ انگوٹھا ہے دکھاتی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر نیکہ اِن میں کوئی بوڑھی ہے کہاتی — البتہ بڑھاپے پہ وہ ٹک رحم ہے کھاتی
پھیکی سی پرانی سی لگاوٹ ہے جتاتی — پر قہر ہے وہ ہم کو ذرا خوش نہیں آتی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

چکلے کے جو اندر کی وہ کہلاتی ہے کسبی — گر ان میں کبھی جاویں تو ہوتی ہے خرابی
منہ دیکھتے ہی کہتی ہیں سب آؤ بڑے جی — کیا آئے ہو یہاں کرنے کو بیری دمریدی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر جاویں طوائف میں تو لگتی ہیں ستانے — کیا آئے ہو حضرت ہمیں قرآن پڑھانے
ہنس ہنس کوئی پوچھے ہے نمازوں کے دوگانے — ٹھٹھے سے کوئی پھینکے ہے تسبیح کے دانے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گو جھک کے کمر پاؤں سے سر آن لگا ہے — پر دل میں تو خوباں کا وہی دھیان لگا ہے
کہتے ہیں جسے ہم کو یہ ارمان لگا ہے — کہتا ہے وہ کیا بوڑھے کو شیطان لگا ہے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا

عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

نقلیں کوئی اِن پوپلے ہونٹوں کی بناوے　　چل کر کوئی کبڑے کی طرح قد کو جھکاوے
ڈاڑھی کے کنے انگلی کو لا لا کے نچاوے　　یہ خواری تو اللہ کسی کو نہ دکھاوے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی میں کئے دھوم دھڑکے　　ویسے ہی بڑھاپے میں چھٹے آن کے چھکے
سب اڑ گئے کافور وہ نظارے وہ جھکّے　　اب عیش جوانوں کو ہیں اور بوڑھوں کو دھکّے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر حرص سے ڈاڑھی کو خضاب اپنی لگا دیں　　جھرّی جو پڑی منہ پہ اسے کیونکہ مٹا دیں
گو مکر سے ہنسنے کے تئیں دانت بندھا دیں　　گردن تو پڑی ہلتی ہے کیا خاک چھپا دیں

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

بوڑھے ہوئے پر حُسن کی چاہت نہیں چھٹتی　　آنکھوں سے یہ دیدار کی لذت نہیں چھٹتی
اور دل سے بھی محبوب کی الفت نہیں چھٹتی　　سب چھٹ گیا پر دید کی یہ لت نہیں چھٹتی

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

سنتے ہو جوانو یہ سخن کہتے ہیں تم سے　　کرنے ہیں جو کر لو وہ مزے عیش و طرب کے
جاوے گی جوانی تو پھر افسوس کرو گے　　تم جیسے ہو، ویسے تو کبھی ہم بھی جواں تھے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب جتنے ہو معشوق یہ سب یاد رکھو بات — جو ہو سو کرو چاہنے والوں کی مدارات
مجھو بو غنیمت ہے جوانی کی یہ اوقات — جب بوڑھے ہوئے پھر تو ہوئے ڈھاک کے دو پات

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

اب جس سے رہیں صاف تو ہوتا ہے وہ گدلا — اللہ نہ دکھلائے کسی کو یہ ملدلا
اس چرخ ستمگار نے سینے میں حسد لا — کیا ہم سے جوانی کا لیا آہ یہ بدلا

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی میں پیئے جام سبو کے — ویسے ہی بُڑھاپے میں پیئے گھونٹ لہو کے
جب آ کے گلے لگتے تھے محبوب بھبو کے — اب کہئے تو بڑھیا بھی کوئی مُنہ پہ نہ تھوکے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

یہ ہونٹ جو اب پوپلے یار دہیں ہمارے — اِن ہونٹوں نے بوسوں کے بڑے رنگ ہیں مارے
ہوتے تھے جوانی میں تو پریوں کے گزارے — اور اب تو چڑیل آن کے اک لات نہ مارے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تھے جیسے جوانی کے چڑھے زور میں، سر شخ — ویسے ہی بڑھاپے کی پڑی آن کے اب بخ

نکلا ہوا تن سوکھ، ردئی بال، رگیں سخ	حلوا ہوئے، چرخا ہوئے، ایسی ہوئے چرخ
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

محفل میں وہ مستی سے بگڑنا نہیں بھولے	ساقی سے پیالوں پہ جھگڑنا نہیں بھولے
ہنس ہنس کے پریزاد وں سے لڑنا نہیں بھولے	وہ گالیاں وہ بوسوں پہ اڑنا نہیں بھولے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا دَور تھا سر دیکھنے کا ہوتا تھا جدا فسوس	ہر غنچہ دہن دیکھ کے کرتا تھا صد افسوس
اب مر بھی اگر جائیں تو ہوتا ہے کہ افسوس	افسوس صد افسوس صد افسوس صد افسوس
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جب جان کے بوڑھا ہمیں چھیڑیں ہیں یہ دلخواہ	اور چھیڑ کے مجلس سے اٹھاتے ہیں بہ اکراہ
اس وقت تو ہم یار و دمِ سرد سے بھر آہ	رو رو کے یہی کہتے ہیں اب کیوں مرے اللہ
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

گر ہوتی جوانی تو ابھی دھوم یہ مچتی	چھاتی سے لپٹ دم میں کڑک ڈالتے پسلی
جب کرتی وہ انگیا کی اڑا ڈالتے دھجی	پر کیا کریں یارو کہ بڑھاپے نے بُری کی
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

وہ جوش نہیں جس کے کوئی خوف سے دبلے — وہ زعم نہیں جس سے کوئی بات کو سہ لے
جب پھوس ہوئے ہاتھ تھکے پاؤں بھی پہلے — پھر جس کے جو کچھ شوق میں آئے وہی کہہ لے

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کہتے تھے جوانی میں تو سب آپ سے آجاہ — اور حسن دکھاتے تھے وہ سب آن کے دل خواہ
یہ تھر بڑھاپے نے کیا آہ نظیر آہ — اب کوئی نہیں پوچھتا اللہ ہے اللہ

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

(۱۴) فقیروں کی صدا

بٹ مار اجل کا آپہونچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا — اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
دل ہاتھ اُٹھا اس جینے سے لے بس من مار مرو بابا — جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اب جینے کو تم رخصت دو اور مرنے کو مہمان کرو — خیرات کرو احسان کرو یا پُن کرو یا دان کرو
یا پوری لڈو بٹواؤ یا خاصہ حلوا نان کرو — کچھ لطف نہیں اب جینے کا اب چلنے کا سامان کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

دل کو تو اپنا جینے سے اب اور سگلے کو مت کاٹو   اب چاٹ فنا کی ٹک چکھو اور خون کسی کا مت چاٹو
دھن چھوڑو حصے بخرے کی اور بھاجی اپنی تم باٹو   نا کند بچھیڑے کو دے چکے اب اور دولتی مت چھاٹو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ اسپ بہت کودا اچھلا اب کوڑا مارو زیر کرو   جب مال اکٹھا کرتے تھے اب تن کا اپنے ڈھیر کرو
گڑھ ٹوٹا لشکر بھاگ چکا اب میان میں تم شمشیر کرو   تم صاف لڑائی ہار چکے اب بھاگنے میں مت دیر کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

سر کانپا چاندی بال ہوئے منہ پھیلا پلکیں آن جھکیں   قد ٹیڑھا کان ہوئے بہرے اور آنکھیں بھی چندھیا گئیں
سکھ نیند گئی اور بھوک گھٹی دل سست ہوا آواز نہیں   جو ہونی تھی سو ہو گزری اب چلنے میں کچھ دیر نہیں

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یوں پاؤں گھسٹ کر چلنے سے مت رستے کو حیران کرو   اور پوپلے منہ سے روٹی کو مت مل مل کر ہلکان کرو
اب آپ ہوئے تم پانی سے مت پانی کا نقصان کرو   کچھ لابھ نہیں ہے جینے میں اب مرنے سے پہچان کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

گر اچھی کرنی نیک عمل تم دنیا سے لے جاؤ گے   تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور بیٹھ کے سکھ سے کھاؤ گے
اور ایسی دولت چھوڑ کے تم جو خالی ہاتھوں جاؤ گے   کچھ بات نہیں بن آنے کی گھبراؤ گے پچھتاؤ گے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ہر دم تن کو چنتی ہے
جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات یہ لکڑی گھنتی ہے
تم گٹھڑی باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دھنتی ہے
اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بنتی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

گھر بار روپے اور پیسے میں مت دل کو تم خرسند کرو
یا گور بناؤ جنگل میں یا جمنا پر آنند کرو
موت آن لتاڑے گی آخر کچھ مکر کرو کچھ فند کرو
بس خوب تماشا دیکھ چکے اب آنکھیں اپنی بند کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

بیوپار تو یاں کا بہت کیا اب واں کا بھی کچھ سودا لو
جو کھیپ ادھر کو چڑھتی ہے اس کھیپ کو یاں سے لدوا لو
اس راہ میں جو کچھ کھانے ہو اس کھانے کو بھی منگوا لو
سب ساتھی پہونچے منزل پر اب تم بھی اپنا رستہ لو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

دو چار گھڑی یا دو دن میں اب تن سے جان نکلنی ہے
یہ ہڈی پسلی جتنی ہے یا گلنی ہے یا جلنی ہے
ہے رات جو باقی تھوڑی سی کوئی دم میں یہ بھی ڈھلنی ہے
اٹھ باندھ کمر سویرے سے تم کو بھی منزل چلنی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ دولت کام نہ آوے گی مت اس کو تم زنجیر کرو
یہ خاک بدن کی پارا ہے مت مار اسے اکسیر کرو
جو پار اتارے دریا سے ان باتوں کو گو سیر کرو
اب ناؤ کنارے آ پہنچی اب چڑھنے میں مت دیر کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

کچھ دیر نہیں اب چلنے میں کیا آج چلو یا کل نکلو — کچھ کپڑا لتّا لینا ہو سو جلدی باندھ سنبھل نکلو
اب شام نہیں، اب صبح ہوئی جوں موم پگھل کر ڈھل نکلو — کیوں ناحق دھوپ چڑھاتے ہو، بس ٹھنڈے ٹھنڈے چل نکلو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ اونٹ کرایہ کا یارو صندوق جنازہ ارتھی ہے — جب اس پر ہوا سوار چلے پھر گھوڑا ہے نے ہستی ہے
کس نیند پڑے تم سوتے ہو یہ بوجھ تمہارا بھاری ہے — کچھ دیر نہیں اب آہ نظیرؔ تیار کھڑی اسواری ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

(۱۵) خوشامد

دل خوشامد سے ہر اک شخص کا کیا راضی ہے — آدمی جن و پری بھوت بلا راضی ہے
بھائی فرزند بھی خوش باپ چچا راضی ہے — شاہ مسرور، غنی شاد، گدا راضی ہے

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

اپنا مطلب ہو تو مطلب کی خوشامد کیجئے — اور نہ ہو کام تو اس ڈھب کی خوشامد کیجئے
اولیا انبیا اور رب کی خوشامد کیجئے — اپنے مقدور غرض سب کی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

چار دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کے سلام — وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام
بڑے عاقل بڑے دانا نے نکالا ہے یہ دام — خوب دیکھا تو خوشامد ہی کی آمد ہے تمام

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مفلس ادنیٰ و غنی کی بھی خوشامد کیجئے — بد بخیل اور سخی کی بھی خوشامد کیجئے
دیو و شیطان و پری کی بھی خوشامد کیجئے — گر ولی ہو تو ولی کی بھی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پیار سے جوڑ دئے ہاتھ طرف جس کے آہ — وہیں خوش ہو گیا کرتے ہی وہ ہاتھوں پہ نگاہ
غور سے ہم نے جو اس بات کو دیکھا واللہ — کچھ خوشامد ہی بڑی چیز ہے اللہ اللہ

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

عیش کرتے ہیں وہی جن کا خوشامد کا مزاج — جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ محتاج
ہاتھ آتا ہے خوشامد سے مکاں ملک اور راج — کیا ہی تاثیر کی اس نسخے نے پائی ہے رواج

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر بھلا ہو تو بھلے کی بھی خوشامد کیجئے — اور بُرا ہو تو بُرے کی بھی خوشامد کیجئے

پاک ناپاک سڑے کی بھی خوشامد کیجئے   کتے بلی و گدھے کی بھی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

خوب دیکھا تو خوشامد کی بڑی کھیتی ہے   غیر کیا اپنے ہی گھر بیچ یہ سکھ دیتی ہے
ماں خوشامد کے سبب چھاتی لگا سیتی ہے   نانی دادی بھی خوشامد سے دعا دیتی ہے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

بی بی کہتی ہے میاں آ ترے صدقے جاؤں   ساس بولے کہیں مت جا ترے صدقے جاؤں
خالا کہتی ہے کہ کچھ کھا ترے صدقے جاؤں   سالی کہتی ہے کہ بھیا ترے صدقے جاؤں
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

آ پڑا ہے جو خوشامد سے سروکار اُسے   ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُلفت کے خریدار اُسے
آشنا ملتے ہیں اور چاہے ہیں سب یار اُسے   اپنے بیگانے غرض کرتے ہیں سب پیار اُسے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

روکھی اور روغنی آبی کی خوشامد کیجئے   نان بائی و کبابی کی خوشامد کیجئے
ساقی و جام شرابی کی خوشامد کیجئے   پارسا رند خرابی کی خوشامد کیجئے
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

جو کہ کرتے ہیں خوشامد وہ بڑے ہیں انسان — جو نہیں کرتے وہ رہتے ہیں ہمیشہ حیران
ہاتھ آتے ہیں خوشامد سے ہزاروں سامان — جس نے یہ بات نکالی ہے میں اس کے قربان

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

کوڑی پیسے وٹکے زر کی خوشامد کیجئے — لعل و نیلم دُر و گوہر کی خوشامد کیجئے
اور جو پتھر ہو تو پتھر کی خوشامد کیجئے — نیک و بد جتنے ہیں یکسر کی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

ہم نے ہر دل میں خوشامد کی محبت دیکھی — پیار و اخلاص و کرم مہر و محبت دیکھی
دلبروں میں بھی خوشامد ہی کی الفت دیکھی — عاشقوں میں بھی خوشامد ہی کی چاہت دیکھی

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

پارسا پیر ہے زاہد ہے مناجاتی ہے — جواریا چور دغاباز خراباتی ہے
ماہ سے ماہی تلک چیونٹی ہے یا ہاتھی ہے — یہ خوشامد تو میاں سب کے تئیں بھاتی ہے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

گر نہ میٹھی ہو تو کڑوی بھی خوشامد کیجئے — کچھ نہ ہو پاس تو خالی بھی خوشامد کیجئے
جانی دشمن ہو تو اس کی بھی خوشامد کیجئے — سچ اگر پوچھو تو جھوٹی بھی خوشامد کیجئے

جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے

حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

مرد و زن طفل و جواں خرد و کلاں پیر و فقیر　　جتنے عالم میں ہیں محتاج و گدا شاہ و وزیر
سب کے دل ہوتے ہیں پھندے میں خوشامد کے اسیر　　تو بھی واللہ بڑی بات یہ کہتا ہے نظیر
جو خوشامد کرے خلق اُس سے سدا راضی ہے
حد تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

(۱۶) کلجُگ

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے　　نیکی کا بدلا نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے　　آرام دے آرام لے دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

کانٹا کسی کے مت لگا گر مثلِ گل پھولا ہے تو　　وہ تیرے حق میں زہر ہے کس بات پر پھولا ہے تو
مت آگ میں ڈال اور کو پھر گھانس کا پولا ہے تو　　سُن رکھ یہ نکتہ بے خبر کس بات پر بھولا ہے تو
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

شوخی شرارت مکر و فن سب کا بسیکھا ہے یہاں　　جو جو دکھایا اور کو وہ آپ دیکھا ہے یہاں
کھوٹی کھری جو کچھ کہے تِس کا پرکھا ہے یہاں　　جو جو پڑا تُلتا ہے دل تِل تِل کا لیکھا ہے یہاں
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو اَور کی بستی رکھے اس کا بھی بستا ہے پُرا　　　جو اور کے مارے چھُری اس کے بھی لگتا ہے چھُرا
جو اور کی توڑے دُھری اس کا بھی ٹوٹے ہے دھڑا　　　جو اور کی چیتے بدی اس کا بھی ہوتا ہے بُرا
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا　　　گیہوں سے گیہوں جَو سے جَو چانول سے چانول پاوے گا
جو آج دیوے گا یہاں ویسا ہی وہ کل پاوے گا　　　کل دیوے گا کل پاوے گا کل پاوے گا کل پاوے گا
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے　　　آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منجدھار ہے　　　اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

تو اور کی تعریف کر تجھ کو ثنا خوانی ملے　　　کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر تجھ کو بھی مہمانی ملے　　　روٹی کھلا روٹی ملے پانی پلا پانی ملے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

جو گل کھلاوے اور کا اس کا ہی گل کھلتا بھی ہے　　　جو اور کا کیلے ہے مُنہ اس کا ہی مُنہ کلتا بھی ہے
جو اَور کا چھیلے جگر اس کا جگر چھلتا بھی ہے　　　جو اور کو دیوے کپٹ اس کو کپٹ ملتا بھی ہے

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

کرجگ جو کچھ کرنا ہو یاں یہ دم تو کوئی آن ہے
نقصان میں نقصان ہے احسان میں احسان ہے
تہمت میں یاں تہمت لگے طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے شیطان کو شیطان ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

یاں زہر دے تو زہر لے شکّر میں شکّر دیکھ لے
نیکوں کو نیکی کا مزہ موذی کو ٹکّر دیکھ لے
موتی جو دے موتی ملیں پتھر میں پتھر دیکھ لے
گر تجھ کو یہ باور نہیں تو تو بھی کر کر دیکھ لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصاں ہووے گا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر پانی پیے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

غفلت کی یہ جا گہ نہیں یاں صاحب ادراک رہ
دلشاد رکھ دلشاد رہ غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے او میاں یاں پاک رکھ بیباک رہ
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

(۱۷) مُفلِسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دُکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

کہئے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں
تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقماں کیا ہیں یاں
عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈُوباتی ہے مفلسی

جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ حال
سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اس نے جال
گر گر پڑے تو کوئی نہ لیوے اُسے سنبھال
مفلس میں ہو دیں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آ کے ملاتی ہے مفلسی

جب روٹیوں کے بٹنے کا آ کر پڑے شمار
مفلس کو دیویں ایک تو نگر کو چار چار
گر اور مانگے وہ تو اُسے جھڑکیں بار بار
اِس مفلسی کا آہ بیاں کیا کروں میں یار
مفلس کو اس جگہ بھی چباتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر
دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر

ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر — جس طرح کتے لڑتے ہیں ایک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

کرتا نہیں حیا سے جو کوئی وہ کام آہ — مفلس کرے ہے اس کے تئیں انصرام آہ
سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانے حرام آہ — کہتے ہیں جس کو شرم و حیا ننگ و نام آہ
وہ سب حیا و شرم اُٹھاتی ہے مفلسی

یہ مفلسی وہ شے ہے کہ جس گھر میں بھر گئی — پھر جتنی گھر میں ست تھی اسی گھر کے در گئی
زن بچے روتے ہیں گویا نانی گزر گئی — ہمسائے پوچھتے ہیں کہ کیا دادی مر گئی
بن مردے گھر میں شور مچاتی ہے مفلسی

لازم ہے گر غمی میں کوئی شور غل مچائے — مفلس بغیر غم کے ہی کرتا ہے ہائے ہائے
مرجاوے گر کوئی تو کہاں سے اُسے اُٹھائے — اِس مفلسی کی خواریاں کیا کیا کہوں میں ہائے
مردے کو بن کفن کے گڑاتی ہے مفلسی

کیا کیا میں مفلسی کی کہوں خواری پھکڑیاں — جھاڑو بغیر گھر میں بکھرتی ہیں جھکڑیاں
کونوں میں جالے لپٹے ہیں چھپر میں مکڑیاں — پیدا نہ ہو دیں جن کے جلانے کو لکڑیاں
دریا میں اُن کے مردے بہاتی ہے مفلسی

بی بی کی نتھ نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے — کپڑے میاں کے بنئے کے گھر میں پڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر میں اڑے رہے — زنجیر نے کواڑ نہ پتھر گڑے رہے
آخر کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی

نقاش پر بھی زور جب آ مفلسی کرے — سب رنگ دم میں کر دے مصور کے کر کرے
صورت بھی اس کی دیکھ کے مُنہ کھنچ رہے پرے — تصویر اور نقش میں کیا رنگ وہ بھرے

اس کے تو منہ کا رنگ اڑاتی ہے مفلسی

عاشق کے حال پر بھی جب آ مفلسی پڑے	معشوق اپنے پاس نہ دے اس کو بیٹھنے
آوے جو رات کو تو نکالے وہیں اسے	اس ڈر سے یعنی رات کو ایذا کہیں نہ دے
تہمت یہ عاشقوں پہ لگاتی ہے مفلسی

کیسی ہی دھوم دھام کی رنڈی ہو خوش جمال	جب مفلسی کا آن پڑے اس کے سر پہ جال
دیتے ہیں اس کے ناچ کو ٹھٹھے کے بیچ ڈال	ناچے ہے وہ تو فرش کے اوپر قدم سنبھال
اور اس کو انگلیوں پہ نچاتی ہے مفلسی

اس کا تو دل ٹھکانے نہیں بھاؤ کیا بتائے	جب مو کنٹھ ڈوبا تو کاہے سے منہ چھپائے
دو تین ساعتے کے بیچ ٹکے ... کو ... سے	... دوں تو آٹھ ساعت تو وہ دو ٹکے بھی پائے
اس طرح سے ... اڑاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہو وے کسی وقت کا دل اداس	پھرتا ہے بے قرار وہ گھر گھر کے آس پاس
اک پاؤ سیر آٹے کی دل میں لگی ہے آس	گرمی کا وقت ہووے تو گاتا ہے وہ بتیاس
یاں تک حواس اس کے اڑاتی ہے مفلسی

مفلس جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بول بول	پیسا کہاں جو جا کے وہ لا دے جہیز مول
جورو کا وہ گلا ہے کہ پھوٹا ہو جیسے ڈھول	گھر کی حلال خوری تلک کرتی ہے ٹھٹھول
ہیبت تمام اس کی اٹھاتی ہے مفلسی

بیٹے کا بیاہ ہو تو نہ بیاہی نہ ساتھی ہے	نے روشنی نہ باجے کی آواز آتی ہے
ماں پیچھے ایک میلی چدر اوڑھے جاتی ہے	بیٹا بنا ہے دولھا تو باوا براتی ہے
مفلس کی یہ برات چڑھاتی ہے مفلسی

گر بیاہ کر چلا ہے سحر کو تو یہ بلا
شہدا، زنانہ، ہیجڑا اور بھاٹ منڈچرا
گھیرے ہوئے اسے چلے جاتے ہیں جا بجا
وہ آگے آگے لڑتا ہوا جاتا ہے چلا
اور پیچھے تھپڑیوں کو بجاتی ہے مفلسی

دروازے پر زنانے بجاتے ہیں تالیاں
اور گھر میں بیٹھی ڈومنی دیتی ہے گالیاں
مالن گلے کا ہار ہو دوڑے لے ڈالیاں
سقا کھڑا سناتا ہے باتیں رذالیاں
یہ خواری یہ خرابی دکھاتی ہے مفلسی

کوئی شوم بے حیا، کوئی بولا نکھٹو ہے
بیٹے نے جانا باپ تو میرا نکھٹو ہے
بیٹی پکارتی ہے کہ بابا نکھٹو ہے
بی بی یہ دل میں کہتی ہے بھڑوا نکھٹو ہے
آخر نکھٹو نام دھراتی ہے مفلسی

مفلس کا درد دل میں کوئی ٹھانتا نہیں
مفلس کی بات کو بھی کوئی مانتا نہیں
ذات اور حسب نسب کو کوئی جانتا نہیں
صورت بھی اس کی پھر کوئی پہچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اس کو گراتی ہے مفلسی

جس وقت مفلسی سے یہ آکر ہوا تباہ
پھر کوئی اس کے حال پہ کرتا نہیں نگاہ
دالیدری کہے، کوئی ٹھہرا دے روسیاہ
جو باتیں عمر بھر نہ سنی ہوویں اس نے آہ
وہ باتیں اس کو آکے سناتی ہے مفلسی

چولھے توا نہ پانی کے مٹکے میں آبی ہے
پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نے رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے
مفلس کی جورو سچ ہے کہ یاں سب کی بھابی ہے
عزت سب اس کے دل کی گنواتی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل
کوئی گدھا کہے اسے ٹھہرا دے کوئی بیل

کپڑے پھٹے تمام بڑھے بال پھیل پھیل   مُنہ خشک دانت زرد بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے   جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
اپنوں کی مہر غیر کی چاہت گھٹاتی ہے   شرم و حیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی   وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی   تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

مفلس کسی کا لڑکا جو لے پیار سے اٹھا   باپ اس کا دیکھے ہاتھ کا اور پاؤں کا کڑا
کہتا ہے کوئی جوتی نہ لیوے کہیں چرا   نٹ کھٹ اچکا چور دغا باز گٹھ کٹا
سو سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی

رکھتی نہیں کسی کی یہ غیرت کی آن کو   سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
سو محنتوں میں اس کی کھپائی ہے جان کو   چوری پہ آکے ڈالے ہے مفلس کے دہیان کو
آخر ندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

دنیا میں لیکے شاہ سے اے یار تا فقیر   خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اِک آن میں حقیر   کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

(۱۸) معجزۂ حضرت علی علیہ السلام

سنتے ہوا ے علیؑ کے محبانِ دوستدار — اک معجزہ میں کہتا ہوں اُس شہ کا آشکار
ہے تازہ واردات یہ از نقل روزگار — تھا کوئی شخص دولت وحشمت میں نامدار
اک روز وہ گیا تھا کہیں کھیلنے شکار

جس دشت میں شکار کو گزرا تھا وہ غنی — واں ایک شیر رہتا تھا اور اس کی شیرنی
تھا ایک چشمہ پانی کا اور سبز تھی بنی — دو بچے اس بنی میں تھی وہ شیرنی جنی
دس بیس روز کے تھے ابھی طفل شیرخوار

بچوں کو اپنی چھاتی پہ رکھے وہ بے زباں — دونوں کو بیٹھی دودھ پلاتی تھی شادماں
بندوق کی جو آئی صدا اس میں ناگہاں — نر مادہ دونوں بھاگ گئے ہو کے نیم جاں
بچے اکیلے رہ گئے جنگل میں بیقرار

القصہ جب شکار سے فارغ ہوا وہ شاہ — ناگاہ دونوں بچوں پر اس کی پڑی نگاہ
رکھوا کے ان کو اونٹ پہ جلدی سے خواہ مخواہ — لی اس شکارگاہ سے پھر اپنے گھر کی راہ
محلوں میں اپنے آن کے اس نے لیا قرار

جب آئے شیر و شیرنی باحالت تباہ — اور دونوں بچے گھر میں نہ آئے انہیں نگاہ
وہ شیر کھا کے غش گرا اک بار کر کے آہ — اور شیرنی نے لی نجف اشرف کی وہیں راہ
سر پیٹتی چلی وہ بیاباں سے سوگوار

القصہ کتنے روز میں وہ شیرنی غریب — بھوکی پیاسی پھیرتی ہونٹوں پہ خشک جیب

شوہر سے چھوٹی اور ہوئی بچوں سے بے نصیب — آ پہنچی یک بیک نجف اشرف کے عنقریب
پنجوں سے اپنے سر پہ اُڑاتی ہوئی غبار

بازار میں نجف کے جب آئی وہ نیم جاں — ہر اک دکاں سے اس کی اُٹھا شور اور فغاں
کوئی پکارا دوڑیو کوئی پکارا ہاں — ہیبت سے اس کی چھپنے لگے پیر اور جواں
چاروں طرف سے دھوم مچی آ کے ایک بار

وہ تو کسی طرف کو نہ گھر کی بتاتی تھی — نے مُنہ کو موڑتی تھی نہ پنجہ اُٹھاتی تھی
آنکھوں سے اُس ہجوم میں آنسو بہاتی تھی — شاہ نجف کے روضے پہ فریادی جاتی تھی
لوگ اُس پہ اپنے خوف سے کرتے تھے مار مار

جس دم وہ پہنچی حیدر صفدر کے در تلک — دربان اس کے خوف سے یکسر گئے سرک
داخل ہوئی وہ روضۂ انور میں یک بیک — رونے لگی وہ سامنے سر کو پٹک پٹک
آنسو کی دونوں آنکھوں سے بہنے لگی قطار

آنکھوں سے اس کے آنسو کی ندی جو بہتی تھی — بچوں کا داغ اپنے کلیجے پہ سہتی تھی
کچھ منہ سے شور کرتی تھی کچھ دیکھ رہتی تھی — گویا وہ شہ سے اپنی زباں میں یہ کہتی تھی
بچے مرے دلائیے یا شیر کردگار

روتی تھی یوں وہ شیرنی آنسو بہا بہا — مظلوم جیسے روتے ہے عادل کے پاس آ
اور کچھ زباں سے اپنی سناتی تھی بغبغا — نکلے تھی آغا آغا کی مُنہ اس کے سے صدا
کہ آغا آغا درد سے روتی تھی زار زار

فریادی بن کے ساقی کوثر کے سامنے — محتاج بن کے صاحب قنبر کے سامنے
یوں دیکھتی تھی روضۂ انور کے سامنے — مظلوم جیسے آن کے داور کے سامنے

کرتا ہے اس کے حکم کا رہ رہ کے انتظار

لوگوں کے دل سے جب تو ہوا خوف اس کا کم — سب اس کے پاس آن کے دیکھیں تھے اس کا غم
ہر آن اپنے سر کو پٹک کر بہ چشم نم — پنجوں کو اس طرح وہ اٹھاتی تھی دمبدم
فریادی داد مانگے ہے جوں ہاتھ کو پسار

فریاد وہ تو مانگے تھی آئمہ سے جھوم جھوم — یعنی فلک نے مجھ کو دکھایا یہ روز شوم
اس بات سے تمام نجف میں پڑی یہ دھوم — گرد اس کے مرد و زن کا ہوا آن کر ہجوم
حیرت میں تھے تمام چہ ناداں چہ ہوشیار

کوئی پانی اس کے واسطے کوئی کھانا لاتا تھا — لیکن اُسے تو رونے سوا کچھ نہ بھاتا تھا
بچوں کا داغ ہوش سب اس کے اڑاتا تھا — جو اس کو دیکھتا تھا اُسے رونا آتا تھا
ایسی طرح سے سر کو پٹکتی تھی باربار

جب تین دن وہ شیرنی بھوکی پڑی رہی — ناچار اُن شریفوں نے دیکھ اس کی بے کلی
جس طرح واں قدیم سے کہنے کی راہ تھی — اس طرح سے جناب مقدس میں عرض کی
باسینۂ الم کش و با چشم اشکبار

آئی ندا یہ شیرنی دیتی دہائی ہے — اک شخص کے یہ ظلم و ستم کی ستائی ہے
بچوں نے اس کے قید کی آفت جو پائی ہے — سو اب ہمارے روضے پہ فریادی آئی ہے
کل اُس کا بھید ہووے گا تم سب پہ آشکار

یاں تو شریف کو یہ عنایت ہوا جواب — واں جا پلنگ اُلٹ دیا اس کا بہ عین خواب
فرمایا وہ جو شیر کے بچے ہیں دل کباب — بھجوا دے ان کو شہر نجف میں تو کل شتاب
ورنہ تو اس گنہ سے بہت ہوگا شرمسار

ماں ان کی اُن کے واسطے آنسو بہاتی ہے — اور تین دن ہوئے ہیں نہ پیتی نہ کھاتی ہے
زیادی ہو کے روتی ہے اور غش میں آتی ہے — غش ہو ہمارے روضے میں جی کو کھپاتی ہے
جلدی سے ان کو بھیج دے کر اونٹ پر سوار

وہ تھرتھرا کے کانپ اٹھا ہو کے عذر خواہ — جانا یہ اس نے یہ ہیں شہنشاہ دیں پناہ
بولا نجف تو پندرہ دن کی ہے یاں سے راہ — بھجوا دوں کس طرح سے انھیں کل میں پُرگناہ
اتنا تو اس غلام میں کب ہے گا اختیار

جب حکم یہ ہوا اسے جس وقت ہو سحر — جلدی سے دونوں بچوں کو رکھوا کے اونٹ پر
بھجوا دے اپنے شہر کی آبادی سے اُدھر — جب پہونچیں گے یہ شہر کے دروازے کے اوپر
واں پیدا ہوگا غیب سے اک ناقہ سوار

ہوتے ہی صبح اس نے منگا کر وہ دو بچے — رکھوا کے ایک اونٹ پہ جلدی رواں کئے
جب لوگ آئے شہر کے دروازے کے لئے — کیا دیکھیں ایک شخص کو واں آدھی رات سے
ہے منتظر دو اونٹ کی پکڑے ہوئے مہار

جاتے ہی دونوں بچے انھوں نے اُسے دئے — با احتیاط سونپ کے پھر شہر کو پھرے
وہ اُن بچوں کو لے کے چلا اس شتاب سے — آ پہونچا اس مکان میں اک پہر دن چڑھے
یک بار اس کا شہر نجف میں ہوا گزار

بچوں کے آنے آنے کے جب غل ہوئے کروڑ — وہ شیرنی بھی تکنے لگی اپنے منہ کو موڑ
جب لا کے اس کے سامنے بچے دئے وہ چھوڑ — یوں خوش ہو چاٹنے لگی الفت کی کر جھنجھوڑ
انسان جیسے کرتا ہے بچوں کو اپنے پیار

بچے بھی دوڑ ماں کے گلے سے لپٹ گئے — یوں جیسے کوئی دور کا بچھڑا ہوا ملے

چھاتی پہ لوٹ لوٹ کے جا دودھ سے لگے ۔ اُس شیرنی کے جیسے کلیجے میں داغ تھے
ویسی ہی اس کے منہ پہ خوشی کی ہوئی بہار

جب اس نے بچے پائے تو ہو کر وہ شادماں ۔ بچوں سمیت اُٹھ کے وہ حیوان بے زباں
روضے کے سات بار تصدق ہوئی وہاں ۔ پھر آستانہ چوم ہوئی واں سے وہ رواں
جا پہنچی اپنے دشت میں خوش ہوتی بار بار

شیر خدا کے عدل کی یہ دیکھ رسم و راہ ۔ خلقت تمام واں کی پکاری کہ واہ واہ
انصاف ایسا چاہیے اے شاہ دیں پناہ ۔ حامی و منصف اور نہیں کوئی تم سا شاہ
ہے ختم تم پہ عدل و حمایت کا کاروبار

حیواں تمھارے لطف سے جس وقت ہوویں شاد ۔ انساں پھر اس مکاں سے رہیں کیونکہ نامراد
جیسے تمھارے در سے ملی شیرنی کی داد ۔ احسان ایسے ایسے بہت اسے کرم نہاد
ہیں گے تمھارے صفحۂ عالم میں یادگار

اے شاہ یہ نظیرؔ تمھارا غلام ہے ۔ رکھتا سوا تمھارے کسی سے نہ کام ہے
عاصی ہے پُرگناہ ہے اور ناتمام ہے ۔ دن رات اُس کا آپ سے اب یہ کلام ہے
رکھ لیجو میری آبرو یا شیر کردگار

(۱۹) دوالی

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا ۔ ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں بھا گیا دوالی کا ۔ کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا

عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار — کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اُدھار
کھلونے، کھیلوں، بتاسوں کا گرم ہے بازار — ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دُکانیں لگا کے حلوائی — پُکارتے ہیں کہ لالہ دوالی ہے آئی
بتاسے لے کوئی برفی کسی نے تُلوائی — کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی
گویا انھوں کے واں راج آ گیا دوالی کا

سِرف حرام کی کوڑی کا جن کا ہے بیوپار — انھوں نے کھایا ہے اس دن کے واسطے ہی اُدھار
کہے ہیں ہنس کے قرضخواہ سے ہر اک اک بار — دوالی آئی ہے سب دے چلائیں گے اے یار
خدا کے فضل سے ہے آسرا دوالی کا

مکان لیپ کے ٹھلیا جو کوری رکھوائی — جلا چراغ کو کوڑی وہ جلد جھنکائی
اَصل جواری تھے ان میں تو جان سی آئی — خوشی سے کود اُچھل کر پُکارے او بھائی
شگون پہلے کرو تم ذرا دوالی کا

شگن کی بازی لگے پہلے یار گنڈے کی — پھر اس سے بڑھ کے لگی تین چار گنڈے کی
پھری جو ایسی طرح بار بار گنڈے کی — تو آگے لگنے لگی پھر ہزار گنڈے کی
کمال نرخ لگا پھر تو آ دوالی کا

کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری — جو کچھ تھی جنس میسر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چُرا چھپا ہاری — کسی نے گٹھری پڑوسن کی اپنی لا ہاری
یہ ہار جیت کا چرچا پڑا دوالی کا

کسی کو داؤ پہ لا نکّی موٹھ نے مارا   کسی کے گھر پہ دھرا سوختہ نے انگارا
کسی کو نرد نے چوپڑ کے کر دیا زارا   لنگوٹی باندھ کے بیٹھا ازار تک ہارا
یہ شور آ کے مچا جا بجا دوالی کا

کسی کی جورو کہے ہے پکار دے بھڑوے   بہو کی نوگرہی بیٹے کے ہاتھ کے کھڑوے
جو گھر میں آوے تو سب مل کہے ہیں سو کھڑوے   نکل تو یاں سے ترا کام یاں نہیں بھڑوے
خدا نے تجھ کو تو شہدا کیا دوالی کا

وہ اس کے جھونٹے پکڑ کر کہے ہے مارونگا   ترا جو گہنا ہے سب تار تار اتاروں گا
حویلی اپنی تو اک داؤ پر میں ہاروں گا   یہ سب تو ہارا ہوں خندی تجھے بھی ہاروں گا
چڑھا ہے مجھ کو بھی اب تو نشا دوالی کا

تجھے خبر نہیں خندی یہ لت وہ پیاری ہے   کسی زمانے میں آگے ہوا جو جواری ہے
تو اس نے جورو کی نتھ اور ازار اتاری ہے   ازار کیا ہے کہ جورو تلک بھی ہاری ہے
سنا یہ تو نے نہیں ماجرا دوالی کا

جہاں میں یہ جو دوالی کی سیر ہوتی ہے   تو زر سے ہوتی ہے اور زر بغیر ہوتی ہے
جو ہارے ان پہ خرابی کی فیر ہوتی ہے   اور ان میں آن کے جن جن کی خیر ہوتی ہے
تو آڑے آتا ہے ان کے دیا دوالی کا

یہ باتیں سچ ہیں نہ جھوٹ ان کو جانیو یارو   نصیحتیں ہیں انہیں دل میں ٹھانیو یارو
جہاں کو جاؤ یہ قصہ بکھانیو یارو   جو جواری ہو نہ برا اس کا مانیو یارو
نظیر آپ بھی ہے جواریا دوالی کا

(۲۰) حضرت سلیم چشتی

ہیں دو جہاں کے سلطاں حضرت سلیم چشتی
عالم کے دین و ایماں حضرت سلیم چشتی
سر دفترِ مسلماں حضرت سلیم چشتی
مقبول خاص یزداں حضرت سلیم چشتی
سردار ملک عرفاں حضرت سلیم چشتی

برجِ اسد کی رونق عرش بریں کے تارے
گلزار دیں کے گلبن اللہ کے سنوارے
یہ بات جان و دل سے کہتے ہیں سب پکارے
تم وہ ولی ہو برحق جو فیض سے تمہارے
عالم ہے باغ و بستاں حضرت سلیم چشتی

شاہوں کے بادشہ ہو با تاج بالوا ہو
اور قبلۂ صفا ہو اور کعبۂ ضیا ہو
خلقت کے رہنما ہو دنیا کے مقتدا ہو
تم صاحبِ سخا ہو محبوب کبریا ہو
ہے تم سے زیب امکاں حضرت سلیم چشتی

شاہ و گدا ہیں تابع سب تیری مملکت کے
لائق تم ہی ہو شاہا اس قدر و منزلت کے
پروردہ ہیں تمہارے سب خوان مکرمت کے
شاہا شرف تو بخشے خالق کی سلطنت کے
اور تم ہو میر ساماں حضرت سلیم چشتی

ہے نام پاک تیرا مشہور شہر و بن میں
کرتی ہیں یاد تم کو یہ جانیں ہیں جو تن میں
ہے خلق کی تمہارے خوشبو گل و سمن میں
خدمت میں ہیں تمہاری فردوس کے چمن میں
جنت کے حور و غلماں حضرت سلیم چشتی

کعبہ سمجھ کے اپنا مشتاق تیرے در کو
کرتے ہیں آ زیارت دل سے جھکا کے سر کو

اوصاف تیرے ہر دم لیتے ہیں سیم و زر کو	پڑھتے ہیں مدح تیری گلشن میں ہر سحر کو
ہو بلبل خوش الحاں حضرت سلیم چشتی

ہے سلطنت جہاں کی سب تیرے زیر فرماں	چاکر ہیں تیرے در کے فغفور اور خاقاں
خوانِ کرم پہ تیرے ہے خلق ساری مہماں	ہیں حکم میں تمہارے جن و پری و انساں
ہو وقت کے سلیماں حضرت سلیم چشتی

تم سب سے ہو معظم اور سب سے ہو مکرم	خلقت ہوئی تمہارے سب نور سے مجسم
اور خوبیاں جہاں کی تم پر ہوئیں مسلّم	ابر کرم سے تیرے دائم ہے سبز و خرّم
عالم کا سب گلستاں حضرت سلیم چشتی

پشت و پناہ ہو تم ہر اک گدا و شہ کے	محتاج ہیں تمہاری اک لطف کی نگہ کے
منزل پہ آ کے پہونچے سالک تمہاری رہ کے	خاکِ قدم تمہاری اور چشم مہر و مہ کے
ہو روشنی کے ساماں حضرت سلیم چشتی

چشم و چراغ ہو تم اب جملہ مومنیں کے	روشن ہیں تم سے پردے سب آسمان زمیں کے
بیشک ضیائے دل ہو ہر صاحب یقیں کے	ذرہ نہیں تفاوت تم آسماں ہو دیں کے
ہو آفتابِ رخشاں حضرت سلیم چشتی

عالم ہے سب معطر تیرے کرم کی بو سے	حرمت ہے دوستوں کی حضرت تمہارے رو سے
یہ چاہتا ہوں اب میں سو دل کی آرزو سے	رکھیو نظیر کو تم دو جگ میں آبرو سے
اے موجدِ ہر احساں حضرت سلیم چشتی

(۲۱) ہولی کی بہار

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا
وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا
اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

گلزار کھلے ہوں پریوں کے اور مجلس کی طیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
منہ لال گلابی آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اس رنگ بھری پچکاری کو انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو ہر آن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو بیہوشی ہو بھڑوے کے منہ میں گالی ہو
بھڑوے بھی بھڑوا بکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھویوں کے لڑکے
ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں کچھ گھٹ گھٹ کے کچھ بڑھ بڑھ کے

کچھ ناز جتا دیں لڑ لڑ کے کچھ ہولی گاویں اڑ اڑ کے　　کچھ لچکے شوخ کمر پتلی کچھ ہاتھ چلے کچھ تن پھڑکے
کچھ کافر نین مٹکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
دھوم مچی ہو ہولی کی اور عیش مزے کا جھکڑ ہو　　اس کھینچا کھینچ گھسیٹی میں بھڑوا رنڈی کا پھکڑ ہو
معجون شرابیں ناچ مزا اور ٹکیا سلفا لکڑ ہو　　لڑ بھڑ کے نظیر بھی نکلا ہو کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ ہو
جب ایسے عیش مہکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۲۲) نانک شاہ گرو

یں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو　　وہ کامل رہبر ہیں جگ میں یوں روشن جیسے ماہ گرو
قصود مراد امید سبھی بر لاتے ہیں دلخواہ گرو　　نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو
ہر آن دلوں بیچ یاں اپنے جو دھیان گرو کا لاتے ہیں　　اور سیوک ہو کر ان کے ہی ہر صورت بیچ کہاتے ہیں
ر اپنی لطف و عنایت سے سکھ چین انھیں دکھلاتے ہیں　　خوش رکھتے ہیں ہر حال انھیں سب من کا کاج بناتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو
آپ گرو نے بخشش سے اس خوبی کا ارشاد کیا　　ہر بات وہ ہے اس خوبی کی تاثیر نے جس پر صاد کیا
ن جس جس نے ان باتوں کو ہے دھیان لگا کر یاد کیا　　ہر آن گرو نے دل اس کا خوش وقت کیا اور شاد کیا
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا اردا اس کرد اور ہر دم بولو واہ گرو

دن رات جنھوں نے یاں دل بیچ ہے یاد گرو سے کام لیا | سب من کے مقصد بھر پائے خوش وقتی کا ہنگام لیا
دکھ درد میں اپنے دہیان لگا جس وقت گرو کا نام لیا | پل بیچ گرو نے آن انھیں خوش حال کیا اور تھام لیا
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا اردا اس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

یاں جو جو دل کی خواہش کی کچھ بات گرو سے کہتے ہیں | وہ اپنی لطف و شفقت سے نت ہاتھ انہوں کے گہتے ہیں
الطاف سے اُن کے خوش ہوکر سب خوبی سے یہ کہتے ہیں | دکھ درد انھوں کے ہوتے ہیں سُو سُکھ سے جگ میں رہتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا اردا اس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

جو ہر دم اُن سے دہیان لگا امید کرم کی دہرتے ہیں | وہ اُن پر لطف و عنایت سے ہر آن توجہ کرتے ہیں
اسباب خوشی اور خوبی کے گھر بیچ انہوں کے بھرتے ہیں | آنند عنایت کرتے ہیں سب من کی چنتا ہرتے ہیں
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا اردا اس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

جو لطف و عنایت ان میں ہیں کب وصف کسی سے اُن کا ہو | وہ لطف و کرم جو کرتے ہیں ہر چار طرف ہیں ظاہر وہ
الطاف جنھوں پر ہیں اُن کے سو خوبی حاصل ہے اُن کو | ہر آن نظیر اب یاں تم بھی تو بابا نانک شاہ کہو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا اردا اس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

۲۳ جَنم کنھیّا جی

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اُس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دوبالا ہوتا ہے
سب بات بِتھا کی بھولے ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے
آنند منڈیلے باجت ہیں نت بھون اُجالا ہوتا ہے

یوں نیک نچھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر اُن کے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم

سبھ ساعت سے یوں دُنیا میں اوتار گربھ میں آتے ہیں
جو نارد من ہے دھیان بھلی سب ان کا بھید بتاتے ہیں
وہ نیک مہورت سے جس دم اس سرشٹ میں جنمے جاتے ہیں
جو لیلا رچنی ہوتی ہے وہ روپ یہ جا دکھلاتے ہیں

یوں دیکھنے میں اور کہنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں
پر بالے ہی پن میں اُن کے اُپکار نرالے ہوتے ہیں

یہ بات کہی جو میں نے اب یوں اس کو تو اب دھیان لگا
ہے پنڈت پستک بیچ لکھا تھا کنس جو راجا متھرا کا
دھن ڈھیر بہت، بل تیج نپٹ سامان انیک اور دِل بڑا
گج اور ترنگ اچھے نیکے انباری ہودے زین سجا

جن بن ٹھن اوجھے ہستی پر وہ پاپی آن نکلتا تھا
سب ساز جھلا جھل کرتا تھا اور سنگ ترنگ دَل چلتا تھا

اک روز جو اپنے جُھجھ بل پر وہ کنس بہت مغرور ہوا
اور ہنس کر بولا دنیا میں ہے دوجا کون بلی مجھ سا
اک بان لگا کر پربت کو چاہوں تو دوں اک پل میں گرا
اس دیس کے بُدھ بل جتنے ہیں ہے کون جو مجھ سے ہووے سوا

جو دُشٹ کوئی آ جُدھ کرے کب موں پر اس کا زور چلے
وہ سامنے میرے ایسا ہو جیوں چیونٹی ہاتھی پاؤں تلے

وہ ایسے ایسے کتنے ہی جو بول گربھ کے کہتا تھا　　سب لوگ سبھا کے سنتے تھے کیا تاب جو بولے کوئی ذرا
تھا ایک پرکھ وہ یوں بولا "تو بھولا اپنے بل پر کیا　　جو تیرا مارن ہارا ہے سو وہ بھی جنم اب لیوے گا

تو اپنے بل پر ہائے مورکھ اس آن عبث ہنکار لیا
وہ تجھ کو مار گرا دے گا یوں جیسے جھنگا مار لیا"

یہ بات سنی جب کنس نے واں تب سن کر اس کے ہوش اڑے　　بھومن کے بھیتر آن بھرا اور بول گربھ سگرے بسرے
یوں پوچھا وہ کس دیس میں ہے، اور کون بنوں آ کر جنمے　　کون اس کے مات پتا ہو ویں جو پالیں اس کو چاہت سے"

وہ بولا: متھرا نگری میں اک روز جنم وہ پاوے گا
جب سیانا ہوگا تب تجھ کو اک پل میں مار گراوے گا"

یہ بات سنائی کنس کو پھر اور آٹھ لکیریں واں کھینچیں　　بسدیو پتا کا ناؤں کہا اور دیوکی ماتا ٹھہرائیں
ان آٹھ لکیروں کی باتیں پھر کنس کو اس نے سمجھائیں　　سب چھوڑا چھوری دیوکی کے ہیں جگ میں ہونے آٹھ یوہیں

بل تیج گرب میں تو نے تو سب کا رتی گیان بسارا ہے
جو پاتے چھے رکھا کھینچی ہے وہ تیرا مارن ہارا ہے

اس بات کو سن کر کنس بہت تب من میں اپنے گھبرایا　　جب نارد من اس پاس گئے تب ان سے اس نے بھید کہا
تب نارد من نے اس کو بھی کچھ اور طرح سے سمجھایا　　پھر کنس کو واں اس بات سوا کچھ اور نہ مارگ بن آیا

جو اپنی جان بچانے کا کر سوچ یہ اس نے پھند کیا
بلوا بسدیو اور دیوکی کو اک مندر بھیتر بند کیا

جب قید کیا ان دونوں کو تب چوکیدار دئے تگڑا　　اک آن نہ نکسن پاویں یہ پھر ان سب کو یہ حکم دیا
سامان رسوئی کا جو تھا سب ان کے پاس دیا رکھوا　　اور دروازے اس مندر کے تب بھاری تالے بھی جڑوا

ہشیار رہے یوں رہنے واں نت چوکی کے دینے ہارے

کیا تاب جو تو ٹھے پیچھے پر اک آن پرندہ پر مارے

بھو بیٹھا تھا جو کنس کے من وہ بھر کر نیند نہ سوتا تھا   کچھ بات سہاتی نا اس کو نت اپنی پلک بھگوتا تھا
اس مندر میں اُن دونوں کے جب کوئی بالک ہوتا تھا   کنس آن اُسے چھپ مارے تھا من مات پتا کا روتا تھا

اک مدت تک ان دونوں کا اس مندر میں یہ حال رہا
جو بالک ان کے گھر جنما سو مارتا وہ چنڈال رہا

پھر آیا واں اک وقت ایسا جو آئے گرب میں منموہن   گوپال، منوہر، مرلیدھر، سیکشن، کشورن، کنول نین
گھنشام، مُراری، بنواری، گردھاری، سندر، شیام برن   پربھوناتھ بہاری کان لِلا سکھدائی جگ کے دکھ بھنجن

جب ساعت پرگھٹ ہونے کی واں آئی مُکٹ دھریا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنھیا کی

تھا نیک مہینہ بھادوں کا اور دن بدھ، گنتی آٹھن کی   پھر آدھی رات ہوئی جس دم اور ہوا نچھتر روہنی بھی
سبھ ساعت نیک مہورت سے واں جنمے آ کر کشن جبھی   اس مندر کی اندھیاری میں جو اور اجالی آن بھری

بسدیو سے بولیں دیوکی جی "مت ڈر بھو من میں دھیر کرو
اس بالک کو تم گوکل میں لے پہنچو اور مت دیر کرو"

جو تم اس کے لے جانے میں یاں تک بھی دیر لگاؤ گے   وہ دُشٹ اِسے بھی مارے گا پچھتاتے ہی رہ جاؤ گے
اِس آن سنبھل کر تم اس کو جو گوکل میں پہنچاؤ گے   اِس بات میں یہ پھل پاؤ گے جو اس کی جان بچاؤ گے

واں گوکل باشی جو اس کو لے اپنی گود سنبھالے گا
کچھ نام وہ اِس کا رکھ لے گا اور مہر دیا سے پالے گا

جو حال یہ واں جا پہنچے گا تو اِس کا جی بچ جاوے گا   جو کرم لکھی ہے تو پھر بھی کچھ ہم کو آن دکھاوے گا
جس گھر کے بیچ پلے گا یہ وہ گھر ہم کو بتلا دے گا   ہم اس سے ملنے جاویں گے یہ ہم سے ملنے آوے گا

نے کام ہمیں کچھ دعوے سے نے جھگڑا اور بکھیڑے سے
جب دیکھیں کو من بھٹکے گا، سکھ پاویں گے اس کے دیکھے سے

ہے آدھی رات ابھی تو یاں لے جاؤ اسے تم چال ادھر   لپٹا لو اپنی چھاتی سے دے آؤ جا کے اور کے گھر
من بیچ انھوں کے تھا ڈر یہ دن ہو دے گا تو کنس آ کر   اک آن میں اس کو مارے گا رہ جاویں گے ہم آنسو بھر
یہ بات نہ تھی معلوم انھیں یہ بالک جگ نستارے گا
کب مار سکے گا کنس اسے یہ کنس کو آپ ہی مارے گا

جب دیوکی نے بسدیو جی سے واں رو رو کر یہ بات کہی   وہ بولے "کیونکر لے جاؤں ہے باہر تو چوکی بیٹھی
اور دوارے لگے ہیں تالے کل کچھ بات نہیں ہے بس کی"   نت دیوکی بولی "لے جاؤ من ایشر کی رکھ آس ابھی"
وہ بالک کو جب لے نکلے سب سانکر بیٹ پٹ چھوٹ گئے
تھے تالے جتنے دوارے لگے اس آن جھڑا جھڑ ٹوٹ گئے

جب آئے چوکیداروں میں تب واں بھی یہ صورت دیکھی   سب سوتے پائے اس ساعت ہر آن جو دیتے تھے چوکی
جب سوتا دیکھا ان سب کو ہو نربھو نکلے واں سے بھی   پھر آئے جمنا پہ جو ہیں پھر جمنا دیکھی بہت چڑھی
یہ سوچ ہوا من بیچ انھیں پیر اس جل میں کیسے دھریے
ہے رین اندھیری بالک سنگ اس بپتا میں اب کیا کریے

یوں من میں ٹھہرا پھر چلیے پھر آپ ہی من مضبوط ہوا   بھگوان دیا پر آس لگا، واں جمنا جی پر دھیان دھرا
یہ جوں جوں پاؤں بڑھاتے تھے وہ پانی چڑھتا آتا تھا   یہ بات لگی جب ہونے واں بسدیو گئے من میں گھبرا
تب پاؤں بڑھائے بالک نے جو آپ سے اور بھیگے جل میں
جب جمنا نے پگ چوم لیے جا پہونچے پار وہ اک پل میں

جب آن براجے گوکل میں سب پھاٹک ان بھی پائے کھلے   تب واں سے چلتے چلتے وہ پھر نند کے دوارے آ پہونچے

وان نند محل کے دوارے بھی سب دیکھے پٹ پٹ دور کھڑے   جو چوکی والے سوتے تھے اب کون انہیں رد کے ٹوکے
جب بیچ محل کے جا پہونچے سب سوتے واں گھر والے تھے
ہر چار طرف اجیالی تھی جوں سانجھ میں دیوے بالے تھے
اک اور اچنبھا یہ دیکھو جو رات جنم سی کشن کی تھی   اس رات جسودا کے گھر میں تھی جنمی یار داک لڑکی
واں سوتے دیکھ جسودا کو اور بدلی کر اس بالک کی   اس لڑکی کو وہ آپ اُٹھا لے نکلے آئے متھرا جی
جب لڑکی لائے مندر میں سب تالے مندر لاگ اُٹھے
جو چوکی دینے والے تھے پھر وہ بھی اس دم جاگ اُٹھے
جب بھور ہوئی تب گھبرا کر سُدھ کنس نے لی اس مندر کی   جب تالے کھلوا بیچ گیا تب لڑکی جنمی اک دیکھی
لے ہاتھ پھرایا چکر دے "تو پٹکے" وہ بن پٹکے ہی   یوں جیسے بجلی کوندے ہے جب چھوٹ ہوا پر جا پہونچی
یہ کہتی نکلی "اے مورکھ کیا تو نے سوچ بچارا ہے
وہ جیتا اب تو سیس مکٹ، جو تیرا مارن ہارا ہے"
جب کنس نے واں یہ بات سُنی من بیچ بہت سا الجھایا   جو کارج ہونے والا ہے وہ ٹالے سے کب ہے ٹلتا
سو فکر کرو سو پیچ کرو سو بات سناؤ حاصل کیا   ہر آن وہی یاں ہونا ہے جو ماتھے کے ہے بیچ لکھا
ہیں کہتے بُدھ جسے اب یاں، وہ سوچ بڑے ٹھیراتی ہے
تقدیر کے آگے پر یارو تدبیر نہیں کام آتی ہے
اب نند کے گھر کی بات سنو واں ایک اچنبھا یہ ٹھیرا   جو رات کو جنمی تھی لڑکی اور بھور کو دیکھا تو لڑکا
گھر ڈنالیں چھوٹیں، ناچ ہوا اور نوبت کا غل شور مچا   پھر کشن گرب نے نام رکھا سب کنبے کے مل بیٹھے آ
نند اور جسودا اور گوات کرنے واں ہیرا پھیر لگے
پکوان مٹھائی میوے کے ہر ناری آگے ڈھیر لگے

سب ناری آئیں گوکل کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں کچھ ڈھول مجیرے لائی تھیں کچھ گیت جچا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم مکھ اس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں کچھ تھال پنجیری کے رکھتیں کچھ سونٹھ سٹھورا کرتی تھیں
کچھ کہتی تھیں "ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو"
کچھ کہتیں "ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو"
کوئی گھٹی میٹھی گرم کرے کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے کوئی کرتہ ٹوپی میوہ گھی
کوئی دیکھے روپ اس بالک کا کوئی ماتھا چومے ہر بھر کے کوئی بھنووں کی تعریف کرے کوئی آنکھوں کی کوئی پلکوں کی
کوئی کہتی عمر بڑی ہووے اسے بیر تمہارے بالے کی
کوئی کہتی بیاہ ہوا دُو اس آس مراد دل والے کی
کوئی کہتی "بالک خوب ہوا اسے بھینا تیری نیک رتی یہ بالے اُن کو ملتے ہیں جو دنیا میں ہیں بڑھ بھاگی
اس کنبے کی بھی شان بڑھی اور بھاگ بڑھے اس گھر کے بھی یہ باتیں سب کی سُن سُن کر یہ بات جسودا کہتی تھی
"اے بیر یہ بالک جو ایسا اب میرے گھر میں جنما ہے
کچھ اور کہوں میں کیا تم سے بھگوان کی مو پر کرپا ہے"
تھی کونے کونے خوش وقتی اور طبلے تال کھڑکتے تھے کوئی ناچ رہی کوئی کود رہی کوئی ہنس ہنس کے کچھ روپ سجے
ہر چار طرف آنندیں تھیں واں گھر میں نند جسودا کے کچھ آنگن بیچ براجے تھیں کوئی بیٹھی کوٹھے اور چھجے
سو خوبی اور خوش حالی سے دکھلاتی تھی سامان کھڑی
سچ بات ہے بالک ہونے کی ہے دنیا میں آنند بڑی
پھر اور خوشی کی بات ہوئی جب بیت ہوئی دو کا ندولی کی رکھوائی دودھ کی مٹکی بھر اور ڈالی ہلدی بہتیری
یہ اس پر پھینکے بھر بھر کر وہ اس پر ڈالے گھڑی گھڑی کوئی پونچھے مکھ اور باہن کو کوئی سگری بھیگی اور نتھری
اس دودھ کی بھی رنگ رلیوں میں روپ اور ہوا ہر ناری کا

اور تن کے ابرن یوں بھیگے، جوں رنگ ہو کیسر کیاری کا

سکھ منڈل میں یہ دھوم مچی اور باہر سنگی جوگی بھی ‎ کچھ ناچیں بھانڈ بھگیتے بھی کچھ ہیجڑے پاویں بیل پری

آنند بدھاوے باج رہے نرسنگے سرنا اور ترئی ‎ رنگین سنہرے پالنے بھی لے ہاتھ کھڑے کتنے برتی

ہر آن اٹھاتے تھے مانک کیا گنتی سونے روپے کی

نند اور جسودا نے ایسی کی شادی بالک ہونے کی

جو نگی جوگی تھے ان کو اس آن نپٹ خوش حال کیا ‎ پھر آئے باگے ریشم کے اور زر بھی بخشا بہتیرا

اور جلنے ناچنے والے تھے اسباب انھیں بھی خوب دیا ‎ مہمان جو گھر میں آئے تھے سب ان کا بھی ارمان رکھا

دن رات چھٹی کے ہونے تک من خوش کیا لوگ لگائی کا

بھر تھال روپے اور مہریں دیں جب نیگ چکایا دائی کا

نند اور جسودا بالک کو واں ہاتھوں چھاؤں میں رکھتے تھے ‎ نت پیار کریں تن من واریں ستھری ابرن گہنے بنکے

جی بہلاتے من پرچاتے اور خوب کھلونے منگواتے ‎ ہر آن جھلاتے پلنے میں وہ ایدھر اور اودھر بیٹھے

کر یاد نظیرؔ اب ہر ساعت اس پالنے اور اس جھولے کی

آنند سے بیٹھو چین کرو جے بولو کانھ جھنڈولے کی

(۲۴) بانسری

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی ادھر دھری ‎ کیا کیا پریم میت بھری اس میں دھن بھری

لے اس میں رادھے رادھے کی ہر دم بھری کھری ‎ لہرائی دھن جو اس کی ادھر اور ادھر ذری

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

کتنے تو اس کے سُننے سے دُھن ہو گئے دھنی — کتنوں کی سدھ بسر گئی جس دم وہ دُھن سُنی
کتنوں کے من سے کل گئی اور بیا کلی چُھنی — کیا نر سے لے کے ناریاں کیا کوڑھ کیا گُنی
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

جس آن کانہہ جی کو وہ بنسی بجاؤنی — جس کان میں وہ آؤنی واں سدھ بھلاؤنی
ہر من کی ہو کے موہنی اور چت لبھاؤنی — نکلی جہاں دُھن اس کی وہ میٹھی سُہاؤنی
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

جس دن سے اپنی بنسی وہ سیکشن نے سجی — اس سانورے بدن پہ نپٹ آن کر سجی
مرلی بھلایا آپ کو ناری نے سُدھ تجی — ان کی اُدھر سے آکے وہ بنسی جدھر بجی
سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

گوالوں میں نندلال بجاتے وہ جس گھڑی — گوپیں دُھن اس کی سننے کو رہ جاتیں سب کھڑی
گلیوں میں جب بجاتے تو وہ اس کی دُھن کڑی — لے لے کے اپنی لہر جہاں کان میں پڑی
سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

بنسی کو مرلی دھر جی بجاتے گئے جدھر — پھیلی دھن اُس کی زور ہر اک دل میں کر اثر
سُنتے ہی اس کی دُھن کی حلاوت ادھر ادھر — منہ چنگ اور نے کی دھنیں دل سے بھول کر

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

بن میں اگر بجاتے تو واں بھی یہ اُس کی چاہ — کرتی دُھن اُس کی پنچھی بڑہی کے دل میں راہ
بستی میں جو بجاتے تو کیا شام کیا پگاہ — پڑتے ہی دھن وہ کان میں بلہاری ہوگئے واہ

سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

کتنے تو اس کی دھن کے لئے رہتے بیقرار — کتنے لگائے کان اُدھر رکھتے بار بار
کتنے کھڑے ہو راہ میں کر رہتے انتظار — آئے جدھر بجاتے ہوئے شیام جی مُرار

سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن — لَے اس کی من کی موہنی دُھن اس کی چت ہرن
اِس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بجن — کیا چل پون نظیرؔ پکھیرو و کیا ہرن

سب سُننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

(۲۵) آگرہ کی تیراکی

جب پیرنے کی رُت میں دلدار پیرتے ہیں — عاشق بھی ساتھ ان کے غمخوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے ناداں ہشیار پیرتے ہیں — پیر و جوان و لڑکے عیّار پیرتے ہیں

ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جھرنے سے لیکے یارو جا کا تا پیالہ — چھتری سے برج خونی دارا کا چونترا کیا
مہتاب باغ اسید تیلی، قلعہ و روضہ — غل شور کی بہاریں انبوہ سیر چرچا
ہر اک مکاں میں ہوکر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

باغ حکیم اور جو شیوداس کا چمن ہے — اُن میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے
میوہ مٹھائی کھانے اور ناچ دل لگن ہے — کچھ پیرنے کی دھومیں کچھ عیش کا چلن ہے
ہر اک مکاں میں ہوکر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

برسات میں جو آکر چڑھتا ہے خوب دریا — ہر جا گھری دچادر، بند اور ناند چکوا
مینڈھا، بھنور، اچھالن، چکر، سمیٹ، مالا — مینڈھا، گھمیر تختہ، کٹے، پچھاڑ، کرا
واں بھی ہنر سے اپنے ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

تربینی میں، ہاہا ہوتی ہیں کیا بہاریں — خلقت کے ٹھٹھ ہزاروں پیراک کی قطاریں
پیریں نہاویں، اُچھلیں، کودیں لڑیں پکاریں — لیتے وہ چھینٹ غوطے کھا کھا کے ہاتھ ماریں
کیا کیا تماشے کر کر اظہار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جمنا کا پاٹ گویا صحن چمن ہے بارے — پیراک اس میں پیریں جیسے کہ چاند تارے

پریوں سے بھر رہے ہیں منجدھار اور کنارے　　منہ چاند کے سے ٹکڑے تن گورے پیارے پیارے
کچھ وار پیرتے ہیں کچھ پار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

سینہ چمک رہا ہے ہیرے کا جوں نگینہ　　کتنے کھڑے ہی پیریں اپنا دکھا کے سینہ
سرووں کا یہ چلا ہے گویا کہ اک قرینہ　　آدھے بدن پہ پانی آدھے پہ ہے پسینہ
دامن کمر پہ باندھے دستار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کتنوں کے ہاتھ پنجرے کتنوں کے سر پہ طوطے　　جاتے ہیں ان میں کتنے پانی پہ صاف سوتے
حقوں کا دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے　　کتنے پتنگ اُڑاتے کتنے سوئی پروتے
سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

دریا میں مچ رہے اندر کے سو اکھاڑے　　کچھ ناچ کی بہاریں پانی کے کچھ لتاڑے
بجرے و ناؤ، چپو، ڈونگے سبنے، نواڑے　　لب ریز گلرخوں سے دونوں طرف کرارے
اِن جمگھٹوں سے ہو کر سرشار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جوڑے بدن میں رنگیں گہنے جھمک رہے ہیں　　ناؤں میں وہ جو گلرو ناچوں میں چمک رہے ہیں
عیش و طرب کی دھو میں پانی چھپک رہے ہیں　　تانیں ہوا میں اڑتیں طبلے کھڑک رہے ہیں
سو ساٹھ کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں
اِس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

ہر آن بولتے ہیں سید کبیر کی جے ۔۔۔ پھر اس کے بعد اپنے اُستاد پیر کی جے
مور و مکٹ کنہیا، جمنا کے تیر کی جے ۔۔۔ پھر غول کے سب اپنے خورد و کبیر کی جے
ہر دم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

کیا کیا نظیر یاں کے ہیں پیرنے کے بانی ۔۔۔ ہے جن کے پیرنے کی ملکوں میں آن مانی
اُستاد اور خلیفہ شاگرد یار جانی ۔۔۔ سب خوش رہیں ہے جب تک جمنا کے بیچ پانی
کیا کیا ہنسی خوشی سے ہر بار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

(۲۶) موسمِ زمستان

جب ماہ اگہن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی ۔۔۔ اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی ۔۔۔ پالا بھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلّا غم ٹھونک اُچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی ۔۔۔ تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو، بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھپو ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی سی کی ۔۔۔ کلّے پہ کلّہ لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکّی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکاں میں سردی نے آ باندھ دیا ہو یہ چکّر ۔۔۔ جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑاکڑ اور تھر تھر
بیٹھی ہو سردی رگ رگ میں اور برف پگھلتا ہو پتھر ۔۔۔ جھڑ باندھ مہاوٹ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لے لے کر

سناٹا باؤ کا چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا اور تن میں نیمہ شبنم کا ہو، جس میں خس کا عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اک فرّاش کھڑا
فرّاش بھی پنکھا جھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

جب ایسی سردی ہو اے دل تب زور مزے کی گھاتیں ہوں کچھ نرم بچھونے مخمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
محبوب گلے سے لپٹا ہو اور کہنی چٹکی لاتیں ہوں کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش و طرب میں پلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہو فرش بچھا غالیچوں کا اور پردے چھوٹے ہوں آ کر اک گرم انگیٹھی جلتی ہو اور شمع ہو روشن اور تس پر
وہ دلبر شوخ پری چنچل ہے دھوم مچی جس کی گھر گھر ریشم کی نرم نہالی پر سو ناز و ادا سے ہنس ہنس کر
پہلو کے بیچ مچلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ترکیب بنی ہو مجلس کی اور کافر ناچنے والے ہوں منہ اُن کے چاند کے ٹکڑے ہوں تن اُن کے روئی کے گالے ہوں
پوشاکیں نازک رنگوں کی اور اوڑھے شال دوشالے ہوں کچھ ناچ اور رنگ کی دھومیں ہوں کچھ عیش میں ہم متوالے ہوں
پیالے پر پیالہ چلتا ہو، تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکاں ہو خلوت کا اور عیش کی سب تیاری ہو وہ جان کہ جس سے جی غش ہو سو ناز سے آ جھنکاری ہو
دل دیکھ نظیر اِس کی چھب کو ہر آن ادا پر واری ہو سب عیش مہیا ہو آ کر جس جس ارمان کی باری ہو
جب سب ارمان نکلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

(۲۷) اُومس

کیا ابر کی گرمی میں گھڑی پہر ہے اُومس گرمی کے بڑھانے کی عجب لہر ہے اُومس
پانی سے پسینوں کی بڑی نہر ہے اُومس ہر باغ میں ہر دشت میں ہر شہر ہے اُومس
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

کہتے تو اس اُومس کے تئیں کہتے ہیں گرماؤ یعنی کہ گھرا ابر ہو اور آ کے رُکے باؤ
اس وقت تو پڑتا ہے غضب جان میں گھبراؤ دل سینہ میں بیکل ہو یہی کہتا ہے کھاتا ؤ
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

بدلی کے جگھٹ آنے سے ہوتی ہے ہوا بند پھر بندسی گرمی وہ غضب پڑتی ہے یک چند
پھینکے کوئی پگڑی کوئی کھولے ہے کھڑا بند دم رُک کے گھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

ایدھر تو پسینوں سے بڑی بھیگے ہیں کھاٹیں گرمی سے اُدھر میل کی کچھ چیونٹیاں کاٹیں
کپڑا جو پہنئے تو پسینے اُسے آٹیں ننگا جو بدن رکھئے تو پھر مکھیاں چاٹیں
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

رُکنے سے ہوا کے جو بُرا ہوتا ہے احوال　　پنکھا کوئی آنچل کوئی دامن کوئی، رومال
دم دھونکنے لگتا ہے لہاروں کی گویا کھال　　کچھ روح کو بے تابیاں کچھ جان کو جنجال
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

گھبرا کے کبھی آتا ہے دم جاتا ہے بھولا　　آرام جو دل کا ہے سبھی جاتا ہے بھولا
آتا ہے کبھی ہوش کبھی جاتا ہے بھولا　　کپڑے بھی بُرے لگتے ہیں جی جاتا ہے بھولا
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

ہوتی ہے اُومس جو کبھی اک رات کو آکر　　کر ڈالتی ہے پھر تو قیامت ہی مقرر
ایدھر تو ہوا بند اُدھر پسّو و مچھر　　پانی کوئی پیوے تو ادھن سے بھی وہ بدتر
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

جس وقت ہوا بند ہوا اور آکے گھٹا چھائے　　پھر کہئے دل اس گرمی میں کس طرح نہ گھبرائے
اوڑھو تو پسینہ جو نہ اوڑھو تو غضب آئے　　پسّو کبھی مچھر کبھی کھٹمل ہی لپٹ جائے
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

گر اس میں ہوا کھل گئی اور پانی بھی لائی　　تو جی میں جی اور جان میں کچھ جان سی آئی
اور اس میں جو پھر ہو گئی اُومس کی چڑھائی　　تو پھر وہی رونا وہی غل شور دہائی
برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس

سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

اُومس میں تو لازم ہے کہ پنکھی نہ ہوا ہو اک کوٹھری ہو جس میں دھواں آکے بھرا ہو
اور مکھیوں کے واسطے گڑ تن سے ملا ہو اس وقت مزا دیکھئے اُومس کا کہ کیا ہو

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

اس رُت میں تو واللہ عجب عیش ہے دلخواہ مینہ برسے ہے اور سرد ہوا آتی ہے ہر گاہ
جنگل بھی ہرے گل بھی کھلے سبز چراگاہ اُومس ہی مگر دل کو ستاتی ہے نظیرؔ آہ

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اُومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اُومس

(۲۸) کورا برتن

کورے برتن ہیں کیاری گلشن کی جس سے کھلتی ہے ہر کلی تن کی
بوند پانی کی اُن میں جب کھنکی کیا وہ پیاری صدا ہے سن سن کی

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

پانی کی آپ اب بڑی ہے ذات قطرہ قطرہ ہے جس کا آبِ حیات
کورے برتن میں جبکہ آیا ہات پھر تو آبِ حیات بھی ہے مات

تازگی جی کی اور تری تن کی

واہ کیا بات کورے برتن کی

وہ جو پانی کی کوری گولی ہے		دہی آنے کے مول کو لی ہے
کیا ہی ٹھنڈی دوا کی گولی ہے		کیا کہوں گولی گولی گولی ہے

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

یہ جو گولی کی بولیاں باندہیں		ہم نے پانی کی گولیاں باندہیں
سوندھی سوندھی ٹھٹولیاں باندہیں		دل نے پھولوں کی جھولیاں باندہیں

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کورا نہاری کا جو ہے مٹکا		اس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا
لے گیا جان پاؤں کا کھٹکا		دل گھڑے کی طرح سے دے پٹکا

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کوری ٹھلیا یہ دیکھکر لوٹا		دل لگا ہونے کچھ کھرا کھوٹا
گرچہ لوٹا وہ قد کا ہے چھوٹا		جس نے دیکھا اسی کا دل لوٹا

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کورے کوزوں کو دیکھ عالم میں		کوزے مصری کے بھر گئے غم میں
یوں وہ رستے ہیں آب کے نم میں		جیسے ڈوبے ہوں پھول شبنم میں

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

وہ جو کورا سفید جھجر ہے　　جس کی جاگیر ملک جھجر ہے
بیل بوٹے سے اس جھجک پر ہے　　تاشش کمخواب یا مشجر ہے

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

جس صراحی میں سرد پانی ہے　　موتی کی آب پانی پانی ہے
زندگی کی یہی نشانی ہے　　دوستو یہ بھی بات پانی ہے

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

جتنے نذر و نیاز کرتے ہیں　　اور جو پیروں سے اپنے ڈرتے ہیں
جب کہ لا پھول پان دھرتے ہیں　　وہ بھی کوری ہی ٹھلیاں بھرتے ہیں

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

خاک سے جب کہ ان کو گڑھتے ہیں　　بندگی سے یہ اپنی بڑھتے ہیں
کوروں پہ پھول ہار چڑھتے ہیں　　حور و غلماں درود پڑھتے ہیں

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

کوروں پہ جو تعلیم جوبنا ہے　　جو حرے میں کہاں وہ کھن کھن ہے

جس گھڑونچی پہ کورا باسن ہے — وہ گھڑونچی نہیں ہے گلشن ہے
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

(۲۹) کوا اور ہرن کا بچہ

اک دشت میں سنا ہے کہ اک خوب تھا ہرن — بچہ ہی تھا ابھی نہ ہوا تھا بڑا ہرن
پھرتا تھا چوکڑی کا دکھاتا مزا ہرن — دیکھا جو ایک کوے نے وہ خوشنما ہرن
دل کو نہایت اس کے وہ اچھا لگا ہرن

دو باتیں کرکے کوے نے اس کو لگا لیا — دم میں ہرن بھی کوے کی الفت میں آ گیا
کوے ہرن میں ٹھیری جو گہری محبت آ — کوا جدھر جدھر کو خوشی ہو کے جاتا تھا
پھرتا تھا اس کے ساتھ لگا جا بجا ہرن

اک گیدڑ اس ہرن کے کنے آ کے نابکار — بولا ہزار جان سے میں تم پہ ہوں نثار
مجھ کو بھی اپنا جان غلام اور دوستدار — اور دل میں یہ کہ کیجیے کس طور سے شکار
اس کے دغا و مکر سے واقف نہ تھا ہرن

گیدڑ یہ کہہ کے مکر سے جس دم گیا اُدھر — کوا ہرن سے کہنے لگا کرکے شور و شر
یہ سخت مکر باز ہے کر اس سے تو حذر — اک دن دغا سے تجھ کو یہ پکڑے گا فتنہ گر
سن کر یہ بات کوے کی چپ ہو رہا ہرن

دن دوسرے ہرن کنے گیدڑ پھر آ گیا — کوے کو سوتا دیکھ یہ بولا وہ پُر دغا

میں آج دیکھ آیا ہوں اک کھیت کیا ہرا　　تم کھاؤ اس کو چل کے تو ہو شاد دل مرا
سنتے ہی اس کے ساتھ اچھلتا چلا ہرن

جس کھیت پر یہ لے کے گیا اس کو بدسگال　　واں پہلے دیکھ آیا تھا وہ اک ہرن کا جال
لے پہنچا جب ہرن کے تئیں کھیت پر شغال　　جاتے ہی واں ہرن نے دیا منہ کو اس میں ڈال
منہ ڈالتے ہی جال میں واں پھنس گیا ہرن

واں پھڑ پھڑاتا آ گیا کوا بھی ناگہاں　　گیدڑ کو دے کے گالی ہرن سے کہا کہ ہاں
تڑپے مت اس میں ورنہ تو ہو دے گا ناتواں　　کوے کی بات سنتے ہی ہمت کو باندھ واں
جیسے کہ گر پڑا تھا وہیں پھر اٹھا ہرن

گیدڑ لگا جب آنے ہرن کی طرف جھپٹ　　کوا پکارا مار تو سینگ اک جو جاوے ہٹ
یا اک کھری تو ایسی لگا پاؤں کی لپٹ　　جاوے جو اس کے لگتے ہی گیدڑ کا پیٹ پلٹ
سنتے ہی یہ تو سینگ ہلانے لگا ہرن

گیدڑ نے خوب کوے کو دیں جل کے گالیاں　　صیاد واں ہوا تھا کسی کام کو رواں
اس میں شکاری آ کے ہوا دور سے عیاں　　کوا پکارا لیٹ جا دم بند کر کے ہاں
دم بند کر کے اپنا وہیں گر پڑا ہرن

گیدڑ نے اس کو دیکھ کے اک جھاڑی لی　　صیاد اس ہرن کو پڑا دیکھ اس گھڑی
افسوس کر کے دام کی رسی وہ کھول دی　　کوا پکارا بھاگ ارے وقت ہے یہی
سنتے ہی واں سے چوکڑی بھر کر اڑا ہرن

صیاد نے جو دیکھا ہرن اٹھ چلا جھپاک　　جلدی سے دوڑا پیچھے ہرن کے وہ سینہ چاک
سونٹے کو پھینک مارا جو پھرتی سے اس نے تاک　　بھاگا ہرن، لگا وہیں گیدڑ کے آ کھٹاک

سر اُس کا پھوٹا اور وہ سلامت گیا ہرن

گیدڑ نے اس ہرن کا جو چیتا تھا واں بُرا
پائی اسی نے اپنی بدی کی وہیں سزا
تھا یہ تو نثر میں نے اسے نظم میں کیا
پھونچا نظیرؔ جب وہ خوشی ہو کے اپنی جا
کوّے کے ساتھ پھر وہ بہت خوش رہا ہرن

(۳۰) خواب کا طلسم

یارو ذرا سنو یہ عجب سیر ہے بڑی
صحنِ چمن میں ابر کی آکر لگی جھڑی
پی کر شراب عیش کی ہر دم کڑی کڑی
کل بے خبر ہو رات کو سویا میں جس گھڑی
اُس خواب میں مجھے اک عمارت نظر پڑی

آئی نظر جو مجھ کو وہ نادر محلسرا
دل میں پری کے باغ کا مجھ کو یقیں ہوا
جب اس مکان کے پاس میں ڈرتا ہوا گیا
دیکھوں تو اس کا ہے در دولت سرا کھلا
آیا یہ دل میں دیکھئے چل کر کوئی گھڑی

پھونچا یونہیں میں اُس چمن زر فشان میں
جھمکے مکان جو اس کے مری آن آن میں
عالم سنہرے پردوں میں اور سائبان میں
کیا دیکھتا ہوں جا کے میں ہر اک مکان میں
سونے کی کھان ہے کہ یہی پھرتی ہے پڑی

گلشن کہیں چمن کہیں شیشہ صراحی جام
فرشِ طلا بچھا کہیں یکسر جڑت کا کام
تھی نقرئی زمین تو سنہرے تمام بام
طاق و رواق اُس کے جھکتے تھے یوں مدام
گویا کہ اینٹ اینٹ جواہر کی ہے جڑی

دیکھی پھر اس میں ایک ستم ایجاد مہ لقا — اور پر نظر گئی جو مری سر سے تا بپا
صورت وہ قہر چاند کا ٹکڑا سا بے بہا — اور حسن کا بیان تو جاتا نہیں کہا
نقشہ وہ جس کے پاؤں پہ لوٹے پری پڑی

خونریز ابرو جان کی قاتل ہر اک نگاہ — مژگاں وہ برچھیوں کو لئے تل رہی سیاہ
مہندی سے انگلیوں نے کئے خوں بے گناہ — آنکھوں میں کھنچ رہا تھا وہ کاجل غضب سیاہ
پڑ جائے جس سے دل میں فرشتوں کے ہڑبڑی

زلفیں وہ مشک ناب سی چہرہ وہ چاند سا — جگنو رہا گلے میں ستارہ سا جگمگا
گہنے کا وصف یا کہ بدن کی کہوں صفا — جاتا تھا سرخ جوڑے میں تن یوں جھمک دکھا
گویا شفق میں آن کے بجلی چمک پڑی

رکھے تھی اس گھڑی تو یہ عالم وہ مہ جبیں — شاید کہ اس طرح کی نہ ہوگی پری کہیں
حسرت سے آن کر مری آنکھوں نے واں جو ہیں — دیکھی جو اس بہار کی کافر وہ نازنیں
دل لوٹ پوٹ ہو گیا جاں غش میں جا پڑی

کیا کیا کہوں میں شوخ کے عالم بناؤ کا — تصویر بن رہی تھی لگا سر سے تا بہ پا
اس دم بندھی تھی اس کی غضب آن کر ہوا — کافر کھڑی ہوئی تھی عجب ڈھب سے بن بنا
اک ہاتھ میں لئے آئینہ اک ہاتھ میں چھڑی

دیکھی جو میں نے واں یہ طلسمات کی ہوا — عالم جواہرات کا ہر جا چمک رہا
اس کی چمک جھمک کی بہاریں کہوں میں کیا — چمکا جو وہ مکاں مری آنکھوں میں نور سا
حیرت سے عقل آن کے چکر میں جا پڑی

ایسا مکاں تو میں نے نہ دیکھا تھا نے سنا — دیوانہ ہو میں چاروں طرف دیکھنے لگا

چاہا کہ دیکھوں کوٹھے کے اوپر نظر اُٹھا اتنے میں اک طرف سے جو پردہ سا اٹھ گیا
بجلی سی کچھ چمک گئی آنکھوں میں اُس گھڑی

آ کر کھڑی ہوئی تھی جو واں ناگہاں وہ شوخ لیتی تھی ہر نگاہ میں عاشق کی جاں وہ شوخ
کچھ چلبلی نگاہ تھی کچھ انکھڑیاں وہ شوخ کرتی تھی سیر چاروں طرف کی جو واں وہ شوخ
اتنے میں پھرتی اُس کی نظر مجھ پہ آ پڑی

اُس کی نگہ کے آنے کا میں کیا کروں بیاں بجلی تھی یا کہ تیر تھی گولی تھی یا سناں
میری طرف کو دوڑ کے آتی تھی ناگہاں میری نظر بھی دوڑ کے اُس کی نظر سے واں
ایسی لڑی کہ خوب لڑی، خوب ہی لڑی

بارے نظر کے لڑتے ہی کچھ کم ہوا حجاب الفت کی آ کے دونوں طرف سے کھنچی طناب
اتنے میں دیکھ دیکھ کے وہ رشک ماہتاب اکبار کھلکھلا کے ہنسی اور اتر شتاب
کافر وہ میرے پاس ہی آ کر ہوئی کھڑی

کہنے لگی کہ تو نے بلایا ہے کیوں مجھے دے خواب کو دعا کہ نہ پاتا تو یوں مجھے
چاہت میں اپنی ڈوبا ہوا دیکھا جوں مجھے ہنس کر لپٹ گلے سے لگی کہنے یوں مجھے
آ اس محل میں چل کے کریں عیش دو گھڑی

اس گلبدن سے جب کہ ملی آ کے مجھ کو داد مارے خوشی کے کچھ نہ رہی تن بدن کی یاد
کیونکر بھلا نہ عیش و طرب دل کو ہو زیاد میری تو اس پری سے یہی عین تھی مراد
سنتے ہی دل کی کھل گئی ہر ایک پھلجھڑی

پالا پڑا جو مجھ کو اس آبِ حیات سے جاں آ گئی بدن میں مرے اس کی بات سے
آخر کو لے چڑھی مجھے کوٹھے پہ گھات سے دو چار جام مجھ کو پلا اپنے ہات سے

سو ناز سے پلنگ پہ مرے پاس آ پڑی

آنے سے اُس کے دل کا مرے کھل گیا چمن　　عیش و طرب کے ابر کی پڑنے لگی بھرن
نازک کمر وہ صاف شکم اور وہ نرم تن　　گل سا ملا جو مجھ کو نیا گدگدا بدن
رگ رگ میں میری چھٹ گئی عشرت کی پھلجھڑی

لے کر بغل میں اس کو لگایا جو ہیں گلے　　سو عشرتوں کے دل پہ مرے کھل گئے ورے
حاضر ہوئے جب اُن کے سب عیش اور مزے　　سینے سے سینہ مل گیا اور لب سے لب ملے
لٹنے لگی بہار مزوں کی دھڑی دھڑی

ادھر تو ہوش عشق ادھر حسن اور جنوں　　ناز و ادا کی ہونے لگی آ کے دھپ دھپوں
ان عشرتوں میں آہ نصیبوں کو کیا کہوں　　چاہا میں اس پری سے جو کچھ اور کچھ کہوں
اتنے میں ہائے یار مری آنکھ کھل پڑی

یہ حادثہ جو مجھ پہ پڑا آ کے یک بیک　　آنکھوں سے میری اس گھڑی آنسو پڑے ٹپک
نیند اُڑ گئی قرار گیا، جل گئی پلک　　جاگا کیا نظیر میں پھر آہ صبح تک
مل مل کے ہاتھ رات کی کاٹی گھڑی گھڑی

(۳۱) ریچھ کا بچہ

کل راہ میں جاتے جو ملا ریچھ کا بچہ　　لے آئے وہیں ہم بھی اُٹھا ریچھ کا بچہ
سو نعمتیں کھا کھا کے پلا ریچھ کا بچہ　　جس وقت بڑھا ریچھ ہوا ریچھ کا بچہ
جب ہم بھی چلے ساتھ چلا ریچھ کا بچہ

تھا ہاتھ میں اک اپنے سوا من کا جو سونٹا — لوہے کی کڑی جس پہ کھڑکتی تھی سراپا
کاندھے پہ چڑھا جھولنا، اور ہاتھ میں پیالا — بازار میں لے آئے دکھانے کو تماشا
آگے تو ہم اور پیچھے وہ تھا ریچھ کا بچّہ

تھا ریچھ کے بچے پہ وہ گہنا جو سراسر — ہاتھوں میں کڑے سونے کے بجتے تھے جھمک کر
کانوں میں دُر اور گھنگرو پڑے پاؤں کے اندر — وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پُر زر
جس ڈور سے یارو تھا بندھا ریچھ کا بچّہ

جھمکے وہ جھمکتے تھے پڑے جن پہ کرن پھول — مقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اوپر جھول
اور ان کے سوا کتنے بٹھائے تھے جو گل پھول — یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پاؤں کی سُدھ بھول
گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچّہ

اک طرف کو تھیں سیکڑوں لڑکوں کی پکاریں — اک طرف کو تھیں پیر و جوانوں کی قطاریں
کچھ ہاتھیوں کی چیخ اور اونٹوں کی ڈکاریں — غل شور مزے بھیڑ ٹھٹھ انبوہ بہاریں
جب ہم نے کیا لا کے کھڑا ریچھ کا بچّہ

کہتا تھا کوئی ہم سے میاں آؤ قلندر — وہ کیا ہوئے اگلے جو تمہارے تھے وہ بندر
ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ پیشہ ہے قلندر — ہاں چھوڑ دیا بابا انھیں جنگل کے اندر
جس دن سے خدا نے یہ دیا ریچھ کا بچّہ

مدت میں اب اس بچّے کو ہم نے ہے سدھایا — لڑنے کے سوا ناچ بھی اس کو ہے سکھایا
یہ کہہ کے جو ڈھپلی کے تئیں گت پہ بجایا — اس ڈھب سے اُسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا
جو سب کی نگاہوں میں کھپا ریچھ کا بچّہ

پھر ناچ کے، وہ راگ بھی گایا تو وہاں واہ — پھر کہروا ناچا تو ہر اک بولی زباں واہ

ہر چار طرف سے سنئے کہیں پیر و جواں واہ — سب ہنس کے یہ کہتے تھے میاں واہ میاں واہ
کیا تم نے دیا خوب نچا ریچھ کا بچہ

اس ریچھ کے بچے میں تھا اس ناچ کا ایجاد — کرتا تھا کوئی قدرت خالق کے تئیں یاد
ہر کوئی یہ کہتا تھا خدا تم کو رکھے شاد — اور کوئی یہ کہتا تھا ارے واہ رے اُستاد
تو بھی جئے اور تیرا سدا ریچھ کا بچہ

جب ہم نے اٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا — خم ٹھونک پہلواں کی طرح سامنے آیا
لپٹا تو یہ کشتی کا ہنر آن دکھایا — جو چھوٹے بڑے جتنے تھے ان سب کو رجھایا
ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچہ

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا — للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اُسے گہ اس نے پچھاڑا — اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا
گو ہم بھی ہارے نہ ہٹا ریچھ کا بچہ

یہ داؤں میں پیچوں میں جو کشتی میں ہوئی دیر — یوں برسے روپے پیسے کہ آندھی میں گویا بیر
سب نقد ہوئے آکے سوا لاکھ روپے ڈھیر — جو کہتا تھا ہر ایک سے اس طرح سے مُنہ پھیر
یارو تو لڑا دیکھو ذرا ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کھڑا کوئی جو کر آہ اہا ہا — اس کے تم ہی استاد ہو واللہ اہا ہا
یہ سحر کیا تم نے تو ناگاہ اہا ہا — کیا کہئے غرض آخرش لے واہ اہا ہا
ایسا تو نہ دیکھا نہ سُنا ریچھ کا بچہ

جس دن سے نظیر اپنے تو دلشاد یہی ہیں — جاتے ہیں جدھر کو اُدھر ارشاد یہی ہیں
سب کہتے ہیں وہ صاحب ایجاد یہی ہیں — کیا دیکھتے ہو تم کھڑے اُستاد یہی ہیں

کل چوک میں تھا جن کا لڑا ریچھ کا بچہ

(۳۲) راکھی

چلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی
سنہری سبز ریشم زرد اور گلنار کی راکھی
بنی ہے گو کہ نادر خوب ہر سردار کی راکھی
سلونوں میں عجب رنگین ہے اس دلدار کی راکھی
نہ پہنچے ایک گل کو یار جس گلزار کی راکھی

عیاں ہے اب تو راکھی بھی چمن بھی گل بھی شبنم بھی
جھمک جاتا ہے موتی اور جھلک جاتا ہے ریشم بھی
تماشہ ہے اہاہا غنیمت ہے یہ عالم بھی
اٹھانا ہاتھ پیارے واہ وا ٹک دیکھ لیں ہم بھی
تمہاری موتیوں کی اور زری کے تار کی راکھی

مچی ہے ہر طرف کیا کیا سلونوں کی بہار اب تو
ہر اک گلرو پھرے ہے راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
ہوس جو دل میں گزرے ہے کہوں کیا آہ میں تم کو
یہی آتا ہے جی میں بن کے باہمن آج تو یارو
میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

ہوئی ہے زیب و زینت اور خوباں کو تو راکھی سے
و لیکن تم سے اے جان اور کچھ راکھی کے گل پھولے
دوانی بلبلیں ہوں دیکھ گل چننے لگے تنکے
تمہارے ہاتھ نے مہندی نے انگشتوں نے ناخن نے
گلستاں کی چمن کی باغ کی گلزار کی راکھی

ادا سے ہاتھ اٹھنے میں گل راکھی جو ہلتے ہیں
کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ چھلتے ہیں
کہاں نازک یہ پہونچے اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں
چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں
جو کچھ خوبی میں ہے اس شوخ گل رخسار کی راکھی

پھریں ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تارے — تو اِن کی راکھیوں کو دیکھ اے جاں چاؤ کے مارے
پہن زنّار اور قشقہ لگا ماتھے اُوپر بارے — نظیرؔ آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تیوہار کی راکھی

(۳۳) سخاوت و عشرت

زر دار ہے تو ہرگز مت مار اپنے من کو — تن زیب بن سکھوں سے ترسا نہ اپنے تن کو
جو زر چلن چلیں ہیں چل تو بھی اُس چلن کو — مرشد کا ہے یہ نکتہ رکھ یاد اس سخن کو
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جا بیٹھ میکدوں میں سب درد غم سے ہٹ کر — جھمکا گلابی مے کی پیالے اُلٹ پلٹ کر
محبوب دلبروں سے خوش ہو لپٹ لپٹ کر — پی دودھ اور بتاشے میوہ مٹھائی چٹ کر
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

کمخواب کیا دوشالہ کیا ریشمی دوسوتی — کر شال کا لنگوٹا مت رکھ قبا اچھوتی
بولے جو شوم بھڑوا مار اس کے سر پہ جوتی — دو دن تو دوستوں میں بلوا لے اپنی طوطی
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

یہ نعمتیں ہیں جتنی جو کچھ ملے سو کھا جا — تاشوں اور باجے میں اک بار جگمگا جا

پاپی بخیل مت بن داتا سخی کہا جا — اک دم تو اپنا ڈنکا من مانتا بجا جا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

یاں کا یہی مزا ہے، کھانا دیا کھلانا — بھوکے کو دال روٹی، ننگے کو کچھ اڑھانا
سب اس گھڑی اُڑا لے جو تجھ کو ہو اڑانا — غافل پھر اس گلی میں تجھ کو نہیں ہے آنا
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جو گل بدن ہیں روٹھے، زر دے انھیں منالے — بوسہ انھوں کا لے کر سینے سے پھر لگا لے
ہنس لے، ہنسا لے ہر دم، دے لے، دلا لے، کھالے — جو بن سکے سو اپنے جی کے مزے اڑا لے
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جو پاس ہے ذخیرہ مت رکھ وہ کونے اندر — مسجد، کنویں بنا دے تالاب، باغ، مندر
دریا کہیں بہا دے بن جا کہیں سمندر — سب کچھ اڑا، لٹا کر، ہو رہ سدا قلندر
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

باغوں کی دیکھ سیریں بھر جام کے چھلکے — اور جہان میلے ٹھیلے کر دھوم اور دھڑکے
آوے جو شوم بھڑوا کاڑھ اس کو دے کے دھکے — تو شوق سے اُڑا لے عیش و مزے بھڑکے
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

صندوق میں جو زر ہے اُس کو بھی لے گنوا دے — مے کے بہا کے نالے طبلوں کو کھڑکھڑا دے
کوٹھے مکاں حویلی سب کھود کر کھلا دے — کڑیاں تلک جلا دے اینٹیں تلک اڑا دے

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جو جو بخیل کنجن زر چھوڑ کر مرے گا — یا کھائے گا جنوائی یا خالصہ سے لگے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ راہ خدا میں دے گا — کھاتا کھلاتا ہنستا تو بھی سدا رہے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

گر آ پڑے گا تجھ پر کچھ حادثہ خلل کا — مالک پھر اور کوئی ٹھہرے گا تیرے ڈل کا
آگے سے دے دلا کے ہو رہ تو اس سے ہل کا — کر سوچ اپنے دل میں کچھ آج کا نہ کل کا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

زر جوڑ جوڑ اپنے تو پاس گر رکھے گا — یا چھین لے گا حاکم یا چور لے مرے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ اب عیش کر چکے گا — جب وقت آ پکارا تب کچھ نہ بن سکے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جس نے یہ زر دیا ہے پھر وہ ہی دھن بھی دے گا — مال و مکاں حویلی باغ و چمن بھی دے گا
جیتا رہے گا جب تک کھانے کو اَن بھی دے گا — مر جاوے گا تو وہ ہی تجھ کو کفن بھی دے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو

گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

جتنے گڑے دبے ہیں سب کھالے اور کھلالے ۔ رکھ دُھن اسی کی دل میں اب کھالے اور کھلالے
اپنا سمجھ اسی کو جب کھالے اور کھلالے ۔ اب تو نظیرؔ تو بھی سب کھالے اور کھلالے
دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

(۴۴) چاندنی رات

صحن چمن میں واہ وا زور بچھی تھی چاندنی ۔ چاند ہلوریں لیتا تھا اور کھلی تھی چاندنی
آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلہ زری ۔ پھیلے تھی تار تاریں مہر کی جھلک ذری ذری
بوس و کنار جام و مے عیش و طرب ہنسی خوشی ۔ اس میں کہیں سے یک بیک مرغ سحر نے بانگ دی
صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اُٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

کیا ہی مزوں سے عیش کی رات تھیں کامیابیاں ۔ چھوٹے تھیں ماہتاب کی نہروں میں ماہتابیاں
آگے چنی تھیں صف بہ صف مے کی کئی گلابیاں ۔ ہم کو نشے کی مستیاں یار کو نیم خوابیاں
سینوں میں اضطرابیاں آنکھوں میں بے حجابیاں ۔ اس میں فلک نے رشک سے ڈالیں یہ کچھ خرابیاں
صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اُٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

شب کو دلوں میں واہ وا زور مزوں کے تار تھے ۔ ہم سے دوچار یار تھا یار سے ہم دوچار تھے

دونوں دلوں میں پیار تھا دونوں گلے میں ہار تھے　　وصل کے بیقرار تھے عیش کے کاروبار تھے
سینے میں آسمان کے تیر حسد کے پار تھے　　ایک پلک میں ناگہاں سب وہ مزے شرار تھے

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

چاندنی واہ چاندنی کرتی تھی کیا جھلک جھلک　　چہک رہی تھیں بلبلیں باغ رہا تھا سب مہک
جام کے لب سے ہر گھڑی نکلے تھی مے چھلک چھلک　　یار بغل میں غنچہ لب بوسوں کی سو لپک جھپک
عیش و طرب کی لذتیں ہونے لگیں جو یک بیک　　ایسے مزے میں عیش میں آہ کہیں سے یک نہ دھک

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

ایک طرف تو نور میں ماہ رہا تھا جگمگا　　ایک طرف وہ رشک مہ میری بغل میں تھا پڑا
دونوں دلوں میں لذتیں دونوں جیوں میں عیش تھا　　مے کی گلابی ہاتھ میں آنکھوں میں چھا رہا نشا
ہونٹوں سے ہونٹ لگ رہے سینے سے سینہ مل رہا　　اتنے میں آہ یک بیک کیا ہی غضب یہ ہو گیا

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

واہ ہوئیں تھیں رات کی چاندنی کی اجلیاں　　جھوم رہی تھیں باغ میں سنبل و گل کی ڈالیاں
شوخ بغل میں ناز سے کھولے تھا زلفیں کالیاں　　خوش ہو گلے لپٹ لپٹ دیتا تھا میٹھی گالیاں
ہم بھی نشے میں مست تھے ساقی کی پی کے پیالیاں　　جل کے فلک نے اس میں ہائے آفتیں لا دکھائیاں

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

کیا ہی چمن میں شب کو واہ برسے تھی نور کی جھڑی　　　تار نشوں کے تھے بندھے، لوٹے تھی چاندنی پڑی
غنچہ دہن تھا بے خبر پی تھی جو مے کڑی کڑی　　　دیتا تھا بوسے پیار کے سینہ سے مل گھڑی گھڑی
چشم سے چشم لب سے لب چھاتی سے چھاتی جب لڑی　　　کیا ہی گھڑی تھی عیش کی اس میں بلا یہ آپڑی

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

باغ تھا یا کہ خلد وہ یا کہ بہشت یا ارم　　　یار تھا یا کہ حور تھا یا کہ پری وہ یا صنم
چاندنی تھی وہ چاندنی چاندی کا رنگ جس سے کم　　　پیتے تھے مے گھڑی گھڑی لیتے تھے بوسے دمبدم
دونوں نشوں میں مست ہو گئے پلنگ پہ جب کہ ہم　　　عین مزہ تھا وصل کا اس میں نظیرؔ بے ستم

صبح ہوئی گجر بجا پھول کھلے ہوا چلی
یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی کی جی میں رہ گئی

(۳۵) هولی

آ جھمکے عیش و طرب کیا کیا جب حسن دکھایا ہولی نے　　　ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خرسند کیا ہر دل کو لبھایا ہولی نے　　　دف رنگین نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے

بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

یا سوانگ کہوں یا رنگ کہوں یا حسن بتاؤں ہولی کا　　　سب ابرن تن پر جھمک رہا اور کیسر کا ماتھے ٹیکا
ہنس دینا ہر دم ناز بھرا دکھلانا سج دھج شوخی کا　　　ہر گالی مصری قند بھری ہر ایک قدم اٹھکیلی کا

دل شاد کیا اور موہ لیا یہ جوبن پایا ہولی نے

کچھ طبلے کھڑکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی ۔۔۔ کچھ جھڑپیں بین ربابوں کی، کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھمی اور منہ چنگ بجی ۔۔۔ کچھ گھنگرو کھٹکے جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

ہر جاگہ تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے ۔۔۔ اور ڈھیر عبیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے ۔۔۔ منہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

پوشاکیں چھڑکیں رنگوں کی اور ہر دم رنگ فشانی ہے ۔۔۔ ہر وقت خوشی کی جھمکیں ہیں پچکاری کی زرافشانی ہے
کہیں ہوتی ہے دھینگا مشتی کہیں ٹھیری کھینچا تانی ہے ۔۔۔ کہیں لٹیاں جھمکیں رنگ بھری کہیں جوتا کیچڑ پانی ہے
ہر چار طرف خوش حالی کا یہ جوش بڑھایا ہولی نے

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں ۔۔۔ رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ راگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں ۔۔۔ کچھ کودیں ہیں کچھ اچھلیں ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

محبوب پری رو یاروں کی ہر جانب نو کا جھونکی ہے ۔۔۔ کچھ آن رنگیلی چلتی ہے کچھ بان ادھر سے روکی ہے
کچھ سینیں ترچھی سحر بھری کچھ گھات لگاوٹ خو کی ہے ۔۔۔ کچھ شور اہاہا کا کچھ دھوم اہو ہو ہو کی ہے
یہ عیش یہ حظ یہ کام یہ ڈھب ہر آن جتایا ہولی نے

معجونوں سے رنگ لال ہوئے کہیں چلتی مے کی پیالی ہے ۔۔۔ کہیں ساز طرب کے بجتے ہیں دل شاداں منہ پر لالی ہے
سو کثرت عیش مسرت کی خوش وقتی اور خوش حالی ہے ۔۔۔ کچھ بولی ٹھولی پیار بھری کچھ گالی ہے کچھ تالی ہے
ان چرچوں کا ان چہلوں کا یہ تار لگایا ہولی نے

ہیں کیا کیا سر میں رنگ بھرے اور سوانگ بھی کیا کیا آتے ہیں ۔۔۔ کر باتیں ہر دم چہل بھری خوش ہنستے اور ہنساتے ہیں

کچھ جوگی چیلے بیٹھے ہیں کچھ کامنیوں کی گاتے ہیں　　کچھ اور طرح کے سوانگ بنیں کچھ ناچتے ہیں کچھ گاتے ہیں
ہر آن نظیرؔ اس فرحت کا سامان دکھایا ہولی نے

(۳۶) جوگی نامہ

صفحۂ رُخ پہ ترے خوبیٔ خط کی ہے پھبن　　ہے سویدا ترے عاشق کا ترا خالِ ذقن
رشکِ گل دست حنائی کو کیے دیکھ چمن　　ہو رقم کس قلم شوق سے اے غنچہ دہن
اشتیاقے کہ بہ دیدار تو دارد دلِ من

اب جو مل جائے کہیں وہ تو یہ ہم اس سے کہیں　　کب تلک درد جدائی کو بھلا تیرے سہیں
اتنا بھی بس نہیں اسے یار کہ ہم مر ہی رہیں　　دور جس دن سے ہوا تجھ چمنِ حسن سے میں
نہ مجھے باغ خوش آتا ہے نہ گلشن نہ چمن

بید مجنوں ہیں کہ ہیں تاک پریشاں خاطر　　یا ہیں خاکستر خاشاک پریشاں خاطر
ہم غرض ایسے ہیں غم ناک پریشاں خاطر　　چشم نم ناک جگر چاک پریشاں خاطر
چاک بر چاک گریباں سے لگا تا دامن

جور اور ظلم سے اس کے نہ کبھی گھبرانا　　نہ کبھی شکوۂ بیداد زباں پر لانا
کام ہرگز نہ کسی سے نہیں آنا جانا　　کوئی کچھ پوچھے تو منہ دیکھ کے چپ رہ جانا
نہ تکلم نہ اشارت نہ حکایت نہ سخن

یاد اس شوخ کی کیا کیا ہی ستم لاتی ہے　　جان بے چینی سے تن میں مرے گھبراتی ہے
آہ کرتا ہوں تو بجلی سی نکل آتی ہے　　جب میں روتا ہوں تو آنکھوں سے برس جاتی ہے

کبھی ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی بھرن

دشت اور کوہ میں وحشی سا پڑا پھرتا ہوں　　برق کی طرح سے بے تاب سدا پھرتا ہوں
میں غرض تجھ سے صنم جب سے جدا پھرتا ہوں　　رات دن ہجر میں جوگی سا بنا پھرتا ہوں
بے قراری سے ترے نام کی جپتا سُمرن

جور اور ظلم مرے دل نے ہزاروں ہی سہے　　شکوۂ جور بھلا تیرا کہاں تک نہ کرے
اب تو یہ حال ہوا ہجر میں اے یار مرے　　دوش پر بار الم کانوں میں غم کے مُندرے
اشکوں کے تار گلے میں پڑے سیلی کے کمن

عشق میں جوگی ہوئے جب سے ہمیں بھائی بھبوت　　بیٹھے در پر ترے اور گرد ہے پھیلائی بھبوت
دیکھ ٹک آن کے کس روپ میں رنگ لائی بھبوت　　پیرہن گیروا اور تن کے اُپر چھائی بھبوت
سر سے لے پاؤں تلک خاک ملی سو سو من

گہ در کعبہ پہ پیشانی کو اپنی گھسنا　　گاہ مسجد میں میاں مانگنا جا جا کے دعا
انکساری سے کبھی دیر میں ہر دم جانا　　دم بہ دم آہ کی پونگی سے بجانا یہ صدا
دیکھیے کون سے دن ہم ہمیں دیں گے درشن

دیکھا میرے تئیں جو تن کے اُپر گل کھائے　　اور کپڑے بھی رنگے گیروے تن پر پائے
دیکھ یہ حال تعجب سے بشر گھبرائے　　کوئی کہتا ہے کہ جوگی جی کدھر کو آئے
سچ کہو کون سی نگری میں تمھارا ہے وطن

یاد کرتے ہو اُسے نام اُسی کا لے لے　　اور زیبا ہیں بہت آپ کے تن پر سیلے
واہ جوگی بھی بنے خوب ہو تم البیلے　　کون سے پنتھ میں ہو کون گرو کے چیلے
کون سے روپ میں ہو کون سا رکھتے ہو برن

ہم کو جوگی جی بتا دیجئے یہ حال اپنا　　　تم جو بیراگی بنے اس میں نفع کیا ہے بھلا
اور مرشد سے تمھارے ہے تمھیں کیا پہنچا　　　نام کیا جوگ میں ہے تم کو گرو نے بخشا
دھیان کیا رکھتے ہو کس گیان کا رکھتے ہو چلن

دُر شہوار جلا کر جو بنائی ہے بھبوت　　　اور کیوں تم کو بتاؤ یہ خوش آئی ہے بھبوت
عشق میں کس کے یہ اب تن پہ رمائی ہے بھبوت　　　کس لئے منہ کے اوپر تم نے لگائی ہے بھبوت
کس کی الفت میں یہ بیراگ کا پہنا ابرن

کس لئے جوگ لیا اور رنگا کپڑوں کو　　　کس پہ عاشق ہو دیا رنج یہ کس نے تم کو
کیونکر اوقات بسر ہوتی ہے یہ ہم سے کہو　　　کیا الم کھاتے ہو اور کس کی طلب رکھتے ہو
دھونی جل پان بھی یا یونہی کرو گے لنگھن

نام پیغمبروں کے کفنی پہ لکھے سارے　　　اور گریبان میں ہیں نام خدا کے لکھے
تم تو کامل سے نظر آتے ہو اپنے لیکھے　　　ہم نے جوگی تو بہت یوں ہیں ہزاروں دیکھے
پر تمھارا تو زمانہ سے نرالا ہے چلن

ہم نے دنیا میں اجی سیکڑوں دیکھے جوگی　　　دیکھے ہر رنگ کے ہر ایک برن کے جوگی
پر غرض تم سے نہیں دیکھے ہیں ہم نے جوگی　　　تم تو آتے ہو نظر ہم کو نئے سے جوگی
سچ کہو جوگ لیا تم نے یہ کس کے کارن

کیا ہوا جوگی جی تم کو بھلا ہم سے تو کہو　　　کیوں خجل خوار پڑے پھرتے ہو منہ سے بولو
کس لئے وحشی سے پھرتے ہو بتاؤ ہم کو　　　کس کی ہے یاد تمھیں کس کے لئے پھرتے ہو
اب کہیں بیٹھوگے یا یوں ہی پھروگے بن بن

کس لئے گھر سے تم آئے ہو بھلا اپنے نکل　　　پھرتے مانند صبا کیوں ہو بدشت و جنگل

تم سے اک بات کہوں اس پہ اگر کیجے عمل   گر کرو حکم تو بنوا دیں تمھارا استھل
شہر میں باغ میں یا برلبِ دریائے جمن

یا کہیں اور بتاؤ کہ جہاں آپ رہیں   یا تو جنگل میں اگر دل لگے یہ آپ کہیں
یا کہ استھل کے بنا دینے کی تجویز کریں   یا کہ متھرا جو پسند آوے تو واں جا گہ لیں
یا کہ در بن میں ہو یا مات مہابندرابن

اور اگر یوں ہی پھروگے تو یہ ہے مشکل سخت   استھل اک ہم جو بنادیں تو زہے اپنے بخت
اس میں اچھا سا بچھا دیویں تمھارے لئے تخت   خاصے پھولوں کے لگا دیویں اس استھل میں درخت
جس سے آنکھوں کو طراوت رہے اور دل ہو مگن

اب تو جوگی جی کہا مان لو یہ تم میرا   ایک جا بیٹھ رہو اور کرو ہم یہ دیا
مت پھرو یوں خجل و خوار بدشت و صحرا   جب تو سن سن کے یہ ہم نے کہا اس سے بابا
تجھ کو کیا کام فقیروں سے، یہ کرنا ان بن

کیا غرض تجھ کو جو پوچھے ہے تو احوال مرا   جوگ کی پوچھے تو بس عشق میں یہ جوگ لیا
اور اس کی ہی جدائی میں پھرے ہیں ہر جا   اور وطن پوچھے ہمارا تو یہ سن رکھ بابا
یا گلی دوست کی، یا یار کے گھر کا آنگن

مثل صرصر اسی کوچے میں پھرا کرتے ہیں   دیکھ دروازے کو بس شاد ہوا کرتے ہیں
خونِ دل جائے مئے ناب پیا کرتے ہیں   اس کے کوچے میں سدا مست رہا کرتے ہیں
وہی بستی، وہی نگری، وہی جنگل، وہی بن

گاتے پھرتے ہیں سدا بین لئے کاندھے پہ گیت   جو اتیتوں کی ہے مدت سے وہی اپنی ریت
محو ہیں تم کے ہیں جب سے کہ لگی اس کی پیت   پنتھ کی پوچھے تو جوگی، نہ جنم کے، نہ اتیت

عشق کے میل میں ہم پریم کا رکھتے ہیں برن

آبلے دل میں جو الفت کے تھے سو پھوٹ گئے — جتنا تھا مال مراتب اُسے لے لُوٹ گئے
اقربا دوست تھے جتنے وہ سبھی چھوٹ گئے — جب سے اُس شوخ کے پھندے میں پھنسے ٹوٹ گئے
جتنے تھے مذہب و ملت کے جہاں میں بندھن

عشق میں چھوڑ کے ہم دنیا و دیں بیٹھے ہیں — خاطر آشفتہ و دلگیر و حزیں بیٹھے ہیں
چھوڑ سب عیش جہاں گوشہ گزیں بیٹھے ہیں — اس کے ہم در پہ منڈا سر کے تئیں بیٹھے ہیں
رات دن پیتے ہیں دھو دھو کے اسی گُر کے چرن

خنجر عشق سے بس اپنا کلیجا ہے شق — یہ تو ظاہر ہے نشاں، منہ کا بھی جو رنگ ہے فق
خون میں آلودہ ہیں زخمی ہیں کہ جوں رنگِ شفق — نام کو پوچھے تو ہے نام ہمارا عاشق
سب سے آزاد ہوئے یار کا لے کر دامن

حال بے باکی کا کیا اپنی بھلا تجھ سے کہیں — گر رہیں بھوکے تو ہرگز بھی کبھی غم نہ کریں
اور کھانے کو ملے تو بھی نہ کچھ شاد رہیں — گر رہیں جیتے تو جینے کی نہیں فکر ہمیں
اور مر جائیں تو ہرگز نہیں پروائے کفن

دیکھ نیرنگی زمانے کی ہوئے گل در گل — اور مل تن کو بھبوت اپنے گئے خاک میں مل
کپڑے رنگنے کو تو آسان نہ جان او غافل — رنگ وہ رنگتے ہیں جس رنگ کا رنگنا مشکل
روپ وہ بھرتے ہیں جس روپ کا بھرنا ہے کٹھن

چھوڑا جنت کو جو آدم نے اُسی کی خاطر — اور ہر ایک کے کی، دم نے، اسی کی خاطر
جی میں کی اپنے خوشی، غم نے، اسی کی خاطر — جوگ بیراگ لیا ہم نے اسی کی خاطر
سب کے تئیں چھوڑ، اسی کی ہے محبت کی لگن

رنگے کپڑوں سے نہ کر ہم پہ تو جوگی کا گمان ہم نے کیا جانے کیا کس لئے ایسا سامان
گر تو عاقل ہے تو پھر دل ہی میں اپنے پہچان ہم میں اور جوگی کی صورت میں بڑا فرق ہے جان
کہاں جوگی کی ادا اور کہاں عاشق کی پھبن

آتشِ غم سے جلا جب سے جلایا دل و جان تب یہ اکسیر ملی ہم کو، تو شک اس میں نہ جان
تو تو عاقل ہے بس اب عقل سے اپنی پہچان خاک ہے یار کے کوچے کی بھبوت اب ہر آن
ہم نے بھی راکھ بنائی ہے جلا کر تن من

سرخ آنکھوں کا جو پوچھے ہے کہ باعث ہے کیا شوق مے کا نہیں کچھ ذوق نہیں افیوں کا
نہ کچھ بنگ سے نے عشق کبھی ہم کو ہوا ہے محبت کے دھتورے کا جو آنکھوں میں نشا
اس کی گرمی ہی سے رہتے ہیں سدا سرخ نین

کوئی مونس ہے، نہ غم خوار نہ ہے سنگ نہ سات رہتا ہوں رنج میں مشغول سدا دن اور رات
اب خدا جانے کہ کس طرح کٹے گی اوقات اور استھل کے بنانے کی کہی تو نے جو بات
یہ بکھیڑا وہ کرے جس کے سکنے ہو کچھ دھن

عشق جب سے کہ ہوا ہے ہمیں اس اچپل سے جب سے بے تاب پھرا کرتے ہیں اور بے کل سے
ہم سے بے کل بھی کہیں بیٹھے ہیں اک جا کل سے ہم فقیروں کو بھلا کام ہے کیا استھل سے
وہی استھل ہے جہاں یار سنگ بیٹھے آسن

خواہش زر نہ کریں اور نہ کسی سے مانگیں تخت اور چتر کی بھی کچھ نہیں پروا ہے ہمیں
گوکل اور متھرا کے رہنے کی نہیں حرص کریں جا پڑیں یاد میں اُس شوخ کی جس بستی میں
وہی گوکل ہے ہمیں اور وہی ہے بندرابن

جب سے جوگی ہوئے دی اُس کو متاعِ دل و جان چھوڑ بیٹھے سبھی آرام کا جو تھا سامان

حاجت تکیہ ہے نے خواہش بستر نہ مکان — جا پڑے خاک پہ رکھ سر کے تلے ہاتھ جہاں
ہے وہی فرش وہی تخت وہی سنگھاسن

ہے خیال اس گل رخسار کا ہر شام و پگاہ — باغ یا غنچہ کی ہرگز ہے نہیں ہم کو چاہ
چاہ ہے چاہ ذقن کی نہیں درکار ہے جاہ — پھول پھلواری کی بھی جب سے نہیں کچھ پرواہ
جب سے گل کھا کے محبت میں جلایا ہے بدن

رہتا ہوں مضطر و مغموم میں ہر دم ہر آن — ہوش گم کردہ پھرا کرتا ہوں اور بے سامان
باز آ ظلم سے اور جور سے تو حق کو مان — اب تو اس حال کو پہنچا ہوں ترے ہجر میں جان
اے گل باغ وفا دل کے چمن کے گلشن

کہیں کہتا ہے جو احوال مرا کوئی ذرا — سر کو دھنتا ہے ہر اک پیر و جوان اور لڑکا
گھر میں رہتا ہوں تو روتا ہے ہر اک خویش اپنا — گھر سے باہر جو نکلتا ہوں تو منہ دیکھ مرا
مرے احوال پہ بھی روتے ہیں جنگل میں ہرن

خاطر آشفتہ میں پھرتا ہوں حزین و دلگیر — عشق میں اُس کے سبھی کھو چکا عزّ و توقیر
پھرتا ہوں گلیوں میں دیوانہ سا ہر روز ضریر — کیا کہوں اب تو گزرتی ہے جو کچھ مجھ پہ نظیر
دل من داند و من دانم و داند دل من

(۳۷) جُوگن نامہ

ہائے اُس الفت ظالم کا بُرا ہے یہ چلن — چھوٹتی ہی نہیں لگ جاتی ہے جس جی کو لگن
چار و ناچار اُٹھانے ہی پڑے رنج و محن — در فراق رُخ پُر نور تو اے غنچہ دہن

دیدہ باید کہ چگونہ شود احوالِ من

ہجر نے اب تو نہایت کیا بے دم مجھ کو　　پھرتی ہوں شکل بگولے کے میں ویراں ہر سو
اے مرے ماہ جبیں اے مرے ہمدم گل رو　　کون سے شہر میں ہے، کون سی جا پر ہے تو

اے مرے ہمدم جاں اے مرے جان و تن من

دلِ صد چاک مرا چاک گریباں میرا　　مثل دریا کے رواں دیدۂ گریاں میرا
برق کی طرح تپاں یہ دل سوزاں میرا　　دیکھ ٹک آن کے یہ حال پریشاں میرا

کہ ترے ہجر میں کیا کیا نہ سہا رنج و محن

میری جیسی ہے کرے حق نہ کسی کی اوقات　　جو سنی بھی نہ تھی گا ہے وہ وہ دیکھی آفات
ہائے افسوس صد افسوس ہے حسرت ہیہات　　زار زار اب تو پڑا ہجر میں رونا دن رات

زندگی ہو گئی دوبھر مجھے اور جان کٹھن

خانماں و طرب و عیش و زر و مال و خوشی　　اک تجھے یاد رکھا سب کے تئیں بھول گئی
ہائے جس وقت لگی آنکھ وہ کیسی تھی گھڑی　　شہر بھی چھوڑ دیا دیس سے پردیس ہوئی

ہجر نے کر دیا آخر ترے مجھ کو جوگن

سرخ آنکھیں ہوئیں الفت کے نشے سے رنگین　　پہن کر حلقہ بگوشی کے بھی مندرے دو تین
تو نہ گردستِ دعا کا پڑی پھرتی ہوں حزین　　پیرہن گیروا رکھے ہوئے کاندھے پہ بین

تن کے منکوں کی بنا، ہات میں پہنی سُمرن

کھوئے پھرتی ہوں سب آرام کو ہر جائی میں　　ڈھونڈھتی ہوں تجھے گل فام کو ہر جائی میں
گاتی پھرتی ہوں اسی کام کو ہر جائی میں　　جپتی پھرتی ہوں ترے نام کو ہر جائی میں

آٹھ آٹھ آنسوؤں سے روتی ہوں اور ترپھی نین

ناتواں ہوگئی اور جسم میں باقی نہیں دم　　رکھو ٹک آ کے کبھی اس دل مضطر پہ قدم
ہوگئیں خشک رگیں سیلیوں سے میں نہیں کم　　گیروا ساری ہے اور جائے بھبوت اے ہمدم
خاک اُڑا اُڑ کے پڑی تن کے اوپر سو سو من

یہی دل ہے کہ ہوا تھا نہ کبھی بھی غمناک　　وہی دل ہے کہ ہوا تیغ جفا سے صد چاک
آگ لگ جائیو اس بیت میں جلیو یہ تپاک　　سیس کے بال تھے سنبل سے جمی جس میں خاک
خاک میں مل گیا تھا یہ جو چندر ماں سا بدن

پھوڑ کر پتھروں سے کر دئے سر کے ٹکڑے　　ہائے تو ہے کہاں اے میرے قمر کے ٹکڑے
آ ادھر دیکھ مری ٹوٹی کمر کے ٹکڑے　　جیب کے بدلے میں کرتی ہوں جگر کے ٹکڑے
نہ تو بستی ہی خوش آتی ہے، نہ کہسار، نہ بن

میں نے کیا کیا نہ سہا آہ تری الفت میں　　ایک دیوانی پڑی پھرتی ہوں میں دقت میں
ناگہاں آ گئی اک مفت کی میں آفت میں　　سیس کے بال کھسوٹوں ہوں کھڑی فرقت میں
خاک اُڑائے پڑی پھرتی ہوں بہ صد رنج و محن

ساری بپت میری گئی اے مرے ساجن تجھ پر　　مال و زر وار دیا اور تن و من تجھ پر
ایک حیران پڑی پھرتی ہوں بروگن تجھ پر　　چھوڑ کر ماتا پتا کو، ہوئی جوگن تجھ پر
لیک تو ہی نہ ملا اے مرے جوگی ساجن

اپنے بیگانوں نے کر ڈالا ہے مجھ کو پامال　　اور ادھر تیری جدائی میں ہوئی جان وبال
خاک کا بھی نہیں وہ حال جو ہے میرا حال　　اقربا کی بھی نظر سے گری اشکوں کی مثال
باپ اور ماں کا ترے واسطے چھوڑا دامن

نہ تو کچھ دیں کی خبر اور نہ دنیا سے ہے کام　　سارے کاموں کے تئیں بھول گئی اے گلفام

دل گیا جان گئی اور گیا عیش و آرام　　گھر گیا، دیس گیا، ہو گئی جگ میں بدنام
اِک سہیلی ہے مری آہ بس اور سب دشمن

یاد میں بیٹھ گئی جس جگہ میں آسن مار　　دل کی کھونٹی کو مروڑا تری جانب کو سُدھار
نالۂ موزوں کے بس کر کے سروں کو طیار　　جگر و تن کی بنا تونبی بس اور آہ کے تار
بین کو غم میں بجاتی پھری بَن بَن بَن بَن

کون سی بات تھی جو واسطے تیرے نہ کری　　چلّے بھی باندھے بہت، پوجا بھی درگاہ میں کی
دیس پردیس پھری چرنوں میں لوگوں کے پڑی　　پوچھا ایک ایک سے تجھ کو میں بہ صد حیرانی
لیک تیرے ہی کسی طرح نہ پائے درشن

جا کے متھرا میں رہی اور بڑا پوجا تجھ کو　　کاشی میں بیٹھ رہی لیک نہ پایا تجھ کو
گنگا اور جمنا کے تیرتھ پہ بھی مانگا تجھ کو　　کون سی جا تھی کہ جس جا پہ نہ ڈھونڈا تجھ کو
پورب اور پچھم و اُتر سے لگا تا بہ دکن

اب تو ناچار ہوئی اور بڑی بے چین ہوئی　　ہجر کے درد و الم میں جلا جاتا ہے جی
تا کہ اب ڈھونڈھنے سے کوئی بھی جا گہ نہ رہی　　اب فقط ملک عدم مجھ کو رہا ہے باقی
سو بھی، کچھ دور نہیں اور نہیں راہ کٹھن

ہو گئی جان کی بیوا تری الفت بیری　　مرگ کے کرتی ہے سامان محبت یہ سبھی
کوئی دن میں تو یہ سُن لیجو نکل جاوے گا جی　　رحم کر مجھ پہ کہاں تک سہوں فرقت تیری
دیکھ اِس جان پہ کیا کیا سہا تیرے کارن

روح ہونٹوں تلک آ جاتی ہے گھبراتی ہے　　لیک امید ملاقات میں پھر آتی ہے
غم پہ پھٹتی مرے ہر ایک کی اب چھاتی ہے　　آہ کے ساتھ مری جان جلی جاتی ہے

اب اُٹھا سکتا نہیں بارِ مصیبت یہ بدن
یاد کر کر کے تجھے دیدہ تو رُو دیتا ہے　　جو مجھے دیکھتا ہے روتا ہُوا رو دیتا ہے
دیکھ ہر ایک مری سمت کو رو دیتا ہے　　جو مرے حال کو دیکھے ہے سو رو دیتا ہے
ہوش لوگوں کے اُڑے جاتے ہیں سن میرا سخن
سر کو کہسار سے ٹکراتی ہے بادِ صرصر　　جانور دیکھیں ہیں حیرانی سے بادیدۂ تر
در و دیوار مرے حال تبر پہ ششدر　　سر کو دھنتا ہے مرے حال پہ ہر ایک شجر
میری بے چینی سے بے چین ہیں شیر اور ہرن
جب کہ تجھ بن یہ ہوا میرے اُپر رنج و تعب　　ہر کوئی کہنے لگا ہائے غضب ہائے غضب
اُڑتے اڑتے مری خبروں کا فسانہ ہوا جب　　اِک دل آباد ہے بستی وہیں جاتے ہیں سب
اس میں اِک راجا مہاراجہ کا ہے سنگھاسن
نامی و نامور اور خلق میں عزت والا　　جس کے تابع ہیں ہر اک شاہ سے لے تا بہ گدا
ہے حقیقت میں جہاں مرضی پہ اُس کی سارا　　عقل کل نام کہا کرتے ہیں اس کا راجا
دیکھ کر مجھ کو وہ کرنے لگا اس طرح سخن
واہ وا بھاگ مرے میں نے جو دیکھا تم کو　　تم سے الفت ہے ہمیشہ سے ہمارے دل کو
میں تو یہ چاہتا ہی تھا کہ کہیں مجھ سے ملو　　آؤ جی بیٹھو مرے گھر میں قدم رنجہ کرو
کرو روشن مرے کاشانے کو ٹک رکھ کے چرن
ہم تمھیں جانتے ہیں اور بزرگوں کو سب　　سب بزرگ آپ کے رکھتے ہیں ہماری ہی طلب
ہم کو بھی لوگوں سے ہے ربط محبت کے سبب　　ہم کو معلوم ہوا آپ کا سب حسب و نسب
عشق نے تم کو بنایا ہے بہ شکل جوگن

ہے عزیز آپ کی خاطر بڑی ہم کو دل میں　　اس سے سمجھاتے ہیں اب مت رکھو غم کو دل میں
کیوں اُٹھا رکھا ہے اس جور و ستم کو دل میں　　جانے دو راہ نہ دو رنج و الم کو دل میں
باغ کی سیر کرو اور رہو محو گلشن

محفل عیش بنا کر رہو آنکھوں کے حضور　　باغ دنیا کی کرو سیر جو ہو دل کو سرور
کیسے کیسے ہیں گل اندامون کا دیکھو تو ظہور　　یاد کو اُس رُخ تاباں کی کرو دل سے دور
کون سی بات کی کمتی ہے تمھیں صاحبِ من

تم بھی سردار ہو، ذی ہوش ہو ٹک غور کرو　　ایک ہی شخص پہ مر جاتے نہیں جان کو کھو
سیکڑوں ماہ جبیناں ہیں ہزاروں خوش خو　　تن سے بس گیروی کفنی کے تئیں دور کرو
پہنو پوشاک شہانہ رکھو خوش دل اور من

شانہ لو ہاتھ میں اور اپنے یہ سلجھاؤ بال　　سرمہ دو آنکھوں میں اور دیکھو یہ قدرت کا خیال
دل کو بہلا کے بھلا دو یہ سبھی رنج و ملال　　تم پہ اس طرح کا ہے نام خدا حسن و جمال
کہ ہیں خلق کے دلبر سبھی دھو دھو کے چرن

دل کو مسرور رکھو اور رہو شاد اور خوش　　شیریں باتیں کرو اور شکل بناؤ دل کش
کہ ہر ایک شخص کو آجائے تمھیں دیکھ کے غش　　نہ کہ تم اور رہو یہ اس طرح پھرو وحشی وش
جانے دو دور کرو دل سے یہ الفت کی لگن

آدمی رنج سہا کرتا ہے اِن باتوں میں　　جان کو کھوتا پھرا کرتا ہے اِن باتوں میں
سب کی نظروں سے گرا کرتا ہے اِن باتوں میں　　نام بدنام ہوا کرتا ہے اِن باتوں میں
خوب ہم دیکھ چکے ہیں کہ برا ہے یہ فن

خوب سُن سن کے میں حیراں رہی مُنہ کو تک　　اور مایوسی و مظلومی سے دیکھا بہ فلک

گفت گو حد سے زیادہ ہوئی بس اور یک بیک تب تو وہ حال ہوا جیسے جراحت پہ نمک

دغا کے تیروں سے پہلو ہوا چھلنی چھن چھن

سب کو روشن ہے بُری ہوتی ہے یہ پیت لگی میں بھی کہنے ہی سے آخر کے تئیں رہ نہ سکی

دل میں غصہ تو بہت آیا و لے رک گئی زار زار آنکھوں سے رونے لگی اور کہنے لگی

ہے بعید ایسے خردمندوں سے یعنی یہ سخن

آپ تو جانتے ہیں پیت بلا ہوتی ہے خوب معلوم ہے تم کو کہ یہ کیا ہوتی ہے

رہے خاموش طبیعت یہ خفا ہوتی ہے واہ جی، یوں بھی لگی دل سے جدا ہوتی ہے

عشق میں کس کے تئیں بھاتی ہے سیرِ گلشن

عیش کیسا بھاتا ہے جب تک کہ نہ ہو یار حضور گل رخسار بجز باغ سے کب ہووے سرور

اس سوا کون ہے بہتر کہ وہ میں دیکھوں ظہور اپنے کیا بس میں ہے جو دل سے کروں رنج کو دور

اپنے قابو میں ہے جو دور کروں رنج و محن

ہاں، خاص اس لئے ہیں مجھ کو یہ منظورِ نظر کہ تمہارے کبھی راہ اس کی جو وہ آئے ادھر

یہ تمنا ہے یہ آنکھیں گریں اُن قدموں پر بات کے کرنے سے، ہے آہ کا کرنا بہتر

جلیو یہ تن جو خوش آئے اسے خوش پیراہن

میرا وہ رشکِ قمر کون ملا دے مجھ سے میرا وہ تیرِ نظر کون ملا دے مجھ سے

میرا متوالا مگر کون ملا دے مجھ سے یا خدا، میرا جگر کون ملا دے مجھ سے

کون جا کر کہے میں پھرتی ہوں بے شہر و وطن

خوش ہوں اس غم سے کہ یہ یار کے باعث سے ہوا ننگ و ناموس بھی سب اُس پہ سے ہے وار دیا

سر ہتھیلی پہ دھرا عشق میں جب پاؤں رکھا جان کا بھی نہیں جب پاس تو پھر پاس ہے کیا

جو کہ سمجھائے مجھے اس کا ہے دیوانہ پن

نام پر تیرے میں اس جان کے تئیں کھوتی ہوں — تیری صورت پہ میں قربان کھڑی ہوتی ہوں
خون دل روتی ہوں عارض کے تئیں دھوتی ہوں — تھام تھام اپنے کلیجے کے تئیں سوتی ہوں

دیکھ رہتی ہوں ہر اک شخص کو حیران بن بن

جو نہ سہنا تھا سہا رنج بہت کھایا ہائے — لیک ارمان رہا دل کو بہت سارا ہائے
یعنی تو نے ہی نہ دیکھا یہ مرا جلنا ہائے — اب تو بےتابی سے گھبرا گیا دل میرا ہائے

ڈوب کر مر ہی رہوں بر لب گنگ اور جمن

کس کو دکھلاؤں جو گزرے ہے تری الفت میں — کچھ مرے بس کی نہیں پھنس گئی اک دقت میں
نام بدنام ہوا فرق پڑا عزت میں — ایک دیوانی سی پھرتی ہوں تری فرقت میں

عرش سے فرش تلک حال ہے میرا اردشن

کس سے جا کے کہوں کون سی جا ہے تیری — کبھی بےتابی سے بیٹھوں کبھی ہوتی ہوں کھڑی
کبھی ہو محوِ تصور یہی کہتی ہوں، اجی — سیس کے بالوں سے میں راہ بُہاروں تیری

جو قدم رنجہ کرو اور مجھے دو درشن

کبھی رو دیتی ہوں آنکھوں سے بہ شکل دریا — کبھی گاتی ہوں ترے نام کو لے لے کے پیا
کبھی منہ پیٹ لیا جیب کبھی چاک کیا — آرزو ہے کہ میں سو جاں سے ہوں تجھ پہ فدا

دیکھے ٹک آن کے تو بھی تو مرا جوگن پن

تو کہیں اور میں کہیں اس سے تو مر ہی جاؤں — اے مرے ماہ جبیں اس سے تو مر ہی جاؤں
تجھ کو بھی ہووے یقیں اس سے تو مر ہی جاؤں — تاب جینے کی نہیں اس سے تو مر ہی جاؤں

ہے جدائی کی نپٹ مجھ پہ مصیبت یہ کٹھن

یا الٰہی کوئی مجھ سا بھی نہ ہووے دلگیر — خجل و خوار پریشان و ذلیل اور حقیر
طور بے طور نظر آتے ہیں، ہوں بس کہ نظیر — حسرتا آہ چہ بے غم بہ غم یار شریر
من حزیں در غمِ او خلق حزیں در غمِ من

(۳۸) موتی

رہے ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام و سحر موتی — جبیں پر موتی اور بیسر میں موتی مانگ پر موتی
ادھر جگنو ادھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی — بھرے ہیں اس پری میں اب تو یار و سر بسر موتی
گلے میں کان میں نتھ میں جدھر دیکھو ادھر موتی

کوئی اس چاند سے ماتھے کے ٹیکے میں اچھلتا ہے — کوئی بندوں سے مل کر کان کی نرموں میں ملتا ہے
لپٹ کر دھگدگی میں کوئی سینے پر مچلتا ہے — کوئی جھمکوں میں جھولے ہے کوئی بالی میں ہلتا ہے
یہ کچھ لذت ہے جب اپنا چھداتے ہیں جگر موتی

کبھی وہ نازنیں ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہے — تو اک اک بات میں موتی کو پانی میں بہاتی ہے
ادا و ناز میں چنچل عجب عالم دکھاتی ہے — وہ سمرن موتیوں کی انگلیوں میں جب پھراتی ہے
تو صدقے اس کے ہوتے ہیں پڑے ہر پور پر موتی

غلط ہے اس لبِ رنگیں کو برگِ گل سے کیا نسبت — کہ جن کی ہے عقیق اور پنے اور یاقوت کو حسرت
اداہٹ کچھ مسی کی اور کچھ اس پر پان کی رنگت — وہ ہنستی ہے تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت
ادھر لعل اور ادھر نیلم ادھر مرجاں ادھر موتی

کبھی جو بال بال اپنے میں وہ موتی پروتی ہے — نزاکت سے عرق کی بوند بھی مکھڑے کو دھوتی ہے

بدن بھی موتی، سر تا پاؤں سے پہنے بھی موتی ہے　　سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہے
کہ کچھ وہ خشک موتی کچھ پسینے کے وہ تر موتی

گلے میں اس کے جس دم موتیوں کے ہار ہوتے ہیں　　چمن کے گل سب اس کے وصف میں موتی پروتے ہیں
نہ تنہا رشک سے قطرات شبنم دل میں روتے ہیں　　فلک پر دیکھ کر تارے بھی اپنا ہوش کھوتے ہیں
پہن کر جس گھڑی بیٹھے ہے وہ رشکِ قمر موتی

وہ زیور موتیوں کا واہ اور کچھ تن وہ موتی سا　　پھر اس پر موتیا کے ہار بازو بند اور گجرا
سراپا زیب و زینت میں وہ عالم دیکھ کر اس کا　　جو کہتا ہوں ارے ظالم ٹک اپنا نام تو بتلا
تو ہنس کر مجھ سے یوں کہتی ہے وہ جادو نظر، موتی

کڑے پازیب توڑے جس گھڑی آپس میں لڑتے ہیں　　تو ہر جھنکار میں کس کس طرح باہم جھگڑتے ہیں
کسی دل سے بگڑتے ہیں کسی کے جی پہ اڑتے ہیں　　کڑے سونے کے کیا، موتی بھی اس کے پاؤں پڑتے ہیں
اگر باور نہیں، دیکھو، ہیں اس کی کفش پر موتی

خفا ہو ان دنوں کچھ روٹھ بیٹھی ہے جو ہم سے وہ　　تو اس کے غم میں جو ہم پر گزرتا ہے سو مت پوچھو
چلے آتے ہیں آنسو دل پڑا ہے ہجر میں غش ہو　　وہ دریا موتیوں کا ہم سے روٹھا ہو تو پھر یارو
بھلا کیونکر نہ برسا دے ہماری چشم تر موتی

شفق میں اتفاقاً جیسے سورج ڈوب کر نکلے　　دیا ابرِ گلابی میں کہیں بجلی چمک جا دے
بیاں ہو کس طرح سے آہ! اس عالم کو کیا کہیے　　تبسم کی جھلک میں یوں جھمک جاتے ہیں دانت اس کے
کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی

ہمیں کیونکر پریزادوں سے بوسوں کے نہ ہوں لہنے　　جڑاؤ موتیوں کے اس غزل پر وارئے گہنے
سخن کی کچھ جو اس کے دل میں ہے الفت لگی رہنے　　نظیر اس ریختے کو سن وہ ہنس کر یوں لگی کہنے

اگر ہوتے تو میں دیتی، تجھے، اِک تھال بھر موتی

(۳۹) موت

دنیا کے بیچ یارو سب زیست کا مزا ہے
جیتوں کے واسطے ہی یہ ٹھاٹھ سب ٹھٹا ہے
جب مر گئے تو آخر پھر عمر خاک پا ہے
نے باپ ہے نہ بیٹا، نہ یار آشنا ہے
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

جیتوں کے دل کو ہر دم کیا عیش پے بہ پے ہے
گلزار، ناچ، سیریں، ساقی، صراحی، مے ہے
جب مر گئے تو ہر گز مے ہے نہ کوئی شے ہے
اس مرگ کے ستم کو کیا کیا کہوں میں ہے ہے
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

ہے دم کی بات جو تھے مالک یہ اپنے گھر کے
جب مر گئے تو ہر گز گھر کے رہے نہ در کے
یوں مٹ گئے کہ گویا تھے نقش رہ گزر کے
پوچھا نہ پھر کسی نے یہ تھے میاں کدھر کے
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

مرنے کے بعد کوئی الفت نہ پھر جتاوے
نے بیٹا پاس آوے نے بھائی مُنہ لگاوے
جو دیکھے ان کی صورت دہشت سے بھاگ جاوے
اس مرگ کی جفائیں کیا کیا کوئی سناوے
ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے

مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

پیتے تھے دودھ شربت اور چابتے تھے میوا
مرتے ہی پھر کچھ ان کا سکہ رہا نہ تھیوا
بچے یتیم ہو گئے، بی بی کہائی بیوا
اس مرگ نے اکھاڑا کس کس بدن کا لیوا

ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

جب روح تن سے نکلے آنا نہیں یہاں پھر
کاہے تو دیکھنے ہیں یہ باغ و بوستاں پھر
ہاتھی پہ چڑھ کے یاں پھر گھوڑے پہ چڑھ کے واں پھر
جب مر گئے تو لوگو یہ عشرتیں کہاں پھر

ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

گھر ہو بہشت جن کا اور بھر رہی ہو دولت
اسباب عشرتوں کے محبوب خوب صورت
پھر مرتے وقت ان کو کیونکر نہ ہووے حسرت
کیا سخت بے بسی ہے کیا سخت ہے مصیبت

ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

کھانے کو نعمت اُن کے سو سو طرح کی آتی
اور وہ نہ یاویں ٹکڑا دیکھو ٹک ان کی چھاتی
کوڑی کی جھونپڑی بھی چھوڑی نہیں ہے جاتی
لیکن نظیرؔ سب کچھ یہ موت ہے چھڑاتی

ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بُری بلا ہے

(۴۰) اکبر آباد

شہرِ سخن میں اب جو ملا ہے مجھے مکاں　　کیونکر نہ اپنے شہر کی خوبی کروں بیاں
دیکھی ہیں آگرے میں بہت ہم نے خوبیاں　　ہر وقت اس میں شاد رہے ہیں جہاں تہاں
رکھیو الٰہی اس کو تو آباد جاوداں

ہر صبح اس کی رکھتی ہے وہ نورِ گستری　　شرمندہ جس کو دیکھ کے ہو عارضِ پری
ہر شام بھی وہ رشکِ ملاحت سے ہے بھری　　لیلیٰ کی جعد کر نہ سکے جس کی ہمسری
دن روئے مہر طلعت و شب زلفِ مہوشاں

باغات پر بہار عمارات پُر نگار　　بازار وہ کہ جس پہ چمن دل سے ہو نثار
محبوب دل فریب گل اندام و گلعذار　　گلیاں کہیں ہیں آپ کو گلزار پر بہار
کوچے کہیں ہیں اپنے تئیں صحنِ گلستاں

آب و ہوا کے لطف کوئی کیا کیا اب سکے　　دیکھو جدھر اُدھر گلِ عشرت ہیں کھل رہے
ایدھر کو قہقہے ہیں تو اودھر کو چہچہے　　اشجار باغ و شہر وہ سرسبز لہلہے
سبزوں کو جن کے دیکھ کے حیراں ہو آسماں

ہر فصل میں وہ ہوتے ہیں پاکیزہ میوہ جات　　دیکھے تو پھر نبات سے بن آوے کچھ نہ بات
شہد ان پہ آٹھ پہر لگائے رہے ہے گھات　　قند و شکر بھی دل سے فدا ہیں دن اور رات
رہتے ہیں اُن کے وصف میں ہر دم شکر فشاں

نہرِ چمن کو دیکھو تو جیسے چمن کی نہر　　لاکھوں بہاریں رکھتی ہے ایک ایک جس کی لہر

کوئی نہاوے اور کوئی منہ دھوے شاد ہو
اس پر ہجوم رکھتے ہیں یوں ساکنان شہر
شمشاد دسہرہ ہوتے ہیں جوں نہر پر عیاں

گریاں کے پیرنے کا کروں وصف میں رقم
تو بحر صفحہ بیچ لگے پیرنے قلم
پیریں ہیں اس روش کی بہاروں سے ہو بہم
سو سو چمن بھرے ہوئے شبنم کے دمبدم
آجاتے ہیں نظر وہیں دریا کے درمیاں

اہل شنا جو کرتے ہیں سو سو طرح شنا
لہریں نشاط و عیش کی اُٹھتی ہیں دل میں آ
ملتا نہیں کنارا کچھ عشرت کے بحر کا
ساحل پہ جوش خلق سے ملتی نہیں ہے جا
ہوتا ہے وہ ہجوم بھی اک بحر بیکراں

یارو عجب طرح کا یہ دلچسپ ہے مقام
ہوتے ہیں ایسے کتنے ہی خوبی کے اژدہام
ہر طور خوش رہے ہے دل اور طبع شاد کام
میری نظیر دل سے یہی ہے دعا مدام
ہنستا رہے یہ شہر بصد امن اور اماں

(۲)

(۱۴) پری کا سراپا

خوں ریز کرشمہ، ناز ستم، غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہے
مژگاں کی سناں، نظروں کی انی، ابرو کی کھنچاوٹ ویسی ہے
قتال نگہ اور دشت غضب، آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہے
عیار نظر، مکار ادا، تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہے
پلکوں کی جھپک، پتلی کی پھرت سرمے کی گھلاوٹ ویسی ہے

جو کافر اس کا عالم ہے وہ عالم حور کہاں پاوے	گر پردہ مُنہ سے دور کرے، خورشید کو چکر آجاوے
جب ایسا حسن بھبھوکا ہو، دل تاب بھلا پھر کیا لاوے	وہ مکھڑا چاند کا ٹکڑا سا جو دیکھ پری کو غش آوے

گالوں کی دمک، خوبی کی جھمک، رنگوں کی کھلاوٹ ویسی ہے

تھی زور ادا سے سر اوپر سنجاف ڈوپٹے کی اُلٹی	بل دار لٹیں تصویر جبیں، جکڑی مینڈیں، نیچی کنگھی
دل پیچ نہ کھاوے اب کیونکر اور دیکھ نہ اُلجھے کیونکر جی	وہ رات اندھیری بالوں کی، وہ مانگ چمکتی بجلی سی

زُلفوں کی کُھلت، پٹی کی جمت، چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہے

بیدرد، ستمگر، بے پروا، چنچل، بے کل، چٹکیلی سی	دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی
ڈوروں کی بان زنگیلی سی، کاجل کی آن کٹیلی سی	وہ آنکھیں مست نشیلی سی، کچھ کالی سی کچھ پیلی سی

چتون کی دغا، نظروں کی کپٹ، سینوں کی لڑاوٹ ویسی ہے

اس کافر بینی اور نتھ کے انداز قیامت شان بھرے	اور گھرے چاہ زنخداں میں سو آفت کے طوفان بھرے
وہ نگمے صاف ستاراسے اور موتی سے دامان بھرے	وہ کان نرے طوفان بھرے کن پھولوں بالے جان بھرے

بُندوں کی ہلت، جُھمکوں کی جُھمکت، بالے کی ہلاوٹ ویسی ہے

چہرے پر حسن کی گرمی سے ہر آن جھمکتے موتی سے	خوش رنگ پسینے کی بوندیں، سو بار جھلکتے موتی سے
ہنسنے کی ادائیں پھول جھڑیں، باتوں میں ٹپکتے موتی سے	وہ پتلے پتلے ہونٹ غضب، وہ دانت چمکتے موتی سے

پانوں کی رنگاوٹ قہر ستم، دھڑیوں کی جماوٹ ویسی ہے

تقریر بیاں سے باہر ہے وہ کافر حسن اہاہاہا	کچھ آپ نئی کچھ حسن نیا، کچھ جوش جوانی کا ادمکا
پیکیں جھبکیں ان باہوں کی پاروں میں واہ کہوں کیا کیا	وہ بانکے بازو ہوش ربا، عاشق سے کھیلیں بانک پٹا

پہنچی کی پہنچ، پھونچے پہ غضب، بانکوں کی بندھاوٹ ویسی ہے

وہ گورے گورے ہاتھ غضب، وہ نرم کلائی ناز بھری	کچھ شوخ کڑوں کی جھنکاریں، کچھ جھمکے چوڑی باہوں کی۔

یہ عالم دیکھ کے عاشق کا سینے میں نہ تڑپے کیونکر جی　　وہ پیاری پیاری انگشتیں، وہ پوریں نازک نازک سی
مہندی کی رنگت، فندق کی بنت، چھلّوں کی چھلاوٹ ویسی ہے

کچھ ناز و ادا کی مغروری، کچھ جور و جفا کچھ بانک پنا　　کچھ آمد حسن کے موسم کی، کچھ کافر جسم رہا گدرا
یہ شور جوانی اٹھتی کا، آتا ہے امنڈ کر جوں دریا　　وہ سینہ ابھرا جوش بھرا، وہ حسن کا عالم جھوم رہا
شانوں کی اکڑ، گردن کی مڑت، مونڈھوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے

یہ کافر گردن کا عالم، گھبرائے پری بھی دیکھ جسے　　اور گورا صاف گلا ایسا بہ جاوے موتی دیکھ جسے
دل لوٹے تڑپے ہاتھ ملے اور غش کھاوے جی دیکھ جسے　　وہ گردن اونچی حسن بھری، کٹ جائے صراحی دیکھ جسے
دائیں کی مڑت، بائیں کی پھرت، کوٹھوں کی کھنچاوٹ ویسی ہے

اس سینے کا وہ چاک ستم، اس کرتی کا تن زیب غضب　　اس قد کی زینت قہر بلا، اس کافر چھب کا زیب غضب
ان ڈبیوں کا آزار برا، ان گیندوں کا آسیب غضب　　وہ چھوٹی چھوٹی سخت کچیں، وہ کچے کچے سیب غضب
انگیا کی بھڑک، گوٹوں کی جھلک، بندوں کی کساوٹ ویسی ہے

اس گورے گورے سینے پر وہ گہنے کی گلزار کھلی　　چمپے کی کلی، ہیرے کی جڑی، توڑے، جگنو، ہیکل بدھی
دل لوٹے تڑپے ہاتھ ملے اور جائے نظر ہر دم پھسلی　　وہ پیٹ ملائی سا کافر، وہ ناف چمکتی تارا سی
شوخی کی گھلاوٹ اور ستم، شرموں کی چھپاوٹ ویسی ہے

ہر آن نرالی ہر ایک سے اس شوخ پری کی محبوبی　　کچھ ناز و ادا کی مرغوبی، کچھ شرم و حیا کی محجوبی
اب گہنے کی تعریف کروں یا کافر جوڑے کی خوبی　　پوشاک سنہری عطر بھری، سر پاؤں جواہر میں ڈوبی
جگنوں کی دمک، سینے کی صفا، کرتی کی پھنساوٹ ویسی ہے

وہ کافر دھج، جی دیکھ جسے سو بار قیامت کا لرزے　　پازیب، کڑے، پایل، گھنگرو، کڑیاں، چھڑیاں، گجرے، توڑے
ہر جنبش میں سو جھنکاریں ہر ایک قدم پر سو کھٹکے　　وہ تخل چال جوانی کی، اونچی ایڑی، نیچے پنجے

کفشوں کی کھٹک، دامن کی جھٹک، ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہے

قاتل ہر آن نیا عالم، کافر ہر آن نئی جھمکیں
بانکی نظریں، ترچھی پلکیں، بھولی صورت، میٹھی باتیں
دل بس کرنے کے لاکھوں ڈھب، جی لینے کی سو سو گھاتیں
ہر آن پھبن، ہر آن سجن، ہر دم میں بدلے لاکھ دھجیں
آنکھوں کی لگاوٹ قہر ستم، باتوں کی رکھاوٹ ویسی ہے

تصویر کا عالم نکھ سکھ سے چھب تختی صاف پری کی سی
کچھ چین جبین کے اینٹھ رہے اور ہونٹوں میں کچھ گالی سی
بیدردی سختی بہتیری اور مہر محبت تھوڑی سی
جھوٹی عیاری ناک چڑھی، بھولی سیانی، پکی پیسی
ٹھٹھوں کی اوڑاوٹ اور غضب قہ قہ کی ہنساوٹ ویسی ہے

نظروں میں صاف اڑا لے دل، اس طرح کی کافر عیاری
اور ہٹ جاوے سو کوس پرے گر بات کہو کچھ مطلب کی
کہنی مارے، چٹکی لے لے، چھیڑے، جھڑکے، دیوے گالی
ہر آن چہ خوش، ہر دم اچھا، ہر بات ہنسی کی چُہل بھری
رمزوں کے ضلع، غمزوں کے جگت، پھبتی کی پھباوٹ ویسی ہے

یہ ہوش قیامت کافر کا جو بات کہو وہ سب سمجھے
روٹھے، مچلے، سو سوانگ کرے، باتوں میں لڑے، نظروں میں ملے
یہ شوخی اور یہ بیتابی، ایک آن کبھی نچلی نہ رہے
چنچل، اچپل، مٹکے، چٹکے، سر کھولے ڈھانپے، ہنس ہنس دے
بانہوں کی جھٹک، گھونگھٹ کی ادا، جوبن کی دکھاوٹ ویسی ہے

ایک شور قیامت ساتھ چلے، نکلے کافر جس دم بن ٹھن
بلدار کمر، رفتار غضب، دل کی قاتل جی کی دشمن
مذکور کروں میں اب یارو اس شوخ کے کیا کیا چنچل پن
کچھ ہاتھ ہلیں، کچھ پاؤں ہلیں، اچھلیں بازو، پھڑکے سب تن
گاتی وہ بلا، تالی وہ ستم، انگلی کی نچاوٹ ویسی ہے

جو ایسا حسن کا دریا ہو، کس طور نہ لہروں میں بہیے
گر مہر و محبت ہو بہتر، اور جور جفا ہو تو سہیے
دل لوٹ گیا ہے غش ہو کر بس اور تو آگے کیا کہیے
مل جائے نظیر ایسی جو پری چھاتی سے لپٹ کر سو رہیے
بوسوں کی چپک، بغلوں کی لپٹ، سینوں کی ملاوٹ ویسی ہے

۴۲ آئینہ

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ
صورت میں اپنی قدرتِ پروردگار دیکھ
خالِ سیاہ اور خطِ مشکبار دیکھ
زلفِ دراز و طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے جان دو تیرا پاک صاف دل
اور خال و خط ہیں تیرے سویدا کے رخ کے تل
زلف دراز فہم رسا سے رہی ہے مل
لاکھوں طرح کے پھول رہے ہیں تجھی میں کھل
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشک تتار و مشک ختن بھی تجھی میں ہے
یاقوت سرخ و لعل یمن بھی تجھی میں ہے
نسرین و موتیا و سمن بھی تجھی میں ہے
القصہ کیا کہوں میں چمن بھی تجھی میں ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

مشک ختن ہے کیا، یہ تری زلفِ پُر شکن
یاقوت و لعل کیا ہیں یہ تیرے لب و دہن
اور موتیا ہے کیا ترے دندان گُہر ثمن
باغ و چمن ہے کیا یہ سراپا ترا بدن
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

سورج مکھی کے گل کی اگر دل میں تاب ہے ۔۔۔ تو اپنے مُنہ کو دیکھ کہ خود آفتاب ہے
گل اور گلاب کا بھی تجھی میں حساب ہے ۔۔۔ رخسار تیرا گل ہے پسینہ گلاب ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس کے پھول پر تو نہ اپنا گمان کر ۔۔۔ اور سرو سے بھی دل نہ لگا اپنا جان کر
یہ سب بہار ہے ہیں تجھی میں تو آن کر ۔۔۔ اپنے سوا کسی پہ تو ہرگز نہ دہیان کر
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

نرگس وہ کیا ہے جان، تری چشم خوش نگاہ ۔۔۔ اور سرو کیا ہے یہ ترا قدِ دراز آہ
گر سیر باغ چاہے تو اپنی ہی کر تو چاہ ۔۔۔ حق نے تجھی کو باغ بنایا ہے واہ واہ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

گر دل میں تیرے قمری و بلبل کا دہیان ہے ۔۔۔ تو ہونٹھ تیرے قمری ہیں، بلبل زبان ہے
ہے تو ہی باغ اور تو ہی باغبان ہے ۔۔۔ باغ و چمن ہیں جتنے، تو اُن سب کی جان ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

بیلا، گلاب، سیوتی، نسرین و نسترن ۔۔۔ داؤدی، جوہی، لالہ و راببیل و یاسمن
جتنی جہاں میں پھولوں کی پھولی ہے انجمن ۔۔۔ یہ سب تجھی میں پھول رہے ہیں چمن چمن
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ

اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

عالم میں تیرے باغ کا اے جاں وہ گھیر ہے — طوطی تدرو طوطی و کبک و بٹیر ہے
باغ و چمن کی تجھ کو عبث گھیر اگھیر ہے — سر پاؤں سے تو آپ ہی پھولوں کا ڈھیر ہے
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

باغ جہاں کے غنچہ و گل میں نہ ہو اسیر — قمری کی سن نفیر نہ بلبل کی سن صفیر
اپنے تئیں تو دیکھ کہ کیسا ہے بے نظیر — ہیں حرفِ مَن عَرَف کے یہی معنی اے نظیر
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ

۴۳ روٹی نامہ

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں — پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں — سینے اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا — کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا — ٹھٹھا، ہنسی، شراب، صنم، ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے — خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے

چو ٹلے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے　　جتنے ہیں نور، سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

آوے تو سے تنور کا جس جا زباں پہ نام　　یا چکّی چو ٹلے کا جہاں گلزار ہو تمام
یہاں سر جھکا کے کیجے ڈنڈوت اور سلام　　اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام
پہلے انھیں مکانوں میں آتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں پور پور　　آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور　　ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہیے یہ ہے دل کا نور کیا　　اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے، "تیرا گیا ہے شعور کیا　　کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف، سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں"

روٹی جب آئی پیٹ میں سو قند گھل گئے　　گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیش تل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آکے ڈھل گئے　　چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے
یہ کشف، یہ کمال، دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو　　میلے کی سیر، خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو　　سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

اب جن کے آگے مال پُوے بھر کے تھال ہیں   پوری بھگت اُنھیں کی وہ صاحب کے لال ہیں
اور جن کے آگے روغنی اور شیرمال ہیں   عارف وہی ہیں اور وہی صاحب کمال ہیں
پکّی پکائی اب جنھیں آتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے   سینے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے   سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے ناچے پیادہ قواعد دکھا دکھا   اسوار ناچے گھوڑے کو کاوا لگا لگا
گھنگرو کو باندھے پیک بھی پھرتا ہے جا بجا   اور اس سوا جو غور سے دیکھا تو جا بجا
سو سو طرح کے ناچ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی کے ناچ تو ہیں سبھی خلق میں بڑے   کچھ بھانڈ بھگتیے یہ نہیں پھرتے ناچتے
یہ رنڈیاں جو ناچے ہیں گھونگھٹ کو منہ پہ لے   گھونگھٹ نہ جانو، دوستو تم زینہار اسے
اس پردے میں یہ اپنی کماتی ہیں روٹیاں

اور وہ جو ناچنے میں بتاتی ہیں بھاؤ تاؤ   چتون اشارتوں سے کہیں ہیں کہ روٹی لاؤ
روٹی کے سب سنگار ہیں روٹی کے راؤ چاؤ   رنڈی کی تاب کیا جو کرے اس قدر بناؤ
یہ آن یہ جھمک تو دکھاتی ہیں روٹیاں

اشرافوں نے جو اپنی یہ ذاتیں چھپائی ہیں   سچ پوچھیے تو اپنی یہ شانیں بڑھائی ہیں
کہیے انھوں کی روٹیاں کس کس نے کھائی ہیں   اشراف سب میں کہیے تو اب نان بائی ہیں
جن کی دکان سے ہر کہیں جاتی ہیں روٹیاں

بھٹیاریاں کھلا دیں نہ اب کیونکہ رانیاں — مہتر خصم ہیں اُن کے وہ ہیں مہترانیاں
ذاتوں میں جتنے اور ہیں قصے کہانیاں — سب میں انھیں کی ذات کی اونچی ہیں بانیاں
کس واسطے کہ سب یہ پکاتی ہیں روٹیاں

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نکوئی ہے — نا دشمنی و دوستی نا تند خوئی ہے
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہے — سب کوئی ہے اسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے
نوکر، نفر، غلام، بناتی ہیں روٹیاں

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر — روکھی بھی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہو وے موٹی، خمیری ہو یا فطیر — گیہوں کی، جوار، باجرے کی جیسی ہو نظیر
ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

(۴۴) آندھی

نہ ہو کیونکر جہاں یارو زبر اور زیر آندھی میں — کہ ہو کر باؤلے پھرتے ہیں بن کے شیر آندھی میں
لگا لینے جو گل دامن ہوا کا گھیر آندھی میں — بگولے اٹھ چلے تھے اور نہ تھی کچھ دیر آندھی میں
کہ ہم سے یار سے آ ہو گئی مڈبھیڑ آندھی میں

کہا میں نے اجی کچھ خیر ہے جاتے ہو تم کیدھر — ہوا ابر بھی تمھیں کچھ ہے نظر اے نازنیں دلبر
چلو بھاگو شتابی ورنہ آندھی آ گئی سر پر — جتا کر خاک کا اڑنا دکھا کر گرد کا چکر
وہیں ہم لے چلے اس گلبدن کو گھیر آندھی میں

یہ سنتے ہی پھری ڈر کر وہ چنچل نازنیں گل رو — چلی اس چال سے اس دم کہ میرا جی گیا غش ہو

کہ اس میں آکے اک جھونکا اندھیرا کر گیا یارو　　رقیبوں نے جو دیکھا یہ اڑا کر لے چلا اس کو
پکارے ہائے یہ کیسا ہوا اندھیر آندھی میں

یہ کہہ کر کھڑکھڑا تیغ و سپر اور مل کے سب دوڑے　　پکارے لے چلو جانے نہ پاوے اس کو جلدی سے
کہاں کا وہ جھلا اور کس کا لینا ہم جو دھر بھاگے　　وہ دوڑے تو بہت لیکن انھیں آندھی میں کیا سوجھے
ز بس ہم اس پری کو لائے گھر میں گھیر آندھی میں

چلے اس میں ہوا کے پھر تو آکر اور سناٹے　　اندھیرا ہو گیا یکسر منوں خاکیں لگیں اڑنے
انھیں جھوکوں میں ہم نے اس پری چنچل کو آندھی میں　　چڑھا کوٹھے پہ دروازے کو موندا اور کھول کر پردے
لگا چھاتی سے لئے بوسے کیا ہت پھیر آندھی میں

ادھر تو آکے آندھی سے اندھیرا ہو گیا ہر سو　　خبر کس کو کسی کی میں کہاں ہوں اور کہاں ہے تو
اہا ہا ہا عجب عشرت کی اس دم بن گئی اک جو　　وہ کوٹھے کا مکاں وہ کالی آندھی وہ صنم گل رو
عجب رنگوں کی ٹھہری آکے ہیرا پھیر آندھی میں

اسی آندھی نے گلشن کر دیا یارو مرے گھر کو　　بچھایا شاد ہو میں نے پلنگ پر جھاڑ بستر کو
صراحی کی خبر لی اور سنبھالا جا کے ساغر کو　　اٹھا کر طاق سے شیشہ لگا چھاتی سے دلبر کو
نشوں میں عیش کے کیا کیا کیا دل سیر آندھی میں

چمن سا کھل گیا یارو مرے کوٹھے کے زینے پر　　ہوئی پنکھوں کی مارا مار گرمی کے پسینے پر
لگے پھر عیش و عشرت جب تو ہونے اس قرینے پر　　کبھی بوسہ کبھی انگیا پہ ہاتھ اور گاہ سینے پر
لگے لٹنے مزے کے سنگترے اور بیر آندھی میں

یہ ٹھہرا جب تو پھر واں عیش کے بادل لگے گھرنے　　جو ڈوبی حسرتیں تھیں دل میں سب اس دم لگیں ترنے
لپٹ کی ٹھہری اور بھی ہاتھ سینے پر لگے پھرنے　　مزے عیش و طرب لذت لگے یوں لوٹ کر گرنے

کہ جیسے ٹوٹ کر میووں کے ہو ویں ڈھیر آندھی میں

اس آندھی میں اہاہا ہا عجب ہم نے مزے مارے — فلک پر عیش و عشرت کے دکھائی دے گئے تارے
رقیبوں کی میں اب خواری خرابی کیا لکھوں بارے — تلے کوٹھے کے بیٹھے اٹ گئے سب گرد کے مارے
بھری نتھنوں میں ان کے خاک دس دس سیر آندھی میں

کسی نے بھاگ کر جلدی سے جا گھر کا لیا آنگن — گرا کوئی گڑھے میں اور کوئی بھاگا کہیں دشمن
کسی کے بھن گئے کپڑے اجلوں کی گئی واں بن — کسی کی اڑ گئی پگڑی کسی کا پھٹ گیا دامن
گئی ڈھال اور کسی کی گر پڑی شمشیر آندھی میں

یہ دن آندھی کے یارو یوں تو سب کے ہوش کھوتے ہیں — جنھیں ہے عیش وہ آندھی میں موتی سے پروتے ہیں
مزا ہے جن کو ہنستے ہیں جنھیں غم ہے سو روتے ہیں — نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دیو ہوتے ہیں
میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

(۴۵) اژدہے کا بچہ

بیچے ہے اب تو کوئی بلبل بئے کا بچا — اور بیچتا ہے کوئی طوطے ہرے کا بچا
مینا، بیا، لوڑا اور ابلقے کا بچا — تیتر، بٹیر، سارس، شکرے، الوے کا بچا
سب بیچتے ہیں آکر چیتے گھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

کھاتے تھے ہم تو اس سے آگے پلاؤ قلیا — یا روکھی سوکھی روٹی یا باجرے کا دلیا
پھرتے ہیں سر پہ رکھ کر چالیس من کی ڈلیا — اب کوئی آگرے میں ایسا نہیں ہے بلیا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

جب بیچتے تھے یارو ہم اژدہا پرانا　　سو سو طرح کا جب تو آتا تھا ہم کو کھانا
اب گاہکی جو کم ہے تو ہے یہ دل میں ٹھانا　　ایک بچہ روز لانا اور روز بیچ کھانا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

گاہک نہ کوئی بولا ہے یہ برا زمانا　　آج اس کو سر پہ رکھ کر سب شہر ہم نے چھانا
اب بھی بکا تو بہتر نہیں پھر پڑے گا لانا　　ہے اس سے ہی ہماری نت روٹی کا ٹھکانا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

ہے ڈر ہم اس کو رکھیں یا پھیر کر لے جاویں　　تو کیا ہم آپ کھاویں اور کیا اسے کھلاویں
کچھ بن نہیں ہے آتا یہ دکھ کسے سناویں　　جی چاہتا ہے اب تو یہ شہر چھوڑ جاویں

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

سو من گیہوں کا ہر دن کھانے کو کہاں سے آوے　　اور سو مٹکا پانی کب تک کوئی پلاوے
جب رات ہو تو ہر دم یہ خوف جی میں آوے　　شاید اسے چرا کر کوئی چور لے نہ جاوے

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

روزی کے اب تو ایسے گھر گھر میں ہیں کسالے　　ہاتھی دگھوڑے اپنے دیتے ہیں لوگ ڈھالے

جب تنگ ہووے روزی کون اژدہے کو پالے اس کی بھی اور ہماری یارو خبر خدا لے

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

نو دس ہزار تک تو چھونے اسے نہ دیں گے اتنے روپے تو اس کے اک پر کے ہم نہ لیں گے
ستر ہزار تک بھی سودا نہیں کریں گے اسی ہزار دے گا تو ہم بھی دے چکیں گے

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

سب اٹھ گئے جہاں سے وہ تھے جو لوگ جیا وہ رہ گئے ہیں جن کے گھر میں نہیں ہے ہنسیا
اس بات کو تو عمدہ ہو بھوگ کا بلسیا جو اژدہے کو پالے ایسا ہے کون رسیا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

آگے تو گھر بہ گھر تھے اکثر تمام داتا سیمرغ پالتے تھے کرنے کو نام داتا
اب تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا سچ ہے نظیر آخر اجگر کے رام داتا

سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو، لو اژدہے کا بچا

(۴۶) ککڑی

پہونچے نہ اس کو ہرگز کابل ڈرے کی ککڑی لے پورب اور نہ پچھم خوبی بھرے کی ککڑی

نے چین کے پرے کی اور نہ ددرے کی ککڑی   دکھن کی اور نہ ہرگز اس سے پرے کی ککڑی
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں   گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں، شیریں کی ہنسلیاں ہیں   مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

کوئی ہے زرد مائل کوئی ہری بھری ہے   پکھراج منفعل ہے، پنّے کو تھرتھری ہے
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے   سیدھی ہے سو وہ یارو رانجھے کی بانسری ہے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

میٹھی ہے جس کو برنی کہیئے، گلابی کہیئے   یا حلقے دیکھ اس کے تازی جلیبی کہیئے
تل شکریوں کی پھانکیں اب یا امرتی کہیئے   سچ پوچھیے تو اس کو دندان مصری کہیئے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

چھونے میں برگ گل ہے کھانے میں کرکری ہے   گرمی کے مارنے کو اک تیر کی سری ہے
آنکھوں میں سکھ کلیجے ٹھنڈک ہری بھری ہے   ککڑی نہ کہیئے اس کو ککڑی نہیں پری ہے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

بیل اس کی ایسی نازک جوں زلف پیچ کھائی — بیج ایسے چھوٹے چھوٹے خشخاش یا کہ رائی
دیکھ اس کی ایسی نرمی باریکی اور گلائی — آتی ہے یاد ہم کو محبوب کی کلائی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

لیتے ہیں مول اس کو گل کی طرح سے کھل کے — معشوق اور عاشق کھاتے ہیں دونوں مل کے
عاشق تو ہیں بجھاتے شعلوں کو اپنے دل کے — معشوق ہیں لگاتے ماتھے پہ اپنے چھلکے

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

مشہور جیسے ہر جا یاں کی جمالیاں ہیں — ویسی ہی ککڑی نے بھی دھومیں پڑالیاں ہیں
میٹھی ہیں سو تو گویا شکر کی تھالیاں ہیں — کڑوی ہیں سو بھی گویا خوباں کی گالیاں ہیں

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

جو ایک بار یارو اس جا کی کھائے ککڑی — پھر جا کہیں کی اس کو ہرگز نہ بھائے ککڑی
دل تو نظیر غش ہے یعنی منگائے ککڑی — ککڑی ہے یا قیامت، کیا کہیے ہائے ککڑی

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

(۴۷) بھونچال

بھونچال کا جو حق نے یہ نقشا دکھا دیا — قدرت کا اپنی زور جہاں کو دکھا دیا
روشن دلوں کے نور نظر کو بڑھا دیا — غفلت زدوں کو مار کے ٹھوکر جگا دیا

دریا و کوہ شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

جن منکروں کو نوح کے طوفان کا شبہ تھا — اور دوزخ و بہشت کو سمجھیں تھے توتیا
قائل نہ قبر کے تھے نہ خطرا تھا حشر کا — ایک زلزلے نے سب کے دیئے وسوسے مٹا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

سنہ بارہ سو اٹھارہ میں یہ واردات تھی — اول جمادی بارھویں تاریخ، سات تھی
دن بدھ کا جمعرات کی وہ آدھی رات تھی — بھونچال کیا تھا قدرتِ خالق کی بات تھی

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

تھی آدھی رات جب ہوا بھونچال کا گزر — پتا سا تھرتھرا گیا پتال کا جگر
ساتوں طبق کے ہل گئے سکان سر بسر — در بولے الحفیظ تو دیواریں الحذر

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

اجزائے ارض قاف سے تا قاف ہل پڑے — اجگر اچل اُٹل کے کلیجے نکل پڑے
انسان گھر سے، دشت سے وحشی نکل پڑے — طائر بھی آشیانوں میں اپنے اوچھل پڑے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

گڑھ، کوٹ، قلعہ، روئے زمیں پر ڈھل گئے — کانپیں النگیں، برج کے کنگورے ہل گئے
سنگیں محل مکان تھے سو وہ بھی اوسل گئے — اینٹوں کے زہرے پھٹ گئے پتھر پگھل گئے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

باہم کواڑ لڑ گئے زنجیریں ہل پڑیں — کڑیاں سرک سرک کے چھتوں سے نکل پڑیں
چھجے، ستون کانپے، منڈیریں ڈہل پڑیں — دیواریں جھوم جھوم کے پنجے سے جھل پڑیں

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

گھر گھر میں شور ہوگیا اور غل گلی گلی — روئے زمیں پہ پڑ گئی ایک دم میں کھلبلی
کوئی اللہ اللہ کہہ اُٹھا کوئی علی علی — کوئی یا حسین کہہ اٹھا کوئی رام رام جی

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

تھیں جتنی جتنی اصل زمیں کی رسائیاں — ایک زلزلے نے سب وہ پکڑ کر ہلائیاں
بھونچال نے یہ جیسی ہوائیں دکھائیاں — ایسی ہزاروں اس کی ہیں قدرت نمائیاں

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا

ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

دستِ قضا کی انگلی کی چھوٹی سی پور ہے ہلنے سے جس کے کانپا ہر اک مار و مور ہے
بھونچال کا تو یارو، یہ ادنیٰ سا شور ہے سو درجہ اس سے، اس کی تو قدرت میں زور ہے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

جیسا کہ حکم اس کے سے آیا تھا زلزلہ کانپی تمام روئے زمیں جس سے تھرتھرا
ویسا ہی اپنے حکم سے گر وہ نہ روکتا پھر کچھ نہ تھا جہان میں فقط پانی پانی تھا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کے تو ہم کو خیالات خام تھے یہ چھوڑنے یہ روکنے قدرت کے کام تھے
تھا ڈول تو وہی کہ نہ خاص اور نہ عام تھے رحم آ گیا وگرنہ وہیں سب تمام تھے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

سجدا کرو خدا کے تئیں یارو دمبدم آخر کریم تھا تو کیا اس نے پھر کرم
باقی تو کچھ رہی نہ تھی پر تھم گیا قدم ورنہ گھڑی میں یارو نہ پھر تم تھے اور نہ ہم

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کیا جو چاہے تو اک پل کے مارتے کر ڈالے آسمان و زمیں کو اوپر تلے
اڑتے پھریں پہاڑ روئی کی طرح پڑے قادر، کریم، دم میں جو کچھ چاہے سو کرے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

کہتے ہیں یوں حکیم کہ پھرتی ہے سب ہوا — آتا ہے اس سے روئے زمیں پر یہ زلزلہ
خالق کا بھید ہے، یہ کسی پر نہیں کھلا — ہم تو اُسی کے حکم کا جانے ہیں دبدبہ

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

محکوم سب اسی کے ہیں حاکم وہی اِلٰہ — تابع ہیں اُس کے حکم کے ماہی سے تا بہ ماہ
جب اس کا حکم آوے تو ہو کون سدِّ راہ — کیا حکم ہے عزیزو، ذرا دیکھو واہ واہ

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

لرزے میں آکے ڈالیاں نخلوں کی ہل گئیں — دہشت سے چل بچل ہو، جڑیں بھی کچل گئیں
تھرّا کے گاؤ ماہی کی چولیں اُدسل گئیں — جل تھل کے ہوش اُڑ گئے، ریخیں نکل گئیں

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

جو ارض سب جہان کے بوجھوں کے تئیں سہے — جب وہ ہی تھرتھرا دے تو پھر ہم کہاں رہے
جنات دیو فیل و شتر، شیر اژدہے — ایک دم میں سب کے تن کے غرض کھل گئے بچھے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کی دھمک کا وہ سنتے ہی کھڑکھڑا — جی ہیبتوں میں آگیا اور دم نکل چلا

اوروں کے دل کی کیا کہوں جانے وہی خدا
پر میں تو جانا صور سرافیل پھونک گیا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

قدرت کی تیغ کی ہے یہ کچھ آب در دری
کھنچتے ہی جس کے پڑ گئی سینوں میں تھرتھری
دارائی کام آئی نہ یہاں کچھ سکندری
ایک دم میں تھرتھرا گئی سب خشکی و تری

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

آنکھوں سے میری اس گھڑی آنسو عجب چلے
گزرا یہ جی میں ہائے ہوا کیا غضب چلے
تحت الثریٰ کی سیر کو ہم سب کے سب چلے
دل میں یہی یقین ہوا یعنی بس اب چلے

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

ہیبت کے مارے پہلے تو دل ہو گیا دو نیم
جب تھم گیا تو ہو گیا جی ذرہ ہیں مستقیم
یہ قدرتوں کی دیکھ کے شان امید و بیم
سر کو جھکا کے میں نے کہا وہیں یا کریم

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال میں کہاں تھا یہ عالم مجال کا
سب حکم تھا یہ حضرت ایزد تعال کا
اک دم میں یوں بڑھا دیا شعلہ جلال کا
اک دم میں یوں دکھا دیا جھمکا جمال کا

دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

بھونچال کا تو کہنے کی خاطر یہ نام تھا — یہ شور زور دیکھا تو قدرت کا کام تھا
احکامِ ذوالمنن کا جہاں اہتمام تھا — یہ زلزلہ تو واں کا اک ادنیٰ غلام تھا
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

حاکم وہی، حکیم وہی، حق وہی کبیر — خالق وہی، خدا وہی، دانا وہی خبیر
مالک وہی، ملک وہی، قادر وہی قدیر — قدرت کا اُس کی ایک یہ شمہ تھا بے نظیر
دریا و کوہ، شہر و جنگل سب ہلا دیا
ایک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

(۴۸) کوڑی نامہ

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں — کھانے کو ان کے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن میں نہایت مہین ہیں — سمجھیں ہیں اس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی بغیر سوتے تھے خالی زمین پر — کوڑی ہوئی تو رہنے لگے شہ نشین پر
ٹپکے سنہری بندھ گئے جاموں کی چین پر — موتی کے گچھے ٹک گئے گھوڑوں کی زین پر
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی ہی چاہتی ہے سدا بادشاہ کو　　کوڑی ہی تھام لیتی ہے فوج و سپاہ کو
لے کر چھڑی رومال گدا بھی نباہ کو　　پھرتا ہے ہر دکان پہ کوڑی کی چاہ کو
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو　　رتھ خانہ، فیل خانہ، طویلا کہاں سے ہو
منڈوا کے سر فقیر کا چیلا کہاں سے ہو　　کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میلا کہاں سے ہو
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کاندھے پہ تیغ دھرتے ہیں کوڑی کے واسطے　　آپس میں خون کرتے ہیں کوڑی کے واسطے
یاں تک تو لوگ مرتے ہیں کوڑی کے واسطے　　جو جان دے گزرتے ہیں کوڑی کے واسطے
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی سے ہر امیر کی چلتی ہے باؤنی　　کوڑی کے ساتھ ہوتی ہے لشکر کی چھاؤنی
کوڑی سے ہے گی لاکھ طرح کی اٹھاؤنی　　کوڑی عجب ہے چیز یہ ....
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

گالی و مار کھاتے ہیں کوڑی کے واسطے　　شرم و حیا اٹھاتے ہیں کوڑی کے واسطے
سو ملک چھان آتے ہیں کوڑی کے واسطے　　مسجد کو دم میں ڈھاتے ہیں کوڑی کے واسطے
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں

کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کتنے تو ہم میں ایسے ہیں کوڑی کے بتلا — کوڑی ہو گندگی میں تو لیں دانت سے اُٹھا
خست نہیں ہے ایسا ہے کوڑی کا مرتبہ — کوئی دانت سے اٹھا دے ہم آنکھوں سے لیں اُٹھا

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی ہی ڈالتی ہے طوائف کے تئیں لتاڑ — کوڑی ہی اُس کی ایتی ہے کرتی اور انگیا پھاڑ
کوڑی ہی ..... ہو کرتی ہے چھیڑ چھاڑ — بڑھ کا بھی دم میں آتا ہے سن کوڑیوں کا جھاڑ

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بن کوڑی خوردے کے برابر بھی بت نہ تھی — کوڑی جب آئی پاس تو بن بیٹھے سیٹھ جی
ہے گے گماشتوں کے کھلی ہر طرف بہی — پھر وہ جو کچھ کہیں تو وہی بات ہے سہی

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بن کوڑی تھیں نہ تیل کی باسی منگوڑیاں — کوڑی ہوئی تو چھٹنے لگیں لمبی چوڑیاں
یوں خلق دوڑے مکھیاں جوں گڑ پہ دوڑیاں — خالق نے کیا ہی چیز بنائی ہیں کوڑیاں

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

اب جن کے گھر میں روز برستی ہیں کوڑیاں — کیا کیا انھوں کی جان میں بستی ہیں کوڑیاں
دانت ان کے نکلے پڑتے ہیں سجتی ہیں کوڑیاں — وہ کیا ہنسیں گے یار یہ ہنستی ہیں کوڑیاں

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

تنکے سے جن کے دانت تھے یوں زرد کوڑیاں
ڈھوتی ہیں ان کے آن میں دکھ درد کوڑیاں
خوبی میں اپنی ایسی ہیں اب فرد کوڑیاں
نامرد کو کریں ہیں غرض مرد کوڑیاں
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

خاصے محل اٹھاتے ہیں کوڑی کے زور سے
پکے کوئیں کھداتے ہیں کوڑی کے زور سے
پل اور سرا بناتے ہیں کوڑی کے زور سے
باغ و چمن لگاتے ہیں کوڑی کے زور سے
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

لے مفلس اور فقیر سے تا شاہ اور وزیر
کوڑی وہ دلربا ہے کہ ہے سب کی دل پذیر
دیتے ہیں جان کوڑی پہ طفل و جوان و پیر
کوڑی عجب ہے چیز میں اب کیا کہوں نظیرؔ
کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

(۴۹) وجد و حال

کیا علم انھوں نے سیکھ لیا جو بن لکھے کو بانچے ہیں
اور بات نہیں منہ سے نکلے بن ہونٹھ ہلائے جانچے ہیں
دل ان کے تار ستاروں کے تن ان کے طبل طمانچے ہیں
منہ چنگ زباں دل سارنگی پا گھنگرو ہاتھ کما نچے ہیں

ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

کل باجے بج کر ٹوٹ گئے آواز لگی جب لہرانے　　اور چھم چھم گھنگرو بند ہوئے، تب گت کا انت لگے پانے
سنگیت نہیں یہ سنگت ہے نٹوے بھی جس سے نٹ مانے　　یہ ناچ کوئی کیا پہچانے، اس ناچ کو ناچے سو جانے
ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

جب ہاتھ کو دھویا ہاتھوں سے جب ہاتھ لگے تھرکانے کو　　اور پاؤں کو کھینچا پاؤں سے جب پاؤں لگے گت پانے کو
جب آنکھ اٹھائی ہستی سے جب نین لگے مٹکانے کو　　سب کاچھ کچھے اسب ناچ نچے، اس رسیا چھیل رجھانے کو
ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

جو آگ جگر میں بھڑکی ہے اس مشعل کی اجیالی ہے　　جو منہ پر حسن کی زردی ہے اس زردی کی سب لالی ہے
جس گت پر ان کا پاؤں پڑا اس گت کی چال نرالی ہے　　جس مجلس میں وہ ناچے ہیں وہ مجلس سب سے خالی ہے
ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

سب گھٹنا بڑھنا پھینک دھر اور دھیان ادھر دھر رکھتے ہیں　　بن تاروں تار ملاتے ہیں جب نرت نرالا کرتے ہیں
بن گھنے جھمک دکھلاتے ہیں بن جوڑے من کو ہرتے ہیں　　بن ہاتھوں بھاؤ بتاتے ہیں بن پاؤں کھڑے گت بھرتے ہیں
ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انھیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سرتال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

تھا جن کی خاطر ناچ کیا جب مورت ان کی آئے گی　　کہیں آپ کہا کہیں ناچ کہا اور تان کہیں لہرائے گی

جب چھیل چھبیلی سندر کی چھب نینوں اندر چھائے گی　　اک مور چھا گت سے آئے گی اور جوت میں جوت سمائے گی
ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت بے سر تال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

سب ہوش بدن کا دور ہوا جب گت پر آ مردنگ بجی　　تن بھنگ ہوا، دل دنگ ہوا، سب آن گئی بے آن سجی
یہ ناچا کون نظیرؔ اب یاں اور کس نے دیکھا ناچ اجی　　جب بوند ملی جا دریا میں، اس تان کا آخر نکلا جی
ہیں راگ انھیں کے رنگ بھرے اور بھاؤ انہیں کے سانچے ہیں
جو بے گت، بے سر تال ہوئے، بن تال پکھاوج ناچے ہیں

(۵۰) جوانی بڑھاپے کی لڑائی

جہاں میں یارو خدا کی عجب خدائی ہے　　کہ ہر کسی کو تکبر ہے خود نمائی ہے
ادھر جوانی بڑھاپے پہ چڑھ کے آئی ہے　　ادھر بڑھاپے کی اس پہ ہوئی چڑھائی ہے
عجب جوانی، بڑھاپے کی اب لڑائی ہے

جوانی اپنی جوانی میں ہو رہی سرشار　　بڑھاپا اپنے بڑھاپے کا ہو رہا دم مار
ہوئے ہیں دونوں جو لڑنے کے واسطے تیار　　اُدھر جوانی نے کھینچی ہے آ سپر تلوار
بڑھاپے نے بھی اُدھر لاٹھی اک اٹھائی ہے

اُدھر ہے تیر سا قامت، اُدھر ہے پشت کمان　　اُدھر ہے کبڑی کمر اور اُدھر اکڑ کے نشان
جوانی کہتی ہے بڑھ کر کہ "سن بڑھاپے میاں　　تیری ہے خیر اسی میں کہ جا سرک اب ہاں
وگرنہ تیری اجل میرے ہاتھ آئی ہے

میں آج وہ ہوں کہ رستم کو کھڑ کھڑ اڑا ڈالوں — پہاڑ ہووے تو اک دم میں ہل ہلا ڈالوں
درخت جڑ سے اکھاڑوں، زمیں ہلا ڈالوں — ابھی کہے تو تری دھجیاں اُڑا ڈالوں
کہ مجھ کو زور کی قوت کی بادشاہی ہے

کہا بڑھاپے نے "گر تجھ میں زور یہ ہے بجا — تو ہاں جی دیکھیں ہمارے تو سامنے آجا
اگرچہ دانت ہمارے نہیں ہے منہ میں رہا — مسوڑوں سے ہی تری ہڈیوں کو ڈالیں چبا
نہ ہم سے لڑ کہ اسی میں تری بھلائی ہے

ہزار گو کہ ترا زور پر چڑھا ہے سن — یہ ہم نہ چھوڑیں ترے کان اب مروڑے بن
اگرچہ تو ہے نیا ہم پرانے ہیں لیکن — نیا ہے تو ہی دن آخر پرانا ہے سو دِن
قدیم ہے یہ مثل، ہم نے کیا بنائی ہے"

کہا جوانی نے "تیرا تو ہے گا کیا احوال — تو میرے سامنے آوے کہاں یہ تیری مجال
نہ تیرے پاس طمنچہ، نہ تیر، سیف نہ ڈھال — ابھی گھڑی میں بکھرتا پھرے گا ایک ایک بال
یہ ڈاڑھی تو نے جواب سوپ سی بڑھائی ہے"

کہا بڑھاپے نے سن کر "اگرچہ تو ہے پہاڑ — تو ہم بھی سوکھ کے جھڑبیری کے ہوئے ہیں جھاڑ
ابھی کہے تو ترے کپڑے سے لئے لیویں پھاڑ — ذرا سی بات میں اک دم کے بیچ ڈالیں جو اکھاڑ
ہر ایک مونچھ تیری یہ جو تاؤ کھائی ہے"

کہا جوانی نے سن کر "چل نہ کہہ یہ بات — ابھی میں آن کے ماروں تری کمر میں لات
کہیں ہو پاؤں کہیں سر کہیں پڑا ہو ہات — جسے تو جینا سمجھتا ہے اور خوشی کے سات
یہ تیرا جینا نہیں یہ تو بے حیائی ہے"

کہا بڑھاپے نے سن کر کہ تو نے خوب کہا — جو پوچھو سچ تو مزا ہے ہمیں کو جینا کا

شراب ہو جو پرانی تو اُڑ چلے ہے نشا — پرانے جب ہوئے چاول تو ہے انھیں میں مزا
یہ بات تو نے نہیں کیا سنی سنائی ہے

تری جو پوچھو تو ہے چار دن کی سب کو چاہ — جہان تو ہو چکی، بس ہے گا تیرا حال تباہ
ہمیں ہیں وہ جو کریں ہیں تمام عمر نباہ — تو ٹک تو دیکھ گریباں میں ڈال کر منہ آہ
کہ اب ہے کس میں وفا، کس میں بے وفائی ہے

جوانی جب تو یہ بولی بڑھاپے سے سن کر — تری وفا سے مری بے وفائی ہے بہتر
میں جب تلک ہوں، بہاریں، مزے ہیں سر تا سر — جو سلطنت ہو گھڑی بھر تو وہ بھی ہے خوش تر
مزے تو لوٹ لئے گو کہ پھر گدائی ہے

کہا بڑھاپے نے سن کر وہ سلطنت ہے کیا — کہ جس کے سات لگا ہو زوال کا دھڑکا
ہمیں ملی ہے بزرگی کی وہ سند اس جا — کہ جب تلک ہیں، رہے گی ہمارے سات سدا
خدا نے ایسی ہی دولت ہمیں دلائی ہے

کہا جوانی نے "چل جھوٹی اب نہ کر تکرار — مجھے تو عیش ہے لیکن تری ہے مٹی خوار
شراب، ناچ، مزے، گل بدن، گلے میں ہار — تری خرابی یہ دیکھی ہے میں نے کتنی بار
جہاں گیا ہے تیری داڑھی وہاں ہلائی ہے

مجھے خدا نے دیا ہے یہ مرتبہ اور شان — جدھر کو جاؤں اُدھر عیش رنگ پھول ریحان
اچھل ہے، کود ہے، لذت، مزے، خوشی کے دھیان — گلے لپٹتے ہیں محبوب گل بدن ہر آن
جہاں گئے تو وہاں سیر ہی اُڑائی ہے"

کہا بڑھاپے نے "چل جھوٹ مجھ سے مت بولے — فدا تو جن پہ ہے وہ میرے پاؤں ہیں پڑتے
ہمیں کہیں ہیں وہ حضرت تجھے کہیں آبے — ہزار بار پڑے تجھ پہ لات اور گھونسے

بھلا بتا تو کہیں ہم نے مار کھائی ہے

پھسل گیا ہے تو جن گل رخوں کی لاتوں میں　　ہم ان کو مارا تاریں ہیں دم کی باتوں میں
ہم عیش دن کو اڑاتے ہیں اور راتوں میں　　کریں ہیں عشق کو ہم بھی ہنر گھاتوں میں
تجھے کہاں ابھی اس ڈھب کی آشنائی ہے

تو جن کے واسطے گلیوں میں اب پھرے ہے خوار　　ہم ان کی لوٹتے ہیں چھو منتر کے بیچ بہار
تجھے تلاش و طلب میں کٹے ہے لیل و نہار　　ہم اپنی دھوکے کی ٹٹی میں کھیلتے ہیں شکار
تو کیا وہ جانے جو کچھ گھات ہم نے پائی ہے

کہا جوانی نے "تو کس سند سے ہے کہتا　　مرا تو وصف کتابوں میں ہے لکھا ہر جا
کہ واہ وقت جوانی ہے زندگی کا مزا　　تری جو بات کا مذکور رہے کہیں آیا
تو ہر طرح سے خواری ہی تجھ پر آئی ہے"

جونہی جوانی نے خواری کا نام منہ سے سنا　　بڑھاپا دوڑ جوانی سے جا وہیں لپٹا
مروڑیں مونچھیں ادھر، اس نے ڈاڑھی کو کھینچا　　لڑے جو دونوں تو آ ہر طرف یہ شور مچا
کہ "یارو دوڑیو، فریاد ہے، دہائی ہے"

کھڑے تھے لوگ ہزاروں یہ دونوں لڑتے تھے　　کبھی پچھاڑتے تھے اور کبھی پچھڑتے تھے
جو بازو چھوڑتے تھے تو کمر پکڑتے تھے　　کچھ اس طرح کے نئے گھونسے لات جڑتے تھے
کہ سب یہ کہتے تھے "کیا ان کے دل میں آئی ہے"

یہ مار کوٹ کا آپس میں جب ہوا چرچا　　نظیر اس میں وہیں ایک ادھیڑ بن آیا
کچھ اس کو روکا ادھر اور کچھ اس کو سمجھایا　　تم اپنے خوش رہو، وہ اپنے خوش رہے ہر جا
ملاپ خوب ہے، لڑنے میں کیا بھلائی ہے

(۵۱) بلدیو جی کا میلہ

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے — ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے، چنبیلی، بیلا ہے — بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
شہر قصباتی اور گنویلا ہے — زر اشرفی ہے پیسہ دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے — بھیڑ ہے خلقتوں کا ریلا ہے
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو کا جی میلا ہے

ہے کہیں یار اور کہیں اغیار — کہیں عاشق ہے اور کہیں دلدار
کہیں بستی ہے اور کہیں گلزار — کہیں جنگل ہے اور کہیں بازار
وہی بھگتی ہے اور وہی اوتار — اس کی لیلائیں کس سے ہوں اظہار
آپ آتا ہے دیکھنے کو بہار — آپ کہتا ہے یوں پکار پکار
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہے کہیں رام اور کہیں لچھمن — کہیں کچھ مچھ ہے اور کہیں راون
کہیں بارا کہیں مدن موہن — کہیں بلدیو اور کہیں سیکشن
سب سروپوں میں ہیں اسی کے جتن — کہیں نرسنگھ ہے وہ نارائن
کہیں نکلا ہے سیر کو بن ٹھن — کہیں کہتا پھرے ہے یوں بن بن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

آج میلے کا یاں جو ہے سامان　　آئے ہیں دور دور سے انسان
کوئی درشن کوئی دعائیں مان　　سب کی ہوتی ہیں مشکلیں آسان
ہر طرف کھل رہے گل وریحان　　ہار، بدھی، مٹھائی اور پکوان
بھیڑ انبوہ غل دکان دکان　　اور یہی شور ہر گھڑی ہر آن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہر طرف حسن کی پکاریں ہیں　　دلربا، سوبرن، سنواریں ہیں
اک طرف نوبتیں جھنکاریں ہیں　　جھانجھ، مردنگ، راس دھاریں ہیں
سیر ہے دید ہے بہاریں ہیں　　کرکے جے جے یہی پکاریں ہیں
کہیں عاشق نظارے مارے ہیں　　سو نگاہوں کی جیت ہاریں ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں آ　　جو کہ تل دھرنے کی نہیں ہے جا
لے کے مندر سے دو دو کوس لگا　　باغ و بن بھر رہے ہیں سب ہر جا
ہیں ہزاروں بساطی اور سودا　　لاکھوں بکتے ہیں گہنے اور مالا
بھیڑ انبوہ اور دھوم دھکا　　جس طرف دیکھئے اہا ہا ہا

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

بس کہ امڈے ہے خلقتوں کا دل　　جابجا بھر رہے ہیں جر جنگل
چوک بازار فوج اور دنگل　　جنگلوں میں ہیں بج رہے منگل
کوئی انبوہ میں رہا ہے کچل　　کوئی دھکوں میں کر رہا ملدل
کتنے کرتے ہیں جست کود اچھل　　کتنے کہتے ہیں مور چھل جھل جھل

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہیں ہزاروں ہی جنس کے ہٹے　　موتی مونگا اور آرسی سٹے
پیڑے لڈو جلیبی اور گٹے　　کولے، نارنگی، سنگترے، کھٹے
کوئی تو کر رہا ہے چھل بٹے　　کوئی چڑھتا ہے کھیر کے چٹے
پُر ہیں مندر کے کوٹھے اور اٹے　　بوڑھے لڑکے جوان اور سٹے کٹے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لوگ چاروں طرف کے آتے ہیں　　آکے عیش و طرب مناتے ہیں
دل سے سب درشنوں کو جاتے ہیں　　اپنے دل کی مراد پاتے ہیں
جھانجھ مردنگ دف بجاتے ہیں　　راس منڈل بھجن سناتے ہیں
دل میں پھولے نہیں سماتے ہیں　　سب یہ ہنس ہنس کے کہتے جاتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہر طرف گلبدن رنگیلے ہیں　　نک پلک غنچہ لب سجیلے ہیں
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں　　دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
خشک، ترا زم، سوکھے، گیلے ہیں　　ٹیڑھے بل دار اور نکیلے ہیں
جوڑے بھی سرخ سبز پیلے ہیں　　پیار الفت بہانے حیلے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

خلق آتی ہے سب جڑی جتھڑی　　چیز رکھتے ہیں باندھ کر جکڑی
کوئی دوڑے ہے ہاتھ لے لکڑی　　دوڑیو چور لے چلا گٹھڑی
جیب کتری کہیں گئی پکڑی　　کہیں ٹوٹی اور دوکان اور ہٹری
چور نے تاک لی کہیں پگڑی　　سو تماشے ہنسی خوشی پھکڑی

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

نازنیں ہیں وہ سانوری گوری　　جن کی نازک ہر اک پری پوری
کرکے چتون نگاہ کی ڈوری　　دل کو چھینے ہیں سب بڑا زوری
دھوم ناز و ادا جھکا جھوری　　بہج میں جیسے مچ رہی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری　　چوری کیسی کہ صاف سرزوری

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کنڈ پر بھی نہان ہوتے ہیں　　جس میں گنگا برن کے سوتے ہیں

پانی لے ہاتھ منہ کو دھوتے ہیں — کتنے کنگھی کھڑے پروتے ہیں
کتنے جا کر بنوں میں سوتے ہیں — بندر دوں میں چنوں کو بوتے ہیں
ان بہاروں میں ہوش کھوتے ہیں — سو مزے سو تماشے ہوتے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کوئی آ کر بہانے اور مس سے — مل رہا ہے ملا ہے دل جس سے
ہوتے ہیں آملاپ جس تس سے — لڑ رہا ہے کوئی کہیں اس سے
کوئی کھویا گیا ہے مجلس سے — کون چلائے پوچھے کس سے
کہنی بازو میں لگ رہی ہے کس سے — اور دھکا پیل اور گھمان ٹھٹے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ناچ اور راگ کے کھڑا کے ہیں — گھنگرو اور تال کے جھنا کے ہیں
نقلیں، قصے، کہانی، سا کے ہیں — کھنڈ و دوہرے، کبت، کتھا کے ہیں
کہیں آغوش کے لپا کے ہیں — کہیں بوسوں کے سو جھپا کے ہیں
تھرتھری دانت پر کڑا کے ہیں — تس پہ جاڑے کے سو جھڑا کے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

صحن مندر کا سب سے ہے اعلیٰ — اس کا گنبد ہے عالم بالا
ہو رہا جھانکیوں کا اجیالا — پردے جیسے ہیں چاند پر ہالا

ہے کوئی درشنوں کا متوالا کوئی جپتا ہے دھیان میں مالا
کوئی ڈنڈوتیں کر رہا لالا کوئی جے جے کرے ہے دھن والا

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہے جو مندر میں آپ وہ لالن ہر گھڑی میں بدل رہی ہے برن
نئی پوشاک اور نئے بھوجن نئی جھانکی ہے اور نئے درشن
آرتی کی کہیں مچی ٹھن ٹھن کہیں گھنٹوں کی ہو رہی چھن چھن
تال مردنگ جھانجھ کی جھن جھن خاص پرشاد مصری اور ماکھن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کوئی چنچل چلے ہے ٹھمکی چال کچھ وہ پتلی کمر وہ لمبے بال
آنکھوں میں حسن کے نشے رنگ لال مصری ماکھن کے ہاتھوں اوپر تھال
کچھ وہ پوشاک کچھ وہ حسن و جمال مالنوں کا زیادہ اُن سے کمال
ڈال دیں ہار کا گلے میں جال بدھی ہو کر لیں صاف دل کو نکال

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

بس کہ آتے ہیں راجا اور رانی اور لاکھوں میں رانی اور نانی
بھیڑ انبوہ کی فراوانی اور ہجوموں کی لاکھ طغیانی
پالکی، ہاتھی، گھوڑے، رتھ بانی جوگی بیراگی گیانی اور دھیانی

کچھ نہیں مول تول کیا پانی　　پانی کا دودھ، دودھ کا پانی
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کتنے کچے ہیں کتنے پکے ہیں　　ان کے منہ اور اچھال چھکے ہیں
چورنٹ کھٹ ہیں اور اچکے ہیں　　دودھ، کھویا، ملائی، چکھتے ہیں
بھیڑ انبوہ اور بھڑکے ہیں　　دھوم دھونسوں کے اور دھڑکے ہیں
پالکی ہاتھی گھوڑے ڈنکے ہیں　　سو تماشے ہیں، سو جھکے ہیں
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لاکھوں بیٹھے بساطی اور منہار　　اپنا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی بنگڑی کی اک طرف جھنکار　　نو گرہی، پونچھ، انگوٹھی چھلے ہار
ٹوٹے پڑتے گنواری اور گنوار　　جس گنواری کو چلئے دھکا مار
گر کے دے گالی یوں کہے ہے پکار　　کیسو اٹھلا چلو ہے ڈاڑھی جار
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

مٹی اور کاٹھ کے کھلونے ڈھیر　　کوئی لیوے ہے کوئی دیوے پھیر
کوئی کمھاری گے کر رہا ہت پھیر　　کوئی کاچھن کے چن رہا ہے بیر
کوئی کنجڑن سے لڑ رہا منہ پھیر　　کوئی بنئے کو مارتا ہے سیر
گالی ڈھک مار کوٹ سانجھ سویر　　لاٹھی پاٹھی ہے شور غل اندھیر

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
کہیں چھوٹیں انار پھلجھڑیاں کہیں کھلتی ہیں دل کی گلجھڑیاں
کہیں الفت سے انکھڑیاں لڑیاں کہیں باہیں گلے میں ہیں پڑیاں
عیش و عشرت کی لٹ رہی دھڑیاں دال موٹھیں، منگوچی اور بڑیاں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لگ رہی بھیڑ اس قدر ٹھٹھ ہو راہ آگے کو اور نہ پیچھے کو
جو جہاں تھا وہیں پھنسا پھر وہ جس کو کھینچے ہیں گر پڑے ہے سو
بیٹھے کہتے ہیں کھا کے دھکوں کو جے مہاراج رام رام بھجو
اور گنوار دل پکار کر ہو ہو اب تو لٹھ وار ہے لگانے کو

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کیا مچی ہے بہار جے بلدیو عیش کے کاروبار جے بلدیو
دھوم لیل و نہار جے بلدیو ہر کہیں آشکار جے بلدیو
ہر زباں پر ہزار جے بلدیو دمبدم یادگار جے بلدیو
کہہ نظیر اب پکار جے بلدیو سب کہو ایک بار جے بلدیو

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

زور بلدیوجی کا میلا ہے

غزلیات

غزلیں

(۱)

بتوں کی مجلس میں شب کو مہ رو جو اور ٹک بھی قیام کرتا
کنشت ویراں، صنم کو بندہ، برہمنوں کو غلام کرتا

خراب خستہ سمجھ کے تو نے پیارے مجھ کو عبث نکالا
جو رہنے دیتا تو گل رخوں میں، قسم ہے تیری، میں نام کرتا

بھلا ہوا جو نقاب تو نے اٹھایا چہرے سے اے پری رو
وگرنہ سینے سے دل تڑپ کر، نگہ میں آ کر مقام کرتا

قیامت آتی جو مسکرا کر چمن میں جاتا وہ سیر کرنے
تڑپتی بلبل، سسکتی قمری، گلوں پہ ہنسنا حرام کرتا

نظر تیری اشارتوں سے یہ باتیں غیروں کی سن رہا ہے
وگرنہ کس میں تھی تاب و طاقت جو مجھ سے آ کر کلام کرتا

کلال گردوں اگر جہاں میں جو خاک میری کو جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر عجیب عیش مدام کرتا

جو پاتا لذت بسانِ مستاں مے محبت سے تیری زاہد
تو صومعے سے نکل کے اپنے، وہ میکدے میں قیام کرتا

وہ بزم اپنی تھی میکشی کی فرشتے ہو جاتے مست و بےخود
جو شیخ جی واں سے بچ کے آتے تو پھر میں ان کو سلام کرتا

جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا

نظیر آخر کو ہار کر میں گلی میں اس کی گیا تھا بکنے
تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر وہ شوخ اپنا غلام کرتا

شور افگن جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا
رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبط آہ کرنا

لالے کو گو کر لال کا پیالہ بنا دیا
پر ساتھ اس کے داغ بھی کیسا لگا دیا

گردوں نے ہم کو کیا نہ دیا اور کیا دیا
سب کچھ دیا اگر دلِ بے مدعا دیا

لے گل سے تا بہ خار مرے دل کے باغ کو
اس شعلہ رو نے ایک نظر میں جلا دیا

اے ابرِ تر ہمارے بھی ابرِ مژہ نے آج
پل مارنے میں اشک کا دریا بہا دیا

خواب عدم میں ہم تو فراغت سے اے نظیر
سوتے تھے، لیکن عشق نے آ کر جگا دیا

الفت نے اس کی اوج یہ ہم کو دلا دیا
جو رفتہ رفتہ خاک میں آ کر ملا دیا

شرمندۂ رفو نہیں عاشق کا چاکِ جیب
کس باغباں نے گل کا گریباں سلا دیا

جیتے رہے فنا نہ ہوئے پھر بھی اب تلک
قاتل نے ہم کو مار کے ایسا جلا دیا

ساقی نے سب کو بھر کے دیے جام بزم میں
ساغر جو ہم نے مانگا تو شیشہ ہلا دیا

چاہا کہ مجھ سے پھر وہ نہ بولے کبھی نظیر
لوگوں نے بارے منتیں کر کے ملا دیا

وہ رشکِ چمن گل جو زیبِ چمن تھا — چمن جنبشِ شاخ سے سینہ زن تھا
گیا میں جو اُس بن چمن میں تو ہر گل — مجھے ہر گھڑی اخگرِ پیرہن تھا
یہ غنچہ جو بیدرد گلچیں نے توڑا — خدا جانے کس کا یہ نقشِ دہن تھا
تنِ مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا — گیا وہ تو جس سے مزیّن یہ تن تھا
ق
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا — مشین بدن تھا، معطر کفن تھا
جو قبرِ کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا — نہ عضوِ بدن تھا، نہ تارِ کفن تھا

نظیرؔ آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا، تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

وہ مجھ کو دیکھ کچھ اس ڈھب سے شرمسار ہوا — کہ میں حیا ہی پر اس کی فقط نثار ہوا
بھوں کو بوسے دئے ہنس کے اور ہنس گالی — ہزار شکر، بھلا، اس قدر تو پیار ہوا
قرار کرکے نہ آیا وہ سنگ دل کافر — پڑیں قرار پہ پتھر، یہ کچھ قرار ہوا
گلے کا ہار جو اس گلبدن کے ٹوٹ پڑا — تو ڈر نظر کا وہیں اس کو ایک بار ہوا

کسی سے اور تو کچھ بس چلا نہ اس کا نظیرؔ
ندان میرے ہی آکر گلے کا ہار ہوا

ادھر اس کی نگہ کا ناز سے آکر پلٹ جانا — ادھر مرنا تڑپنا غش میں آنا دم الٹ جانا
کہوں کیا کیا میں نقشے اس کی ناگن زلف کے یارو — لپٹنا، اڑ کے آنا، کاٹ کھانا پھر پلٹ جانا
اگر ملنے کی دھن رکھنا تو اس ترکیب سے ملنا — سرکنا، دور ہٹنا، بھاگنا اور پھر لپٹ جانا
نہ ملنے کا ارادہ ہو تو یہ عیاریاں دیکھو — ہمکنا، آگے بڑھنا، پاس آنا اور ہٹ جانا
یہ کچھ بہروپ پن دیکھو کہ بن کر شکل دانے کی — بکھرنا، سبز ہونا، لہلہانا پھر سمٹ جانا

یہ یکتائی یہ یک رنگی اِتس اوپر یہ قیامت ہے — نہ کم ہونا نہ بڑھنا اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا
نظیرؔ ایسا جو چنچل دلربا بہروپیا ہووے
تماشا ہے پھر ایسے شوخ سے سودے کا پٹ جانا

لا کر ہر ایک ادا میں وہ عیار چٹکلا — چٹکی بجا کے چھوڑے ہے ہر بار چٹکلا
ظاہر میں گرچہ وصل کی کہتا ہے مجھ سے بات — پر دل میں اور کرتا ہے تیار چٹکلا
سب جانتے ہیں چٹکلے بازی نظیرؔ کی
اس کے تو ہر سخن میں ہے اے یار چٹکلا

نہ گل اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا — بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

بہار آئی کیا ہر شاخ پر گل نے مکاں اپنا — بنا اب تو بھی اے بلبل چمن میں آشیاں اپنا
بڑے حظ لوٹتے ہم بھی لب جو میکشی کر کر — اگر آتا چمن میں آج وہ سرو رواں اپنا
مقابل اس کے منہ کے گل کو تو کس منہ سے کرتا ہے — کہاں گل اور کہاں وہ، منہ تو دیکھ اے باغباں اپنا
عدم سے جو ہمیں لے ہمنشیں ہستی میں لایا ہے — وہی غمخوار اپنا، یار اپنا، مہرباں اپنا
اسی کی مہربانی سے سبھوں کی مہربانی ہے
ہوا جب وہ نظیرؔ اپنا تو پھر ہے سب جہاں اپنا

دیا قاتل نے پہلی ہی نظر میں جان کو دہلا — الٰہی شرم رکھیو ابھی یہ وار ہے پہلا
بہ حق ذوالفقار حیدری ہم منہ نہ موڑیں گے — اگر زخموں سے بن جاوے گا تن شمشیر کا دہلا
چمک جا پھر خدا کے واسطے اے طور کے شعلے — کہ مثل آتش افسردہ پھر کچھ دل چلا گھلا
جو شاعر ہے تو خالی ڈال مت اس یار کا کہنا

نظیر اب دیکھتا کیا ہے تو ہی یہ ریختہ کہہ لا

جھمک دکھاتے ہی اس دلربا نے لُوٹ لیا ہمیں تو پہلے ہی اُس کی ادا نے لوٹ لیا
نگہ کے ٹھگ کی لگاوٹ نے فن سے کر غافل ہنسی نے ڈال دی پھانسی، دغا نے لوٹ لیا
وفا جفا نے یہ کی جنگ زرگری ہم سے وفا نے باتوں لگایا، جفا نے لوٹ لیا
لُٹے ہم اس کی گلی میں تو یوں پکارے لوگ کہ ایک فقیر کو ایک بادشاہ نے لوٹ لیا
ابھی کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آوے کہ ہم کو راہ میں ایک آشنا نے لوٹ لیا

ہزاروں قافلے جس شوخ نے کیے غارت
نظیر کو بھی اُسی بے وفا نے لوٹ لیا

ایک دن آپ نے اس کا نہ کبھی دھیان کیا جس نے یہ حسن دیا اور تمھیں انسان کیا
طور کو پھونک دیا اس نے تمھاری خاطر چشم کے واسطے جب سرمے کا سامان کیا

ٹھیرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیر
کام مشکل تھا، پر اللہ نے آسان کیا

دل یار کی گلی میں کر آرام رہ گیا پایا جہاں فقیر نے بسرام رہ گیا
کس کس نے اس کے عشق میں مارا نہ دم و لے سب چل بسے مگر وہ دل آرام رہ گیا

جس کام کو جہان میں تو آیا تھا اسے نظیر
خانہ خراب تجھ سے وہی کام رہ گیا

جو پوچھا میں نے یہاں آنا منظور رکھیے گا تو سن کر یوں کہا یہ بات دل سے دور رکھیے گا
بہت روئیں یہ آنکھیں اور پڑی دن رات روتی ہیں اب ان کو چشم بھی کیجیے گا یا ناسور رکھیے گا
جو پردہ بزم میں منہ سے اُٹھاتے ہو تو یہ کہہ دو کہ پھر یہاں شمع کے جلنے کا کیا مذکور رکھیے گا

دیا دل ہم نے تم کو اور تو اب کیا کہیں لیکن — یہ ویرانہ تمھارا ہے اسے معمور رکھئے گا
نظیر اب تو دل و جاں سے تمھارا ہو چکا بندہ
میاں اپنے غلاموں میں اسے مشہور رکھئے گا

چاند اپنا تو کسی اور کا ہالا نکلا — ہم نے سمجھا تھا جسے گل سو وہ لالا نکلا
بھیک لینے ترے اس گھر سے ٹکڑے کی رات — بدر چاندی کا لئے ہاتھ میں پیالا نکلا
اس کے چہرے پہ نہیں کاکل مشکیں کی نمود — یہ ٹپاری کے تئیں توڑ کے کالا نکلا
طور پر جیسی کسی وقت میں چمکی تھی چمک — کچھ سر بام سے ویسا ہی اُجالا نکلا
مٹ گئی شور و فغاں جی کے نکلتے ہی نظیر
پھر نہ سینے سے اُٹھی آہ نہ نالا نکلا

کدھر سے آج آئی وہ شوخ چلبلیا — کہ جس کے غم سے مرا دل ہوا ہے باولیا
تمام گوروں کے حیرت سے رنگ اڑ جاتے — جو آج گھر سے نکلتا وہ میرا سانولیا
تجھے خبر نہیں بلبل کہ باغ سے گل چیں — بڑی سی پھولوں کی ایک بھر کے لے گیا ڈلیا
خدا کے واسطے سمجھو نہ اس کو کوٹھے وال — فریب دیتا ہے تم کو یہ بوالہوس تیلیا
نظیر یار کی کل ہم نے جو ضیافت کی — پکایا قرض منگا کر پلاؤ اور قلیا
سو آپ یار نہ آیا رقیب کو بھیجا — ہزار حیف ہم ایسے نصیبوں کے بلیا
اُدھر تو قرض ہوا اور اُدھر نہ آیا یار
پکائی کھیر تھی قسمت سے ہو گیا دلیا

آغوش تصور میں جب ہم نے اسے مسکا — لبہائے نزاکت سے ایک شور تھا بس بس کا
سو بار حریر اس کا مسکا نگہ گل سے — شبنم سے کب اے بلبل پیراہن گل مسکا

اس تن کو نہیں طاقت شبنم کے تلبس کی　　　اے دست ہوس اس پر تو قصد نہ کر مس کا
ملتی ہے پری آنکھیں اور حور جبیں سا ہے　　　ہے نقش جہاں یار و اس پائے مقدس کا
تر رکھیو سدا یارب تو اس مژۂ تر کو　　　ہم عطر لگاتے ہیں گرمی میں اسی خس کا

اس گریۂ خونی کی دولت سے نظیرؔ اپنی
اب کلبۂ احزاں میں کل فرش ہے اطلس کا

ادھر مدت ہوئی وہ حسرت گلشن نہیں آتا　　　شکار دل تڑپتا ہے شکار افگن نہیں آتا
نزاکت اور خوش اندامی زیادہ اس سے کیا ہوگی　　　مہ کنعاں کا جس کے بر میں پیراہن نہیں آتا
لڑی منہ سے نہ بولی روٹھ بیٹھی جھڑکیاں دے لیں　　　اسے سب کچھ بن آتا ہے مجھے کچھ بن نہیں آتا
طرح دینا، اڑا دینا، لگا دینا، بجھا دینا　　　یہ ڈھب ہیں یاد تس پر کچھ فریب و فن نہیں آتا
صریحاً یہ تو ضد ہے مجھ سے اس بیدرد ظالم کو　　　کہ ہر دم روٹھنا آتا ہے لیکن من نہیں آتا

نظیرؔ اس شوخ نے سیکھی زبان فارسی جب سے
دلوں کے حق میں جز بشکن اسے مشکن نہیں آتا

اس کے شرار حسن نے شعلہ جو اک دکھا دیا　　　طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا
پھر کے نگاہ چار سو ٹھہری اسی کے روبرو　　　اس نے تو میری چشم کو قبلہ نما بنا دیا
میرا اور اس کا اختلاط ہو گیا مثل ابر و برق　　　اس نے مجھے رلا دیا میں نے اسے ہنسا دیا
میں ہوں پتنگ کاغذی ڈور ہے اس کے ہاتھ میں　　　چاہا ادھر گھٹا لیا چاہا ادھر بڑھا دیا
تیشے کی کیا مجال تھی یہ جو تراشے بے ستوں　　　تھا وہ تمام دل کا زور جس نے پہاڑ ڈھا دیا
شکوہ ہمارا ہے بجا مفت بروں سے کس لئے　　　ہم نے تو اپنا دل دیا ہم کو کسی نے کیا دیا

سن کے ہمارا عرض حال یار نے یک بہ یک نظیرؔ

ہنس کے کہا کہ بس جی بس تم نے تو سر پھرا دیا

زیر فلک وہ خلق ہوئے ماہ پارہ ہا — دیکھے ہے جن کو رشک سے چشم ستارہ ہا
ہر شب ترے فراق میں اے اخترِ مراد — اپنی ہر ایک آہ ہے گنجِ ستارہ ہا
ہے تو وہ مہرِ حسن کہ ہر دم تری طرف — کُل اخترِ سپہر ہیں گرمِ نظارہ ہا
یوں سنگِ ہجر توڑے ہے آئینہ ہائے دل — مینا کے ٹکڑے کرتے ہیں جوں سنگِ خارہ ہا
کرتی ہے اک نگاہ کی گردش ہزار ناز — رکھتی ہے ایک جنبشِ ابرو اشارہ ہا
پیدا ہوئے وہ خلقتِ انساں میں وُر نظیر — کرتا ہے عرش جن پہ فدا گوشوارہ ہا

ہیں دم کے ساتھ عشرت و عسرت ہزار ہا — وابستہ ایک تارِ نفس سے ہیں تار ہا
کچھ صید زخم خوردۂ جاناں ہمیں نہیں — ہر صید گہ میں اس کی ہیں بسمل شکار ہا
آیا وہ جب تو ہم نہ رہے آپ میں غرض — دیکھا اسی طرح سے، اُسے ہم نے بار ہا
اس گُل کے چاکِ جیب کی حسرت سے باغ میں — ہر صبح چاک ہوتی ہیں جیب و کنار ہا
اس سوزنِ مژہ کے تصور میں شانہ ساں — ٹوٹے ہیں ایک خلق کے پہلو میں خار ہا
کس کس کی دیکھئے چمنِ صنع میں بہار — اپنی فقط دو چشم ہیں اور یہاں بہار ہا
تھے کل یہ خطِ عارضِ خوباں سبزہ رنگ — کہتے ہیں آج خلق جنھیں سبزہ زار ہا
تھے کل یہ شاہدانِ سہی سرو و سیمتن — شاہد ہیں آج مرگ کے جن کے مزار ہا

سب کو نظیر سونا ہے ایک دن بہ زیرِ خاک
سنگِ مزار، اس کے ہیں آئینہ دار ہا

یار نے ہم کو اگر رسوا کہا اچھا کہا — ہم تو رسوا ہیں ہی کیا بے جا کہا اچھا کہا
وصف اس کے حسن کا کلی ہوا کس سے مگر — جس کے جتنا فہم میں آیا کہا اچھا کہا

آپ سے جب آپ کو ہم نے ملایا خاک میں — پھر تو جس جس نے جو کچھ چاہا کہا اچھا کہا
یار کے آگے پڑھا یہ ریختہ جا کر نظیرؔ
سن کے بولا واہ واہ اچھا کہا اچھا کہا

نہ آیا رات بھی کتنا ہی انتظار کیا — قرار کر مجھے کافر نے بیقرار کیا
چمن میں اس گل رنگین کی جامہ زیبی نے — ہر ایک گل کے گریبان کو تار تار کیا
کیا ہے کیا مہ کنعاں پہ حسن نے احسان — کہ اس کے دور میں تجھ کو نہ آشکار کیا
بہار دیکھ اسے رشک سے یہ کہتی ہے — کہ تھا یہ حسن تو پھر مجھ کو کیوں بہار کیا
نظیرؔ آج تصدق کو کچھ نہ تھا ہم پاس
وہی جو باقی تھا اک جی وہی نثار کیا

تجھے کچھ بھی خدا کا ترس ہے اے سنگ دل ترسا — ہمارا دل بہت ترسا ارے ترسا نہ اب ترسا
نہ جاؤں میں تو اس کے پاس لیکن کیا کروں یارو — یکایک کچھ جگر میں آ کے لگ جاتا ہے نشتر سا
نظیرؔ اک دو گلے کرنے بہت ہوتے ہیں خوباں کے
چلو اب چپ رہو بس کھول بیٹھے تم تو دفتر سا

جال میں زر کے اگر موتی کا دانا ہوگا — وہ نہ اس دام میں آوے گا جو دانا ہوگا
آج دیکھ اس نے مری چاہ کی چتون یارو — منہ سے گو کچھ نہ کہا دل میں تو جانا ہوگا
پھر نظر دیکھیں گے اس عہد شکن کی صورت — دیکھیے کون سا یارب وہ زمانا ہوگا
خوں بہانے کا مرے حشر میں جب ہوگا بہا — دیکھیں کیا اس گھڑی قاتل کو بہانا ہوگا
وہاں بھی کچھ ایسی ہے کہہ دے گا کہ جب اس کو — بات کی بات بہانے کا بہانہ ہوگا
دیکھ لے اس چمن دہر کو دل بھر کے نظیرؔ — پھر تیرا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

دل فدا تجھ پہ جو لے سرو گل اندام ہوا — حلقہ زلف بتاں پھر اُسے کب دام ہوا
ہو گیا دیکھتے ہی مشرق خورشید خجل — اس کف پا سے مشرف جو سر بام ہوا

آ گیا اس میں وہ محبوب دل آرام نظیر
جب اُسے دیکھ لیا تب ہمیں آرام ہوا

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا — اسلام چھوڑ کفر لیا، پھر کسی کو کیا
اس بے وفا نے ہم کو اگر اپنے عشق میں — رسوا کیا، خراب کیا، پھر کسی کو کیا
آپ ہی کیا ہے اپنے گریباں کو ہم نے چاک — آپ ہی سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

دنیا میں آ کے ہم سے بُرا یا بھلا نظیر
جو کچھ کہ ہو سکا سو کیا پھر کسی کو کیا

سبھوں کو مے ہمیں خوناب دل پلانا تھا — فلک مجھی پہ تجھے کیا یہ زہر کھانا تھا
لگی تھی آگ جگر میں بجھائی اشکوں نے — اگر یہ اشک نہ ہوتے تو کیا ٹھکانا تھا
نگہ سے اس کی بچاتا ہے کس طرح دل کو — ازل سے یہ تو اسی تیر کا نشانا تھا
نہ کرتا خون میں ہمیں کس طرح وہ رنگین آہ — اسے تو ساتھ ہمارے یہ رنگ لانا تھا
شب فراق کی ادنیٰ سی اک یہ حالت ہے — کہ تھا جو گھر سو ہمارا وہ قید خانا تھا
جو کروٹیں تھیں سو وہ بے کلی کی شدت تھی — جو خواب تھا سو وہ دل غش میں ڈوب جانا تھا

غرض نہ سر کی خبر تھی نہ پا کا ہوش نظیر
سرہانا پائنتی اور پائنتی سرہانا تھا

کیا جو یار نے ہم سے پیام رخصت کا — تو دم نکل گیا سنتے ہی نام رخصت کا
مثال شمع کے ٹپ ٹپ ٹپک پڑے آنسو — سنا جو شوخ کے مُنہ سے کلام رخصت کا

تم اپنے ظلم سے ہرگز نہ باز آؤ گے
چلا، نظیر کسے لیجے، سلام رخصت کا

جب میں سنا کہ یار کا دل مجھ سے ہٹ گیا
سنتے ہی اس کے میرا کلیجا الٹ گیا
میں عشق کا جلا ہوں مرا کچھ نہیں علاج
وہ پیڑ کیا ہرا ہو جو جڑ سے اُکھٹ گیا
اتنا کوئی کہے کہ دوانے پڑا ہے کیا
جا دیکھ ابھی اُدھر کوئی پریوں کا غٹ گیا
آنکھوں میں میری صبح قیامت گئی جھمک
سینے سے اس پری کے جو پردہ الٹ گیا
یہ کشمکش ہوئی کہ گریباں مرا ادھر
ٹکڑے ہوا اور اس کا ڈوپٹہ بھی پھٹ گیا
آخر اسی بہانے ملا یار سے نظیر
کپڑے بلا سے پھٹ گئے سودا تو پٹ گیا

پھر آن کے منت سے ملا ہم سے وہ لالا
المنۃ للہ تقدس و تعالیٰ
گر قتل مجھے تو نے ہمیشہ کو جلایا
ظالم تجھے جیتا رکھے اللہ تعالیٰ
دیکھ اب تو مجھے ہر کوئی کہتا ہے یہی آہ
پھر قبر سے اللہ نے مجنوں کو نکالا
مر مر مجھے کہتا تھا سو مرتا ہوں میں یارو
اب لاؤ کہاں ہے وہ مرا کوسنے والا
شاید وہی بن ٹھن کے چلا ہے کہیں گھر سے
ہے یہ تو اسی چاند سی صورت کا اُجالا
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں
صدقے ترے پھر ایک نظر ہم کو دکھا لا
ہم تجھ سے اِسی روز کو روتے تھے نظیر آہ
کیوں تو نے پڑھا عشق و محبت کا رسالا

پھر ہو کے خفا روٹھ گیا ہم سے وہ لالا
اے داغ مبارک ہو تجھے منصب والا
یہ سیل کے اشکوں کی بیاباں میں نہیں نہر
پھوٹا کوئی مجنوں کے مگر پاؤں کا چھالا

شیریں کے دراو پہ جو ہے شیر نہ جانو — فرہاد کے لوہو کا چھلکتا ہے پیالا
کیا جانیے کس حال میں ہووے گا عزیز — دل آج مرا ، سلمہ اللہ تعالیٰ
وہ آپ سے رو دیکھا ہمیں منے کا نظیر آہ
کیا دیکھیے ہے چل پاؤں پڑا اور اسے منالا

مانی نے جو دیکھا تری تقدیر کا نقشا — سب بھول گیا اپنی وہ تحریر کا نقشا
اس ابروئے خم دار کی صورت سے عیاں ہے — خنجر کی شباہت ذم شمشیر کا نقشا
یہ زلف سیہ عارض قاتل پہ نہ جانو — تقدیر نے کھینچا ہے یہ زنجیر کا نقشا
کیا گردش ایام سے اے آہ جگر سوز — اُلٹا نظر آیا تری تاثیر کا نقشا
تدبیر تو کچھ بن نہیں آتی ہے نظیر آہ
اب دیکھیے کیا ہوتا ہے تقدیر کا نقشا

ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا — کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا
تو وہ ہے نور سراپا کہ تیری صورت کو — بشر تو کیا ہے اری جاں ملک نہ دیکھ سکا
گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے — ہمیں تو آہ فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا
یہ ناتواں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو — تو صورت اس کی اٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا
نظیر تم سے نہ ہوتا کبھی جدا پیارے
یہ کیا کرے کہ یہ کافر فلک نہ دیکھ سکا

ملا مجھ سے وہ آج چنچل چھبیلا — ہوا رنگ سن کر رقیبوں کا نیلا
کیا مجھ سے جس نے عداوت کا نیچہ — سنلقی علیہم عذاباً ثقیلا
نکل اس کی زلفوں کے کوچے سے اے دل — تو پڑھنا قم اللیل الا قلیلا

کہستاں میں ماروں اگر آہ کا دم   نکانت جبالاً کثیباً مہیلا
نظیر اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ
فقل حسبی اللہ نعم الوکیلا

کل جو رخ عرق فشاں یار نے ٹک دکھا دیا   پانی چھڑک کے خواب مست فتنے کو پھر جگا دیا
اس کے شرار حسن نے جلوہ جو اک دکھا دیا   طور کو سر سے پاؤں تک پھونک دیا جلا دیا
گزرے جو سوئے خانقاہ واں بھی بہ شکل جانماز   اہل صلاح و زہد کو فرش کیا بچھا دیا
نکلے جو راہ دیر سے اک ہی نگاہ مست میں   گبر کا صبر کھو دیا، بت کو بھی بت بنا دیا
سن کے یہ میرا عرض حال یار نے یوں کہا نظیر
چل بے زیادہ اب نہ بک تو نے تو سر پھرا دیا

خرام ناز سے اس شوخ نے دامن کو جب جھٹکا   ہماری خاک نے کیا کیا ہوا کے ساتھ سر پٹکا
نہیں گٹا عبادت کا ترے ماتھے پہ اے زاہد   نشاں ہے یہ کسی محبوب بے پروا کی چوکھٹ کا
نظیر آرام سے گر تجھ کو اس دنیا میں رہنا ہے
سوا اللہ کے ہرگز کسی سے دل کو مت اٹکا

سامنے اس صف مژگاں کے میں کل جاؤں گا   چھد تو جاؤں گا پر آگے سے نہ ٹل جاؤں گا
ہے کف بادہ مصفا کہ جیسے دھیان میں لا   پائے نظارہ یہ کہتا ہے پھسل جاؤں گا
مجھ کو دیتے ہو عبث خانۂ زنجیر میں جا   جوں صدا میں ابھی اس گھر سے نکل جاؤں گا
گرچہ ہوں بے حرکت ضعف سے جوں آتش سنگ   پر جو چھیڑا تو شرر ساں میں اچھل جاؤں گا
بے کلی آج بھی واں لے گئی مجھ کو تو نظیر
میں نے ہر چند یہ چاہا تھا کہ کل جاؤں گا

شہر دل آباد تھا جب تک وہ شہر آرا رہا　　جب وہ شہر آرا گیا پھر شہر دل میں کیا رہا
کیا رہا پھر شہر دل میں جز ہجوم درد و غم　　تھی جہاں بزم طرب واں لشکرِ غم آ رہا

آ رہا آنکھوں میں دم تو بھی نہ آیا وہ صنم
حیف کس سے پوچھیے جا کر کہ وہ کس جا رہا

عشق کا جو گُل زخم دم شمشیر کھلا　　رہ گیا جسم پہ مثل گل تصویر کھلا
طفل اشک اے مژہ چاہے کہ بہے تک تو اسے　　پیار سے، مہر سے، الفت سے بہ تدبیر کھلا

تو تدبیر میں ہم لیک خدا ہی جانے
کون سا گل ہے پس پردہ تقدیر کھلا

کان میں نام خدا اس مہ کے جب بالا پڑا　　آ گئی چکر میں برق اور ماہ پر ہالا پڑا
دیکھنا ہمدم یہ اترا سنبلستاں میں قمر　　یا تہ کاکل کسی کے چھلے سے ہے بالا پڑا
لائق اس بالے کے گوہر یہاں تو ہاتھ آیا نہ ایک　　دیکھنا ہم کو مگر اب عالم بالا پڑا
گوہر مقصود سمجھے ہم وہی اس راہ میں　　پاشنہ سے تا سر انگشت جو چھالا پڑا
دیکھ نقش تن مرا اپنی گلی کی خاک پر　　ق　یوں کہا یاں تو نہ دیوانہ نہ متوالا پڑا
نیند بھر کر سکھ سے سونے کے لئے اس جا مگر　　رات تھا کوئی ہمارا چاہنے والا پڑا
کل گُل لالہ سے پوچھا میں نے اے دل سوختہ　　ق　کس سبب سینے میں تیرے داغ یہ کالا پڑا
سن کے بولا جس سے تو جھنکتا ہوا آیا ہے یہاں　　یار مجھ پر بھی اسی آتش کا پرکالا پڑا

سنگ دل محبوب کو کہنا غلط تھا پر نظیر
ہم نے جب جانا جب اس بے درد سے پالا پڑا

دیکھ لے عالم جو اس کے حُسن بالا دست کا　　حوصلہ اتنا کہاں اپنی نگاہِ پست کا

نیست رہتے ہم تو یہ سیریں کہاں سے دیکھتے — یہ فقط احسان ہے اُس ذاتِ پاکِ ہست کا
بے صدا آ کر لگا، اور ہو گیا سینہ سے پار — یہ خدنگِ ناز تھا کس بے نشاں کی شست کا
پنجۂ خورشید رنگین خونِ حسرت سے ہوا — برق ساں چمکا جو رنگ اس کے حنائی دست کا

بات کچھ کہتا ہے اور نکلے ہے کچھ منہ سے نظیرؔ
یہ نشا ایسا ہوا کس کی نگاہِ مست کا

لائے خاطر میں ہمارے دل کو وہ مغرور کیا — جس کے آگے مہر کیا، مہ کیا، پری کیا حور کیا
دل نیا ہم نے لگایا ہے بتا دو، مہرباں — اس کی ہے رہ کیا روش کیا رسم کیا دستور کیا
یاد ہوں عیاریاں جس کو بہت پھر بس کریں — اُس کے آگے مکر کیا چھل کیا فسوں کیا زور کیا
یوں کہا ہم بوسہ لیں گے اب تو چھو کر زلف کا — بولا منہ کیا دست گہ کیا تاب کیا مقدور کیا

ہم کو چاہت ایک ہی ہے اس پری رو کی نظیرؔ
روبرو کیا درقفا کیا متصل کیا دور کیا

دل ہوا جس روز بسمل ابروئے خمدار کا — تھا وہی پہلا دن اُس بسمل کی بسم اللہ کا
جس نے دیکھا وہ رخِ انور تو اُس کو عمر بھر — پھر نہ روئے مہر خوش آیا نہ چہرہ ماہ کا
ایک دن آگے خلیل اللہ کے ایک شخص نے — یک بیک آ کر لیا منہ سے جو نام اللہ کا
اُس خلیل اللہ نے سنتے ہی آ کر شوق میں — سب دیا اُس کو جو تھا اسبابِ عز و جاہ کا
اور کہا اے شخص پھر بہرِ خدا یہ نام لے — میں بجاں مشتاق ہوں اس اسمِ خاطر خواہ کا
گر وہ لیتا نام پھر اللہ کا تو بالیقیں — جی نکل جاتا وہیں حضرت خلیل اللہ کا
حاصل اس کہنے سے اُس کی چاہ کچھ آساں نہیں — جب کوئی ایسا ہو تب لے نام اُس کی چاہ کا

اس میں کیا طاقت جو مالک ہو کوئی بت اے نظیرؔ

جان بھی اللہ کی اور مال بھی اللہ کا

دریا و کوہ و دشت و ہوا ارض اور سما　　دیکھا تو ہر مکاں میں وہی ہے رہا سما
ہے کونسی وہ چشم نہیں جس میں اس کا نور　　ہے کونسا وہ دل کہ نہیں جس میں اُس کی جا
قمری اُسی کی یاد میں کو کو کرے ہے یار　　بلبل اسی کی شوق میں کرتی ہے چہچہا
مفلس کہیں غریب تونگر کہیں غنی　　عاجز کہیں نبل کہیں سلطاں کہیں گدا
بہروپ سا بنا کے ہر اک جا وہ آن آن　　کس کس طرح کے روپ بدلتا ہے واہ وا
ملکِ رضا میں لیکے توکّل کی جنس کو　　بیٹھے ہیں سب اسی کی دکانیں لگا لگا
سب کا اُسی دکان سے جاری ہے کاروبار　　لیتا ہے کوئی چین کوئی دل ہے بیچتا

دیکھا جو خوب غور سے ہم نے تو یاں نظیر
بازار مصطفےٰ سے خریدار ہے خدا

ترے رخسار رنگیں نے کیا دل زیر پھولوں کا　　ترے حسنوں کی فوجوں نے دیا رخ پھیر پھولوں کا
بدن گل چہرہ گل لب گل اور دہن ہے گل　　سراپا اب تو وہ رشکِ چمن ہے ڈھیر پھولوں کا
یہ پر بلبل کے اکھڑے مت سمجھ اے باغباں ہرگز　　ہوا ہے میکدہ میں لوٹ کر یہ ڈھیر پھولوں کا

گلے میں ہار اور ہاتھوں میں گجرے ہو کے یوں لپٹے
خدا کے واسطے دیکھو ذرا اندھیر پھولوں کا

اک پردۂ ہستی نہ رہا جوں نظر آیا　　وہ پردہ بر انداز ہمیں کیوں نظر آیا
اس مہرِ پُر انوار سے شبنم کی طرح ہم　　گم ہوتے گئے ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا

سرسبز دل جلوں کو نہ ہرگز کرے فلک　　دانہ کہیں اگا ہے جو آتش میں بھن گیا
جب سے ہوئے ہیں وہ لب جاں بخش جلوہ گر　　تب سے تمام نسخۂ عیسیٰ کا گُن گیا

پہنچے نہ ذیل وصف میں دست اس کے عام کا — موصوف ہو جو خاص خدا کے کلام کا

چمن طرازِ حقیقی نے اپنی صنعت سے — کسی کو پھول بنایا، کسی کو گھاس کیا

وصل اس کا ہوتا کیونکر میسر — وہ نورِ جاں تھا، میں آب و گل تھا

جو وصف زلف کو پوچھا تو حلقے حلقے کو — آب دمرجع و لجائے صد اسیر کہا

دیکھ اُسے رنگِ بہار و سرو و گل اور جو بنا — اک اُڑا، اک گر گیا، اک جل گیا، اک کٹ گیا

تو ہے وہ گل اے جان کہ ترے باغ میں ہے شوق — جبریل کو بلبل کی طرح نغمہ زنی کا

نہ آئی بو جو ذرا تیرے مصحفِ رُخ کی — نسیم پھاڑ گئی آ کے ہر ورق گُل کا

ہم وہ درخت ہیں کہ جسے دم بہ دم قضا — ارہ ادھر دکھاتی ہے، اُدھر تبر قضا

بتوں کی ناز برداری میں بھی تیری عبادت ہے — مری اس بندگی کا اب تو ہی شاہد ہے معبودا

عزیزو کیا پڑے سوتے ہو غفلت میں ذرا جاگو — جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محمل ہا

نظیر اب اس ندامت سے کہوں کیا — فآہا، ثُمّ آہا، ثُمّ آہا

پان سے سرخ ہوئے پھر بتِ عیار کے لب — دیکھ اس وقت تو اے دل مرے خونخوار کے لب
منفعل ہو کے کبھی دعویٰ سرخی نہ کرے — دیکھے گر لعل بدخشاں مرے دلدار کے لب
خوف نرمی و نزاکت کا مجھے ہے ورنہ — چوم لوں میں ابھی اس شوخ پری وار کے لب
لذتِ زندگی اس دم مجھے ہووے گی نظیر
جب ملے ہوں گے بہم میرے لب اور یار کے لب

اس کی تجلی سے کب ہووے دوچار آفتاب — ایک تو کیا ہے اگر ہوویں ہزار آفتاب
پاس ادب ہے اُسے ورنہ ترے حسن پر — حکم جو ہو تو ابھی ہووے نثار آفتاب
خانہ زیں میں تجھے دیکھے تو پھر رشک سے — توسنِ افلاک پر ہو نہ سوار آفتاب
ایک نظر گر تجھے دیکھیں تو شادی سے پھر — مہ کو لگیں چار چاند، مہر کو چار آفتاب
جیسے یہ ہیں مہر و مہ ایسے تو اس کے نظیر
چمکیں ہیں سو ماہتاب اور ہزار آفتاب

ہو تیرے مہر حسن سے کب ہم سر آفتاب — ذرہ تری نگاہ سے ہو یکسر آفتاب
تو حسن میں وہ مہر سپہر جمال ہے — ہر روز جبہہ سا ہے ترے در پہ آفتاب
ہر لحظہ تیرے چہرۂ انور کے وصف میں — یہ بیت پڑھ رہا ہے فدا ہو کر آفتاب
از بہر دفع چشم بد از روئے خوب تو — سیارہ ہا سپند شود ، مجمر آفتاب
اس مہر کبریا کی اشارت سے اے نظیر
مغرب تلک پہونچ کے پھرا اکثر آفتاب

ہوا جو ہم کو وہ کوچہ چمن سرشت نصیب — خدا نے ہم کو اسی جا کیا بہشت نصیب

جُدا جو اس سے ہوئے ہم تو اپنی قسمت سے — ہے وہ تو خوب پر اپنے ہی کچھ ہیں زشت نصیب
لکھیں نہ حرف وفا کیا کریں کہ اول سے — ہوئی قلم کو ہمارے یہی نوشت نصیب
زمینِ دل میں گرایا ہے تخم تو لیکن — کریں گے دیکھئے سرسبز کب یہ کِشت نصیب
یہ کم نصیب ہوئے ہم کہ بعد مرگ نظیرؔ
ہوئی مزار کو اپنے نہ ایک خشت نصیب

ساقی شراب ہے تو غنیمت ہے اب کی اب — پھر بزم ہوگی جب تو سمجھ لیجو جب کی جب
ساغر کے لب سے پوچھئے اس لب کی لذتیں — کس واسطے کہ خوب سمجھتا ہے لب کی لب
کم فرصتی سے عمر کی اپنی ہزار حیف — جتنی تھیں خواہشیں وہ رہیں دل میں سب کی سب
سُن کر وہ کل کی آج نہ ہو کس طرح خفا — اے ناشناس طبع کہی تو نے کب کی کب
پھولا ہوا بدن میں سماتا نہیں نظیرؔ
وہ گُل بدن جو پاس رہا اس کے شب کی شب

کچھ اور تو نہیں ہمیں اس کا عجب ہے اب — یعنی وہ شوخ ہم سے خفا بے سبب ہے اب
آہ و فغان و گریہ و اندوہ و درد و داغ — جو جنس عشق ہے وہ مرے پاس سب ہے اب
دیکھے سے جس کے غنچہ صفت گُل ہو رشک سے — ایسا تو اس چمن میں وہی غنچہ لب ہے اب
صبح فلک بھی جس کی تجلی سے ہو خجل — اس رشک ماہتاب سے اپنی وہ شب ہے اب
آئینہ ایک دم نہیں رکھتا ہے ہاتھ سے — ایسا وہ اپنے رخ کا تماشا طلب ہے اب
اس گل بدن کے وصل سے ہر دم نظیرؔ کو
سب سے زیادہ خلق میں عیش و طرب ہے اب

خوباں میں اس طرح ہے وہ دلخواہ سب سے خوب — جوں وقت شب ستاروں میں ہے ماہ سب سے خوب

محبوب کا جو وصل تصور میں ہو تو پھر — مشتاق وصل کو ہے یہی راہ سب سے خوب
دل جس کو چاہتا ہو اُسے بھی خبر نہ ہو — اپنے تو فہم میں ہے یہی راہ سب سے خوب
کیسا ہی وہ بُرا ہو تو لگ جائے جس سے دل — لگتا ہے دل کو پھر وہی واللہ سب سے خوب

خوبی میں خوب رد تو سبھی خوب ہیں نظیر
پر خوب غور کی تو ہے اللہ سب سے خوب

بوسہ اس دل سے نہ کرائے دل افگار طلب — یہ زیادہ طلبی ہے نہ ہو دشوار طلب
جلد آ یار کہ اب ہم کو ستاتے ہیں بہت — گوش گفتار طلب، دیدۂ دیدار طلب
ربط اس عربدہ جو سے ہیں کس طور سے ہو — ہم تو ہیں صلح طلب اور وہ ہیں پیکار طلب
آرزو خوب ہے موقع سے اگر ہو ورنہ — اپنے مقصود کو کم پہنچے ہیں بسیار طلب

عذر عاصی کو نہیں چاہئے کچھ اس سے نظیر
جس خطا پوش کی رحمت ہے گنہگار طلب

جب کھلے اس معجزہ آرا کے لب — بند ہوئے حضرت عیسیٰ کے لب
عشق میں اس گوہر نایاب کے — آج تلک خشک ہیں دریا کے لب
لعل بھی ہو رشک سے یاقوت زرد — دیکھے اگر اس در یکتا کے لب
نام سے اس لب کے ہیں لب پُر از شہد — خلد میں حوران شکرخا کے لب
ایک تبسم میں کریں لاکھ کام — ایسے ہیں اس شاہد رعنا کے لب
تھی وہ اسی لب کی شکر جس کو دیکھ — مصر میں چپکے تھے زلیخا کے لب

اس لب جاں بخش کے آگے نظیر
کس کو خوش آتے ہیں مسیحا کے لب

کس کے لئے کیجئے جامۂ دیبا طلب — دل تو کرے ہے مدام دامن صحرا طلب
کامروا ہوں بھلا اس سے ہم اب کس طرح — اس کو تمنا نہیں، ہم ہیں تمنا طلب
کس سے کہیں کیا کریں ہے یہ تماشے کی بات — وہ تو ہے پردہ نشیں ہم ہیں تماشا طلب
کہئے تو کس کس کے اب غور کرے وہ طبیب — جس کے طلبگار ہوں لاکھ مداوا طلب

ایک تمنا ہو تو یار سے کہئے نظیرؔ
دل ہے پر از آرزو کیجئے کیا کیا طلب

ہے اب تو وہ ہمیں اس سرو سیم بر کی طلب — کہ طائران ہوا سے ہے، بال و پر کی طلب
جو کہئے حسن کو خواہش نہیں یہ کیا امکاں — اُسے بھی اہل نظر سے ہے اک نظر کی طلب
کمال عشق بھی خالی نہیں تمنا سے — جو ہے ایک آہ تو اس کو بھی ہے اثر کی طلب
پری رخوں کو غرض کیا تھی زیب و زینت سے — نہ ہوتی گر انہیں اپنے نظارہ گر کی طلب
طلب سے کس کو رہائی ہے بحر ہستی میں — اگر صدف ہے تو اس کو بھی ہی گہر کی طلب
چمن میں بلبل و گل بھی ہیں اپنے مطلب کے — اسے ہے گل کی طلب اس کو مشت پر کی طلب

جہاں وہ باغ تمنا ہے جس کے بیچ نظیرؔ
جو اک شجر ہے تو اس کو بھی ہے ثمر کی طلب

ہو کس طرح نہ ہم کو ہر دم ہوائے مطلب — دیکھا جو خوب ہم نے دنیا ہے جائے مطلب
جو گلبدن کہ آیا آغوش میں ہمارے — کچھ اور بو نہ نکلی اس میں سوائے مطلب
عشاق کی بھی الفت خالی نہیں غرض سے — مرتے ہیں یہ بھی اس پر جس سے برائے مطلب
کوئی کسی کے اوپر ہم نے فدا نہ دیکھا — منہ پر فدا ہیں لیکن دل میں فدائے مطلب
مطلب سے آشنا کو ہو کس سے آشنائی — کب آشنا کسی کا ہو آشنائے مطلب

گر بزم رقص دیکھی تو واں بھی گوش دل میں کوئی صدا نہ آئی غیر از صدائے مطلب
زیرِ فلک تو ہم سے جاتی نہیں تمنا ہاں پھر فلک پہ جاویں جب ہم سے جائے مطلب
وہ آبرو کہ جس پر کرتے ہیں جاں تصدق اس کو بھی دے چکے ہیں اکثر برائے مطلب
جب حرف آبرو تک پہنچا نظیرؔ پھر تو
کیا کہیے ایسی جاگہ جز یہ کہ ہائے مطلب

یوں جھمکتا ہے رخ اس محبوب کا زیرِ نقاب ہو نمایاں جس طرح ابرِ تنک میں آفتاب
دیکھ اس مہ رو کے رخ کا رات چشمِ تر میں عکس کیا ہی لوٹا رشک سے دریا میں عکسِ ماہتاب
کیا نزاکت ہے کہ اس نازک کمر کے روبرو رشتۂ ساں حسرت سے کھاتی ہے رگِ گل پیچ و تاب
رنگِ رخسار اس گلِ باغِ حیا کا دیکھ کر قطرۂ شبنم نہیں ہے شرم سے گل آب آب
وہ عرق آلود رخ جس دن سے آیا ہے نظر جب سے ہم واقف نہیں کیسا گل اور کیا گلاب
جس کی ایک دم لڑ گئی اس چشمِ میگوں سے نگاہ پھر اُسے یارو کہاں کا جام اور کیسی شراب
خواب کر جاتا ہے رم ایک لخت آنکھوں سے نظیرؔ
یاد آ جاتی ہے جب ساقی کی چشمِ نیم خواب

بحرِ ہستی میں صحبتِ احباب یوں ہے جیسے بروئے آب حباب
بادۂ ناب کیا ہے خونِ جگر زرد ئی رنگ ہے شبِ مہتاب
جس کو رقص و سرود کہتے ہیں وہ بھی ہے ایک ہوائے خانہ خراب
حسن اور عشق جن کو کہتے ہیں خفقۂ برق و قطرۂ سیماب
گردشِ آسماں میں ہم کیا ہیں پر کا ہے میانۂ گرداب
عمر کہتے ہیں جس کو وہ کیا ہے مثلِ تحریرِ موج نقش بر آب

جسم کیا روح کی ہے جولانگاہ — روح کیا ایک سوار پا بہ رکاب
زندگانی و مرگ بھی کیا ہیں — ایک مثل خیال و دیگر خواب
فرصت عمر قطرۂ شبنم — وصل محبوب گوہر نایاب
قفس غم ہے مسکن وادی — اشک حسرت بجائے دانۂ آب
سب کتابوں کے کھل گئے معنی
جب سے دیکھی نظیرؔ دل کی کتاب

جو کچھ ہے حسن میں ہر مہ لقا کو عیش و طرب — وہی ہے عشق میں ہر مبتلا کو عیش و طرب
اگرچہ اہل نوا خوش ہیں، ہر طرح لیکن — زیادہ اُن سے ہے ہر بے نوا کو عیش و طرب
وہ میکدے میں حلاوت ہے رند میکش کو — جو خانقاہ میں ہے پارسا کو عیش و طرب
رکھے ہے ہر تن عریاں برہنہ پائے وہی — جو کچھ ہے صاحب اسپ و قبا کو عیش و طرب
کمال قدرت حق ہے نظیرؔ کیا کہیئے
جو شاہ کو ہے وہی ہے گدا کو عیش و طرب

جو اس کی چشم گلابی کی دیکھ پائے شراب — تو اس کو حشر تلک ہو نہ پھر ہوائے شراب
ہماری بزم میں ہے مے فروش کا کیا کام — وہ اپنے وہاں کے ہی لوگوں میں بیچ کھائے شراب
ہم اس شراب کے خواہاں نہیں ہیں اے ساقی — پئیں جو تو ہمیں اس چشم کی پلائے شراب
نشہ جو اس کی نگہ میں ہے وہ نہ ہو ہرگز — اگر ہزار طرح کی کوئی بنائے شراب
جہاں میں موسم گل ہے میں کیا کروں ہیہات — مجھے تو آب میسر نہیں چہ جائے شراب
بہ قول حضرت صائب ہزار حیف نظیرؔ
کہ در بہار ندارم بہ کف بہائے شراب

ہو حسن اثر کیوں نہ مری آہ میں یارب — سب کچھ ہے مہیا تری درگاہ میں یارب
پہنچے ہے وہی منزل مقصود کو جو شخص — چلتا ہے فدا ہو کے تری راہ میں یارب
ہر جاہ میں ملتا ہے اسے یوسف اقبال — جو تشنہ و والا ہے تری چاہ میں یارب
جو خانہ بدوشی میں ہے طالب کو ترے عیش — وہ عیش نہیں خیمہ و خرگاہ میں یارب

اپنا ہی طلبگار نظیرؔ اپنے کو رکھیو
ہر طور میں، ہر رسم میں، ہر راہ میں یارب

ترے مریض کو اے جان شفا سے کیا مطلب — وہ خوش ہے درد میں اس کو دوا سے کیا مطلب
فقط جو ذات کے ہیں دل سے چاہنے والے — انہیں کرشمہ و ناز و ادا سے کیا مطلب
نہال تازہ رہیں نامیہ کے منت کش — درخت خشک کو نشو و نما سے کیا مطلب
مراد و مقصد و مطلب ہیں سب ہوس کے ساتھ — ہوس ہی مر گئی پھر مدعا سے کیا مطلب
مجھے وہ پوچھے تو اُس کا ہی لطف ہے ورنہ — وہ بادشاہ ہے اُسے مجھ گدا سے کیا مطلب
جو اپنے یار کے جور و جفا میں ہیں مسرور — انھیں پھر اور کے مہر و وفا سے کیا مطلب

رضائے دوست جنھیں چاہیے بہر صورت
نظیرؔ پھر انھیں اپنی رضا سے کیا مطلب

نہ دل میں صبر نہ اب دیدۂ پُر آب میں خواب — شتاب آ کہ نہیں آوے اس عذاب میں خواب
جہاں بھی خواب ہے اور ہم بھی خواب ہیں اے دل — عجب بہار کا دیکھا یہ ہم نے خواب میں خواب
ہماری چشم کا اے شہسوار توسن ناز — جو غور کی تو کیا ہے تری رکاب میں خواب
ہر ایک مکاں میں گزرگاہ خواب ہے لیکن — اگر نہیں تو نہیں عشق کے جناب میں خواب
ہجوم اشک میں لگتی ہے چشم تر اس طور — کہ جیسے ماہی کو آتا ہے اپنے آب میں خواب

روا روی میں لگے آنکھ کس طرح سے نظیرؔ
مسافروں کو کہاں ایسے اضطراب میں خواب

ہنسنا ہوا ازل سے کب اے یار کے نصیب
رونا ہماری دیدۂ خونبار کے نصیب

دل سا در یتیم بکا اک نگہ کے مول
کیا کہئے خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

بھیجے ہے جام خور نہیں ہوا ہر سحر مسیح
اس اوج پر ہیں اب ترے بیمار کے نصیب

بازار یوسفی میں نہ دیکھی تھیں خواب میں
جو گرمیاں ہوئیں ترے بازار کے نصیب

دیکھ اس کو آج باغ میں بولی یہ بلبلیں
بارے کھلے ہمارے بھی گلزار کے نصیب

غش تھے معانقے کی تمنا میں ہم و لے
وہ بھی سنا کہ اب کے ہوا ہار کے نصیب

کل ہم سے روٹھ کر وہ رقیبوں سے جا ملا
چمکے ہیں کیا ہی دیکھئے اغیار کے نصیب

جس گل کو اپنے سر پہ چڑھاتے تھے ہم نظیرؔ
وہ گل ہوا رقیب کے دستار کے نصیب

نامہ کو میرے دھو کے نہ اس نے لکھا جواب

اتنا تو نامہ بر سے نہ ہوتا میں شرمسار
اے کاش بھیجتا وہ برا یا بھلا جواب

بہروں تلک میں کہتا ہوں حال اپنا پر مجھے
وہ اپنی ایک بات میں کرتا ہے لاجواب

حاضر جوابی دیکھو کہ لب سے مرے ہنوز
نکلا نہیں سوال کہ وہاں ہو گیا جواب

کوچے سے اس کے آتا ہوں یوں ہو کے ناامید
نوکر شکستہ حال کو جیسے ملا جواب

کہتا ہے تو تو جیتا ہے اپنی خوشی سے اب
ورنہ میاں خدا تو تجھے دے چکا جواب

کھوئی تمام عمر بتوں کی جناب میں
دے گا نظیرؔ کیا تو خدا کو بھلا جواب

ہیں گو کہ یوں تو اور بھی محبوب خوب خوب　　لیکن اُسی کو کہتے ہیں سب خوب خوب خوب
نام خدا میں کیا کہوں اس گل کے حُسن میں　　کیا کیا پڑے ہیں ناز کے اسلوب خوب خوب
فضل خدا سے اب تو نظیر اپنی بزم میں　　اسباب سب ہیں عیش کے مرغوب خوب خوب
ہیں اس طرف تو ساقی و مطرب کرشمہ سنج
اور اس طرف کو بیٹھے ہیں محبوب خوب خوب

تمھاری آن عزیزا اور ہر ایک ادا محبوب　　تمھیں ہو حسن میں اب سر سے تا بہ پا محبوب
تمھیں وہ ہو کہ تمھیں دیکھنے ہم آتے ہیں　　وگرنہ یوں تو ہزاروں ہیں جا بجا محبوب
کہیں جو ہم تمھیں محبوب مت بُرا مانو　　بھلا ہم اور کہیں کیا تمھیں سوا محبوب
جو چاہے آپ سے محبوب بن سکے کیا ذکر　　وہی بنے ہے کہ جس کو خدا کرے محبوب
تمھاری آج وہ محبوبیاں ہیں نام خدا　　کہ تم کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں دلربا محبوب
کوئی کہے ہے بصد اشتیاق دل یا دوست　　کوئی پکارے ہے بیتاب ہو کے یا محبوب
نظیر بھی تمھیں اب دیکھ کر یہ کہتا ہے
الٰہی خلق ہو اور میں ہوں اور مرا محبوب

گزرے خوشی سے نہ وہ دم کبھی اے وائے نصیب　　تھے عجب کلک وہ جس سے مرے لکھوائے نصیب
قاصد اس دولت بیدار سے کہیو کہ کبھی　　دو گھڑی آ کے ہمارے بھی جگا جائے نصیب
آویں ہم بھی جو تری بزم میں جوں شمع اے جاں　　ایسے ہم سوختہ بختوں نے کہاں پائے نصیب
یار دیکھ اس کو لگے رکھنے عداوت مجھ سے　　دوست بھی ہو گئے دشمن مرے اے وائے نصیب
ایک دم نزع میں لائے نہ اُسے بالیں پر　　اپنے قسمت سے تو اتنے بھی نہ کام آئے نصیب
یاد آتا ہے ہمیں جب وطن اپنا تو نظیر

سر کو حسرت سے پٹک کہتے ہیں ہم ہائے نصیب

یہ گلہ دل سے تو ہرگز نہیں جانا صاحب　　سب نے جانا ہمیں پر تم نے نہ جانا صاحب
ان بیانوں سے غرض ہم نے یہ جانا صاحب　　آپ کو خون ہمارا ہے بہانا صاحب
چھوڑ کر آپ کے کوچے کو پھروں صحرا میں　　سو تو مجنوں سا نہیں ہوں میں دوانا صاحب
یاد تھے ہم کو جوانی میں تو سو مکر و فریب　　ایک کرشمہ تھا تمھیں دام میں لانا صاحب

اب جو بوڑھے ہیں تو اب بھی ہیں شیطان نظیر
ہنس کے کہتا ہے اجی آئیے نانا صاحب

تمھارے ہاتھ سے کل ہم بھی رو لئے صاحب　　جگر کے داغ جو دھونے تھے دھو لئے صاحب
غلام عاشق و چاکر مصاحب و ہمراز　　غرض جو تھا ہمیں ہونا سو ہو لئے صاحب
قرار صبر جو کرنے تھے کر چکے برباد　　حواس و ہوش جو کھونے تھے کھو لئے صاحب
ہمارے وزن محبت میں کچھ ہو فرق تو اب　　پھر امتحاں کی ترازو میں تو لئے صاحب
کچھ انتہائے بکا ہو تو اور بھی یک چند　　سرشک چشم سے موتی کو رو لئے صاحب
کل اس صنم نے کہا دیکھ کر ہمیں خاموش　　کہ اب تو آپ بھی ٹک لب کو کھو لئے صاحب

یہ سن کے میں نے نظیر اس سے یوں کہا ہنس کر
جو کوئی بولے تو البتہ بو لئے صاحب

کچھ اسے شرم کچھ ہے ہم کو حجاب　　ہے نئی چاہ میں یہ طرفہ عذاب
کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے　　یار مہ چہرہ اور شب مہتاب
زور کیفیتیں دکھاتے ہیں　　ساقی گلعذار و بادہ ناب
کرتے ہیں تار تار جیب الم　　تار قانون و بین و چنگ و رباب

وقت خلوت یہ ہم نے اس سے کہا قطعہ اب تو ٹک مُنہ سے دور کیجئے نقاب
بولے ہم تو ابھی اُٹھا دیں مگر لائیں کب آپ دیکھنے کی تاب
اور جو آجاوے غش تمھیں تو نظیر
پھر چھڑکنا پڑے گا ہم کو گلاب

رکھتا ہے صدا ہونٹ کو جوں گل کی کلی چپ وہ غنچہ دہن آہ یہ سیکھا ہے بھلی چپ
سوتا ہے تو لیتا ہوں میں یوں چوری سے بوسہ جوں مُنہ میں کھلاوے کوئی مصری کی ڈلی چپ
منت سے کہا ہم نے تو تم آہ نہ بولے جب خیر نے کی گدگدی پھر کچھ نہ چلی چپ
پروانے سے عاشق کے تئیں شمع جلا کر پھر آپ بھی روتی ہے کھڑی بخت جلی چپ
سبزی بھی اُگی باغ میں غنچے بھی کھلے آہ پر اس مری گونگی کے لبوں سے نہ ٹلی چپ
غصے میں رقیب آتا ہے جب بھوت سا جن کر پڑھتا ہوں میں جب دل میں کھڑا نادعلی چپ
مر جائیں پہ شکوے کی کبھی بات نہ نکلے یہ ہونٹھ وہ ہیں جن میں ازل سے ہے پلی چپ
جس دم یہ خبر جا کے رقیبوں کو ہوئی پھر بس سنتے ہی سُن ہو گئے اور سانس نہ لی چپ
اُلٹی ہی سمجھ یار کی سُنتا ہے نظیر آہ
زنہار نہ کچھ بولیو یہاں سب سے بھلی چپ

دل کو لے کر ہم سے اب جاں بھی طلب کرتے ہیں آپ لیجئے حاضر ہے پر یہ تو غضب کرتے ہیں آپ
مورد تقصیر گر کرتے ہو لازم تھی سزا یہ جفا پھر کہئے ہم پر کس سبب کرتے ہیں آپ
کرتے ہو ابرو سے کشتہ رُخ سے دیتے ہو جلا حسن میں اعجاز کیا کیا روز و شب کرتے ہیں آپ
قیس سے جو تھا کیا در پردہ لیلیٰ نے سلوک سو ہی اے مہرباں ہم سے بھی اب کرتے ہیں آپ
بے کلی ہوتی ہے حسرت سے دل صد چاک کو اپنی زلف عنبریں میں شانہ جب کرتے ہیں آپ

ہم نے پوچھا پھر بھی اس کی جاں پھری سب جسم میں　　نزع میں دُوری ہے جس کو جاں بہ لب کرتے ہیں آپ
ہنس کے فرمایا نظیرؔ اپنی نگاہ لطف سے
یہ بھی ہو سکتا ہے کیا اس کا عجب کرتے ہیں آپ

ہے جو اس محبوب کی انگشتری در دستِ چپ　　رکھتی ہے کیا کیا نزاکت پروری در دستِ چپ
آج صہبا کی گلابی اس کے ہے در دستِ راست　　اور چھلکتی مے کی اک پیالی بھری در دستِ چپ
جس کماں کو کھینچتا ہے وہ بتِ ابرو کماں　　اس کے قبضے میں ہے سو زینت وری در دستِ چپ
کچھ جو لکھتا ہے قلم لے کر تو پھر کیا کیا رقم　　کرتے ہیں قرطاس پر زیب آوری در دستِ چپ
کل تو بائیں ہاتھ میں تسبیح رکھتا تھا نظیرؔ
اور مصلے کی عنایت گستری در دستِ چپ

نہ چین گھر میں نہ کل ہے باہر نہیں جو تم نے دکھائی صورت　　تمہارے ناز و عتاب نے تو عجب ہماری بنائی صورت
وہ شکل دیکھی تو ہو کے بے حس رہے تحیر میں اس طرح ہم
نظر میں آنکھوں میں اور جاں میں بھری اسی کی وجاہتیں ہیں　　کچھ ایسے نقشے سے اپنے دل میں ہے اب کسی کی سمائی صورت
پری کی بیہودہ ہمسری نے کیا جو اس کا مزاج برہم　　تو آپ ہی ہو کر خجل وہ بولی کہ ایسی کب ہم نے پائی صورت
بیان ہو کیا حسن صورت اس کا جو دیکھ آئینہ ہے یہ کہتا　　ہو ایسی صورت تو پھر غرض کیا ہمیں جو دیکھیں پرائی صورت
الم میں چاہت کے اب ہماری بدل گئی ہے جو شکل ہمدم　　کسی کو پھر یاد کیا رہے جب ہمیں نے اپنی بھلائی صورت
نظیرؔ محفل میں گل رخوں کی جو ہم نے دیکھا تو اُن سبھوں میں
فدا ہوا ہے دل اپنا جس پر اسی کی ہم کو خوش آئی صورت

اے چشم جو یہ اشک تو بھر لائی ہے کم بخت　　اس میں تو سراسر مری رسوائی ہے کم بخت
الفت میں تو اے دل تری رسوائی ہے کم بخت　　کم بخت تجھے کیا یہی اب بھائی ہے کم بخت

اِس قد میں جو رعنائی و زیبائی ہے اے سرو
مت بھول کہ وہ تو نے نہیں پائی ہے کم بخت

ایک بات بھی مل کر نہ کریں اُس سے ہم اے چرخ
کیا تجھ کو یہی بات پسند آئی ہے کم بخت

یارو ہمیں تکلیف نہ دو سیرِ چمن کی
آنے دو بلا سے جو بہار آئی ہے کم بخت

رہنے دو ہمیں کنجِ قفس میں کہ ہماری
قسمت میں یہی گوشۂ تنہائی ہے کم بخت

اس جام نگوں سے مئے راحت نہ طلب کر
یہاں بادہ نہیں بادیہ پیمائی ہے کم بخت

توڑے ہیں بہت شیشۂ دل جس نے نظیرؔ آہ
یہ چرخ وہی گنبدِ مینائی ہے کم بخت

آگے ہی دل اپنا تو یہ سودائی ہے کم بخت
اور تس پہ سنا یہ کہ بہار آئی ہے کم بخت

کھل گیا رخسار اس کا جس گھڑی کاکل سمیت
حسن کے گلشن میں دیکھا ہم نے گل، سنبل سمیت

ہم کو دیکھا باغ میں اس نازنیں کے ساتھ جب
ہو گئی محوِ نگاہِ رشک بلبل، گل سمیت

بزم میں اس کی بہارِ چشم مے گوں دیکھ کر
کیا کہوں کیا کیا ہوا مدہوش ساقی مُل سمیت

اس کے بازو کی لچک سے لگ گئے یوں ہلنے دل
جس کی جُنبش پر فدا ہو شاخِ گُل بلبل سمیت

خوش ہوا دل میں، دلے ناخوش وہ ظاہر میں نظیرؔ
آ گیا اس کی نظر جب ہاتھ میرا گل سمیت

صورت کبھی دکھلائی تو اس میں بھی لگاوٹ
باتوں کی جو ٹھیرائی تو اس میں بھی لگاوٹ

آتے نہیں اول تو کہیں اور کہیں شاید
تشریف جو فرمائی تو اس میں بھی لگاوٹ

جس بات میں کچھ رمز تھی اور ہم جو نہ سمجھے
وہ ہم کو جو سمجھائی تو اس میں بھی لگاوٹ

بوسے کا جو اقرار کیا وہ بھی فقط جُل
اور ہنس کے قسم کھائی تو اس میں بھی لگاوٹ

ہنسنے میں نظیر اس کے لگاوٹ تو ہے لیکن
ابرو میں جو چین آئی تو اس میں بھی لگاوٹ

دے کے دل بے مہر کو کرنا گلہ یہ بھی عبث — اور جو کہیے اس سے مت کر تو جفا یہ بھی عبث
دام میں پھنس کر غلط فہمی ہے کہنا چھوڑ دو — پھر جو یہ کہیے نہ کیجے اب رہا، یہ بھی عبث
ہوں جو بے درد اُن سے کیا رکھیے توقع لطف کی — کچھ اگر رکھیے تو پھر ہوتا ہے کیا یہ بھی عبث
سُن کے خواہش بوسہ دشنام کی بولا وہ شوخ — یہ تمنا بھی ہے بے جا، مدعا یہ بھی عبث

جب نہ ہو دشنام کے دینے کے لائق تو نظیر
پھر جو بوسے کے لئے تو نے کہا یہ بھی عبث

کرنے لگا دل طلب جب وہ بت خوش مزاج — ہم نے کہا جان کل، اس نے کہا ہنس کے آج
زلف نے اس کی دیا کاکل سنبل کو رشک — چشم سیہ نے لیا، چشم سے آہو کے باج
اس کی وہ بیمار چشم دیکھ رہا تو جو دل — رہ تو اسی میں ترا کرتا ہوں کیسا علاج
کام پڑا آن کر چاہ سے جس دن ہمیں — چھٹ گئے اس روز سے اور جو تھے کام کاج

دل تو نہ دیتے ہم آہ لے گئی لیکن نظیر
اس کی جبیں کی حیا اور وہ آنکھوں کی لاج

اس کے تشریف جو لانے کی خبر پائی آج — دل نے کی پھر ہوس انجمن آرائی آج
کیوں نہ جوں جام ہنسیں ہم کہ بہت مدت میں — اپنے دل خواہ پھر اک سبد مینائی آج
ہو گئی باغ میں عطریت سنبل برباد — نکہت اس زلف کی لے کر جو صبا آئی آج
اس کے کوچے کی طرف جانے میں ہم نے ہمدم — امتحاں کو، جو ذرا دیر کی ٹھہرائی آج

شام نزدیک جب آئی تو کہا اس نے نظیر

کیا سبب ہے نہیں آیا جو وہ سودائی آج

طریق عشق بے مرشد نہ ہو طے — کہ یہ رہ ہے نہایت پیچ در پیچ
بتوں کی کاکلوں کے دیکھ کر پیچ — پڑے ہیں دل پہ کیا کیا پیچ پر پیچ
نہ ہووے دل کی الجھن کٹ کے برباد — اگر ڈالے نہ وہ تار نظر پیچ
نظیر ایک روز اپنے زخم سر کو — جو باندھا ہم نے دے کر بیشتر پیچ
نظر کرتے ہی اس سرکش نے یک بار — کہا کر کر سخن کا مختصر پیچ
دعا دیجے ہماری تیغ کو آج
کہ جس نے آپ کو بخشا ہے یہ پیچ

کی تم نے جفا ہم نے وفا جھوٹ ہے یا سچ — سوچو تو اپنے دل میں ذرا جھوٹ ہے یا سچ
غصہ بھی کیا، دکھ بھی دیئے تم نے ولیکن — چپ ہو رہے ہم سر کو جھکا جھوٹ ہے یا سچ
تم ہم سے کئی بار خفا ہو گئے اے جان — پر ہم نہ ہوئے تم سے خفا جھوٹ ہے یا سچ
جو تم نے کہا اس کے بجا لانے میں ہم نے — اک لحظہ توقف نہ کیا جھوٹ ہے یا سچ
سن کر یہ نظیر اس نے کہا ہنس کے بصد ناز
جانے اسے اب میری بلا جھوٹ ہے یا سچ

تھی چھوٹی اس کے مکھڑے پر کل زلف مسلسل اور طرح — پھر دیکھا آج تو اس گل کے تھے کاکل کے بل اور طرح
وہ دیکھ بھر ملتا ہے ہم کو گر غصہ ہر دم اور ہمیں — ہے چین اسی کے ملنے سے زنہار نہیں کل اور طرح
معلوم نہیں کیا بات کہی غماز نے اس سے جو ہم سے — تھیں پہلی باتیں اور نمط اب بولے ہے چنچل اور طرح
دل مجھ سے اس کے ملنے کو کہتا ہے تو اس کے پاس الجھے — جب پہنچا تھا بھیس بدل پھر اب کے نئے چھل اور طرح
ہے کتنے دنوں سے عشق نظیر اس یار کا ہم کو جس کے ہیں

صبح اور برن، شام اور بھبن آج اور روش کل اور طرح

ہم تو ہو جائیں اس سے اب گستاخ　　ہونے دے گا مگر وہ کب گستاخ
ایک شب ہم نے بیقراری سے　　چھو لی زُلف اُس کی ہو کے جب گستاخ
لا کے ابرو پہ چیں کہا اس نے　　نکلے تم تو کوئی عجب گستاخ
ہم تو اس کی بہت سزا دیں گے　　کس لئے، تم ہو بے ادب گستاخ
آج تو زلف چھو لی تم نے نظیر
کل یونہی چوم لو گے لب گستاخ

بر سر بام دل زلف نے ڈالی کمند　　پھرنے کی ہرگز نہیں اب کے یہ خالی کمند
ہاتھ لگا زلف کو اس کا تری گھات میں　　بھاگ رے دل ورنہ دیکھ اس نے سنبھالی کمند
مر کے بھی چھٹتا نہیں اس میں بندھا جو غرض　　کاکل پر پیچ ہے سب سے نرالی کمند
جب وہ چلا صید کو ابرو نے لے لی کمان　　گیسوئے بل دار نے جھپ سے اٹھالی کمند
شال کے جھرمٹ میں زلف لے ہے چھپا اس لئے　　یعنی ملا جب کہ صید تو تو نکالی کمند
اور نہ چڑھا جو کوئی گھات کے اوپر نظیر
تو اسی جھرمٹ میں پھر اپنی چھپالی کمند

کیا نہ جس نے ہمیں نامہ و پیام سے یاد　　ستا رہی ہے ہمیں اس کی آج شام سے یاد
جگر میں جوش تپش اور بہ لب ہجوم فغاں　　ہوئی ہے آج یہ کچھ اس کی اژدہام سے یاد
ہمارے آگے نہ لو نام گل کوئی ورنہ　　وہ گل بدن ہمیں آوے گا گل کے نام سے یاد
دلایا نالہ ہمیں یاد بڑھ کے بلبل نے　　یہ بات سچ ہے کہ آتا ہے کام کام سے یاد
علیحدہ خط وہ لکھے گا نظیر کیا جس نے

کیا نہ غیر کے خط میں کبھی سلام سے یاد

عشق کا دور کرے دل سے جو دھڑکا تعویذ   اس دھڑکے کا کوئی ہم نے نہ دیکھا تعویذ

ہو کچھ آسیب تو واں چاہئے گنڈا تعویذ   اور جو ہو عشق کا سایہ تو کرے کیا تعویذ
دل کو جس وقت یہ جن اُن کے لپٹا پھر تو   کیا کریں واں وہ جو لکھتے ہیں فلیتا تعویذ
ہم تو جب ہوش میں آویں جو کہیں سے پاویں   یار کے ہاتھ کا، بازو کا گلے کا تعویذ
زور تعویذ کا چلتا تو عرب میں یارو   کیا کوئی ایک بھی مجنوں کو نہ دیتا تعویذ
کوہکن کو وہ کو کس واسطے کاٹا کرتا   دیتے غم خوار نہ کیا اس کے تئیں لا تعویذ
آخر اس کے بھی گیا دل کا دھڑکنا اس روز   قبر کا تیشے نے جب اس کے تراشا تعویذ
ہم کو بھی کتنے ہی لوگوں نے دیئے آہ نظیر
پر کسی کا کوئی کچھ کام نہ آیا تعویذ

ہرگز نہ چلائے مجھے تو آنکھ بدل کر   ساقی ترے کوچے سے نہ جاؤں گا سنبھل کر
میں کشتۂ ابرو ہوں ترا اے مرے قاتل   آتے ہو لئے ہاتھ میں کیوں تیغ مچل کر
کہتا ہے نظیر اس کو ذرا پیارے تو سوجا
تب اُٹھ کے کھڑا ہوتا ہے وہ شوخ مچل کر

رکھی ہرگز نہ ترے رخ نے رخ بدر کی قدر   کھوئی کاکل نے بھی آخر کو شب قدر کی قدر
عزت و قدر کی اُس گل سے توقع ہے عبث   واں نہ عزت کی کچھ عزت ہے نہ کچھ قدر کی قدر
راستی خوار ہے اس چشم فسوں پرور سے   ہاں مگر منزلت مکر ہے اور غدر کی قدر
مے پرستوں میں ہے یوں ساغر و مینا کا وقار   جیسے اسلام میں ہو محتسب و صدر کی قدر

کفش برداری سے اس مہر کی چمکا ہے نظیرؔ
ورنہ کیا خاک تھی، اس ذرۂ بے قدر کی قدر

اس کے بن دیکھے جو مر جاؤں میں آنکھیں بھر کر — ڈر خدا سے اے فلک اتنا تو مت اندھیر کر
میں تو بے غیرت نہیں کیا جاؤں اس بدخو کے پاس — کون سا کم بخت پھر لاتا ہے مجھ کو گھیر کر

داغ مرنے کا وہی محروم جانے جس کو آہ
موت آ پہونچی شتاب اور یار آیا دیر کر

بسمل کے گلے کی نہیں تدبیر کوئی اور — جز یہ کہ لگا جائیے شمشیر کوئی اور
یوں چھوڑ کے زخمی جو ہمیں جاتے ہو تم آہ — کیا ترکش مژگاں میں نہیں تیر کوئی اور
اس لطف سے جز موقلم مانیٔ تقدیر — کیا تاب جو کھینچے تری تصویر کوئی اور
بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا — صد شکر کہ ہے کاتب تقدیر کوئی اور

غنچہ بھی تری تنگ دلی دیکھ نظیرؔ آہ
کہتا ہے کہ ایسا نہیں دلگیر کوئی اور

کہ جوں ساغر میں دے، ساقی شراب ارغوانی بھر
گل عارض شگفتہ صبح دم دیکھ اس کا خجلت سے — گیا پانی، سحر کا آفتاب ارغوانی بھر
بھری ہے کاسۂ سر میں وہ ہی اپنے ہوا ساقی — کہ جس سے ہے رہا مے کا حباب ارغوانی بھر
گلوں کے اشک سے اس دیدۂ خونبار نے یارو — دیا اک دم میں دامان سحاب ارغوانی بھر

نظیرؔ اس گل نے بنوائی جو تھی اوراق گلگوں کی
گئی شعروں سے تیرے وہ کتاب ارغوانی بھر

پڑی ہے خاک گورستاں میں، کیا کیا قد موزوں پر — اُگی ہے گھاس کس کس گل بدن کے روئے گلگوں پر

وہ رکھے اینٹ چھاتی پر بہ زیر خاک سوتے ہیں　　چمکتے تھے سنہرے قصر جن کے بام گردوں پر

لن ترانی نے کیا اپنا ظہور آخر کار　　موسیٰ بے خود ہوئے اور جل گیا طور آخر کار
قرب سمجھا تھا جسے تو وہ ہے دوری اے شیخ　　اُسی نزدیک نے پھینکا تجھے دور آخر کار

کتنا تنک صفا ہے کہ پائے نگاہ کا　　ہلکا سا اک غبار ہے چہرے کے رنگ پر

اے شوخ ہر گھڑی نہ ہوس آشنا کو چھیڑ　　ایسا ہی چھیڑنا ہے تو اہل وفا کو چھیڑ
چھیڑے گا جب تو پیش نہ جاوے گا کچھ فسوں　　اے دل، نہ اس کے افعیٔ زلف دوتا کو چھیڑ
چھیڑیں تو یاد مجھ کو بھی ہیں گی بہت ولے　　دل کی خوشی یہ ہے کہ نہ اس دلربا کو چھیڑ
رک رک کے اشک چشم کے لایا ہے عنقریب　　اے غنچہ لب بس اب نہ دل مبتلا کو چھیڑ
اک حرف چھیڑ کا تو صریحاً نہ کہہ نظیرؔ
چھیڑے تو پردے پردے میں اس پُر جفا کو چھیڑ

جو آوے منہ پہ ترے ماہتاب ہے کیا چیز　　غرض یہ ماہ تو کیا، آفتاب ہے کیا چیز
یہ پیرہن میں ہے اس گورے گورے تن کی جھلک　　کہ جس کے سامنے موتی کی آب ہے کیا چیز
بھلا دیں ہم نے کتابیں کہ اس پری رو کے　　کتابی چہرے کے آگے کتاب ہے کیا چیز
تمہارے ہجر میں آنکھیں ہماری مدت سے　　نہیں یہ جانتیں دنیا میں خواب ہے کیا چیز
نظیرؔ حضرت دل کا نہ کچھ کھلا احوال　　میں کس سے پوچھوں یہ ندرت مآب ہے کیا چیز
جو سخت ہووے تو ایسا کہ کوہ آہن کا　　جو نرم ہووے تو برگ گلاب ہے کیا چیز

گھڑی میں سنگ گھڑی موم اور گھڑی فولاد　　　خدا ہی جانے یہ عالی جناب ہے کیا چیز

نہ ادا میں مزا نہ لذت ناز　　　آہ کا ہے کو خط ہوا آغاز
نام سنتے ہی اس پری رو کا　　　ہوش اپنے تو کر گئے پرواز
دیکھ تنہا نظیر کو خاموش　　　بولا آ ہی سے وہ بت طناز
مار ڈالا تری خموشی نے　　　کچھ تو پھر بیان کر اپنا راز
جب تو لاچار ہو کے بھر کر آہ　　　یہی اس نے کہا کہ بندہ نواز
عاشقاں کشتگان معشوق اند
بر نہ آید ز رفتگاں آواز

زلفیں یہ دو نہیں رخ دلبر کے آس پاس　　　ابر سیہ ہے ماہ منور کے آس پاس
تجھ میں تو یہ شمیم نہ تھی سچ کہہ اے نسیم　　　کس کے پھری تو زلف معنبر کے آس پاس
گلشن میں جا کے پھرتا ہوں اُس قد کو یاد کر　　　دو دو پہر میں سرو صنوبر کے آس پاس
رو دیں گے ہم تو دیکھیو کوچے میں اپنے یار　　　پانی ہی پانی ہوگا ہر اک گھر کے آس پاس
کیا کیا ہجوم ہوں گے محبوں کے اے نظیر
محشر کے روز ساقیٔ کوثر کے آس پاس

گر وہ مژہ ہو مائل جنگ پر طاؤس　　　تو سہم سے بے پر ہو خدنگ پر طاؤس
یوں زلف معنبر کے خط سبز ہے نزدیک　　　گویا پر طوطی ہے بہ چنگ پر طاؤس
دکھلا دیں جو ہم داغ دل اپنے کی سیاہی　　　پرواز کرے خوف سے رنگ پر طاؤس
دیکھے جو ترے عاشق گل خوردہ کی تصویر　　　حیرت زدہ ہو دیدۂ نیرنگ پر طاؤس
لکھ لکھ کے نظیر اس غزل تازہ کو خوباں

رکھ لیں گے کتابوں میں بہ رنگِ پرِ طاؤس

انکار ہم سے غیر سے اقرار بس جی بس
دیکھے تمھارے ہم نے یہ اطوار بس جی بس

اتنا ہوں جائے رحم جو کرتا ہے وہ جفا
تو اس سے رو کے کہتے ہیں اغیار بس جی بس

ساقی ہمیں پلائیے یوں جام پے بہ پے
جو ہم نشیں کہہ اٹھیں یک بار بس جی بس

ہوں ناامید وصل سے یوں جیسے وقت نزع
رو کر کہے طبیب سے بیمار بس جی بس

غش ہوں میں وقت بوسہ جو کہتا ہے ہنس کے وہ
منہ کو ہٹا ہٹا کے بہ تکرار بس جی بس

اس کا جو بس جی بس مجھے یاد آوے ہے تو آہ
پہروں تلک میں کہتا ہوں ہر بار بس جی بس

کل وہ جو بولا ٹک تو کہا ہم نے منہ پھرا
خیر اب نہ ہم سے بولئے زنہار بس جی بس

ق

ہم دل لگا کے تم سے ہوئے یہاں تلک بہ تنگ
جو اپنے جی سے کہتے ہیں لاچار بس جی بس

سن کر کہا کہ کیا مرے لگتی ہے دل میں آگ
شکوہ سے جب کرے ہے تو اظہار بس جی بس

ایسے طمانچے ماروں گا منہ میں ترے نظیر
گر تو نے مجھ سے پھر کہا ایک بار بس جی بس

ابھی تازہ حلقۂ زلف میں جو پھنسا ہے طائرِ دل بھلا
اسے رنج پہنچے ہے اے صبا تو گھڑی گھڑی نہ ہلا قفس

ہم ایسے کب تھے کہ خود بدولت یہاں بھی کرتے قدم نوازش
مگر یہ اک اک قدم پہ اے جاں فقط عنایت کرم نوازش

کہاں یہ گھر اور کہاں یہ دولت جو آپ آتے ادھر کو اے جاں
جو آن نکلے ہو بندہ پرور تو کیجیے اب کوئی دم نوازش

لگا کے ٹھوکر ہمارے سر پر بلا تمھاری کرے تاسف
کہ ہم تو سمجھے ہیں اس کو دل سے، تمھارے سر کی قسم نوازش

جواب مانگا جو نامہ بر سے تو اس نے کھا کر قسم کہا یوں
زباں قلم ہو جو جھوٹ بولے کہ واں نہیں یک قلم نوازش

اٹھا دیں ناز ان کے ہم نہ کیونکر نظیر دل سے کہ جن کے ہو دیں

جفا، لطف، عتاب، شفقت، غضب، توجہ، ستم، نوازش
واماندگان راہ تو منزل پہ جا پڑے	اب تو بھی اے نظیر یہاں سے قدم تراش

ہے تو کہنے کو ہر کہیں اخلاص	لیک مشکل ہے ہم نشیں اخلاص
اس کی باریکیاں وہی جانے	ہووے جس شخص کے تئیں اخلاص
رشک سے ایک غیر نے اس کو	اپنے دل کا جتا وہیں اخلاص
یوں کہا تم نظیر سے اے جان	دل سے رکھتے ہو یا یوہیں اخلاص
اس نے اخفائے راز کو میرے	منہ سے اس کے سنا جو ہیں اخلاص
یوں کہا ایسے پوچ لوگوں سے	کوئی رکھتے ہیں نازنیں اخلاص
اس کو ہو کچھ تو، خیر وہ جانے
ہم کو تو اُس سے کچھ نہیں اخلاص

سنیئے اے جاں کبھی اسیر کی عرض	اپنے کوچے کے جا بزیر کی عرض
چھد گیا دل زباں تلک آتے	ہم نے جب کی نگہ کے تیر کی عرض
اس گھڑی کھلکھلا کے ہنس دیجئے	ہے یہی اب تو کہنہ پیر کی عرض
جب تو اس گل بدن شکر لب نے	یوں کہا سُن کے اس حقیر کی عرض
اب تلک دُھن ہے حسن دنداں کی
دیکھ اس پوپلے نظیر کی عرض

حسن کو ہے دلبری سے ارتباط	رخ کو ہے جاں پروری سے ارتباط
ہر مژہ کو تیر سے ہے ہم سری	چشم کو افسوں گری سے ارتباط

قد کو ہے سروِ سہی سے ہم قدی | تن کو ہے نازک تری سے ارتباط
ناز کو شوخی سے ہے پیوستگی | آن کو غارت گری سے ارتباط
مل کے ایسے نازنیں سے پھر نظیرؔ
کب کیا ہم نے پری سے ارتباط

دل ہے اس کج کلاہ سے محظوظ | جی بھی ہے اس کی چاہ سے محظوظ
تم سے جو ناز ہو کرو اے جاں | ہم ہیں اس رسم و راہ سے محظوظ
خوش پری بھی جو ہو سو ہو ہم تو | ہیں اسی رشکِ ماہ سے محظوظ
کیا تماشا ہے یارو کل تو نظیرؔ | تھا بہت خانقاہ سے محظوظ
آج بیٹھا ہے میکدے کے بیچ
مغبچے کی نگاہ سے محظوظ

ہے ترا رخ بھی تجلی میں کچھ اس نور کی شمع | دیکھ جس نور کو کافور ہو کافور کی شمع
چشمِ بد دور اسی رخ سے ہوئی تھی روشن | مشعلِ وادیٔ ایمن، شجرِ طور کی شمع
ہے شب میں وہ رخشاں ترے عارض کی جھلک | جس کے پرتو سے خجل ہو، شبِ دیجور کی شمع
آفریں ہے دلِ پروانہ کو جس نے جل کر | حسن کی گرمیٔ بازار میں مشہور کی شمع
آیا نزدیک جو محفل کے وہ مہ رات نظیرؔ
اہلِ محفل نے خجل ہو کے وہیں دور کی شمع

ساقیا ہے بہارِ زینتِ باغ | دے چھلکتے ہمیں بھی مے کے ایاغ
دیکھی جس دن سے اس پری کی چشم | پھر ہمیں ہوش کا ملا نہ سراغ
اس نے بھیجا نہ رقعہ ایک اور ہم | کئی مکتوب کر چکے ابلاغ

جائے حیرت ہے کل نظیر اپنا
تھا پراگندہ بوئے مے سے دماغ
آج لینے کو جام پے در پے
نہیں ساقی کی منتوں سے فراغ

اے صف مژگاں تکلف برطرف
دیکھتی کیا ہے الٹ دے صف کے صف
دیکھ وہ گورا سا مکھڑا رشک سے
پڑ گئے ہیں ماہ کے منہ پر کلف
آگیا جب بزم میں وہ شعلہ رو
شمع تو بس ہو گئی جل کر تلف
ساقی بھی یوں جام لے کر رہ گیا
جس طرح تصویر ہو ساغر بکف
جب تو ہم نے بھی وہیں یہ عرض کی
دیکھ کر اس شاہ خوباں کی طرف
جان و دل لائے ہیں ہم بھی نذر کو
گر قبول افتد زہے عز و شرف
آبرو رکھیو نظیر اپنے کی تم
یا امیر المومنین شاہ نجف

ساقی یہ پلا اس کو جو ہو جام سے واقف
ہم آج تلک مے کے نہیں نام سے واقف
مستی کے سواد ور میں اس چشم سیہ کے
کافر ہو جو ہو گردش ایام سے واقف
مر کر بھی تہ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ
اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف
صیاد کی الفت سے پھنسے آن کے ورنہ
تھے کاہے کو ہم اس قفس و دام سے واقف
ملنے کا پیام اس سے کہو جا کے عزیزو
جو اس کے نہ ہو وصل کے پیغام سے واقف
اوروں سے قسم کھائیے اور ہم تو مری جاں
ہیں خوب تمہارے قسم اقسام سے واقف
کوئی نہیں کرتا جو کیا تو نے نظیر آہ
دل اس کو دیا جس کے نہیں نام سے واقف

محفل میں ہم تھے اس طرف وہ شوخ چنچل اس طرف
تھی سادہ لوحی اس طرف مکر و فسوں چھل اس طرف

بیٹھے ہم اپنے دہیان میں بیٹھا وہ اپنی آن میں
فکر نظارہ اس طرف مکھڑے پہ آنچل اس طرف

کیا کیا دکھاتی ہے الم کیا کیا رکھے ہے پیچ و خم
آہوں کی شورش اس طرف زلف مسلسل اس طرف

ہم دے کے دل ہیں رنج کش وہ لے کے دل ہے جی تیں خوش
بے تابیٔ جاں اس طرف راحت، خوشی، کل اس طرف

آج اس سے ملنے کو نظیرؔ احوال ہے دل کا عجب
ہم کھنچتے ہیں اس طرف کہتا ہے وہ چل اُس طرف

مضمون سرد مہریٔ جاناں رقم کروں
گر ہاتھ آئے کاغذ کشمیر کا ورق

دیکھا جو ہمیں اس نے لگایا دس سے تا فرق
ہنس کر یہ کہا تمیں میں اور اس میں ہے کیا فرق

وہ دست وہ پا اس کے حنا بستہ جو دیکھے
پھر دست میں اور پا میں ہمیں کچھ نہ رہا فرق

کل ہنس کے نظیرؔ اس نے کہا ناز میں ہم سے
کچھ بوسہ و دشنام میں بھی تم نے کیا فرق

جو چاہو سو ہم دیویں تمھیں ہم نے کہا خوب
دونوں کی حلاوت میں نہیں ہم کو ذرا فرق

گو لطف سے دینے کو کہا آپ نے ہم کو
پر کہنے میں اور کرنے میں لے جاں ہے بڑا فرق

چتون درست سین بجا باتیں ٹھیک ٹھیک
ناز و ادا کی اس میں ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

کیا دل کو اچھی لگتی ہیں ان خوش قدوں کی آہ
یہ پیاری پیاری بولیاں یہ گاتیں ٹھیک ٹھیک

منہ میں طمانچے چھاتی میں گھونسا کمر میں لات
کیا کیا ہوئیں یہ مجھ پہ عنایاتیں ٹھیک ٹھیک

موقع سے بوسہ موقع سے گالی بھی ہم کو دی
کی شوخ نے یہ دونوں مداراتیں ٹھیک ٹھیک

جب دوستی میں قول کے پورے ہوں دونوں شخص
ہوتی ہیں پھر تو کیا ہی ملاقاتیں ٹھیک ٹھیک

جب بن پڑی تو شیخ جی شیخی نہ ماریں کیا　　ہم سے بھی پھر تو ہو دیں کراماتیں ٹھیک ٹھیک

سچ ہے بہ قول حضرت سید نظیرؔ آہ
بن آتی ہیں تو ہوتی ہیں سب باتیں ٹھیک ٹھیک

تیرے بھی منہ کی روشنی رات گئی تھی مہ سے مل　　تاب سے تاب، رخ سے رخ، نور سے نور، ظل سے ظل
یوسفِ مصر سے مگر ملتے ہیں سب ترے نشاں　　زلف سے زلف، لب سے لب، چشم سے چشم، تل سے تل
جتنے ہیں کُشتگانِ عشق، اُن کے ازل سے ہیں ملے　　اشک سے اشک، نم سے نم، خون سے خون، گل سے گل
جب سے مُوا ہے کوہکن، کرتے ہیں اس کا غم سدا　　کوہ سے کوہ، جو سے جو، سنگ سے سنگ، سل سے سل

یار ملا، جب اے نظیرؔ میرے گلے تو مل گئے
جسم سے جسم، جاں سے جاں، روح سے روح، دل سے دل

کب مثل شیشہ ان کا کسی سے برائے دل　　پتھر جنھیں دیا ہے خدا نے بجائے دل
جب لے چلا وہ دل مرے پہلو سے کھینچ کر　　دل سے مرے صدا یہی نکلی کہ ہائے دل
آوے اگر بتاں کے تئیں رسم دلبری　　تو تو جہاں میں پھر کہیں ڈھونڈھا نہ پائے دل
اب تو تری جفا سے یہ مانگوں ہوں میں دعا　ق　ظالم خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل
اور جس پہ تو فدا ہو وہ ظالم ہو اس قدر　　جو مطلقاً ترا وہ نہ خاطر میں لائے دل
تجھ پر بھی چند روز تو یہ کشمکش رہے　　دُر دُر اُدھر کرے اور ادھر کو ستائے دل
ناچار جیسے تجھ سے چھڑاتا ہوں دل کو میں　　ایسا ہی تو بھی اس سے لگا کر چھڑائے دل
شیدا ہوں میں تو لیلیٰ و مجنوں کی چاہ پر　　خالق نے کیا ہی خوب بھلے ان کے بنائے دل
تھے اس کے پاک آبلے چھاتی پہ اس کے آہ　　کیا اتحاد جسم تھا اور کیا صفائے دل

ہیں یاں بڑے جو اہلِ دل اکثر یہ کہتے ہیں

چھوٹتا سا اک نظیر بھی ہے خاک پائے دل

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم

مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

طاق ابرو میں صنم کے کیا خدائی رہ گئی
اب تو پوجیں گے اسی کافر کے بت خانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیر
تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم

کبھی دیکھوں نہ سنبل باغ کو میں مجھے اس خم زلف دوتا کی قسم
نہ نگہ کروں عارض گل کی طرف مجھے اس رخ مہر وفا کی قسم

یوں پھرتی ہے چمن کی فضا میں صبا وہ ہزار طرح سے ہو نافہ کشا
مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا مجھے کوئے صنم کی ہوا کی قسم

جو نہیں آیا ادھر تو وہ چشم سیہ، وہیں لے گیا دل کو بسیر نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ مجھے اس بت ہوش ربا کی قسم

بدن اس کا ہے رو کش برگ سمن، ترے بر میں جو آوے وہ رشک چمن
کھلے غنچۂ دل مرا گل کے تئیں، مجھے اس کھلے بند قبا کی قسم

ترے عشق نے دل میں جو درد دیا، تو کچھ اس سے مزہ میں ایسا لیا
نہ کروں نہ کروں نہ کروں میں دوا، میں نے کھائی ہے اب تو دوا کی قسم

لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں، تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ نشاں
وہ شفق جو کہ صبح کو ہووے عیاں سو وہ کھاتی ہے اس کی حنا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں، تو وہ شرم و حیا سے ہو سرد قریں
لئے نیچی نگاہوں سے جان دل و دیں، میں کہوں کیا، اب اس کی حیا کی قسم

ہوں تیرے تصور میں مری جاں ہمہ تن چشم
دل ہے مرا جوں آئینہ حیراں ہمہ تن چشم

تا ایک نظر دیکھے تجھے اے مہ تاباں
رہتا ہے سدا مہر درخشاں ہمہ تن چشم

آنکھوں کو ملے تا کہ ترے پاؤں کے نیچے
ہر نقش قدم سے ہے بیاباں ہمہ تن چشم

دیوانگی میری کے تحیر میں شب و روز
ہے حلقۂ زنجیر سے زنداں ہمہ تن چشم

اس آئینہ رو کے ہے تصور میں نظیر اب
حیرت زدہ نظارہ، پریشاں ہمہ تن چشم

نہ میں دل کو اب ہر مکاں بیچتا ہوں — کوئی خوب رو لے تو ہاں بیچتا ہوں
وہ مے جس کو سب بیچتے ہیں چھپا کر — میں اس مے کو یارو عیاں بیچتا ہوں
یہ دل جس کو کہتے ہیں عرشِ الٰہی — سو اس دل کو یارو میں یہاں بیچتا ہوں
ذرا میری ہمت تو دیکھو عزیزو — کہاں کی ہے جنس اور کہاں بیچتا ہوں
لئے ہاتھ پر دل کو پھرتا ہوں یارو — کوئی مول لیوے تو ہاں بیچتا ہوں
وہ کہتا ہے جی کوئی بیچے تو ہم لیں — تو کہتا ہوں لو ہاں میاں بیچتا ہوں
میں ایک اپنے یوسف کی خاطر عزیزو — یہ ہستی کا سب کارواں بیچتا ہوں
جو پورا خریدار پاؤں تو یارو — میں یہ سب زمین و زماں بیچتا ہوں
زمیں آسماں عرش کرسی بھی کیا ہے — کوئی لے تو میں لامکاں بیچتا ہوں
جسے مول لینا ہو لے لے خوشی سے — میں اس وقت دونوں جہاں بیچتا ہوں
بکی جنس خالی دوکاں رہ گئی ہے — سو اب اس دوکاں کو بھی ہاں بیچتا ہوں

محبت کے بازار میں اے نظیر اب
میں عاجز غریب اپنی جاں بیچتا ہوں

جان کر ہم سے نہ پوچھو کہ تم عاشق ہو بہ جاں — ہم تو عاشق ہی تمھارے ہیں عیاں راچہ بیاں
دو بدو اس بت سرکش سے نہ ہو نا ملے دل — مژہ اور ابرو کی طیار ہے وہاں تیر و کماں

جب یہ کہتے ہیں کہ ہم دل سے تمھیں چاہتے ہیں
دیکھ کر ہم کو تعجب سے یہ کہتا ہے کہ ہاں

نہ دیویں ہم تو دل اپنا کبھی بتوں کے تئیں / پر ان کے حسن کے آگے کچھ اختیار نہیں
جنھیں ہو دل کے ستانے کی خو وہ دل لے کر / اگر جفا نہ کریں تو کب ان کو ہو تسکیں
کہاں تلک نہ پھنسے آن کر وہ طائرِ دل / بچھاوے جس کے لئے دام کاکلِ مشکیں
نظیر ایک دن اُس تند خو سے میں نے کہا / یہ فارسی میں کہ اے مہ عذار مہر جبیں
چہ کردہ ام کہ نگاہے بہ حالِ من نہ کنی / چہ گفتہ ام کہ نہ گوئی دمے بیا بنشیں
بہ جز جفا و تعدی نمی کنی بر من / نظر عتاب قریں داری و جبیں پُر چیں

دلم برائے ہمیں بردۂ کہ ظلم کنی
شنید گفت بلے بردہ ام برائے ہمیں

چاہت کے اب افشا کن اسرار تو ہم ہیں / کیوں دل سے جھگڑتے ہو گنہگار تو ہم ہیں
رو آئینے کو دیتے ہو برعکس ہمارے / آئینہ رُخو طالبِ دیدار تو ہم ہیں
گلشن میں عبث جاتے ہو کر حُسن کی تزئین / اس جنسِ دل آرا کے خریدار تو ہم ہیں
کیا کبک کو دکھلاتے ہو انداز خرام آہ / حسرت زدۂ شوخیٔ رفتار تو ہم ہیں
کی چشم سوئے نرگسِ بیمار تو پھر کیا / اس عینِ عنایت کے سزاوار تو ہم ہیں
دل دے کے دل آزار کو کیا شکوۂ بیداد / گر سوچیے اپنے لئے آزار تو ہم ہیں

جس دن سے پھنسے دیکھی نہ پھر شکل رہائی
کیا کہیے نظیر ایسے گرفتار تو ہم ہیں

کہیں بیٹھنے دے دل اب مجھے جو حواس ٹک میں بجا کروں / نہیں تاب مجھ میں کہ جب تلک تو پھرے تو میں بھی پھرا کروں
تو ہزار مجھ کو ستائے پر تری چاہ مجھ سے نہ چھوٹے گی / مرے دل کی بھی ہے یہی خوشی تو جفا کرے میں وفا کروں
کبھی اس کے کوچے میں جا ملی جو یہ کام دل گھڑی دو گھڑی / تو ہیں یاد مجھ کو وہ مکر و فن کہ میں اس کے دل میں بھی جا کروں

جو نگہ سے چاہ کی دیکھوں ٹک تو چڑھا کے تیوری یہ کہتا ہے — تری اس نگہ کی سزا ہے یہ کہ بس اب میں تجھ سے چھپا کروں
جو میں بوسہ میں نے طلب کیا تو کہا تجھے تو نہیں ہے ڈر — مجھے خوف ہے کہ مبادا اگر کوئی دیکھ لے تو میں کیا کروں
مجھے مدتوں سے ہے درد دل جو کہا کچھ اس کا علاج کر — تو کہا کہ اس کی دوا یہ ہے تو کہا کرے میں سنا کروں

کوئی بولا تم نے نظیر کو نہ جھڑک دیا تو کہا میاں
دل و جاں سے مجھ پہ وہ ہے فدا اسے کس طرح سے خفا کروں

عبث چمن میں نہیں گل عذار آتے ہیں — گلوں کو اپنی دکھانے بہار آتے ہیں
گھڑی گھڑی ہمیں دیکھا اپنے در پہ کہتا ہے — یہ کون ہیں جو ادھر بار بار آتے ہیں
قرار لینے کو جاتے ہیں ہم جب اس کے پاس — زیادہ اور بھی ہو بے قرار آتے ہیں
جو سادی وضع میں کل لے گئے تھے ہوش تیرے دل — سنا ہے آج وہ کر کر سنگار آتے ہیں

گئے تھے ملنے کو شاید جھڑک دیا اس نے
میاں نظیر تو کچھ شرمسار آتے ہیں

مجھ پہ ابرو کی تو نہ کھینچ کماں — او میں تیری کمان کے قرباں
داد تیرے بھی حسن کی دیتا — آج ہوتا اگر مہ کنعاں
ٹھنڈی آہیں جگر سے نکلیں ہیں — اشک بھی متصل ہیں قطرہ زناں
دم غنیمت ہے پھر کہاں اے دل — یہ ہوا سرد اور یہ آب رواں
قطعہ
بوسہ لیجے جو ہو کے دست و کمر — اتنی ہم میں کہاں ہے تاب و تواں

وہ دہن اور کہاں لب اپنے نظیر
وہ کمر اور کہاں یہ ہاتھ میاں

تو کہتا ہے میں آؤں گا دو چار گھڑی میں — مر جائے گا ظالم ترا بیمار گھڑی میں

جس کام کو برسات میں لگتے ہیں مہینے　　وہ کرتے ہیں یہ دیدۂ خونبار گھڑی میں

میں تجھ کو نہ کہتا تھا نظیرؔ اس سے نہ ملنا
اب دیکھو حال اپنا تو ایک چار گھڑی میں

نہ دن کو چین نہ راتوں کو خواب آنکھوں میں　　بھرا رہے ہے ترے غم سے آب آنکھوں میں
جدھر وہ دیکھیے اُدھر صف کی صف الٹ ڈالے ہے　　بھری ہے شوخ کی ایسی شراب آنکھوں میں
تمھارے ہم تو قدیمی غلام بندے ہیں　　تمھیں نہ چاہیے ہم سے حجاب آنکھوں میں
تھمانہ اشک نہ نیند آئی نہ پلک جھپکی　　بسا ہے جب سے وہ خانہ خراب آنکھوں میں
قسم ہے چشم گلابی کی تیری اے گل رو　　کہ یہاں کھنچے ہے پڑا نت گلاب آنکھوں میں
خدا کی بات جنھیں بات بھی نہ آتی تھی　　وہ اب کریں ہیں سوال و جواب آنکھوں میں

شتابی آن کے مجبو چند ریاں رنگ لو
نظیرؔ لایا ہے بھر کر شہاب آنکھوں میں

مرتے ہیں ہم تو جان تو اب جان یا نہ جان　　باقی ہے کوئی آن تو اب جان یا نہ جان
تیری تغافلوں کی جفا سے ترس ترس　　جی دیں گے ہم ندان تو اب جان یا نہ جان

مجنوں کے جو نشان تھے سو اب تجھ میں اے نظیرؔ
ہیں سب وہی نشان تو اب جان یا نہ جان

وہ بے نشاں دہن رخِ خورشید تاب میں　　ذرہ سما گیا ہے دل آفتاب میں
مردے کو ٹھوکروں میں جلا دیتے ہوں جہاں　　وہاں حضرت مسیح ہیں پھر کس حساب میں
ہر زخم پر ہے آہ کے بدلے صدائے واہ　　کیا پُر دلی ہے اس دل خانہ خراب میں
لگتے ہی آنکھ شب کو نظر آ گئی وہ شکل　　پائی یہ ہم نے دولت بیدار خواب میں

آپہی تو دل کو لے گئے آپہی ہیں پوچھتے
کہئے میاں نظیرؔ ہیں کس اضطراب میں
قدرت کہاں جو اس سے کہوں میں یہ بات آہ
صاحب تمھیں تو ڈال گئے ہو عذاب میں

ہم میں بھی اور انھوں میں پہلے جو یاریاں تھیں
دونوں دلوں میں کیا کیا امیدواریاں تھیں
وہ منتظر کہ آویں ہم پرتشش کہ جاویں
اس ڈھب کی ہر دو جانب بے اختیاریاں تھیں
نہ ضبط ہے نگہ کا نہ رک سکے نظارہ
کیا شوق ورزیاں تھیں کیا بیقراریاں تھیں
اُٹھنے میں بیٹھنے میں، ہنسنے میں بولنے میں
کچھ بے شعوریاں تھیں، کچھ ہوشیاریاں تھیں
جس جا نظیرؔ آکر ہوتی ہیں الفتیں تو
واں ایسی ایسی کتنی عشرت شعاریاں تھیں

لطف جو چاہت کے ہیں سو وہ جتانے نہیں
چاہ چھپی کیجئے تا کوئی جانے نہیں
گنج محبت عبث کیجئے برباد کیوں
یہ تو بڑا نقد ہے آنے دو آنے نہیں
نکلیں ہیں جو اشک و آہ دل میں وہیں روکئے
دیدہ و لب کو مزے اُن کے چکھانے نہیں
خواب میں آکر کوئی پوچھے کہ عاشق ہو تم
واں بھی تعشق کے راز اس کو بتانے نہیں
تھا جو نظیرؔ اس کو ایک شخص نے آکر کہا
پڑھئے کچھ اپنا سخن کیجے بہانے نہیں
جب نہ پڑھا کچھ تو پھر اس نے خفا ہو کہا
کیا تمھیں شعر اپنے آہ ہم کو سنانے نہیں
سنتے ہی اس بات کے بھر کے دم سرد آہ
کہنے لگا کیا پڑھیں، دل تو ٹھکانے نہیں

قتل پہ باندھ چکا وہ بت گمراہ میاں
دیکھیں اب کس کی طرف ہوتے ہیں اللہ میاں
نزع میں چشم کو دیدار سے محروم نہ رکھ
ورنہ تا حشر یہ دیکھیں گی تری راہ میاں

تو جدھر جاہے اُدھر جا کہ سحر سے تا شام
میں بھی سائے کی طرح ہوں ترے ہمراہ میاں

ہم تری چاہ سے چاہیں گے اُسے بھی دل سے
جس کو جی چاہے اُسے شوق سے تو چاہ میاں

لیکن اتنا ہے کہ اس چاہ میں دریا ہیں کئی
ایسے ایسے کئی ہیں جن کی نہیں تھاہ میاں

آگے مختار ہو تم ہم جو تمھیں چاہے ہیں
اس سبب سے تمھیں ہم کرتے ہیں آگاہ میاں

جب دم نزع نہ آیا وہ ستمگر تو نظیر
مرگیا کہہ کے یہ حسرت زدہ اے واہ میاں

دل ٹھرا ایک تبسم پر کچھ اور بہا اے جان نہیں
گر ہنس دیجے اور لے لیجے تو فائدہ ہے نقصان نہیں

یہ ناز ہے یا استغنا ہے یا طرز تغافل ہے یارو
جو لاکھ کوئی تڑپے سسکے فریاد کرے کچھ دھیان نہیں

جب سنتا ہے احوال مرا یوں کہتا ہے عیاری سے
ہے کون وہ اس سے ہم کو تو کچھ جان نہیں پہچان نہیں

کچھ بن نہیں آتا کیا کیجے کس طور سے ملیے اے ہمدم
وہ دیکھ ہمیں رک جاتا ہے اور ہم کو چین اک آن نہیں

تر دیکھ کے میری آنکھوں کو یہ بات سناتا ہے ہنس کر
ہیں کہتے جس کو چاہ میاں وہ مشکل ہے آسان نہیں

دل پھنس کر اس کی زلفوں میں تدبیر رہائی کی مت کر
کب چھوٹے اس کے دام سے تو وہ دانا ہے نادان نہیں

زنہار نہ رکھیو دل میں نظیر اس لب سے توقع بوسے کی
گر بھولے سے بھی یار تجھے دشنام وہ دے امکان نہیں

کر گئی ہے اس کی مژگاں کی جھپک بے کل ہمیں
کل اگر چاہے تو ہمدم اس گھڑی کچھ کل ہمیں

کچھ تو جاتی دل سے خار بیقراری کی خلش
کاش وہ نوک مژہ دیتی قرار اک پل ہمیں

وہ کف پا ہم نے سہلائی ہے نازک نرم نرم
کیا جتاتی ہے تو اپنی نرمی اے مخمل ہمیں

اسی پری رو کی گلی میں یا نہاں یا آشکار
جس طرح سے ہو سکے اے ہمنشیں لے چل ہمیں

ہم تو ہوں کیفی ترے پر کیا کریں اے چشم یار
ہوش میں آنے نہیں دیتا ترا کاجل ہمیں

دل خمِ ابرو کو دیتے ہیں تو کِس کِس پیچ سے
دام میں لیتا ہے اس کاکُل کا اِک اِک بل ہمیں

ہم تو اس کے چاہنے والے ہیں مُدت سے نظیر
اور نیا کہتا ہے اب تک وہ صنم چنچل ہمیں

کہتے ہیں یاں کہ مجھ سا کوئی مہ جبیں نہیں
پیارے جو ہم سے پوچھو تو یاں کیا کہیں نہیں

ساقی کو جام دینے میں اُس خوش نگہ کو آہ
ہر دم اشارتیں ہیں کہ اس کے تئیں نہیں

پوچھے ہے اس سے جب کوئی قتل نظیر کو
کہتا ہے ہم نے مارا ہے، ہاں ہاں نہیں نہیں

وہ چاندنی میں جو ملک سیر کو نکلتے ہیں
تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

چراغ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
یہ بزم تم کو مبارک ہو ہم تو چلتے ہیں

فدا جو دل سے ہیں یاں شوخ سبز رنگوں پر
یہ کافراں کی بھی چھاتی پہ مونگ دلتے ہیں

ہوا ہوں خشک میں یہاں تک کہ حضرت مجنوں
یہ مجھ سے کہتے ہیں اور اپنے ہاتھ ملتے ہیں

کوئی تو پگڑی بدلتا ہے یار سے، لیکن
میاں نظیر ہم اب تم سے تن بدلتے ہیں

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

جس قدر پینا ہو پی لے پانی ان کے ہاتھ سے
آبِ جنت تو بہت ہوگا، یہ پانی پھر کہاں

لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گی وہاں
پر یہ میٹھی گالیاں خوباں کی کھانی پھر کہاں

واں تو ہاں حوروں کے گہنے کے بہت ہوں گے نشاں
ان پریزادوں کے چھلوں کی نشانی پھر کہاں

الفت و مہر و محبت سب ہیں جیتے جی کے ساتھ
مہرباں ہی اٹھ گئے جب مہربانی پھر کہاں

واعظ و ناصح بکیں تو ان کے کہنے کو نہ مان
دم غنیمت ہے میاں یہ نوجوانی پھر کہاں

جا پڑے چُپ ہو کے جب شہرِ خموشاں میں نظیرؔ
یہ غزل، یہ ریختہ، یہ شعر خوانی پھر کہاں

صفائی اس کی جھلکتی ہے گورے سینے میں — چمک کہاں ہے، یہ الماس کے نگینے میں
نہ توئی ہے، نہ کناری، نہ گوکھرو بتس پر — سجی ہے شوخ نے انگیا بنت کی سینے میں
جو پوچھا میں کہ کہاں تھی تو ہنس کے یوں بولی — میں لگ رہی تھی اس انگیا موئی کے سینے میں
پڑا جو ہاتھ مرا سینے پر تو ہاتھ جھٹک — پکاری آگ لگے آہ، اس قرینے میں
جو ایسا ہی ہے تو اب ہم نہ روز آویں گے — کبھو جو آئے تو ہفتے میں یا مہینے میں
کبھو مٹک، کبھو بس بس، کبھو پیالہ پٹک — دماغ کرتی تھی کیا کیا شراب پینے میں
چڑھی جو دوڑ کے کوٹھے پہ وہ پری اک بار — تو میں نے جا لیا اس کو اُدھر کے زینے میں
وہ اٹھتی چھاتیاں دکھلا اپنی کہتی ہے، ہے ہے — یہ کیا بلا ہے کہ اٹھتی ہے میرے سینے میں
وہ پہنا کرتی تھی انگیا جو سرخ لاہی کی — لپٹ کے تن سے وہ تر ہو گئی پسینے میں

یہ سرخ انگیا جو دیکھی ہے اس پری کی نظیرؔ
مجھے تو آگ سی کچھ لگ رہی ہے سینے میں

لب پہ ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں — اے یار میں تو کشتۂ روزِ الست ہوں
اک دم کی زندگی کے لیے مت اٹھا مجھے — اے بے خبر میں نقشِ زمیں کی نشست ہوں
تو مست کر شراب سے اے گل بدن مجھے — ظالم میں تیری چشمِ گلابی سے مست ہوں
دہ ہ از طریق مجھ کو سمجھو نہ زاہدا — گر تو خدا پرست ہے، میں بت پرست ہوں

ان سنگ دل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیرؔ
میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں — مے کہیں شیشہ کہیں ساقی کہیں جام کہیں
دل کی بیتابی نہیں ٹھہرنے دیتی ہے مجھے — دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں
ایک دل دیجئے، کس کس کو سبھی مانگتے ہیں — بُندے بالے کہیں اور زلفِ سیہ فام کہیں
نامہ بر، نامہ لکھوں یا میں زبانی کہہ دوں — خط کے پرزے یہ لکھوں قاصد ناکام کہیں

دل بھی اور جان بھی، دی سب اُسے پر ہے نظیر
گل کہیں غنچہ کہیں، بلبل بدنام کہیں

چمن میں جب سے لب اس غنچہ لب نے کھولے ہیں — گلوں کے پہلو میں غنچے نہیں پھپھولے ہیں
یہ مہر و مہ جو نشیب و فراز میں گرداں — تمہارے باغ میں ایسے کئی ہنڈولے ہیں
ہمارے قطرۂ اشک اس کی سرد مہری سے — کسی زمانے میں موتی تھے اب تو اولے ہیں
تمہارے خندۂ دنداں نما کی دولت سے — صدف تو کیا ہے کہ نیساں نے موتی رولے ہیں
غلط ہے یہ جو مرے گھر وہ بھول کر آویں — ادھر جو بھول پڑیں کیا وہ ایسے بھولے ہیں
تُلا نہ حسن تمہارا وگرنہ میزاں نے — فلک کی شمس و قمر لاکھ بار تولے ہیں

وہ سنگ دل جو نہ بولا تو کیا تعجب ہے
میاں نظیر کہیں بت بھی منہ سے بولے ہیں

طلعت یوسف صباحت میں ہے لاثانی ولے — یہ نمک یہ خال و خط یہ زلف یہ ابرو کہاں
کس طرح سنبل ہو، ان زلفوں سے آ کر سربسر — یہ لٹک، یہ بل، یہ پیچ و تاب، یہ خوشبو کہاں

جب کہ اُلٹی ہم نے تکرار نظر پر آستیں — کھینچ لی، اس نے رخِ رشکِ قمر پر آستیں
اسی پری رو کے دِوانے کی یہ ہے شکلِ لباس — تار دامن خار پر، شاخِ شجر پر آستیں

یہ چمن دی بہاراں جن دہلی آندھیاں ہیں — کہ کہ طرح جگر وچ دھواں مچاندیاں ہیں
کوئی نہ دیکھدا ہے، دیکھو ادھر تو پیارے — تم بن ہماری انکھیاں انجو بہاندیاں ہیں

طوفاں اٹھا رہا ہے مرے دل میں سیل اشک — وہ دن خدا نہ لائے جو میں آب دیدہ ہوں

صبح جب بول اٹھا مرغ سحر ککڑوں ککڑوں — اٹھ گئے پاس سے وہ رہ گئے ہم ٹٹروں ٹوں

مبتلا ایسے ہی خوش وضعوں کے ہوتے ہیں نظیر — بے قرار و دل فگار و خستہ حال و بے وطن

آ پڑے ہیں اب تو کوئے یار میں ہم شاد ہو — دیکھیں اس افتاد کی آگے کو کیا افتاد ہو
ہے چمن میں اپنی رعنائی سے پابند غرور — گر وہ قد دیکھے تو سرو اس قید سے آزاد ہو
ایک بت بیداد گر سے ہم نے با عجز و نیاز — یوں کہا کچھ ہم کہیں خدمت میں گر ارشاد ہو
سن کے فرمایا کہو، جب ہم نے یوں اس سے کہا — دل کو ہم اس شرط سے دیں گر نہ کچھ بیداد ہو
سوچ کر اس نے کہا ہم عہد تو کر لیں و لے — اور جو وقت جور وہ پیماں نہ ہم کو یاد ہو
پھر یہ کہیے کیا کروگے جب تعدی و جفا — جو معین ہے وہ سب ہو بلکہ کچھ ایجاد ہو

عافیت کی گر ہوا خواہی تمھیں ہے تو نظیر
تم ہوا میں ہم سے بے دردوں کی مت برباد ہو

ہمدم چھپا دے واں کوئی کیا دل کی چاہ کو — شاہد جہاں سمجھتے ہیں پہلی نگاہ کو
دکھلا حنائی دست لیا جیب سے چھین دل — کیا دست رس ہے دیکھئے اس دستگاہ کو

بیٹھا جو چاندنی میں تو رُخ کی جھلک دکھا
خجلت تھی کون سی کہ نہ دی روئے ماہ کو

ناصح تو راست کہتا ہے لیکن وہ کیا کرے
دے بیٹھے اپنا دل جو کسی کج کلاہ کو

جھڑکی سے اُس نے ہم کو خفا دیکھ کر کہا
کیا ناپسند گنتے ہو اس رسم و راہ کو

جانے ہیں جھڑکیوں میں ہماری وہ لذتیں
جو چاہ میں سمجھتے ہیں بہتر نگاہ کو

گر عار ہے کچھ اس میں تمھیں تو نیال نظیرؔ
لے جاؤ اپنے اس دل عزت پناہ کو

جھڑکے بھی نہ الفت سے جو ایذا کوئی ہو
تو ناز کا حسرت زدہ کیا شاد کوئی ہو

مشاطہ ذرا بہر خدا حُسن کی اُس کے
اتنی نہ ہوا باندھ جو برباد کوئی ہو

اے دل تو عبث اس سے نہ کر خواہش دشنام
دشنام تو وہ دے جو اسے یاد کوئی ہو

تخفیف جفا کا یہ سبب ہے کہ مبادا
شاید کہیں مجھ سا نہ پری زاد کوئی ہو

منظور ہوا دام میں جب دل کو پھنسانا
پھر وسوسہ کیا چاہئے صیاد کوئی ہو

ڈر ہم کو بناوٹ کی اداؤں کا نہیں ہے
وہ آن غضب ہے جو خدا داد کوئی ہو

بیداد بھی کرتا ہے بہت وہ تو نظیرؔ آہ
البتہ جو شائستہ بیداد کوئی ہو

سرچشمۂ بقا سے ہرگز نہ آب لاؤ
حضرت خضر کہیں سے جا کر شراب لاؤ

رکھتی ہے جیسے ناز میں اس کی جبیں گرہ
اس لطف کی تو آہ نہ ہو گی کہیں گرہ

مُنہ دیکھتے ہی در سے تیوری چڑھاتی ہو
پھر کہئے دل میں آپ کے کیونکر نہیں گرہ

غیروں کی تاب کیا جو رکھیں ہم سے کچھ مروڑ
بس جانا ہم نے رکھتے ہو ہم سے تمھیں گرہ

دل میں چمن کے ہے تری حسرت کی گلجھڑی ۔۔۔ باور نہیں تو دیکھ یہ غنچہ نہیں گرہ
ہم سے تو نزع میں بھی نہ بولا وہ غنچہ لب ۔۔۔ اپنی کھلی نہ تا بہ دم واپسیں گرہ
چین جبیں عرق میں ہوئی اس صنم کی تر ۔۔۔ اے دل بس اب تو چل کہ یہ کھلنی نہیں گرہ
کوتہ نہ ہووے رشتۂ عمر آہ کس طرح ۔۔۔ جب غم میں اس کے آنگے پڑے ہر کہیں گرہ
مر کر بھی اپنا عقدۂ مشکل ہوا نہ وا ۔۔۔ سچ پوچھیے تو کہتے ہیں اس کے تئیں گرہ
الفت کا تار توڑ کے جوڑا تو کیا ہوا ۔۔۔ خوبی جبھی تلک ہے کہ جب تک نہیں گرہ
کانوں کے موتیوں کو ترے دیکھ رشک سے ۔۔۔ تنہا چمن میں دانۂ شبنم نہیں گرہ
وہ کیا کلی کلی کے جگر میں ہے بے کلی ۔۔۔ کلیاں بھی کیا کہ ہو گئی ہے تار دوں تئیں گرہ

اس بحر میں نظیر تو لکھ اور بھی غزل
زلف سخن میں چاہیے ہو ہر کہیں گرہ

یوں ہم سے اس کی رکھتی ہے زلف دو جبیں گرہ ۔۔۔ پڑتی ہے جیسے پاس گرہ کے کہیں گرہ
ظاہر میں گو وہ تیوری چڑھاتا ہے ہم کو دیکھ ۔۔۔ لیکن ہزار شکر کہ دل میں نہیں گرہ
ڈوری کی یہ گرہ نہیں جو لے تو اس کو کھول ۔۔۔ ناصح ہے میرے اس کے تو اب دل نشیں گرہ
بھر عمر میرے دل کا یہ غنچہ کھلا نہ آہ ۔۔۔ ایسی فلک نے کس کے دی میرے تئیں گرہ
ملنے کے یاد رکھنے کو مدت کے پیچ آہ ۔۔۔ دے کر گیا ہے بند میں وہ نازنیں گرہ
بندھتا ہے جیسا دل کی محبت کا عقدہ ۔۔۔ ایسی جہاں میں کوئی نہیں دل نشیں گرہ
تم اپنے دل میں چاہیے جیسی رکھو مروڑ ۔۔۔ ورنہ ہمارے دل میں تو ہرگز نہیں گرہ
نافے میں مشک غم سے گرہ ہو کے مر گیا ۔۔۔ دیکھ اس پری کی زلف کی وہ عنبریں گرہ
اے شوخ تیرے نیفے کے تکمے کے رشک سے ۔۔۔ دریا میں سوکھ کر ہوا دُر ثمیں گرہ

مدت میں کل تو زلف کے دل کی جبیں کی آہ کھولی ہے ہم نے بیٹھ کے اے ہم نشیں گرہ

باقی رہی گرہ جو محبت کی غیر کی
وہ بھی نظیرؔ کھولیں گے آخر ہیں گرہ

بس کہ دل اس کا ہے مانوس خیال آئنہ ہے وہ ملک حسن محروس خیال آئنہ
تھا وہ پشت بام پر عکس آرسی میں ہم نے بھی زور حکمت سے لیا بوس خیال آئنہ
تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جور سے بلبل تصویر و طاؤس خیال آئنہ
دل جفا سے اس کی آزردہ ہو سو ہوتا نہیں بے خطر ہے زنگ سے بروس خیال آئنہ
کل اُسے آئینہ خانے میں جو تھی مشق خرام تھا وہ صد جا ہم کو پابوس خیال آئنہ
صافیٔ دل کا لغت اس سے نہ پھر پنہاں رہے یک نظر دیکھے جو قاموس خیال آئنہ

ہے اگر منظور سیر عالم حیرت نظیرؔ
تو دل اپنا کر تو محبوس خیال آئنہ

رفتار سے دلوں کو کچلتے ہیں وہ جو آہ اپنا یہ بد چلن دل انھیں کا ہے خاک راہ
سچ پوچھئے تو اس میں خطا دل کی کچھ نہیں خوباں کی شوخیاں ہی بڑھاتی ہیں جی کی چاہ
دشنام میں یہ کچھ ہے حلاوت کہ دم بہ دم ہوتے ہیں ہم اسی کے لئے مصدر گناہ
تیوری چڑھا کے دیکھیں ہیں جس دم عتاب سے کس کس طرح کے لطف دکھاتی ہے وہ نگاہ
چٹکی میں دیر ہووے تو ہوتے ہیں ہم دیاں بے رحمی و تغافل ناخن کے داد خواہ
کہنی کے التماس کا رہتا ہے جاں کو عزم ٹھوکر کے اشتیاق میں پھرتا ہے دل تباہ
کہئے اگر کہ ہم ہیں تمھیں دل سے چاہتے تو کہتے ہیں جو خوش کوئی شاہد کوئی گواہ
گر چشم نم نے دی بھی گواہی تو کہتے ہیں اے بے وقوف کس نے کہا تھا تو ہم کو چاہ

یہ کہہ کے جب بھڑکتے ہیں ہو کر خفا نظیر
وہ جھڑکیاں بھی ایسی ہی دل خواہ ہیں کہ واہ

زاہد و روضۂ رضواں سے کہو عشق اللہ — عاشقو کوچۂ جاناں سے کہو عشق اللہ
جس کی آنکھوں نے کیا بزم دو عالم کو خراب — کوئی اس فتنۂ دوراں سے کہو عشق اللہ
یارو دیکھو جو کہیں اس گل خنداں کا جمال — تو مرے دیدۂ گریاں سے کہو عشق اللہ
ہیں جو وہ کشتۂ شمشیر نگاہ قاتل — جا کے اُن گنج شہیداں سے کہو عشق اللہ
آہ کے ساتھ مرے سینے سے نکلے ہے ہوا — اے بُتاں مجھ دل بریاں سے کہو عشق اللہ

یاد میں اُس کے رُخ و زلف کی ہر آن نظیر
روز و شب سنبل و ریحاں سے کہو عشق اللہ

ہم سے تو آج بھی نہ ملا وہ نگار آہ — ہم عید کے بھی دن رہے امیدوار آہ
ملنا تو اک طرف ہے عزیزو کہ بھر نظر — پوشاک کی بھی ہم نے نہ دیکھی بہار آہ
تھی آس عید کی سو گئی وہ بھی دوستو — اب دیکھیں کیا کرے دل امیدوار آہ
ہر عید میں ہمیں تو سدا آس ہی رہی — کافر کبھی نہ ہم سے ہوا ہم کنار آہ

جس عید میں کہ یار سے ملنا نہ ہو نظیر
اس کے اُپر تو حیف ہے اور صد ہزار آہ

صحن گلشن میں چلی پھر کے ہوا بسم اللہ — چشم بد دور بہار آئی ہے کیا بسم اللہ
مصحف رخ پہ ترے ابروئے پیوستہ نہیں — مو قلم سے ید قدرت نے لکھا بسم اللہ
اس قدر تھا وہ نشہ میں کہ یکایک جو گرا — میں نہ بولا، پہ مرے دل نے کہا بسم اللہ
زلف اُس عارض رنگیں پہ بکھرنے جو لگی — بول اُٹھی مُنہ سے دہیں باد صبا بسم اللہ

آج گلشن میں ذرا پاؤں جو پھسلا اُس کا — گل ہنسا غنچے نے جلدی سے کہا بسم اللہ
یار قاتل میرے جو جو کہ لگاتا تھا وار — لب پہ ہر زخم کے نکلے تھی صدا بسم اللہ

شیشہ و ساقی و ساغر سبھی حاضر ہیں نظیرؔ
مے کشی کیجئے اب دیر ہے کیا بسم اللہ

تری وہ شان کی رفعت ہے یا رسول اللہ — کہ لامکاں نے کہا لا الٰہ الا اللہ
وہ نورِ دیدۂ احمد کہ جس کے رتبے کی — حدیث بضعۃ منّی ہے دو جہاں میں گواہ

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ — پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

تم سے ہم اے حسن کے سردار رخصت ہو چلے — مدتوں میں دیکھ کر دیدار رخصت ہو چلے
چاہتا تھا دل تو یوں، رہتے تمہارے پاس ہم — پر فلک کے ہاتھ سے ناچار رخصت ہو چلے
آ گئے تھے سیر کرتے تم کو دیکھا خوش ہوئے — اب خدا حافظ ہے ہم اے یار رخصت ہو چلے
پھر بھی آجاویں گے ادھر کو اگر جیتے رہے — اب تو رہنا ہے ہمیں دشوار رخصت ہو چلے
کیوں نہ لالہ کی طرح دل ہو ہمارا داغدار — کس مزے میں چھوڑ کر گلزار رخصت ہو چلے

گل رخوں کی بزم میں کیا بیٹھتے ہو اے نظیرؔ
تم بھی رخصت ہو کہ اب سب یار رخصت ہو چلے

منہ سے برقع نہ اٹھے صاحب من یاد رہے — پھر قیامت ہی عیاں ہے یہ سخن یاد رہے
مر بھی جاویں گے تو جز پیرہن عریانی — آپ سے ہم نہیں لینے کے کفن یاد رہے
اب تو ہے ناز یہ ٹھکرا کے سروں کو چلنا — لیکن آخر نہیں اچھا یہ چلن یاد رہے

سو چمن ایک نقطہ اس کے ہیں ٹکڑے میں نظیر
جب یہ صورت ہو تو پھر کس کو چمن یاد رہے

تن دیکھ کے جس گل کا جان چھوڑ کے تن نکلے — وہ سیم تن اس تن سے کس طرح نہ تن نکلے
ہیں خالِ سر کاکل یا ڈالیاں سنبل کی — چرنے کے لئے شب کو آہوئے ختن نکلے
ہم درج گہر اپنے سینے میں سمجھتے تھے — جب روئے تو آنکھوں سے کل لعل یمن نکلے
آنے کی قسم کھا کر پھر منہ بھی نہ دکھلایا — سادہ جنھیں سمجھے تھے سو ان میں یہ فن نکلے
اب روئیے الفت کو یا کوٹیے قسمت کو — جو قول کے پورے تھے وہ عہد شکن نکلے

تھا میں جو نظیر اس کے دنداں کے تصور میں
جب منہ سے مرے ایسے موتی سے سخن نکلے

نہ سرخی غنچۂ گل میں ترے دہن کی سی — نہ یاسمن میں صفائی ترے بدن کی سی
میں کیوں نہ پھولوں کہ اس گل بدن کے آنے سے — بہار آج مرے گھر میں ہے چمن کی سی
یہ برق ابر میں دیکھے سے یاد آتی ہے — جھلک کسی کے ڈوپٹے میں نور تن کی سی
گلوں کے رنگ کو کیا دیکھتے ہو اے خوباں — یہ رنگتیں ہیں تمھارے ہی پیرہن کی سی
جو دل تھا وصل میں آباد تیرے ہجر میں آہ — بنی ہے شکل اب اس کی اجاڑ بن کی سی
تو اپنے تن کو نہ دے نسترن سے اب تشبیہ — بھلا تو دیکھ یہ نرمی ہے تیرے تن کی سی
ترا جو پاؤں کا تلوا ہے نرم مخمل سا — صفائی اس میں ہے کہیے تو نسترن کی سی

نظیر ایک غزل اس زمین میں اور بھی لکھ
کہ اب تو کم ہے روانی ترے سخن کی سی

نہیں ہوا میں یہ بو نافۂ ختن کی سی — لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پر شکن کی سی

میں ہنس کے اس لئے منہ چومتا ہوں غنچے کا
کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی
خدا کے واسطے گل کو نہ میرے ہاتھ سے لو
مجھے تو آتی ہے اس میں کسی بدن کی سی
ہزار تن کے چلیں بانکے خوب رو لیکن
کسی میں آن نہیں تیرے بانکپن کی سی
مجھے تو اس پہ نہایت ہی رشک آتا ہے
کہ جس کے ہاتھ نے پوشاک تیرے تن کی سی
کہا جو تم نے کہ منکا ڈھلا تو آؤں گا
ہے بات کچھ نہ کچھ اس میں بھی مکر و فن کی سی
وگرنہ سچ ہے تو اے جان اتنی مدت میں
یہی بس ایک کہی تم نے میرے من کی سی
وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے
یہ آئے دیکھئے ڈاڑھی لگا کے سن کی سی
کہاں تو اور کہاں وصل اس پری کا نظیر
میاں تو چھوڑ یہ باتیں دوانہ پن کی سی

درج غم میں چشم نے گوہر اگل کر بھر دئے
اشک نے جنگل کے جنگل دم میں ڈھل کر بھر دئے
جلوہ گر محفل میں رات اُس حسن کے شعلے کو دیکھ
شمعداں شمعوں نے اپنے سب پگھل کر بھر دئے
کل جو ٹک رویا کسی کو یاد کر وہ گل بدن
اشک تھے آنکھوں میں یا موتی کچل کر بھر دئے
جام کم بھرنے میں ساقی کو ذرا چھیڑا جو میں
اس نے ایک دو چار ساغر مجھ کو جل کر بھر دئے
ذبح کرتا تھا جو قاتل مجھ تپش آلودہ کو
خون میں سب دامن کے پاٹ اس کے اچھل کر بھر دئے
زخم شانے کے تری زلفوں نے اے وعدہ خلاف
آخر ش لیت و لعل سے آج کل کر بھر دئے
کہتے ہیں اے باغباں جتنے کہ خالی تھے چمن
جوش گل نے اب کے سب پھول پھل کر بھر دئے
اب ترے رونے کا عالم حد سے گزرا ہے نظیر
اشک نے تیرے تو سب جل تھل نکل کر بھر دئے

ہنسے روئے بھرے، رسوا ہوئے بھاگے بندھے چھوٹے
غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

کلیجے میں پھپھولے، دل میں داغ اور گُل ہیں ہاتھوں پر کھِلے ہیں دیکھیے، ہم میں بھی الفت کے یہ گُل بوٹے
تفاوت کچھ نہیں گلچیں میں اور بے درد خوباں میں جو اس کے ہاتھ گُل لُوٹے تو ان کے ہاتھ دل لُوٹے
ہزاروں گالیاں دیں پھر ذرا ہنس کر ادھر دیکھا بھلا اتنی تسلی سے پھپھولے دل کے کب پھوٹے
مچلتے ہو مجھے تم، میں یہ مانگوں ہوں دعا دل میں کوئی دلبر مرے آگے تمھیں بھی خوب سا کوٹے
زباں کی کر کے مقراض اور بنا دشنام کا کاغذ ہمارے حق میں کیا کیا آپ نے کترے ہیں گُل بوٹے
یہ کہتے ہیں کہ عاشق چھوٹ جاتا ہے اذیت سے جب اس کی عمر کو لشکر اجل کا آن کر لوٹے

ہماری روح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں
نظیرؔ اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

خوشی دوچند تمھیں سیر ماہتاب میں ہے جلو میں چاہنے والے قمر رکاب میں ہے
ملا ہے اس لب میگوں کے ساتھ خال اے دل فقط یہی نہیں افیوں بھی اس شراب میں ہے
وہ جلوہ گر ہو تو رہتی ہے جان ورنہ آج دل نظارہ طلب سخت اضطراب میں ہے
لیا ہے ہم سے دل اب دین بھی ہو طلب کرتے ق دل اس تقاضے سے اپنا تو پیچ و تاب میں ہے
کہا کہ دفتر حسن پری رخوں کی نظیرؔ
تمھیں خبر نہیں، یہ بھی اسی حساب میں ہے

نہیں آئے کل سے جو تم ادھر اسے کیا خیال میں لائیے جو کچھ عذر ہو تو بیان کرو نہیں، جیسے آئے تھے آئیے
کہا جب کہ ہم سے بھی بولیے تو بنا کے مُنہ کہا غیر سے یہ سخن ہے سچ کہ ہر ایک کو بہت اپنے منہ نہ لگائیے
لگے جب بچھانے بساط ہم گلی اس کی میں تو کہا میاں یہ جو دام یہاں پہ بچھاتے ہو اسے جلد یہاں سے اٹھائیے
وہ نگار گل رخ و غنچہ لب جو گلے سے آ کے لگے تو پھر یہ شگفتگی ہو بہ رنگ گل کہ نہ پھولے دل میں سمائیے
یہ وہ ہاتھ ہیں کہ ستم کریں یہ بہار ان کی عجب ہو جب کڑے ان میں سونے کے ڈال کے حنا ان میں خوب رچائیے

جو کہا تھا تم نے کہ بزم میں تمھیں پاس اپنے بٹھائیں گے — نہیں لائق اس کے تو ہم مگر جو کہا تو کر بھی دکھائیے

جو ہیں آتے دیکھا نظیر کو طرف اپنے ہنس کے کہا کہ ہاں
تمھیں لائی اپنی کشش ادھر اجی آئیے اجی آئیے

دل اس کی زلف میں پھنس کر یہ خوش دلی تو لے — کہ جب صبا سے ہلے وہ تو اس میں تو جھولے
نشا ہے اس کو بہت وقت ہے ابھی لے دل — میں اس کے چوم لوں منہ کو تو زلف کو چھولے
جو دو بدو ہو دل اس کے تو کیونکہ ہو جاں بر — بچے جو تیر نگہ سے تو تیغ ابرو سے لے
ہے اس کی چشم سیہ وہ کہ دیکھ کر اس کو — مقام حلقۂ حیرت میں چشم آہو لے

ہنسی ہنسی میں دل اپنے کو مفت کھو بیٹھے
میاں نظیر بتوں کے تپاک پر بھولے

نہ دیں گے ہم تو دل اور تم ہو کہتے دو زبردستی — نہ صاحب ہم نہیں راضی گر لے لو زبردستی
جو تم زور آوری کرتے ہو ہم سے دل لگانے میں — کسی نے دل لگایا ہے کہیں لوگو زبردستی
ہمیں کچھ مدعا ہوتا تو آپ ہی بیٹھتے اس جا — تمھیں کچھ ہے غرض جب تو بٹھاتے ہو زبردستی
بتاں دست حنا بستہ یہ کرتے ہیں جسے مائل — وہ جانے ہے کریں ہیں اس پہ یہ جو جو زبردستی
کہاں تک دل نہ دیوے وہ کہ ہر دم جس کے پاس آ جا — بنا کر حسن تم ہنس ہنس کے آ بیٹھو زبردستی
نہ ہوتے ہم تو مل کر تم سے بے بس اس قدر لیکن — کریں کیا جب تمھیں آپ ہی سے آ لپٹو زبردستی
جو محبوبوں سے دل مانگیں تو جھڑکیں اور بٹھا رکھیں — نہ دل دیویں نہ گھر جانے دیں یہ دیکھو زبردستی
کریں حجت تو کہتے ہیں خوشی سے کیا دیا تھا دل — ارے ناداں لیا ہے گا وہ ہم نے تو زبردستی

نظیر اب تو تمھارے بس میں ہے کچھ کہہ نہیں سکتا
کرو جو ہو سکے تم سے زبردستو، زبردستی

جو تم نے پوچھا تو حرفِ الفت برآیا صاحب ہمارے لب سے　　سو اس کو سن کر ہوئے خفا تم نہ کہتے تھے ہم اسی سبب سے
نہ دیتے ہم تو کبھی دل اپنا نہ ہوتے ہرگز خراب و رسوا　　دلے کریں کیا کہ تم نے ہم کو دکھائیں جھلکیں عجب ہی چھب سے
وہ جعد مشکیں جو دن کو دیکھے تو یاد اس کی ہیں شام ہی سے　　یہ پیچ و تاب آ کے دل سے الجھے کہ پھر سحر تک نہ سلجھے شب سے
لگائی فندق جو ہم نے اس کی کلائی پکڑی تو ہنس کے بولا　　یہ انگلی پہنچے کی یہاں نہ ٹھہری بس آپ رہیے ذرا ادب سے
کہا تھا ہم کچھ کہیں گے تم سے کہا تو ایسا کہ ہم نہ سمجھے　　سمجھتے کیونکر کہ اس نے لب سے سخن نکالا کچھ ایسے ڈھب سے
ہوس تو بوسے کی ہے نہایت یہ کیجئے کیا کہ بس نہیں ہے　　جو دسترس ہو تو مثلِ ساغر لگا دیں لب کو ہم ان کے لب سے

کسی نے پوچھا نظیر کو بھی تمہاری محفل میں بار ہو گا
کہا کہ ہو گا، وہ بولا کب سے کہا کبھو کا کبھی نہ اب سے

قدم پہ نقدِ دل اپنا رکھ دیں جو اس طرف بھی ہو جلوہ بازی　　تمہیں تو پرواہ نہیں ولیکن ہماری اس میں ہے سرفرازی
مقابل اس چشم کے ہوں کیونکر کہ دیتی فرصت نہیں ہے اک پل　　ادھر نگاہوں کی ترکتازی ادھر کو مژگاں کی نیزہ بازی
جو حال دل کا کبھی ہیں کہتے تو دو ہی باتیں ہے سن کے کہتا　　بہ خوبی ہم تو سمجھتے اس کو جو تم نہ کہتے بہ این درازی
کہا یہ ایک شمع رو نے شب کو کہ ہم کو چاہو تو ہم یہ بولے　　وہ دل کو تم سے لگا دے صاحب کہ جس کو لینی ہو دل گدازی

جو ایک دلبر سے دل چھڑایا تو دوسرے سے وہیں لگایا
نظیر ہم تو رہیں خوشی سے جو یہ حسین لینے دے عشق بازی

بوسۂ لب سے ہمیں ہم خوش کیجئے　　پھر ہمیں دل چاہے سو کہہ لیجئے
ہے تمہیں اے جاں ہمارے سر کی قسم　　آج تو ایک ساغرِ مے دیجئے
قابلِ محفل ہمیں سمجھو اگر　　تو کبھی آنے ہمیں واں دیجئے
جیب تو پھاڑا مرا دلدار نے　　فائدہ کیا ہے اسے جو سیجئے

صبح کو تم پاس آیا ہے نظیر

اور جو لڑنا ہے تو لڑ لیجیے

لو نہ ہنس ہنس کے تم اغیار کے گل دستوں سے — اتنی ضد بھی نہ کرو اپنے جگر خستوں سے

فندقیں بزم میں دیکھ اس کے سر انگشتوں کی — رشتۂ ربط نے لی راہ کف گل دستوں سے

دو بہ دو ہو جو نہ چشمان بتاں کے اے دل — ڈرتے رہنا ہی مناسب ہے سیہ مستوں سے

دست صیاد سے چھوٹے تو اچھل پے در پے — ورنہ کیا فائدہ اے آہوئے دل جستوں سے

پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیرؔ
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے

جلد آؤ اگر تم کو مری خواہش خوں ہے — کچھ دیر نہیں لگنے کی یہاں صید زبوں ہے

عشاق سے ملنے کی عبث پوچھو ہو ساعت — جب دل ادھر آجاوے وہی نیک شگوں ہے

جب میں نے کہا تم مجھے پہچانتے ہو گے — میں وہ ہوں کہ مدت سے جسے شوق دروں ہے

یہ سن کے نظیرؔ اس نے کہا کہتا ہے کس سے — ہیں یہ بھی کوئی زور تماشے کا فسوں ہے

ہم تیری تو صورت سے بھی واقف نہیں ہرگز
اے شخص تو بے عقل ہے یا تجھ کو جنوں ہے

ابرو نے کماں زلف نے زنجیر دکھا دی — مژگاں نے بھی ایک ترکش پُر تیر دکھا دی

مل کر در دنداں میں مسی شوخ نے ہنس کر — کچھ زور نزاکت بھری تحریر دکھا دی

کوچے میں ہمیں خاک نشینی نے تمھاری — تانبا ہو طلا جس سے وہ اکسیر دکھا دی

کل اُس سے کہا حُسن میں ہم رشک پری ہیں — مکھڑے نے ہمارے ہی وہ تنویر دکھا دی

ہم بولے نظیرؔ اس سے کہ ہے جھوٹ تو ہنس کر
چھب اس نے پری کی ہمیں تصویر دکھا دی

کاکل مشکیں کا تجھ کو شوق بیتابانہ ہے — اے دل صد چاک سچ کہہ دل ہے تو یا شانہ ہے
کر دیا پہلے ہی ساغر میں ہمیں مدہوش و مست — ہم نشیں چشم بتاں کا بھی عجب مے خانہ ہے
شمع رویوں کو تو کچھ پروا نہیں پر کیا کریں — دل جو ہم رکھتے ہیں وہ دل تو نہیں پروانہ ہے
پڑ گئی تھی ایک دن اس چشم مے گوں پر نظر — اب تلک پا میں ہماری لغزش مستانہ ہے
پھر وہ چشم مست لے دل میل کرتی ہے ادھر — یا وہی اس کا نشہ کچھ یہ وہی پیمانہ ہے
حال دل ہم نے کہا جس دم تو بولا سچ کہو — یہ کوئی قصہ نیا ہے یا کہن افسانہ ہے

اس پری رو سے چلا پھر دل لگانے کو نظیر
کیا کہیں یہ بھی کوئی وحشی ہے یا دیوانہ ہے

ناگن ہے تری زلف کی دل کیونکہ نہ ڈر جائے — یہ کاٹ بھی کھاوے جو کسی کو تو مکر جائے
شکل و بدن و زیور و پوشاک سب اس کی — ایک عالم تصویر ہے جس جس پہ نظر جائے
ہے حسن پرستی بھی عجب چیز دغا کیش — دل پیر بھی ہو جائے پہ اس کا نہ اثر جائے

محبوب کے رتبے پہ نظر رکھیو نظیر آہ
ایسا نہ ہو جو یار کے دل سے تو اُتر جائے

جام نہ رکھ ساقیا شب ہے پڑی اور بھی — پھر جہاں کٹ گئے چار گھڑی اور بھی
موسم برسات کی کرتے چھُٹکے بات ہم — دیدۂ گریاں بھلا، کوئی جھڑی اور بھی
پہلے ہی ساغر میں تھے ہم تو بڑے بوتے — اتنے میں ساقی نے دی اُس سے کڑی اور بھی
عشق بھلا ہے تجھے زلف بتاں کی قسم — ہجر کی شب سے کوئی شب ہے بڑی اور بھی
کچھ تپش دل تھی کچھ سُنتے ہی فرقت کا نام — آگ سی ایک آگ پر آن پڑی اور بھی
گرچہ اُپڑ آئیں ہیں تن پہ مرے پر میاں — اتنی لگائیں جہاں، ایک چھڑی اور بھی

کیا کہوں اس شوخ کی واہ میں خوبی نظیرؔ
سنتے ہی اس بات کے ایک جڑی اور بھی

دیکھ عقد ثریا ہمیں انگور کی سوجھی | کیوں بادہ کشاں ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی
ہم نے تو اُسے دیکھ کے جانا کہ پری ہے | پریوں نے جو دیکھا تو اُنھیں حور کی سوجھی
غش کھا کے گرا پہلے ہی شعلے کی جھلک سے | موسیٰ کو بھلا کہیے جو کیا طور کی سوجھی
دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا | بلور کی چوکی پہ جھلک نور کی سوجھی
سر پاؤں سے جب پھنس گیا اس زلف سیہ میں | تب ہم کو سیاہی شب دیجور کی سوجھی
جنت کے لیے شیخ جو کرتا ہے عبادت | کی غور جو خاطر میں تو مزدور کی سوجھی

مصنوع میں صانع نظر آوے تو نظیرؔ آہ
نزدیک ہی کیا ہے کہ یہاں دور کی سوجھی

بھولتی دل سے نہیں ہوش رُبائی تیری | دلبری عشوہ گری، جلوہ نمائی تیری
کیوں نہ پھروں میں تکوں اب تیرے مکھڑے کی طرف | کیا کروں مجھ کو یہ صورت ہے، خوش آئی تیری
مہ کی صورت مجھے آگے تیرے کب خوب لگے | اُس کے چہرے سے تو صورت ہے، سوائی تیری
آنکھ جوں آئینہ رہ جاتی ہے پریوں کی کھلی | جب نظر آتی ہے مکھڑے کی صفائی تیری
ہے تو مختار جو کچھ چاہے سو کر ناز غرور | کشورِ دل میں پھری اب تو دُہائی تیری
کل جو گلشن میں گیا میں کہ ذرا غم بھولے | وہاں بھی ہر گل نے مجھے یاد دلائی تیری
سونگھا ایک گل کو جو ہم میں نے تو اس میں بھی ہیں | اے مرے غنچہ دہن بُو مجھے آئی تیری

غم میں مرتا تھا نظیرؔ اس کو جلایا تو نے
جان کس منہ سے کہوں اب میں بُرائی تیری

سب ٹھاٹھ یہ ایک بوند سے قدرت کی بنا ہے
یہاں اور کسی کی نہ بنی ہے نہ بنا ہے

بالفرض اگر ہم ہوئے حوا کے شکم سے
آدم کے تئیں دیکھئے وہ کس کا جنا ہے

یہاں لوگ دوا من و دوطا کے قصے میں پھنسے ہیں
وہاں اور بنت ہے نہ بنی ہے نہ بنا ہے

حکمت کا الٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
وہ کہتے ہیں غافل یہ بقا ہے یہ فنا ہے

لے عرش سے تا فرش جو روشن ہے طلسمات
یہ نور سب اس نور کی چھلنی سے چھنا ہے

ہم کچے سے کچا اسے سمجھے ہیں وگرنہ
اس دیگ کے چاول میں کچی ہے نہ کنا ہے

ملنا بھی غرض کا ہے لڑائی بھی غرض کی
نہیں اور کسی سے کوئی روٹھا نہ منا ہے

حاجت نہ بر آئی تو وہیں کرنے لگے ہجو
اور ہو گیا مطلب تو وہیں وصف و ثنا ہے

یا بس کہیں مرطوب کہیں گرم کہیں سرد
مصری ہیں کہیں زہر ہلاہل میں سنا ہے

ایک اس کی دوا کچھ بھی نہیں جانتی نظیر آہ
کچھ زور ہی معجون کا نسخہ یہ بنا ہے

تھے آگے بہت جیسے خوش اے یار ہمیں سے
ویسے ہی تم اب رہتے ہو بیزار ہمیں سے

ہے سب سے تو ایما و اشارات ولیکن
رہتی ہے پھری ابروئے خمدار ہمیں سے

محفل میں جو دیکھا تو ادھر تم ہو خفا اور
ساقی کو بھی ہے حجت و تکرار ہمیں سے

اوروں سے جو کہتے ہو کہ ہم ان سے ہیں ناخوش
اس کو تو فقط کرنا ہے اظہار ہمیں سے

گلگشت چمن کرتے ہو جب ہم رہ یاراں
وہاں بھی غرض آتی ہے تمہیں عار ہمیں سے

اقرار ملاقات ہر ایک سے ہے بہ صد مہر
کی غور تو ہے گا تمہیں انکار ہمیں سے

سمجھے گا جو رتبے کو نظیر اہل وفا کے
تو ملنے لگے گا وہ طرحدار ہمیں سے

سرسبز رکھیو کشت کو اے چشم تو مری تیری ہی آب سے ہے بس اب آبرو مری
گو میں جفا سے مر گیا رنگ رنگ کے روسیاہ پر شکر ہے وفا تو ہوئی سرخ رو مری
اس کی جبین پاک پر اس دم تک اے نسیم کافر ہوں گر پڑی ہو نظر بے وضو مری
بل کھا کے زلف کان میں اس کان حسن کے پھونکے ہے پردے پردے میں کچھ مو بہ مو مری
میں مرگیا تھا زہر جو کھا کر تو اس لئے ق یعنی وہ شاد ہو کہ مٹی ہاؤ و ہو مری
سو تو نے میرے غم میں رلایا اسے فلک اے روسیاہ یہ تو نہ تھی آرزو مری

پہروں تلک بکا میں پر اس شوخ نے نظیر
ایک چٹکی میں اڑا دی وہ سب گفتگو مری

کیا ادا کیا ناز اور کیا آن ہے یہاں پری کا حسن بھی حیران ہے
حور بھی دیکھے تو ہو جاوے فدا آج اس عالم کا یہ انسان ہے
اس کے رنگ سبز کی ہے چین میں دھوم کیوں نہ ہو آخر کو ہندوستان ہے
جان و دل ہم نذر کو لائے ہیں آج لیجئے یہ دل ہے اور یہ جان ہے
دل بھی دل سے ہے تصدق آپ پر جان بھی سو جان سے قربان ہے

قطعہ

دل کہاں پہلو میں جو ہم دیں تمھیں یہ تو گھر اک عمر سے ویران ہے
عقل و صبر و ہوش سب جاتے رہے ہاں میاں اک ادھ موئی سی جان ہے
وہ اگر لینی ہو تو لے جائیے خیر یہ بھی آپ کا احسان ہے

آن کر مل لو نظیر اپنے سے جان
اب وہ کوئی آن کا مہمان ہے

خجلت تو نہ دی کچھ اس بے مہری یاری نے — شرمندہ کیا ہم کو نا تجربہ کاری نے
گلشن میں نقاب الٹا دو بار رُخ اس کے سے — کیا لطف کیا ہم پر گل باد بہاری نے
اور پارہ کیا دم میں سو گل کے گریباں کو — اس رشک گلستاں کی اک زیب شعاری نے
رات اس کو سنا آئی پھر صبح تلک ہم کو — اک لحظہ نہ فرصت دی ساعات شماری نے

کیا کیا چمن پُر گل دکھلائے نظیر اس دم
اس دست نگاریں کی توصیف نگاری نے

سرشک چشم سے موتی بہت پروئے گئے — ولے یہ داغ جگر کے نہ ہم سے دھوئے گئے
غرور نے تو ہمارے بہت ہی کھینچا سر — پر اس کو ہم بھی سدا خاک میں رلوئے گئے
ہماری اُن کی رہی عمر بھر یہی صحبت — ادھر وہ ہنستے رہے ہم ادھر سے روئے گئے
سمائے ایسے ہی آ کر کہ پھر مرے دل سے — نہ جاگتے میں کبھی اور کبھی نہ سوئے گئے

نظیر کیا ہی مزا تھا کہ کل خوشی سے ہم
گئے تھے یار کو لینے سو آپ ہی کھوئے گئے

ہمیں اس غنچہ لب کی بات کیا دل سے لگی پیاری — کہ جس کو بے کلی لینی ہو وہ ہم سے کرے یاری
جو دل کے لینے والے ہیں وہ لے ہی جاتے ہیں آخر — دھری رہتی سب اپنی نگہبانی و ہشیاری
قطعہ
کیا ہم نے یہ استفسار اس سے یعنی اب ہم پر — کسی کے کہنے سننے سے یہ رہتی ہے ستمگاری
اگر کہنے سے ہو تو کچھ کریں تدبیر ہم اس کی — وگر اپنی ہی مرضی ہے یونہی تو خیر لاچاری

مکدر ہو گیا لیتے ہی دل کے یک بہ یک ہم سے
نظیر اس آئینہ رو نے تو کی یہ صاف عیاری

کمر تک اس نے زلفوں کو جو بل دے دے کے چھوڑا ہے — یہ دو زلفیں نہیں کافر یہ اک ناگن کا جوڑا ہے

پھرے ہے حرص سے بلبل چمن کے تختے تختے میں
جو کچھ بھی صبر ہو تو ایک گُل کیا اس کو تھوڑا ہے

دیا ہے سنگ دل کے ہاتھ جس نے شیشۂ دل کو
جو سچ پوچھو تو اس نے لعل کو پتھر سے توڑا ہے

سمندِ آسماں کب آپ سے دوڑے ہے اس پر تو
کسی کی ایڑ پہ ہے اڑا اور کوڑے پہ کوڑا ہے

کل اس نے نیلگوں ناخن سے ایسے میرے چٹکی لی
کہ جس کے نیل کا اب تک مرے تن میں ددوڑا ہے

تپک ہے درد ہے کوندن پڑی ہے ہول اُٹھتے ہیں
مرے پہلو میں کیوں یارو یہ دل ہے یا کہ پھوڑا ہے

نشے میں پا کے اس کو کس طرح بوسہ نہیں لیتا
بھلا یارو کسی نے بھی شکار اپنے کو چھوڑا ہے

عبث اس بے وفا کے تو جو نکتوڑے اٹھاتا ہے
ارے دل تجھ کو کیا دنیا میں محبوبوں کا توڑا ہے

یہی ہے دھوم کل سے وہ مرے ملنے کو آتا ہے
گلے میں ہار ہیں اور تن میں نافرماں کا جوڑا ہے

غرض میں تو نظیر اس سے یہ سمجھا ہوں کہیں شاید
کسی کا نیل بگڑا ہے کہ یہ طوفان جوڑا ہے

اظہار ہم بھی کرتے احوال دل فگاری
شرمِ وفا گر ایک دم دیتی زباں کو یاری

جن میں فریب و فن کی سوختہ کاریاں ہیں
ہم اُن کے مبتلا ہیں اے وائے خام کاری

شکوہ فرامشی کا کیا اُن سے کیجے جن کو
صورت ہی بھول جاوے پھر کیسی یادگاری

یک بار ملتے ملتے رُک جاؤ تم تو اے جاں
دل بستگاں کی پھر ہو کیونکر نہ اشکباری

وعدے پہ گل رخوں کے مت کھا فریب اے دل
ان کے قرار میں ہیں صد خار بے قراری

لیتی ہے ہم سے بدلا اب صبحِ حشر اس کا
جو شام مُو میں ہم نے کی تھی سیاہ کاری

گر کر نظیر ہم اس محبوب کی نظر سے
ایسے ہوئے ہیں ہلکے جو زندگی ہے بھاری

جس وقت خواب ناز سے وہ چشم وا ہوئی
صد خستہ نہ خفتہ کی حاجت روا ہوئی

لا بوئے گل نہ کلبۂ احزاں میں اے نسیم — یہ کب ہماری روح کی راحت فزا ہوئی
یوں کارواں شباب کا گزرا کہ گوش زد — آواز پا ہوئی نہ صدائے درا ہوئی
پوچھی نظیرؔ ایک نے کل شکلِ وصلِ یار — ہم نے کہا یہ اس سے کہ کیا کہئے کیا ہوئی

جو شکل دور باش تھی روزِ نخست کی
اب بھی جو ہم گئے تو وہی برملا ہوئی

بنا کے منہ جو سراسر ہمیں برا کہئے — تمہارا ہم نے بگاڑا ہے کیا بھلا کہئے
غرض تھی چاہ سے ہم کو سو ہم نے کی آگے — گناہ اس کو سمجھ لیجئے خطا کہئے
وفا جو ہم میں ہے کم سینکڑوں میں نکلے گی — اگر ہزار طرح ہم کو بے وفا کہئے
صریح خوش تھے ہمیں دیکھ کر ہوئے ناخوش — یہ اختلاط میں ہے کون سی ادا کہئے
جو چاہے آپ کو دل سے اسے خفا کیجے — یہ ناروا ہے محبت میں یا روا کہئے
رہو خوشی سے تم اپنی تو ہے مراد مری — تمہارے دل کا جو کچھ ہو وہ مدعا کہئے
ہم آویں جاویں بھلا کیا خوشی سے آپ کے پاس — نہ جا نکالئے لب سے کبھی نہ آ کہئے
جو لے کے دل کو کریں رات دن ستم گاری — تو منصفو انھیں پھر کچھ نہ کہئے کیا کہئے

گلے کی داد نزاکت سے دیتے ہم بھی نظیرؔ
پر اس صنم کا ہے نازک مزاج کیا کہئے

جان بھی بہ جان ہے ہجر میں اور دل فگار بھی — تر ہے مژہ بھی اشک سے جیب کا تار تار بھی
طرفہ فسوں سرشت ہے چشم کرشمہ سنج یار — لیتی ہے ایک نگاہ میں صبر بھی اور قرار بھی
کوچے میں اس کے بیٹھنا حسن کو اس کے دیکھنا — ہم تو اسی کو سمجھے ہیں باغ بھی اور بہار بھی
دیکھئے کیا ہو بے طرح دل کی لگے ہیں گھات میں — عشوۂ پُرفریب بھی غمزۂ سحر کار بھی

زلف کو بھی ہے دمبدم عزم کمند افگنی
دام لئے ہے مستعد طرۂ تابدار بھی

کہنے لگی وہ اپنے جب چاہنے والوں کو نظیر
اٹھ کے یکایک اس گھڑی ہم نے کہا کہ یار بھی

ہم اطوار تاسف سے نہ کرتے آج جہاں کا ہی
گر اس بے درد کے طرزوں سے ہوتی کچھ بھی آگاہی

خیال شوخی چشم اس کا اپنے دیدۂ تر میں
پھرے ہے یوں کہ جیسے ہو شناور بحر میں ماہی

ہم اس کو یاد کش بھی جھل نہیں سکتے ہیں اس ڈر سے
کہ ہے وہ رمز فہم اور اس میں ہے طرز ہوا خواہی

نہ کر پہلو تہی اس کے جفا و جور سے اے دل
مزا کیا عشق کے آفات کا جب عافیت چاہی

بتوں کو دل دیا تھا تو نے اب دیں کو بھی دے بیٹھا
ارے کچھ تو خدا سے ڈر نظیر اتنی بھی گمراہی

غفلت میں جو رہا وہ نہ بھولے تو کیا کرے
فربہ جسے کیا وہ نہ پھولے تو کیا کرے

گل سے کوئی کہے کہ شگفتن سے باز آ
اس کو تو پھول لنا ہے نہ پھولے تو کیا کرے

جو ناقبول شے کے بنایا قبول کو
پھر اس کو وہ بھلا نہ قبولے تو کیا کرے

لڑکے کو دیں جو نہد میں مادر پدر سلا
لاچار پھر وہ اس میں نہ جھولے تو کیا کرے

جس فیلباں کو حکم ہو سردار کا نظیر
پھر وہ غریب ہاتھی نہ ہولے تو کیا کرے

اس رشک مہ کے منہ پہ وہ مشکیں جو خال ہے
ایسا تو خال خلق میں اب خال خال ہے

اے مردمان چشم بتاں یہ وہ خال ہے
تم سب کے آج خال کو یہاں جانے حال ہے

کیا دام زلف چاہئے جس جا یہ خال ہے
دانا کے واسطے تو یہ دانہ ہی جال ہے

اس مہ جبیں کے گوشۂ ابرو میں خال ہے
جیسا وہ سمجھے ہے یہ ویسا ہی ڈھال ہے

مکھڑے پہ اس کے گرچہ بناوٹ کا خال ہے — اصلی کو پر یہ حسن بنانا محال ہے
جس منہ پہ جوشِ حُسن سے تل بھر بھی جا نہ ہو — وہاں تل بھی آ پڑے تو یہ تل کا کمال ہے
اس خال کے فراق میں اپنے جگر کا آج — وہ حال ہے جو چاند کے سینے کا حال ہے
خوبی میں اس کی چشم سلیمانی کہئے آہ — نیلم ہے یا کہ مردم چشم غزال ہے
اب کس سے اس کے خال کو تشبیہ دیں نظیر
کافر یہ رد سیہ تو کوئی بے مثال ہے

اب تو ہر لحظہ وہ بے درد ستاتا ہے مجھے — بے نہایت ستم و ظلم دکھاتا ہے مجھے
جاگتا ہوں تو یہ کہتا ہے کہ جا سو بھی کہیں — اور جو سوتا ہوں تو ٹھوکر سے جگاتا ہے مجھے
جس طرح جلتی ہے فانوس میں شمع محفل — اس طرح یہ دکھی پردے میں جلاتا ہے مجھے
خوش نصیبی مری الفت کی تو دیکھو یارو — یاد کرتا ہوں جسے میں وہ بھلاتا ہے مجھے
شوق دیدار ہے یا جذبۂ الفت ہے غرض — کوئی تو ہے کہ جو کھینچے لئے جاتا ہے مجھے
آج وہ خاک نشیں ہوں میں کہ جوں نقش قدم — ہر کوئی پاؤں کی ٹھوکر سے مٹاتا ہے مجھے
عشق میں اس کے نہ مرتا ہوں نہ جیتا ہوں نظیر
ایسی مشکل ہے کہ کچھ بن نہیں آتا ہے مجھے

یہ کس نے آج چمن میں قبا اُتاری ہے — کہ جس کی بُو سے ہر ایک گُل بیقراری ہے
تو وہ ہے گُل کہ ہمیشہ قدم قدم پہ ترے — چمن نے باغ میں سو سو بہار واری ہے
ترا میں حُسن زلیخا سے پوچھ آتا جان — تو کیا کروں کہ وہ تشریف لے سدھاری ہے
نہ برق میں ہے نہ سیماب میں نہ شعلے میں — الٰہی دل کو کہاں کی یہ بیقراری ہے
نظیر، ابروئے مژگاں کو اپنا دل دے ڈال

نہیں تو دم میں میاں پھر چھری کٹاری ہے

لینے کو ہم آئے ہیں دلِ زار کسی سے — کچھ اور نہیں حجت و تکرار کسی سے
اب خیر اسی میں ہے کہ دے ڈالئے دل کو — تا مفت نہ ہو قصہ و پیکار کسی سے
ہم اپنی ہی خوبی سے نہیں بولے ہیں ورنہ — ہوتا خلش اب تک تو کئی بار کسی سے
اقرار جو کر کے کوئی مکرے تو وہ جانے — ہم نے تو کیا کچھ نہیں اقرار کسی سے
سب جانتے ہیں دل کے تئیں مفت لیا ہے — بوسے بھی نہیں پائے ہیں دو چار کسی سے
کیا وجہ نہ دینے کی کوئی منہ سے تو بولو — تو ہم بھی نہ ہوں دل کے طلبگار کسی سے
یہ سن کے نظیر اس نے کہا سنتے ہو یارو — ہم کو تو عداوت نہیں زنہار کسی سے

سو آپ میں اس مکر کو ہوں خوب سمجھتا
اس پر تو نہ بولے میری بیزار کسی سے

ان کو اُدھر سے حسن دکھانا گھڑی گھڑی — اور ہم کو غش یہ غش اِدھر آنا گھڑی گھڑی
دن رات اس کے ہجر میں گھڑیال کی طرح — پڑتا ہے مجھ کو شور مچانا گھڑی گھڑی
آتے ہیں اب تو پہر میں کچھ آٹھ سات بار — کیا جانے کیا کرے گا یہ آنا گھڑی گھڑی
آنا کبھی تو گھر میں یہ کہنا آنا بار بار — یعنی کہ مجھ کو وہاں سے بلانا گھڑی گھڑی
اور آپ بھی جو چار گھڑی بیٹھنا تو پھر — کرنا ہر ایک طرح کا بہانا گھڑی گھڑی
گر وصل کی ہو شب تو انھیں ہونا مضطرب — کہنا جاؤں جاؤں مجھ کو کڑھانا گھڑی گھڑی
القصہ وقت صبح تک اُن کو تو روٹھنا — اور ہم کو پاؤں پڑ کے منانا گھڑی گھڑی

جاتی ہے قدر اس میں، کچھ اچھا نہیں نظیر
گھر میں کسی کے دوڑ کے جانا گھڑی گھڑی

جلد اتنا نہ چل او جلوہ دکھانے والے　　ہیں نقاہت زدہ پیچھے ترے آنے والے
وائے غفلت جنھیں ہے فکر جراحت درپیش　　ہم انھیں سمجھے ہیں مرہم کے لگانے والے
جُرم میں چاہ کے جو چاہو سو کہہ لو صاحب　　شرم سے ہم نہیں اب سر کو اٹھانے والے
یک سرِ مو نہ پریشان ہو تو اے کاکلِ یار　　ہم ترے دام میں آکر نہیں جانے والے
ہم تو جا بیٹھیں ابھی یار کے کوچے میں مگر　　چین دینے کے نہیں رشک کے کھانے والے

ل نہ بے درد بتوں سے ہمیں ہے خوف نظیر
تو ہے کم زور دہ ہیں زور جتانے والے

کہہ کے اس قاتل نے آج ایک بات میرے سامنے　　دل کے دو ٹکڑے کئے ہیہات میرے سامنے
شعلۂ دل سے مرے پروانہ کیا ہوگا دوچار　　شمع نے رو رو دیا تھا، رات میرے سامنے
کیا کوئی اُس شعلہ رو سے ہو مقابل حُسن میں　　ہو گئی پریوں پری بھی مات، میرے سامنے
نقطۂ حسن اس کے رُخ کا ایک کتابِ حُسن ہے　　ہو چکی اس کی بھی تحقیقات میرے سامنے
اس کی ابرو کی صفت میں ہر کماں ابرو نے رات　　بزم میں کیا کیا پڑھیں ابیات میرے سامنے
میں تو اس غماز کو کیا کیا سزا دیتا مگر　　کیا کروں منکر ہوا بد ذات میرے سامنے

پھر چلا تو آج اس چنچل کے کوچے میں نظیر
کل تو تو آیا تھا کھا کر لات میرے سامنے

گئی فلک تئیں پر اس کے دل میں راہ نہ کی　　ہماری آہ نے پیدا یہ دستگاہ نہ کی
جگر کو دیکھئے میرے کہ یوں ہوا ہوں قتل　　سپر تو کیا ہے کہ ہاتھوں تلک پناہ نہ کی
زیادہ اس سے اب اخفائے درد کیا ہوگا　　کہ جان آنکھوں میں آ آ گئی پر آہ نہ کی
کہا میں یار سے ایک دن کہ اے مہ تاباں　　ہماری شام کبھی تم نے صبح گاہ نہ کی

نہ ہم سے پیار نہ الفت نہ مہر نہ اخلاص — جو سرسری سی نگہ گاہ کی تو گاہ نہ کی
یہ سن کے مجھ سے کہا یہاں بھی کچھ اجارہ ہے — نہ کی تو چل بے نہ کی، واہ خواہ مخواہ نہ کی

میاں نظیر ہمیں چاہتے رہے سب کو
ہزار حیف کسی نے ہماری چاہ نہ کی

غنچہ لب، مہر جبیں، عارض گلفام پری — گلشن حسن ہے اب وہ گل اندام پری
کیوں نہ جھمکیں طرب و عیش کہ جس بزم میں ہو — مے و مینا پری ساقی پری اور جام پری
وہ پری رو جہاں آوے تو ہو وہاں کی یاد — دن پری، رات پری، صبح پری، شام پری
یوں مرے سینے پہ سوتا ہے شب وصل میں وہ — جس طرح اپنے پلنگ پر کرے آرام پری
اس کے مکھڑے کی جھلک بھی وہی کرتی ہے جو کچھ — کرتی ہے حسن کی دکھلا کے جھلک کام پری
میں نے پوچھا کہ ہے کیا نام تمہارا کہئے — بولی کیا تو نہیں واقف ہے مرا نام پری

جس گل اندام کو اپنا دیا دل تو نے نظیر
حسن میں نام خدا ہے وہ دل آرام پری

ہو جو دوچار صبح اس عارض برق تاب سے — نکلیں ستارے رشک کے دیدۂ آفتاب سے
چھپتے ہیں یوں پری رخاں اس رخ مہر تاب سے — جیسے ستارے صبح کو چھپتے ہیں آفتاب سے
مکھڑے کی اس کے ہمسری کیونکہ ہو ماہتاب سے — باتیں کرے ہے اب تو صاف بڑھ کے وہ آفتاب سے
دل کو اسیر کر لیا زلف کے پیچ و تاب سے — آنکھوں کی نیند لے گیا نرگس نیم خواب سے
چہرے پہ اپنے تم نقاب کھینچو ہو کیوں حجاب سے — یہ تو بھبھوکا اب نہیں وہ کہ چھپے نقاب سے
اس کا وہ روئے مہروش چھلکے ہے یوں نقاب سے — جیسے شعاع آفتاب پھوٹے تنک سحاب سے
سویا ہے وہ ابھی نسیم لگیو نہ اس کے تن سے تو — اور جو لگی تو وہ ابھی چونک پڑے گا خواب سے

زلفیں جو کھولیں آپ نے سنبل تر کا جرم ہے — یا کہ ختن میں کچھ خطا ہو گئی مشک ناب سے
اس کا وہ قد ہے جلوہ گر دیدۂ تر سے یوں مگر — جیسے عیاں ہو عکس سرو نہر چمن کے آب سے
اپنا کتابی رُخ جو یوں پھیر رہو ہو ہم سے دم بدم — تم نے کیا ہے انتخاب کیا یہی اس کتاب سے
چھوڑ کے مجھ کو نیم جاں اب تو چلے ہو تم مگر — دیر نہ کیجیو مہرباں پھر یو ذرا شتاب سے
سخت عذاب تھا ہمیں آہوں سے دل کی کیا کہیں — بارے وہ تم نے لے لیا، چھوٹے ہم اس عذاب سے

کہتے ہیں جس کو زندگی دم کی ہوا ہے اے نظیر
ہم کو تو آج کھل گیا عقدہ یہ ایک حباب سے

آیا نہیں جو کر کے اقرار ہنستے ہنستے — جل دے گیا ہے شاید عیار ہنستے ہنستے
اتنا نہ ہنس دل اس سے، ایسا نہ ہو کہ چنچل — لڑنے کو تجھ سے ہووے تیار ہنستے ہنستے
لے کر صریح دل کو وہ گل عذار یارو — ظاہر کرے ہے کیا کیا انکار ہنستے ہنستے
ہنس ہنس کے چھیڑ اس کو زنہار تو نہ اے دل — ہوگا گلے کا تیرے یہ ہار ہنستے ہنستے
ہنسنے کی آن دکھلا، لیتا ہے دل کو گل رو — کرتا ہے شوخ یارو یہ کار ہنستے ہنستے
جھنجھلا کے حال دل کا کہنا نہیں روا ہے — لائق یہاں تو کرنا انکار ہنستے ہنستے
دستار سرخ کج کر طرہ زری کا رکھ کر — آیا جو دل کو لینے دلدار ہنستے ہنستے
آنکھیں لڑا کے اس نے ہنس کر نگہ کی ایسی — جو لے گیا دل آخر خونخوار ہنستے ہنستے

آیا ہے دیکھنے کو تیرے نظیر اے گل
دکھلا دے ٹک تو اس کو دیدار ہنستے ہنستے

لگایا دام زلفوں کی شکن نے پیچ نے بل نے — بنایا پان نے رنگ اور سنبھالا سحر کاجل نے
مرا دل دیکھتے ہی اس صنم کو ہو گیا شاداں — نگاہیں دم بہ دم سو عیش و عشرت سے لگیں ملنے

کبھی خوش ہو کے ہُو ہُو کی، کبھی بولا اہاہا ہا ۔۔۔ عجب لوٹے مزے اس وقت نظاروں کی اُنگل نے
نہ بولا منہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری ۔۔۔ مگر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے
مجھے کہہ کر "ارے غافل" بھولی صورت کا بنا نقشا ۔۔۔ کیا اک بار منہ غصے سے سرخ عیار چنچل نے
اب اس ظالم کے ہاتھوں سے بچاؤں کیونکر اپنا جی ۔۔۔ اٹھا کر جھٹ قدم واں سے لگا گھر کی طرف چلنے
چلا ڈرتا جو آگے کو تو وہ پھر ہنس کے یوں بولا ۔۔۔ "اڑا کر مفت نظارے بجا، اب تم لگے ٹلنے"
ادب سے یوں کہا "اب تو ہوئی تقصیر یہ مجھ سے ۔۔۔ لگے قطرے پسینے کے مرے منہ سے وہیں ڈھلنے
لگے غمزے لگانے تیر ادھر دکھلا کے سو پھرتی ۔۔۔ اُدھر سے تیغ ابرو کی بھی پھر کیا کیا لگی چلنے
اِدھر آنکھوں کے جادو نے بنایا باولا کیا کیا ۔۔۔ ادھر کیں پھرتیاں کیا کیا نگاہوں کی بھی چنچل نے

دکھا کر مجھ کو اپنی واں زبردستی کے یہ نقشے
وہیں دل لے لیا جھٹ پٹ نظیر اس شوخ چنچل نے

ہم تو عاشق ہیں ترے ناز اٹھانے والے ۔۔۔ تم سے کم دیکھے ہیں محبوب ستانے والے
بند کر قیدِ محبت میں خبر میری نہ لی ۔۔۔ دام میں جس کے پھنسے دام چھڑانے والے
کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں ۔۔۔ آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے
کل جو رستے میں ملاقات ہوئی تو یہ کہا ۔۔۔ کہاں جاتے ہو طرحدار جلانے والے
گزری مدت کہ مرے ساتھ پلٹنے نہیں آئے ۔۔۔ کیا ہوئے یار و گلے ہم کو لگانے والے
یوں تو اوقات گزرتی ہے مزے داری میں ۔۔۔ نہ ملے چین مزے دار دکھانے والے

اب کے ملنا ہو نظیر اس سے تو کہنا جا کے
کیا ملیں ہم، نہ رہے یار بلانے والے

کسی کی چین نہ لی ہم نے چاہ کی گھڑی ۔۔۔ نظر پڑی نہیں ہرگز نباہ کی گھڑی

پس از وفات نہ آئے ہماری تربت پر
بجائے سبزہ رکھی لاکے کاہ کی گٹھڑی

مژہ سے اس کی پڑا ہے مقابلہ یارب
ادھر یہ دل ہے، ادھر ہے سیاہ کی گٹھڑی

تمھارے طرۂ رہزن نے چھین لی سرِ شام
متاعِ صبر، اسی دادخواہ کی گٹھڑی

حضور میں تری رحمت کے جھک نہیں سکتا
کہ سر پہ ہے مرے بارِ گناہ کی گٹھڑی

رکھے ہے کون، جنون، وادیٔ محبت میں
بغیر آبلہ یا زادِ راہ کی گٹھڑی

بہم ہوا تھا جو کچھ یاں طوافِ کعبہ سے
کرشمے نے وہ بتوں کے، تباہ کی گٹھڑی

کوئی تو غرق ہے بحرِ فراق کا یاں شوخ
نہیں حباب یہ ہے سوز و آہ کی گٹھڑی

ابھار سینے پہ اس کے کچوں کا ہے بارے
یہ شاہِ حسن کے ہے خیمہ گاہ کی گٹھڑی

پڑا ہے ناز و ادا کا بہم جو یہ لشکر
بجا ہے گر کہیں گردِ سپاہ کی گٹھڑی

زمینِ نظیرؔ نہیں گرم، اس میں ہے کیا خاک
مگر بہ زورِ طبیعت نباہ کی گٹھڑی

دَیر سے آج جو نکلے بت ذی شان کئی
لے گئے صبر کئی، دین کئی، ایمان کئی

اتنا رویا ہوں کہ اب لختِ جگر کے یارو
ڈھیر ہیں چشم سے لے تا سرِ داماں کئی

اب تو ٹک منہ کو دکھا یار کہ نرگس بن کر
نکلے ہیں خاک چمن سے ترے حیران کئی

اس کے دامن سے لگوں پاؤں پڑوں ساتھ چلوں
خاک ہوں تو بھی مرے دل میں ہیں ارمان کئی

آخر آیا ہے تو گلشن میں بھی ٹک اب تو چل
یاں بھی رہتے ہیں ترے چاک گریبان کئی

پان کھا کھا نہ ہنس اس درجہ تو اے دشمنِ جاں
ابھی بھر جائیں گے خون میں لب و دندان کئی

نظر آتے ہیں مجھے اس کی گلی میں دن رات
ٹکڑے ٹکڑے کئی، بسمل کئی، بے جان کئی

جان کر گورِ غریباں میں قیامت نہ مچا
ابھی سوتے ہیں ترے بے سر و سامان کئی

بادشاہ کو نہ لکھا رقعہ کبھی جس نے نظیر
اُس شہِ حسن کے آئے مجھے فرمان کئی

کب آہ وہ کر سکتے ہیں دل کی تپشوں سے — صحبت ہے جنھیں حسن کے نازک منشوں سے
ہو جرب زباں سے نہ پری رویوں کی تسخیر — یہ لوگ جو ملتے ہیں تو دل کی کششوں سے
ہے آج تو خوش پر نہیں بلبل کو یہ معلوم — گل سر کو پٹکتا ہے چمن کی روشوں سے
خوباں تو چلے ہم سے چلن ناز کے لیکن — چھیڑا ہے انھیں ہم نے بھی کن کن روشوں سے

مدت میں نظیر اس نے کیا دل کے تئیں قتل
صد شکر کہ ہم آج چھٹے سب خلشوں سے

نہ آیا آج بھی سب کھیل اپنا مٹی ہے — تمام رات یہ سر اور پلنگ کی پٹی ہے
جبیں پہ قہر نہ تھا سیاہ پٹی ہے — بھوؤں کی تیغ بھی کافر بڑی ہی کنٹی ہے
بھبکتی نکلیں ہیں اشکوں کی شیشیاں یارو — ہمارے سینے میں کس شیشہ گر کی بھٹی ہے
گلے لگائیے منہ چومئے سلام رکھئے — ہمارے دل میں بھی کیا کیا ہوس اکھٹی ہے

کوئی حجاب نہیں تجھ میں اور صنم میں نظیر
مگر تو آپ ہی پردہ ہے، آپ ہی ٹٹی ہے

وہ جب گھر سے نکلے لچکتے لچکتے — قدم بھی اٹھائے جھجکتے جھجکتے
نہ مانا کبھی دل نے کہنا ہمارا — نہایت ہم عاجز ہوئے بکتے بکتے
نہ آیا ادھر کر کے وعدہ وہ اور ہم — گئے جی میں گھبرا اُدھر تکتے تکتے
نظیر اُس کی محفل میں جب دور بیٹھا — ہوا جب وہ ناخوش جھڑکتے جھڑکتے
بٹھایا تو دور اُس نے پر اپنے ڈھب سے — وہ پھر واں ہی پہنچا سرکتے سرکتے

عشق پھر رنگ وہ لایا ہے کہ جی جانے ہے — دل کا یہ رنگ بنایا ہے کہ جی جانے ہے
ناز اٹھانے میں جفائیں تو اٹھائیں لیکن — لطف بھی ایسا اٹھایا ہے کہ جی جانے ہے
زخم اُس تیغ نگہ کا مرے دل نے ہنس ہنس — اس مزے داری سے کھایا ہے کہ جی جانے ہے
اُس کی دزدیدہ نگہ نے مرے دل میں چھپ کر — تیر اِس ڈھب سے لگایا ہے کہ جی جانے ہے
بام پر چڑھ کے تماشے کو ہمیں حُسن اپنا — اس تماشے سے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
اُس کی فرقت میں ہمیں چرخ ستمگار نے آہ — یہ رُلایا، یہ رُلایا ہے کہ جی جانے ہے
حکم چُپکی کا ہوا شب کو، سحر تک ہم نے — رت جگا ایسا منایا ہے کہ جی جانے ہے
پا کے سہلانے میں گو اونگھ گئے جھک جھک کر — پر مزہ بھی وہ اُٹھایا ہے کہ جی جانے ہے

رنج ملنے کے بہت دل نے سہے لیک نظیر
یار بھی ایسا ملایا ہے کہ جی جانے ہے

ہم اشکِ غم ہیں اگر تھم رہے رہے نہ رہے — مژہ پہ آن کے ٹک جم رہے رہے نہ رہے
رہیں وہ شخص جو بزمِ جہاں کی رونق ہیں — ہماری کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے
مجھے ہے نزع وہ آتا ہے دیکھنے اب آہ — کہ اس کے آنے تلک دم رہے رہے نہ رہے
بقا ہماری جو پوچھو تو جوں چراغِ مزار — ہوا کے بیچ کوئی دم رہے رہے نہ رہے
ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ — مثالِ قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے
یہی ہے عزم کہ دل بھر کے آج رو لیجے — کہ کل یہ دیدۂ پُرنم رہے رہے نہ رہے
تمہارے غم میں غرض ہم تو دے چکے ہیں جی — بلا سے تم کو بھی اب غم رہے رہے نہ رہے
یہی سمجھ لو ہمیں تم کہ ایک مسافر ہیں — جو چلتے چلتے کہیں تھم رہے رہے نہ رہے
نظیر آج ہی چل کر بتوں سے مل لیجے — پھر اشتیاق کا عالم رہے رہے نہ رہے

جب سے حقہ تجھ لب جاں بخش کا ہم راز ہے
تب سے حق حق کیا کہ قہ قہ کی سی کچھ آواز ہے

یہ جو اڑتا ہے دھواں اب تیرے مُنہ سے اے پری
اس دھوئیں والا نَے کی عرش تک پرواز ہے

پیچواں پینے میں کس کس آن کا کھلتا ہے پیچ
گڑگڑی پینے میں کافر اور ہی انداز ہے

پیچواں کو اپنے پیچوں پر نہیں اتنا غرور
جتنا تیری گڑگڑی کو ڈیڑھ خم پر ناز ہے

دل جلانے کو تو ابھی عاشق جانباز ہے

آب نے حقے تو سے نیچے کو یہ رتبہ کہاں
منہ سے لگنے میں تو اب منہال بھی ممتاز ہے

گر تجھے ہونا ہے گل اے دل تو جل اور دم نہ مار
دیکھ تمباکو کو کیا کیا سوز ہے اور ساز ہے

گل کیا دم بھر میں تمباکو جلا کر آگ میں
اے پری رو تیرے دم میں یہ کچھ اعجاز ہے

ہے کہاں ٹک بول اُٹھ جلدی خدا کے واسطے
او میاں حقے عجب پیاری تری آواز ہے

کیوں نہ تجھ کو منہ لگا دیں خلق میں شاہ و گدا
تو تو پریوں کے لبوں کا ہمدم و ہمراز ہے

پیچواں پر پیچ کھاتی ہے پڑی حوروں کی زلف
گڑگڑی تیری بھی سادی، اے پری طناز ہے

آدم ایک دمڑی کی حقیا کو رہے عاجز سدا
ہم کو کیا کیا گڑگڑی اور پیچواں پر ناز ہے

غور کر دیکھا تو اب یہ وہ مثل ہے اے نظیر
باپ نے بدڑی نہ ماری بیٹا تیر انداز ہے

کچھ نہ دیکھا ہم نے جز بیداد تیرے ہاتھ سے
اے مرے بیداد گر فریاد تیرے ہاتھ سے

پنجۂ خورشید بھولا تھا ید بیضا کا رشک
پھر وہی رشک اس کو آیا یاد تیرے ہاتھ سے

زخم کھایا ہم نے مُنہ پر جب تو قاتل نے کہا
اپنے چہرے پر ہوا یہ صاد تیرے ہاتھ سے

کھولی ناخن سے رگِ جاں تو نے اے فصاد یاں
یہ نیا نشتر ہوا ایجاد تیرے ہاتھ سے

صید کیا تو نے تو مارا دل پہ صیادوں کے ہاتھ
ہاتھ ملتے ہیں غرض صیاد تیرے ہاتھ سے

حیف کیا گلشن ہوا برباد تیرے ہاتھ سے ہاتھ ٹوٹیں تیرے گل چیں تو نے کیوں توڑے وہ گل

تو نے چنگل سے نہ چھوڑا یار کا دامن نظیر
ہم ہوئے دل میں نہایت شاد تیرے ہاتھ سے

زلف ہو بر سرِ احسان تو گرفتار کرے چشم کی عین عنایت ہو تو بیمار کرے

تیغ ابرو کی نوازش ہو تو ہو زخم حصول شورِ لب زخم کو چاہے تو نمک زار کرے

بکارا قاصد اشک آج فوج غم کے ہاتھوں سے ہوا تاراج پہلے شہر جانِ دل کا نگر تیجھے

سنو میں خون کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں ورناتی چلے آتے ہیں اٹھتے بیٹھتے لختِ جگر تیجھے

ہستیاں نیستیاں یاں بھی ہیں ایسی جیسے وہ کمر اور وہ دہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے

بے زری، فاقہ کشی، مفلسی، بے اسبابی ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے

میں دست و گریباں ہوں دم بازپسیں سے ہمدم اسے لانا ہے تو لا جلد کہیں سے

منہ زرد و آہ سرد و لب خشک و چشم تر سچی جو دل لگی ہے تو کیا کیا گواہ ہے

مری اس چشم تر سے ابر باراں کو ہے کیا نسبت کہ وہ دریا کا پانی اور یہ خونِ دل ہے برساتی

گئی گزری اپنی وہ مے کشی لگی آگ جب سے فراق کی یہ جلے ہے دل سو کباب ہے یہ سرشک چشم شراب ہے

مرتا ہے جو محبوب کی ٹھوکر پہ نظیر آہ پھر اس کو کبھی اور کوئی لت نہیں ہوتی

ہو کے خفا اور تیوری چڑھا کر بولی میں اپنی کہا نظیر آپ نے جو دکھالی تھی نہیں بن ٹھن، او ہو کا بن چھیے

باتیں ہمارے دل کی کہہ دیں نظیر اس نے ہے سچ تو یوں کہ دل کو ہوتی ہے راہ دل سے

بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس نے نظیر کیا دم دیا ہے حضرت آدم کو دیکھئے

مسلسل غزلیں

(۲)

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا
یارب تری قدرت کا ہے ہر آن تماشا

لے عرش سے تا فرش نئے رنگ نئے ڈھنگ
ہر شکل عجائب ہے، ہر ایک شان تماشا

افلاک پہ تاروں کی جھمکتی ہے طلسمات
اور روئے زمیں پر گل و ریحان تماشا

جنات، پری، دیو، ملک، حور بھی نادر
انسان عجوبہ ہیں تو حیوان تماشا

جب حسن کے جاتی ہے مرقع پہ نظر آہ
کیا کیا نظر آتا ہے ہر اک آن تماشا

چوٹی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہے لہریں
رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا

گر عشق کے کوچے میں گزر کیجے تو واں بھی
ہر وقت نئی سیر ہے، ہر آن تماشا

منہ زرد، بدن خشک، جگر چاک، الم ناک
غل، شور، تپش، نالہ و افغان تماشا

ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیر آہ
سب ارض و سما کی ہے گلستان تماشا

سحر اس جھمک سے آیا نظر اک نگار رعنا — کہ خور اس کے حسن رخ کو لگا تکنے ذرہ آسا
خد و خال خوبی آگیں لب لعل پان سے رنگیں — نظر آفت دل و دیں مژہ صد مضرت افزا
کھلی رخ پہ زلف پرخم سی رشک رنگ سلیم — غرض اس طرح کا عالم کہ پری کہے اہاہا
کہا ہم نے اے سمن بر پری چہرہ مہر پیکر — جو چلی ہو یوں جھمک کر کہو عزم ہے کدھر کا
ہے جو قصد سیر بستاں چلیں ہم بھی ساتھ اے جاں — کہا سن کے یارے میاں کوئی تم بھی ہو تماشا
نہ کچھ آشنائی الفت نہ شناخت اک دو دن کی — جو یہ ہے اسی کی مرضی تو ہے سوچ پھر یہ کیسا

کہا جب نظیرؔ ہم نے یہی دل میں ہم تو سمجھے
تو کہا جو نیکی ہووے تو پھر اس کا پوچھنا کیا

کی وصل میں دلبر نے عنایات تو پھر کیا — یا ظلم سے دی ہجر کی آفات تو پھر کیا
جب آئی اجل پھر کوئی ڈھونڈا بھی نہ پایا — قصوں میں رہے حرف و حکایات تو پھر کیا
حد بوس و کنار اور جو تھا اس کے سوا آہ — گر وہ بھی میسر ہوا ہیہات تو پھر کیا
دو دن اگر ان آنکھوں نے دنیا میں مری جاں — کی ناز و اداؤں کی اشارات تو پھر کیا
پھر اڑ گئی اک آن میں سب حشمت و سب شان — لے شرق سے تا غرب لگا ہات تو پھر کیا
اسپ و شتر و فیل و خر و نوبت و لشکر — گر قبر تلک اپنے چلا سات تو پھر کیا
آخر کو جو دیکھا تو ہوئے خاک کی ڈھیری — دو دن کی ہوئی کشف و کرامات تو پھر کیا
جب آئی اجل ایک ریاضت نہ گئی پیش — مر مر کے جو کی کوشش و طاعات تو پھر کیا
جب آئی اجل پھر وہیں اٹھ بھاگے شتابی — رندوں میں ہوئے اہل خرابات تو پھر کیا
جب آئی اجل آہ تو اک دم میں گئے مر — گر یہ بھی ہوئی آہ میں کرامات تو پھر کیا
دو دن کو جو تعویذ فلیتے و عمل سے — تسخیر کیا عالم جنات تو پھر کیا

اس عمرِ دو روزہ میں اگر ہو کے نجومی — سب چھان لیے ارض و سماوات تو پھر کیا
اک دم میں ہوا ہو گئے سب علمی و نظری — تجھے یاد جو اسباب و علامات تو پھر کیا
اس نے کوئی دم بیٹھ کے آرام سے کھایا — وہ مانگتا در در پھرا خیرات تو پھر کیا
دولت ہی کا ملنا ہے بڑی چیز نظیر آہ
بالفرض ہوئی اس سے ملاقات تو پھر کیا

سحر آیا جونہی میں کلبۂ احزاں میں بیچارا — وہیں اک بارگی جوشِ جنوں نے دل کو للکارا
پڑا ہے کیا فسردہ مثلِ برف اے شعلۂ آتش — بہار آئی دکھا گر تجھ میں ہے کچھ قوت و یارا
اٹھا اک گرد دل کر خاک اپنی گھر سے پھر باہر — پڑھا یہ بند اور ہو ہو کرکے نالہ آہ کا مارا
ہجومِ محشرم، ہنگامہ ام، دیوانہ ام مستم — نہ از پا می شناسم سر، نمی دانم ز سر پا را
قضا نے لا وہیں اک اس قدر زنجیر پہنائی — کہ جس کے غل کا پہنچا عرش کے کانوں میں جھنکارا
کھٹکتی دور تک جاتی تھی اس شور و فغاں سے وہ — مگر گرجا زمیں کے رعد کی نوبت کا نقارا
نظیر آیا جونہی پھر ہوش میں تو کہہ کے یہ بولا
کہ آخر ہر کمالے را زوالے می شود یارا

سحر جو نکلا میں اپنے گھر سے تو دیکھا اک شوخ حسن والا — جھمک وہ مکھڑے کی اس صنم کے کہ جیسے سورج کا ہو اجالا
وہ زلفیں اس کی سیاہ پرخم کہ ان کے بل اور شکن کو یارو — نہ پہونچے سنبل نہ پہنچے ریحاں نہ پہنچے ناگن نہ پہنچے کالا
ادائیں بانکی عجب طرح کی وہ ترچھی چتون بھی کچھ تماشا — بھویں وہ جیسے کھنچی کمانیں پلک سناں کش نگاہ بھالا
وہ آنکھیں مست اور گلابی اس کی کہ ان کو دیکھے تو دیکھتے ہی — مے محبت کا اس کی دل کو ہو گیا ہی گہرا نشہ دوبالا
لبوں پہ سرخی وہ پان کی کچھ کہ لعل بھی منفعل ہو جس سے — وہ آن ہنسنے کی بھی پھر ایسی کہ جس کا عالم ہی کچھ نرالا
وہ جامہ زیبی وہ دل فریبی وہ سج دھج اس کی وہ قد زیبا — کہ دیکھ جس پر فدا ہوں قمری دل سے وہ جن کو کہتے ہیں سرو بالا

نگہ لڑائی ہے اس نے جس دم جھٹک لیا جھپ سے دل کو میرے ادا ادا نے ادھر دبوچا، پلک پلک نے ادھر اچھالا
جو لے لیا دل کو میرے یارو، تو اس نے لی راہ اپنے گھر کی پڑا تڑپتا میں رہ گیا واں، زباں پہ آہ اور لبوں پہ نالا
بہت یہ میں نے تو چاہا پوچھوں میں نام اس کا وہ لے وہ گل رو نہ مجھ سے بولا، نہ کی اشارت، نہ دی تسلی نہ کچھ سنبھالا
پری رخ من مشکل لب من، دمے تو باز آ، بہ پیش چشم بہ یاد سرو تو بے قرارم، نہال عشقت شدہ است بالا
فدائے وجہک عشقی شوقاً دموع نہراً دمن فراقک کثیر حزناً مع الہموم، ثقیل ہجراً وکالجبالا
تساڈے سنے توں، دل ہے بیکل ایہی وہ گلاں نت اکھدا ہے سدا لے مینوں تے، اپنے گھر وچ نہیں تو اٹھے اساڈے نا آ
تمہاری آسا گی ہے نس دن تمہارے درشن کو ترسیں نیناں دلا سے سندر انوٹھے ابرن، ہٹیلے موہن، انوکھے لالا
اپن سے من کو جو چھپنوں تھی، ابار کائیں سگائی کا اتنی پھر آئیں آکر کہو لوبھاں کی پلک کٹارا جو تہاں نے گھالا
اگن برت ہے ہیا میں موہے برہ میں تیرے اے من موہنوا تو لیے جو نیناں نے موبا مکونہ چھینوں تنکو بھو ادکھالا
جگت سبھا مت ہر یکہ اٹک گیسو، من کرن لگا دوانی کینی تمن ہر کچن نہ سدھ کی گرداڑ نہ بدھ کی چھالا
کبھی تو ہنس کر شتاب آجا، نظیر کی بھی طرف ٹک آجان بنا کے سج دہج، پھرا کے دامن، لگا کے ٹھوکر، ہلا کے بالا

دل نہ لو دل کا یہ لینا ہے نہ اخفا ہوگا اس کو دل کہتے ہیں بس لیتے ہی چرچا ہوگا
تم کو ہر آن ادھر ہووے گی حسن آرائی ہم کو ہر لحظہ ادھر ذوق تماشا ہوگا
ہم بھی سو چاہ سے دیکھیں گے تمہاری جانب تم سے بھی ضبط تبسم نہ پھر اصلا ہوگا
جب تمھیں دیکھیں گے اور تم متبسم ہوگے چاہ غنچۂ زسر بستہ دہیں وا ہوگا
گفتگو ہووے گی باہم جو اشاراتوں میں متن اس کا بھی جو زلفوں میں محشا ہوگا
پاؤں تک ہاتھ جو لادیں گے کسی عذر سے ہم تاڑنے والوں میں شور اس کا بھی برپا ہوگا
جب یہ تقریر سنی اس گل خنداں نے نظیر ہم سے دل لے لیا اور ہنس کے کہا کیا ہوگا
قاصد صنم نے خط کو مرے دیکھ کیا کہا حرف عتاب یا سخن دل کشا کہا

تجھ کو قسم ہے کچھ نہ پوشیدہ مجھ سے تو — کیو وہی جو اس نے مجھے برملا کہا
قاصد نے کب تو سن کے کہا کیا کہوں میں یار — پہلے مجھی کو اس نے بہت ناسزا کہا
پھر تجھ کو سو عتاب سے جھنجھلا کے دم بدم — کیا کیا کہوں میں تجھ سے کہ کیا کیا برا کہا
اس کا مزا چکھاؤں گا جا کر اسے شتاب — رہ رہ اسی سخن کے تئیں بارہا کہا
میری تو کچھ خطا نہیں تو ہی سمجھ اسے — بے جا کہا یہ اس نے مجھے یا بجا کہا
کہتا تھا میں تجھے کہ نہ بھیج اس کو خط میاں — لیکن نظیر تو نے نہ مانا مرا کہا
رخ و جبین و مژہ تیر و چشم و ابرو کو — سنان و بدر و مہ و نرگس و ہلال لکھا
سنان و دل لب و دنداں کو رو و نکرت سے — عقیق و سیم و دُر و سنگ کے مثال لکھا
ذقن کو چاہ، زنخداں کو گوش و گردن کو — صراحی، سیب و گُل و چشمۂ زُلال لکھا
کف حنائی و انگشت و ساعد و قد کو — سنان و برگ گل و غنچہ و نہال لکھا
نہ ٹوکو دستو اس کی بہار نام خدا — یہی اب ایک ہے یہاں گلعذار نام خدا
یہ وہ صنم ہے پریرو کہ جس پہ ہوتی تھیں — ہزار جان سے پریاں نثار نام خدا
اسی صنم کی نگاہوں کی برچھیاں یارو — ہوئی ہیں میرے کلیجے کے پار نام خدا
اسی کے نشتر مژگاں میں اب وہ تیزی ہے — کہ جس سے ہوتے ہیں ہم دل فگار نام خدا
اسی صنم کے رخ و زلف کے تصور میں — ہماری گزرے ہے لیل و نہار نام خدا
گلی میں کوچہ و بازار میں ہم اب دن رات — اسی کے واسطے پھرتے ہیں خوار نام خدا
اسی کے سر کی قسم ہے کہ ہم تو مر جاتے — اگر نہ ہوتا یہ گل رو نگار نام خدا
بنے ہیں یہاں جو کئی دیر اور طلسم خانے — اُدھر جو ہوتا ہے اس کا گزار نام خدا
اُٹھا کے سینہ جھٹک بازو اور بنا کر دھج — چلے ہے جس گھڑی ٹھوکر کو مار نام خدا

قدم قدم پہ برہمن کہیں ہیں بسم اللہ　　صنم بھی کہتے ہیں سب بار بار نام خدا
غرض جدھر کو نکلتا ہے یہ تو ہر اک کے　　زباں سے نکلے ہے بے اختیار نام خدا
نظیرؔ ایک غزل اور کہہ کہ تیرے سخن
ہیں اب تو سب گہر آبدار نام خدا

نہ پہنے کیونکہ وہ پھولوں کے ہار نام خدا　　ابھی تو اس کی نئی ہے بہار نام خدا
جو مجھ سے پوچھے ہے ہنس کر کہ میں پری ہوں کیا　　تو میں یہ کہتا ہوں ہاں میری یار نام خدا
نشے کی اب تلک آنکھوں میں کچھ نہ تھی مستی　　پر اب کچھ آ چلا ہے خمار نام خدا
وہ دوبدو کی نگاہیں لڑانا کیا جانے　　حیا سے ہے وہ ابھی شرمسار نام خدا
ابھی تو اس کی بڑھائی ہیں ہنسلیاں یارو　　ابھی یہ آیا ہے چوٹی اتار نام خدا
مجھی سے لینے کی دل کے ہوئی ہے بسم اللہ　　مجھی یہ اس کا یہ پہلا ہے وار نام خدا
ابھی تو آنکھ اٹھا کر مجھی کو دیکھا ہے　　ابھی تو مجھ سے ہی رکھتا ہے پیار نام خدا
میں اپنی دیکھ کے ایڑی یہ بات کہتا ہوں　　نہ ہوگا ایسا کوئی وضع دار نام خدا
کمر کو باندھ کے اپنی پری سے توسن پر　　جدھر کو نکلے گا ہو کر سوار نام خدا
ادھر غرض کہ صفیں کی صفیں الٹ دے گا　　کرے گا حشر سا ایک آشکار نام خدا
نظیرؔ دیکھ اسے سب یہ مجھ سے کہتے ہیں
پری ہے یار تیرا، یہ تو یار، نام خدا

کل اس کے چہرے کو ہم نے جو آفتاب لکھا　　تو اس نے پڑھ کے وہ نامہ بہت عتاب لکھا
جبیں کو مہ جو لکھا تو کہا ہو جبیں بہ جبیں　　یہ کیسی اس کی سمجھ تھی جو ماہتاب لکھا
چمکتے دانتوں کو گوہر لکھا تو ہنس کے کہا　　ستارے اڑ گئے تھے جو دُرِ خوش آب لکھا

لکھا جو مشک خط زلف کو تو بل کھا کر — کہا خطا کی جو یہ حرف ناصواب لکھا
گلاب عرق کو لکھا تو یہ بولا ناک چڑھا — اسے نہ عطر میسر تھا جو گلاب لکھا
جگر کباب لکھا اپنا تو کہا جل کر — بھلا جی کیا میں شرابی تھا جو کباب لکھا
حساب شوق کا دفتر لکھا تو جھنجلا کر — کہا میں کیا متصدی تھا جو حساب لکھا
جو بے حساب لکھا اشتیاق دل تو کہا — وہ کس حساب میں ہے یہ بھی بے حساب لکھا

ہوئی جو رد و بدل ایسی کتنے بار نظیر
تو اس نے خط کا ہمارے نہ پھر جواب لکھا

نظر پڑا اک بت پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا — جو عمر دیکھو تو دس برس کی یہ قہر آفت غضب خدا کا
جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر — کسی سے چٹکی کسی کے کہنی کسی کے ٹھوکر نپٹ لڑاکا
گلے لپٹنے میں یہ شتابی یہ اضطرابی کہ مثل بجلی — ادھر جو چمکا چمک چمک کر ادھر جو لپکا تو پھر جھپاکا
یہ رنج وحشت یہ دور کھنچنا یہ ننگ عاشق کے دیکھنے کا — جو پتا کھڑکے ہوا سے آکر تو سمجھے کھٹکا نگہ کے پا کا
نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے نہ وہ منایا منے کسی سے — جو قتل عاشق پہ آکے مچلے تو غیر کا پھر نہ آشنا کا
یہ جھنجلاہٹ یہ اچپلاہٹ خبر نہ سر کی نہ تن کی سدھ بدھ — جو چیرا کھلا ابلا سے بکھرا نہ بند باندھا کبھی قبا کا
یہ راہ چلنے میں اچپلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے — کہاں کا اونچا کہاں کا نیچا خیال کس کو قدم کے جا کا
لڑا دی آنکھیں یہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ ماری — جو نظریں نیچے کرے تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا
جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی جو باتیں سنئے تو میٹھی میٹھی — یہ دل وہ پھر کہ سر اڑا دے جو نام لیجے کبھی وفا کا

نظیر چھپ جا کہیں سرک جا بدل لے صورت چھپا لے منہ کو
جو دیکھ پاتا ہے وہ ستم گر تو یار پھر ہے ابھی جھڑاکا

وہ رشک حور جو وقت سحر بے نقاب تھا — دیکھ اس کے رخ کو رو بہ زمیں آفتاب تھا

قطعہ

اک دن دل اپنا عیش گزشتہ کو یاد کر   رہ رہ کے ہم سے مانگتا اس کا جواب تھا
یعنی وہ کیا زمانۂ عشرت تھا اے نظیر   جس میں ہزار عیش سے میں کامیاب تھا
اب زار و ناتوان و ضعیف و نحیف ہوں   نقش طلسم تھا وہ کوئی یا حباب تھا
اک جنبش مژہ میں وہ برہم ہوا طلسم   کیا کہیے اس کو اور مگر یہ کہ خواب تھا
جب ہم نے دل سے بھر کے دم سرد یوں کہا   جس میں مئے طرب سے تو مست و خراب تھا
ہیہات کیا بتائیں ہم اس عصر خوش کا نام   اے غفلت انتما وہی عہد شباب تھا
تھی باغ زندگی کی اسی سے ہی آب و رنگ   دیوان عمر کا بھی وہی انتخاب تھا

اپنی تو فہم میں وہی ہنگام دل فروز
مجموعۂ حیات کا لب لباب تھا

ہر ایک گھاٹ پہ ہے اب رواج پریوں کا   عجب نہان ہے دریا پہ آج پریوں کا
جو خوبرو ہیں ہم ان کے حکیم ہیں یارو   کیا ہے ہم نے ہمیشہ علاج پریوں کا
جدھر کو دیکھیے پریاں تمام پھرتی ہیں   ہوا جہان میں کیا یارو راج پریوں کا
نہ بیٹھے دل کا کبوتر کسی کے دانے پر   ہمیشہ اس نے تو کھایا ہے ناج پریوں کا
ق
ملی کل ایک جو رنڈی سیاہ بدصورت   چمار دیکھ کرے جس کو لاج پریوں کا
کہا نظیر تو ہم پاس کیوں نہیں آتا   کہ ہم نے حسن میں پایا ہے تاج پریوں کا
ہم آج وہ ہیں پری زاد گل بدن گلرو   کہ ہم کو حسن میں آیا خراج پریوں کا

یہ سن کے میں نے کہا بی یہ وہ مثل ہے آج
کہ ہو چڑیل کی صورت مزاج پریوں کا

جن دنوں حسن بتاں کے دل نپٹ نظارہ تھا   سو بہ سو ہر دم دواں اور کو بہ کو آوارہ تھا

بحر طفلی پل میں طے کر آ گیا پیری میں حیف — ہمدم اپنی عمر کا اختر عجب سیارہ تھا
جب تلک خون تھا رگوں میں گردشِ خونخوار بھی — ہو چکا جب وہ تو پھر کب آشنا خونخوارہ تھا
مدتوں میں ایک دن ہم دل سے ملنے کو گئے — کس سبب مربوط اس سے اپنا جی ہموارہ تھا

ساقی بہار آئی اور جوش ہے گلوں کا — لا جام بھر کے سن لیں ٹک شور بلبلوں کا
دل لے کے تو بھی ظالم ملتا نہیں خوشی سے — شکوہ کروں میں کیا کیا اس کے تغافلوں کا
قطعہ
کل تو نظر کیا کیا سیریں ہوئیں چمن میں — مدت کے بیچ نکلا ارمان دل جلوں کا
باراں میں مے کشی کی ٹھہریں عجب بہاریں — کچھ باغ کی ہوائیں، کچھ رنگ بادلوں کا
اس میں وہ شوخ گل رو منہ پاس میرے لا کر — بولا کہ سے لے بوسہ اِن حسن کے گلوں کا
منہ دیکھ دیکھ اس کا میں نے کہا کہ پیاری — سمجھا ہوں میں تمہارے انداز چوچلوں کا
رخسار کا تو بوسہ زنہار میں نہ لوں گا — اس کا ادب نہ رکھنا ہے فہم جاہلوں کا
ایسا ہی گر ہے دینا تو دیجئے لبوں سے — بوسہ لبوں کا لینا ہے کام کاملوں کا
جب تو وہ شوخ ہنس کر بولا یہ وہ مثل ہے
یعنی کہ گڑ تو کھا دیں پرہیز گلگلوں کا

گلہ لکھوں میں اگر تیرے غم کے چھالوں کا — تو پھر نباہ نہ پھلوں کا اور نہ پہلوں کا
سنے سے نام محبت کا تھرتھراتے ہیں — یہ کچھ تو حال ہے تیرے ستم کے دہلوں کا
جدھر کو دیکھیے اُدھر آپ ہی جھمکتا ہے — مزا پڑے نہ اُسے کیونکہ شیش محلوں کا
کہا میں یار سے ایک دن کہ جی یہ چاہے ہے — طریق جیسے ہے عشرت کے اہلے گہلوں کا
مکان ہو ایک سنہرا بھرے ہوں شیشہ و جام — بچھا ہو فرش بھی واں بادلے رو پہلوں کا

کھلی ہو چاندنی بکھرے ہوں ڈھیر پھولوں کے　　پلنگ بھی نرمی سے ہو جی رُوئی کے پھلوں کا
یہ سُن کے اس نے کہا یہ تو وہ مثل ہے نظیرؔ
کہ سودیں جھونپڑے میں خواب دیکھیں محلوں کا

رتبہ کچھ عاشقی میں نہ کم ہے فقیر کا　　ہیں جس کے سب صنم وہ صنم ہے فقیر کا
تکیہ اسے نہ بھول کے کہنا کبھی میاں　　تکیہ نہیں یہ باغِ ارم ہے فقیر کا
رہتا ہے پھر وہ پھولتا مثل سدا سہاگ　　جس گلبدن پہ لطف و کرم ہے فقیر کا
گھٹ جائیں جس کو دیکھ کے لاکھوں تری گھٹا　　اے ابرِ تر وہ دیدۂ نم ہے فقیر کا
لکھتا ہے بن تراشے ہی حرفوں کے جوڑ توڑ　　اے خوش نویس یہ وہ قلم ہے فقیر کا
ظلِ ہما بھی وہاں سے سعادت کرے حصول　　جس سرزمیں پہ نقشِ قدم ہے فقیر کا
ہیں زیرِ سایہ اس کے ہزاروں گدا و شاہ　　بیرق اسے نہ کہو یہ علم ہے فقیر کا
کیونکر لکھے نہ فقر کے شان و شکوہ کو
یارو نظیرؔ پر بھی کرم ہے فقیر کا

عیسیٰ کے قُم سے حکم نہیں کم فقیر کا　　اِذنی پکارتا ہے سدا دم فقیر کا
خوبی بھری ہے جس میں دو عالم کی کوٹ کوٹ　　اللہ نے کیا ہے وہ عالم فقیر کا
سب جھوٹ ہے کہ تم کو ہمارا ہو غم میاں　　بابا کسے خدا کے سوا غم فقیر کا
ہم کیوں نہ اپنے آپ کو رولیویں جیتے جی　　اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا
مر جائیں ہم تو یہ بھی خبر ہو نہ تم کو آہ　　کیا جانے کب جہاں سے گیا دم فقیر کا
اب ہم پہ کیا گزرتی ہے اور کیا گزر گئی　　کس سے کہیں وہ یار ہے محرم فقیر کا
جب جیتے جی کسی نے نہ پوچھا تو مہربان　　پھر بعد مرگ کس کو رہا غم فقیر کا

ہو کیوں نہ اس کو فقر کی باتوں میں دستگاہ
ہے بالکا نظیرؔ بڑا اتم فقیر کا

رہوں کا ہے کو دل خستہ پھروں کاہے کو آوارہ — اگر آں ترک شیرازی بہ دست آرد دل مارا
خدا اگر مجھ گدا کو سلطنت بخشے تو میں وارو — بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
ہم اپنا تو بہشت اور چشمۂ کوثر سمجھتے ہیں — کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را
زمیں پر آیا جب یوسف اسی دن آسماں رویا — کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را
جو صاحب حسن ہیں ہرگز نہیں محتاج زینت کے — بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
بتوں کی گالیوں میں بھی عجب لذت نکلتی ہے — جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خا را
تو ہستی کی گرہ پر عقل کا ناخن نہ توڑ اے دل — کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را
نصیحت کیمیا ہے جب تو گوش دل سے سنتے ہیں — جوانان سعادت مند پند پیر دانا را
نظیرؔ اس لطف سے تضمین تو کر مصرعۂ حافظ
کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریا را

میں ہوں اور مہ رو ہے اور ساقی ہے اور بزم شراب — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب
جوش عشرت دور ساغر رقص خوباں صحن باغ — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب
قصر رنگیں فرش زریں وقت خلوت جائے عیش — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب
بوسہ بازی ہمکناری بے حجابی سرخوشی — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب
خوش لباسی خوش معاشی خوش مذاقی خوش رہا — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب
گل فشانی شادمانی، کامرانی، خرمی — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب
عشق بازی عیش سازی نہ خیالی بے غمی — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

دل کشائی بادہ نوشی، ذوق مستی خرمی — پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

اس طرح کی عشرتوں میں اب تو بیٹھا ہے نظیر
پر خدا جانے یہ بیداری ہے اے دل یا کہ خواب

بزم طرب وقت عیش ساقی و نقل و شراب — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
مجمع خوباں و لے، زمزمۂ چنگ و نے — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
صحن چمن، حسن گل، ابر و ہوا، شرب مل — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
عشرت صبح بہار، سیر گل و لالہ زار — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
رقص بت غنچہ لب، کثرت عیش و طرب — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
عشق کے عجز و نیاز، حسن کے انداز و ناز — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
مستئ میخانہ ہا، گردش پیمانہ ہا — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
شادئ وصل بتاں، صحبت مہ طلعتاں — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
غلغل کوس نشاط، خوش دلی و انبساط — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب
ثروت و مال و منال، حشمت و جاہ و جلال — کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب

قصر و محل دل پذیر، زینت و زیب اے نظیر
کوئی اسے کچھ کہو ہم تو سمجھتے ہیں خواب

یہ جواہر خانۂ دنیا جو ہے با آب و تاب — اہل صورت کا ہے دریا اہل معنی کا سراب
وہ معلی قصر رنگین و منقش زرنگار — جن کی رنگینی سے تھا قصر ارم کو پیچ و تاب
وہ مطلا شہ نشینیں وہ مذہب بام و در — وہ مرصع خواب گاہیں بہر عیش و بہر خواب
وہ عظیم الشان مکاں دیتی تھیں جن کی رفعتیں — ہنس کے طاق آسماں کو طاق ابرو سے جواب

صحن میں بُستاں سرا ایسے پُر از غلمان و حور — جن کے انہاروں میں جائے آب گُل خالص گلاب
ان میں تھے وہ صاحبِ ثروت جنھیں کہتے تھے خلق — کیقباد و قیصر و کیخسرو و افراسیاب
مہر وش، بہرام صولت بدر قدر و چرخ رخش — مشتری ہمت ثریا بارگہ، کیواں جناب
وہ تجمل وہ تمول وہ تفوق وہ غرور — وہ تحشم وہ تنعم وہ تعیش وہ شباب
ہر طرف فوجِ بتاں ہر سو، ہجومِ گل رخاں — جن کے عارض رنجِ ماہ و رشکِ روئے آفتاب
چشمک و آن و اشارات و ادا و سرکشی — طنز و تعریض و کنایت غمزہ و ناز و عتاب
صبح سے لے شام تک اور شام سے لے تا بہ صبح — متصل رقص و سرود و پے بہ پے جامِ شراب
ساقی و مطرب، ندیم و مستی و میخوارگی — ساغر و مینا گل و عطر و مے و نقل و کباب
کثرتِ اہلِ نشاط و جوشِ نوشانوش مے — از زمیں تا آسماں شورِ نے و چنگ و رباب
وہ بہاریں وہ فضائیں وہ ہوائیں وہ سرور — وہ طرب وہ عیش کچھ جس کے نہیں حد و حساب
یا تو وہ ہنگامۂ تنشیط تھا یا دفعتاً — کر دیا ایسا کچھ اس دورِ فلک نے انقلاب
جو وہ سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر — رہ گئے عبرت زدہ وہ قصرِ ویران و خراب
تھا جہاں وہ مجمعِ عالی وہاں اب ہے تو کیا — نقشِ سُمِ گور و خر یا کوئی کھنڈر پر عقاب
ہیں اگر دو خشت باہم تو لبِ افسوس ہیں — اور جو کوئی طاق ہے تو صورتِ چشمِ پُر آب

خواب کہئے اس تماشے کو نظیرؔ اب یا خیال
کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

کہا یہ آج ہمیں فہم نے سنو صاحب — یہ باغِ دہر غنیمت ہے دیکھ لو صاحب
جو رنگ و بو کے اٹھانے ہیں حظ اُٹھا لیجئے — مبادا پھر کفِ افسوس کو ملو صاحب
یہ وہ چمن ہے نہیں ایک سے نہیں جس میں — تبدل اس کا ہر ایک گل سے سوچ لو صاحب

کہ تھا جو صبح شگفتہ نہ تھا وہ شام کے وقت　　جو شام تھا سو نہ دیکھا وہ صبح کو صاحب
پس اس مثال سے ظاہر ہے یہ سخن یعنی　　اسی طریق سے عالم میں تم بھی ہو صاحب
جو سرنوشت ہے ہوگا اسی طرح سے نظیرؔ
قضا قضا نہیں ہونے کی کچھ کرو صاحب

تری قدرت کی قدرت، کون پا سکتا ہے کیا قدرت　　ترے آگے کوئی قادر کہا سکتا ہے کیا قدرت
تو وہ یکتائے مطلق ہے کہ یکتائی میں اب تیری　　کوئی شرکِ دوئی کا حرف لا سکتا ہے کیا قدرت
زمیں سے آسماں تک تو نے جو جو رنگ رنگے ہیں　　یہ رنگ آمیزیاں کوئی دکھا سکتا ہے کیا قدرت
ہزاروں گُل، ہزاروں گلبدن تو نے بنا ڈالے　　کوئی مٹی سے ایسے گُل کھلا سکتا ہے کیا قدرت
ہوئے ہیں نور سے جن کے زمین و آسماں پیدا　　کوئی یہ چاند، یہ سورج بنا سکتا ہے کیا قدرت
ہوا کے فرق پر کوئی بنا کر ابر کا خیمہ　　طنابیں تارِ باراں کی لگا سکتا ہے کیا قدرت
جم و اسکندر و دارا و کیکاؤس و کیخسرو　　کوئی اس ڈھب کے دل بادل بنا سکتا ہے کیا قدرت
کیا نمرود نے گو کبر سے دعویٰ خدائی کا　　کہیں اُس کا یہ دعویٰ پیش جا سکتا ہے کیا قدرت
نکالا تیرے اک پشّے نے کفشیں مار مغز اُس کا　　سوا تیرے خدا کوئی کہا سکتا ہے کیا قدرت
نکالے لکڑیوں سے تو نے جس جس لطف کے میوے　　کوئی پیڑوں میں یہ پیڑے لگا سکتا ہے کیا قدرت
ترے ہی خوانِ نعمت سے ہے سب کی پرورش، ورنہ　　کوئی چیونٹی سے ہاتھی تک کھلا سکتا ہے کیا قدرت
ہماری زندگانی کو بغیر از تیری قدرت کے　　کوئی پانی کو پانی کر بہا سکتا ہے کیا قدرت
ترے حسنِ تجلی کا، جہاں ذرہ جھمک جاوے　　تو پھر موسیٰ کوئی واں تاب لا سکتا ہے کیا قدرت
دمِ عیسیٰ میں وہ تاثیر تھی تیری ہی قدرت کی　　دگرنہ کوئی مردے کو جلا سکتا ہے کیا قدرت
تو وہ محبوب چنچل ہے کہ بارِ ناز کو تیرے　　بغیر از مصطفےٰ کوئی اُٹھا سکتا ہے کیا قدرت

نظیر اب طبع پہ جب تک نہ فیضان الٰہی ہو
کوئی یہ لفظ یہ مضمون بنا سکتا ہے کیا قدرت

دریے ہیں دل اپنے کے ادھر عشوہ گرے چند   خواہندۂ یک جان ہیں اُدھر مو کمرے چند
کیا کیا مگس عقل کے باندھیں ہیں پر و بال   کر کر کے شکر خندہ بہم لب شکرے چند
مژگان تر و سرد دم و رنگ شکستہ   ہیں الفت پنہاں کے یہی پردہ درے چند
ایک دن یہ ہوا عزم کہ با صد طرب و عیش   گلشن میں بسر کیجیے شام و سحرے چند
جب گھر سے چلے ہم تو ملے راہ میں یک جا   حیرت زدۂ خستۂ خونیں جگرے چند
دیکھا جو مجھے سوئے چمن گرم تگ و پو   یوں لب سے کیے بند کے افشا گہرے چند
اے یار تو جاتا ہے چمن میں تو خبر دار   جلدی سے نکل آئیو کر کر نظرے چند
وہاں آج تو البتہ مہیا ہیں بہ ہر سو   داؤدی و نسرین و گل و برگ و برے چند

گل برگِ خزاں دیدہ نظیر اس میں اڑیں گے
اور ہوں گے پڑے بلبل و قمری کے پرے چند

اے مری جان ہمیشہ ہو تری جان کی خیر   نازکی و دلربا حسن کے سامان کی خیر
رات دن شام سحر پہر گھڑی پل ساعت   مانگتے جاتی ہے ہم کو تری آن آن کی خیر
منہدی چوٹی ہو سوائی ہو چمک پیٹی کی   عمر چوٹی کی بڑی زلف پریشان کی خیر
بے طرح بوجھ سے جھمکوں کے جھکے پڑتے ہیں   کیجو اللہ تو ان جھمکوں کی اور کان کی خیر
پان کھایا ہے تو اس وقت بھی لازم ہے یہی   ایک بوسہ ہمیں دیجئے لب و دندان کی خیر
آنکھ اٹھا دیکھئے اور دیکھ کے ہنس بھی دیجئے   اپنے کاجل کی زکوٰۃ اور مسی و پان کی خیر
پہلے جس آن تمہاری نے لیا دل ہم سے   اب تلک مانگتے ہیں دل سے ہم اس آن کی خیر

کیا غضب نکلے ہے بن ٹھن کے وہ کافر یارو　　آج ہوتی نظر آتی نہیں ایمان کی خیر
جتنے محبوب پری زاد ہیں دنیا میں نظیرؔ
سب کے اللہ کرے حُسن کی اور جان کی خیر

سحر ہم نے چمن اندر عجب دیکھا کل اک دلبر　　سہی قامت پری پیکر، مقطع وضع خوش منظر
سخن بر غنچہ لب گل رو، جبین مہر اور کماں ابرو　　دو چشم شوخ پُر جادو نگہ تیر اور مژہ نشتر
تبسم زلف مشک افشاں تغافل سو ستم ساماں　　غرور اور ناز بے پایاں مزاج اور طبع نازک تر
ادائیں سب فسوں آئیں نہ چھوڑیں دل نہ چھوڑیں دیں　　فریب و عشوہ صلح آگیں عتاب و غمزہ جنگ آور
یہ دیکھا ہم نے جب عالم تو رکھ دل ہاتھ پر ہمدم　　کہا ہیں نذر کرتے ہم جو لے لیجئے تو ہے بہتر
کہا لیجا تو اپنا دل کہ تو کیا اور تیرا دل　　نہ لیویں ہم تو ایسا دل، کہا جب ہم نے یوں ہنس کر
یہی ایک دل ہے بیچارہ بھلا ہے یا کہ ناکارہ　　اگرچہ ہے یہ آوارہ ولیکن ہے وفا پرور
جو نا منظور کرتے ہو تو کر دو یہ کب اٹھتا ہے　　ہے جب تک دم میں دم اس کے رہے گا یہ اسی در پر
نظیرؔ اس نے سنا یہ جب تو بولا یوں وہ شیریں لب
ہمارا ہو چکا یہ اب، بس اس قصے کو کوتہ کر

دنیا ہے اک نگار فریبندہ جلوہ گر　　الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت و ضرر
آج اس پہ تھی کمین تو لگائی کل اس پہ گھات　　حسرت فزا و ہوش ربا و شکیب بر
ہوتا ہے آخر اس کے گرفتار کا یہ حال　　جیسے مگس کے شہد میں بھر جاویں بال و پر
سحر و فسوں وہ رکھتی ہے بہر فریب دل　　حیران ہو سحر سامری بھی جس کو دیکھ کر
لینے کو نقد عمر کے شیریں ہے مثل قند　　جب لے چکے تو ہوتی ہے حنظل سے تلخ تر
جو اس سے دل لگاتے ہیں، آخر ہو منفعل　　ملتے ہیں اپنے دست تاسف بہ یک دگر

تو بھی جو اُس کے پاس لگاوے گا دل تو یار　　اس نخل سے ملے گا تجھے بھی یہی ثمر
میں تجھ کو اس کے ربط سے کرتا نہ منع آہ　　لیکن کروں میں کیا تجھے درپیش ہے سفر
تو اس مثل کو سوچ ذرا، گر سفر گزیں　　کرتا ہے قطع راہ کو باندھے ہوئے کمر
گر درمیان رہ کوئی مل جاوے باغ اُسے　　تو چلتے چلتے دیکھتا جاتا ہے اک نظر
بس اس نگار خانے کو تو بھی اسی نمط　　سیر مسافرانہ کر اور اس سے درگزر

اِس حرف کو نظیرؔ کے یوں دل میں دے مکان
کرتا ہے جیسے نقش، نگیں کے جگر میں گھر

قصر رنگیں سے گزر باغ و گلستاں سے نکل　　ہے وفا پیشہ تو مت کوچۂ جاناں سے نکل
نکہت زلف یہ کس کی ہے کہ جس کے آگے　　ہوئی خجلت زدہ بو سنبل و ریحاں سے نکل
گو بہار اب ہے ولے روز خزاں اے بلبل　　یک قلم نرگس و گل جاویں گے بستاں سے نکل
امتحاں کرنے کو یوں دل سے کہا ہم نے رات　　اے دل غمزدہ اس کاکل پیچاں سے نکل
کھا کے سو پیچ کہا میں تو نکلنے کا نہیں　　مگر اے دشمن جاں چل تو مرے ہاں سے نکل
ہو پریشانی سے جس کی مجھے سو جمعیت　　کس طرح جاؤں میں اس زلف پریشاں سے نکل
لاکھ زنداں پر آفات میں ہوتا ہے وہ قید　　جو کوئی جاتا ہے اس طور کے زنداں سے نکل
مجھ سے ممکن نہیں محبوب کی قطع اُلفت　　گرچہ میں جاؤں گا اس عالم امکاں سے نکل

چاہ میں مجھ کو یہ مرشد کا ہے ارشاد نظیرؔ
آبرو چاہے تو مت چاہ زنخداں سے نکل

جو دل کو دیجئے تو دل میں خوش ہو کرے ہے کس کس طرح کی چہلیں　　وگر نہ دیجے تو وہ ہیں کیا کیا جتاوے خفگی، عتاب، اکڑ، بل
اگر یہ کہئے کہ ہم ہیں بیکل ذرا گلے مل تو ہنس کے ظالم　　دکھاوے ہیکل اٹھا کے، یعنی بلا سے میری مجھے تو ہے کل

گر اس بہانے سے ہاتھ پکڑیں کہ دیکھ دل کی دھڑک ہمارے ۔۔۔ تو ہاتھ جھپ سے چھڑا لے کہہ کر مجھے نہیں ہے کچھ اس کی اٹکل
جو چھپ کے دیکھیں تو تاڑ جاوے، وگر صریحاً تو دیکھو پھرتی ۔۔۔ کہ آتے آتے نگاہ رخ تک چھپالے منہ کو الٹ کے آنچل
کرے جو وعدہ تو اس طرح کا کہ دل کو سنتے ہی ہو تسلی ۔۔۔ جو سوچیے پھر تو کیسا وعدہ فقط بہانہ، فریب اور چھل
جو دل کو بوسے کے بدلے دیجے، تو ہنس کے لیلے بہت خوشی سے ۔۔۔ جو بوسہ مانگو تو پھر یہ نقشا کبھی تو آج اور کبھی کہے کل

نہ جل میں آوے نہ پھڑ کے نکلے نہ پاس بیٹھے نظیرؔ اک دم
بڑا ہی پُرفن، بڑا ہی سیانا، بڑا ہی شوخ اور بڑا ہی چنچل

دکھا کر ایک جھمک دل کو نہایت کر گیا بیکل ۔۔۔ پری رو، تند خو، سرکش، ہٹیلا، چلبلا، چنچل
وہ عارض اور جبیں تاباں کہ ہوں شرمندہ دیکھ اس کو ۔۔۔ قمر، خورشید، زہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل
کفوں میں انگلیوں میں لعل لب میں چشم ہے گوں میں ۔۔۔ حنا، آفت، ستم، فندق، مسی، جادو، فسوں، کاجل
بدن میں جامۂ زرکش سراپا جس پہ زیب آور ۔۔۔ کڑے، بندے، چھڑے، چھلے، انگوٹھی، نورتن، ہیکل
نزاکت اور لطافت وہ کف پا تک کہ حیراں ہوں ۔۔۔ سمن، گل، لالہ، نسریں، نسترن، دُر، پرنیاں، مخمل
سراسر پُرفریب ایسا کہ ظاہر جس کی نظروں سے ۔۔۔ شرارت، شوخی، عیاری، طرح، پھرتی، دغا، چھل بل

نظیرؔ ایک عمر عشرت ہو جو ملے ایسا پری پیکر
اگر ایک آن اگر ایک دم، اگر ایک چھن، اگر ایک پل

اسی کی ذات کو ہے دائما ثبات و قیام ۔۔۔ قدیر، وحی، کریم و مہیمن و منعام
بروج بارہ میں لاکر رکھی وہ بارہ دری ۔۔۔ کہ جس کو پہنچے نہ فکرت نہ دانش و اوہام
ادھر فرشتۂ کرّوبی اور ادھر غلمان ۔۔۔ قلم کو لوح پہ بخشی ہے طاقت ارقام
یہ دو ہیں شمس و قمر اور ساتھ ان کے یار ۔۔۔ عطارد و زحل و زہرہ، مشتری بہرام
جو چاہیں ایک پلک ٹھہریں یہ سو طاقت کیا ۔۔۔ پھرا کریں گے یہ آغاز سے لے تا انجام

بشر جو چاہے کہ سمجھے انھیں سو کیا امکان
ہے یہاں فرشتوں کی عاجز عقول اور افہام

نکالے ان سے گل و میوہ شاخ و برگ و بار
سب اس کے لطف و کرم کے ہیں عام یہ انعام

اسی کے باغ سے دل شاد ہو کے کھاتے ہیں
چھوہارے کشمش و انجیر پستہ و بادام

چمک رہا ہے اسی کی یہ قدرتوں کا نور
بہ ہر زمان و بہ ہر ساعت و بہ ہر ہنگام

کہ اس کا شکر کریں شب سے تا بہ روز ادا
اطاعت اس کی بجا لاویں صبح سے تا شام

نظیرؔ نکتہ سمجھ، مہر و فضل خالق کو
اسی کے فضل سے دونوں جہاں میں ہے آرام

ہر آن تمہارے چھپنے سے ایسا ہی اگر دکھ پائیں گے ہم
تو ہار کے آخر اس کی بھی تدبیر کوئی ٹھہرائیں گے ہم

بیزار کریں گے پہلے تو خاطر کو تمہاری چاہت سے
پھر دل کو بھی کچھ ہیبت سے کچھ منت سے سمجھائیں گے ہم

گر کہنا دل نے مان لیا اور رک بیٹھا تو بہتر ہے
اور چین نہ لینے دیوے گا تو بھیس بدل کر آئیں گے ہم

اول تو نہیں پہچانو گے اور لوگے بھی پہچان تو پھر
ہر طور سے چھپ کر دیکھیں گے اور دل کو خوش کر جائیں گے ہم

گر چھپنا بھی کھل جاوے گا تو مل کر جادو سازوں سے
کچھ اور ہی لٹکا سحر بھرا اس وقت بہم پہنچائیں گے ہم

جب وہ بھی پیش نہ جاوے گا اور شہرت ہووے گی پھر تو
جس صورت سے بن آوے گا تصویر کھنچا منگوائیں گے ہم

موقوف کرو گے چھپنے کو تو بہتر ورنہ نظیرؔ آسا
جو حرف زبان پر لاویں گے ہم پورا ہی کر دکھلائیں گے ہم

تدبیر ہمارے ملنے کی جس وقت کوئی ٹھہراؤ گے تم
ہم اور چھپیں گے یہاں تک جی خوب ہی پھر گھبراؤ گے تم

بیزار کرو گے دل ہم سے نا منت ڈر سے روکو گے
وہ دل تو ہمارے بس میں ہے کس طور اسے سمجھاؤ گے تم

گر بھیس بدل کر آؤ گے ہم کتنے تاڑنے والوں کو
اس کوچے میں بٹھلاویں گے پھر کیسے کیونکر آؤ گے تم

گر چھپ کر دیکھنے آؤ گے ہم اپنے بالا خانے کے
در پردے چھوڑے رکھیں گے پھر کیونکر دیکھنے پاؤ گے تم

گر جادو منتر سیکھو گے تو سحر ہماری نظروں کا — تاثیر کو اس کی کھووے گا کچھ پیش نہیں لے جاؤ گے تم
تصویر اگر منگواؤ گے تو دیکھ ہماری صورت کو — حیران مصور ہووے گا پھر رنگ کہو کیا لاؤ گے تم
جس وقت نظیرؔ ان باتوں کی ہم خوب کریں گے ہشیاری
جو حرف زباں پر لاؤ گے تم پھر کیونکر کر دکھلاؤ گے تم

کی طلب ایک شہ نے کچھ پند از حکیم نکتہ داں — اس نے سن کے یوں کہا اے صاحب تیغ و نشاں
یاد رکھ اور پاس رکھ اور سخت رکھ اور جمع کر — کھا اور چھپا، کاٹ اور اٹھا دے، لے بخوبی ہر زماں
اس نے اس مجمل کے تفصیلات جب پوچھے تو پھر — لطف سے اس نکتہ رس نے یوں کہا اس کا بیاں
یاد رکھ ہر دم خدا کو پاس رکھ حسن وفا — سخت رکھ دین کو مدام اور جمع کر علم اے جواں
کھا غضب غصہ، چھپا عیب رفیق و آشنا — کاٹ ربط ہم نشین بد کہ ہے اس میں زیاں
اور اٹھا ہر دم ضعیف و ناتواں سے ظلم و جور — داد مظلوموں کی دے اور لے بہشت جاوداں
نثر میں مجھ کو نظیرؔ آئے تھے یہ نکتے نظر
میں نے نظم ان کو کیا تو دل ہو ہر دم شادماں

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن — گل رخ و گل گوں قبا و گل عذار و گل بدن
مہر طلعت، زہرہ پیکر، مشتری رو، مہ جبیں — سیم بر، سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن
نازنیں، ناز آفریں، نازک بدن، نازک مزاج — غنچہ لب، رنگیں ادا، شکر دہاں، شیریں سخن
تیر قد، نشتر نگہ، مژگاں سناں، ابرو کماں — برق تاز و رزم ساز و نیزہ باز و تیغ زن
بے مروت، بے وفا، بے درد، بے پروا خرام — جنگ جو، قتال وضع و سرفراز و سر فگن
زلف و کاکل، خال، خط چاروں کے یہ چار ہیں علام — مشک تبت، مشک چیں، مشک خطا، مشک ختن
دوش و بر، دنداں و لب چاروں کے یہ چار ہیں لقب — نسترن، برگ سمن، دُرِ عدن، لعل یمن

بتلا ایسے ہی خوش وصفوں کے ہوتے ہیں نظیرؔ
بے قرار و دل فگار و خستہ حال و بے وطن

جُھکائے سر کو چپ ہوں یوں میں بحرِ غم کی لہروں میں
کوئی کھیلے ہے جیسے بازیٔ شطرنج پہروں میں

پٹے ہیں جیسے مہرے خانے خانے میں بساط اوپر
رکھیں ہیں دل یونہی اس زلف کے حلقوں کے لہروں میں

ہمارے دل کے کیا کیا فیل بند صبر توڑے ہے
پڑی ہے یہ جو زنجیر طلا پے چھلے سنہروں میں

رکھیں سرسبز کشت غم کو کیونکر اے شہ خوباں
نہیں یک قطرۂ آب اب تو ان آنکھوں کی نہروں میں

تدرو و کبک فرزیں بند غم سے رُخ ہیں اے مہ رُخ
تری ان اچپلی چالوں کی سُن کر دھوم شہروں میں

دلا تو پا پیادہ، وہ سوار اسپ خوبی ہے
نہ کر ملنے کے منصوبے، نہ پڑ ان سوچ گھروں میں

نظیرؔ اب دل تمھیں دیتا ہے لے لو، بُرد ہی سمجھو
وگرنہ یار پھر ہوگی یہ بازی مات پہروں میں'

کرکے بسنتی لباس سب سے برس دن کے دن
یار ملا آن کر ہم سے برس دن کے دن

کھیت پہ سرسوں کے جا، جام صراحی منگا
دل کی نکالی میاں ہم نے ہوس دن کے دن

سب کی نگاہوں میں دی عیش کی سرسوں کھلا
ساقی نے کیا ہی لیا واہ یہ جس دن کے دن

خلق میں شور بسنت یوں تو بہت دن سے تھا
ہم نے تو لوٹی بہار عیش کی بس، دن کے دن

آگے تو پھرتا رہا غیروں میں ہو زرد پوش
ہم سے ملا پر وہ شوخ کھا کے ترس دن کے دن

گرچہ یہ تہوار کی پہلی خوشی ہے زیادہ
عین جو رس ہے سو وہ نکلے ہے رس دن کے دن

لُوٹے گا پھر سال بھر گلبدنوں کی بہار
یار سے مل لے نظیرؔ، آج برس دن کے دن

نہ لذتیں ہیں وہ ہنسنے میں اور نہ رونے میں
جو کچھ مزا ہے ترے ساتھ مل کے سونے میں

پلنگ پہ سیج بچھاتا ہوں مدتوں سے جان کبھی تو آن کے سو جا مرے بچھونے میں
مسک گئی ہے وہ انگیا جو تنگ بندھنے سے تو کیا بہار ہے کافر کے چاک ہونے میں
کہا میں اُس سے کہ ایک بات مجھ کو کہنی ہے کہوں میں جب کہ چلو میرے ساتھ کونے میں
یہ بات سنتے ہی جی میں سمجھ گئی کافر کہ تیرا دل ہے کچھ اب اور بات ہونے میں
یہ سن کے بولی کہ ہے ہے یہ کیا کہا تو نے پڑا ہے کیوں تجھے دنیا سے اب تو کھونے میں
تو بوڑھا مردوا اور بارہواں برس مجھ کو میں کس طرح سے چلوں تیرے ساتھ کونے میں
نظیرؔ ایک وہ عیار سُرتی ہے کافر
کبھی نہ آوے گی وہ تیرے جادو ٹونے میں

حال دل ہم نے کہا زہرہ جبیں کہہ دیویں پھر جو ہو حکم سو وہ دل کے تئیں کہہ دیویں
اس پہ جو جو کہ گزرتا ہے تغافل کے سبب ہو اگر آپ کے خاطر کو یقیں کہہ دیویں
چاہ میں اس نے جو کچھ دیکھیں ہیں رنج و کلفت اور وہ جتنی کہ جفائیں ہیں سہیں کہہ دیویں
سُن کے اس بات کو اور ہم کو سمجھ کر بیباک دل میں سوچا کہ مبادا یہ کہیں کہہ دیویں
ہنس دیا اور یہ کہا اس پہ جو گزری ہے نظیرؔ
ہم کو معلوم ہے، کہیے تو ہمیں کہہ دیویں

کیا کاسہ مے لیجئے اس بزم میں اے ہمنشیں دور فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں
یہ کاسۂ فیروزہ گوں ہے شیشہ باز پر فنون جتنے حیل ہیں اور فسوں سب اس کے ہیں زیر نگیں
ہو اعتماد اس کا کسے ہے کاسہ بازی یاد اسے رکھتا ہے شاد اک دم جسے کرتا ہے پھر اندوہگیں
کل دامن صحرا میں ہم گزرے سے تھے وقت صبح دم ایک کاسۂ سر پُر الم آیا نظر اپنے تئیں
بولا بہ فریاد و فغاں کیا دیکھتا ہے او میاں تھے ہم بھی سر بر آسماں گو اب پڑے ہیں بر زمیں

گل برگ سے نازک بدن، سرپاؤں سے رشکِ چمن — زریں و سیمیں پیرہن، دلکش مکانوں کی مکیں
دن رات ناز اور نعمتیں مہ طلعتوں سے صحبتیں — عیش و نشاط و عشرتیں، ساقی قِران مطرب مکیں
باغ و چمن پیشِ نظر بزم و طرب شام و سحر — ہر سو بہ کثرت جلوہ گر، حُسنِ بتانِ نازنیں
ایک آسماں کے دور سے ایک گردشِ فی الفور سے — ملک سوچئے گا غور سے در لحظہ آں در لمحہ ایں
سنتے ہی جی تھرا گیا رخسار پر اشک آ گیا — دل عبرتوں سے چھا گیا، خاطر ہوئی بس سہمگیں

اس میں سراپنا ناگہاں، ہر مو بنا مثلِ زباں
بولا نظیرؔ آگہ ہو ہاں، من نیز روزے ہم چنیں

گر کسی صورت سے وہ صورت دکھا جاتے ہیں — تو غم و درد آج یہ صورت نہ دکھلاتے ہمیں
وہ تو اپنا مُنہ دکھا کر چھپ گئے پر ہمنشیں — دو پہر اب چاہئیں پھر ہوش میں آتے ہمیں
جیسے کل تم نے خفا ہو کر کہا تھا مر رہو — سچ اگر پوچھو تو کیا لگتا تھا مر جاتے ہمیں
پر یہ ڈر تھا پھر جو بلوا دیں سو بلوایا ہے آج — کیوں جی مر جاتے تو اب پھر تم کہاں پاتے ہمیں
ہم تو یہ کرتے ہیں خاطر داریاں اور مہربانیاں — تو بھی تم واللہ خاطر میں نہیں لاتے ہمیں
سن کے فرمایا چہ خوش بس اگ نہ جلیئے اس قدر — یہ تمہارے چوچلے ہی تو نہیں بھاتے ہمیں

ہجر کی سختی نظیرؔ ایک تو یہ ہے جو شام سے
صبح ہو جاتی ہے اکثر سر کو ٹکراتے ہمیں

کیا دل لگا دیں مہرباں ہم حسن صورت سے کہیں — نہ وہاں ثبات اس سے بہم نہ یہاں قیام اپنے تئیں
تھا اِک مکان دلکشا رشکِ چمن جس کی فضا — تھی اس جگہ رونق فزا رقاصہ شوخ ایک نازنیں
قد حسرتِ سروِ چمن لب غیرتِ لعلِ یمن — جعد معنبر پُر شکن نوکِ مژہ نشتر قریں
دیکھ اس کی رقصوں کی ادا دل رقص میں ہے جابجا — نغمات یکسر سحر زا، انداز کُل جادو گریں

نازو ادا کی گرمیاں غارت گرِ صبر و تواں
طورِ تکلّم دُر فشاں، طرزِ تبسم شکریں

کیا کیا لگاوٹ بے بدل کیا کیا رُکھاوٹ بر محل
کیا کیا بناوٹ پل بہ پل کرتی تھی وہ زہرہ جبیں

گردوں نے اک گردش جو کی زار و عجوزہ ہو گئی
وہ نوجوانی تازگی دیکھا تو کوسوں تک نہیں

وہ گل سے مکھڑا زرد ہے گرمی کا عالم سرد ہے
جان رنج و غم پُر درد ہے آزردہ دل اندوہگیں

جوں بید لرزاں دست و پا ہے جائے چوبِ گل عصا
ہر موجو سنبل رشک تھا یکسر ہے برگِ یاسمن

نہ چشم میں مستی رہی نہ خو میں وہ تندی رہی
نہ لب میں وہ سُرخی رہی نہ مُنہ میں وہ دُرِ ثمیں

دیکھا اس کو ہم نے! کہاں پوچھا کچھ اپنا کر بیاں
تھی کل تو رشکِ گلستاں ہے آج خارِ ہمگیں

بولی نظیرؔ عبرت میں رہ کیا پوچھنے کی ہے جگہ
یہاں کی یہی ہے رسم و رہ گاہے چناں گاہے چنیں

کہا جو ہم نے ”ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو“
کہا کہ ”اس لئے تم یاں جو غل مچاتے ہو“

کہا ”لڑاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہمدم“
کہا کہ ”تم بھی تو ہم سے نگہ لڑاتے ہو“

کہا جو حال دل اپنا، تو اس نے ہنس ہنس کر
کہا ”غلط ہے یہ باتیں جو تم بناتے ہو“

کہا ”جتاتے ہو کیوں ہم کو روز ناز و ادا“
کہا ”کہ تم بھی تو چاہت ہمیں جتاتے ہو“

کہا کہ ”عرض کریں ہم یہ جو گزرتا ہے“
کہا ”خبر ہے ہمیں، کیوں زباں یہ لاتے ہو“

کہا کہ ”روٹھے ہو کیوں ہم سے کیا سبب اس کا“
کہا ”سبب ہے یہی تم جو دل چھپاتے ہو“

کہا کہ ”ہم نہیں آنے کے یاں“ تو اس نے نظیرؔ
کہا کہ ”سوچو تو کیا آپ سے تم آتے ہو“

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو
جس کی نوید پہنچی ہے رنگ بسنت کو

دی بر زمین اب لباسِ بسنتی کو جیسے جا
ایسے ہی تم ہمارے بھی سینے سے آلگو

گر ہم نشے میں "بوسہ" کہیں دو تو لطف سے
تم پاس منہ کو لا کے یہ ہنس کر کہو کہ "لو"

بیٹھو چمن میں نرگس و صد برگ کی طرف
نظارہ کر کے عیش و مسرت کی داد دو

سن کر بسنت مطرب زریں لباس سے
بھر بھر کے جام پھر مئے گل رنگ کے پیو

کچھ قمریوں کے نغمے کو دو سامنے میں راہ
کچھ بلبلوں کا زمزمۂ دل کشا سنو

مطلب یہ ہے نظیر کا یوں دیکھ کر بسنت
ہو تم بھی شاد، دل کو ہمارے بھی خوش کرو

نور حق شافع امت سے کہو عشق اللہ
ہر دم اس شاہ ولایت سے کہو عشق اللہ

یاد کر، مومنو، اس کا وہ ہرا پیراہن
سبزۂ باغ امامت سے کہو عشق اللہ

لشکر شام کو للکار کے تنہا وہ لڑا
گوہر درج شجاعت سے کہو عشق اللہ

پر سوا حق کی رضا اس نے نہ کچھ دم مارا
اس جواں مرد کی ہمت سے کہو عشق اللہ

ہیں زمانے میں یہی بارہ امام اے یاراں
سب ہر ایک صاحب عزت سے کہو عشق اللہ

راہ مولیٰ میں خوشی ہو کے دیا سر اپنا
ان شہیدوں کی شہادت سے کہو عشق اللہ

مال و جان دولت و گھر بار تلک بخش دیا
اس سخی دل کی سخاوت سے کہو عشق اللہ

دل میں خوش بیٹھے ہوئے کرتے ہیں اللہ اللہ
ان جوانوں کی قناعت سے کہو عشق اللہ

کہیں ہیں باطنی لوٹے ہیں عبادت کے مزے
دوستو ان کی عبادت سے کہو عشق اللہ

چاہیں اکسیر کریں خاک کو ہر دم لے لے
ان کی سب کشف و کرامت سے کہو عشق اللہ

کہ سخن عشق کا پھر سب کو سناتا ہے نظیر
اس کے سب حرف و حکایت سے کہو عشق اللہ

انداز کچھ اور ناز و ادا اور ہی کچھ ہے
جو بات ہے وہ نام خدا اور ہی کچھ ہے

نہ برق نہ خورشید نہ شعلہ نہ بھبھوکا
کیوں صاحبو یہ حسن ہے یا اور ہی کچھ ہے

بلور کی چمکیں ہیں نہ الماس کی جھمکیں
اُس گورے سے سینے کی صفا اور ہی کچھ ہے

پیچھے کو نظر کی تو وہ گدی ہے قیامت
آگے کو جو دیکھا تو گلا اور ہی کچھ ہے

سینے پہ کہا میں نے یہ دو سیب ہیں کیا ہیں
شرما کے یہ چُپکے سے کہا اور ہی کچھ ہے

تم باتیں ہمیں کہتے ہو اور سنتے ہیں ہم چُپ
اپنی بھی خموشی میں صدا اور ہی کچھ ہے

ہیں آپ کی باتیں تو شکر ریز پہ اے جاں
اس گونگے کے گڑ میں بھی مزا اور ہی کچھ ہے

پُوچھی جو دوا ہم نے طبیبوں سے تو بولے
بیماری نہیں ہے یہ بلا اور ہی کچھ ہے

عناب نہ خطمی نہ بنفشہ نہ خیارین
اِس ڈھب کے مریضوں کی دوا اور ہی کچھ ہے

ہم کو تو نظیر اُن سے شکایت ہے جفا کی
اور اُن کا جو سُنیئے تو گلا اور ہی کچھ ہے

یہ جو اُٹھتی کونپل ہے جب اپنا رنگ نکالے گی
ڈالی ڈالی چاٹے گی اور پتا پتا کھالے گی

ہونہار بروا کے پتے چکنے چکنے ہوتے ہیں
بہت نہیں کچھ تھوڑے ہی دن میں بیل بہنگ کو آئے گی

ابھی تو کیا ہے چھُٹپن ہے نادانی ہے بیہوشی ہے
پھر تو اس دن ہووے گا جب اپنا ہوش سنبھالے گی

ناز ادا اور غمزوں کے تیو اور ہی کترے گی گل پھول
سین لگاوٹ چتون کا بھی اور ہی عطر نکالے گی

کاجل مہندی پان مسی اور کنگھی چوٹی میں ہر آن
کیا کیا رنگ بناوے گی اور کیا کیا نقشے ڈھالے گی

جب یہ تن گدراوے گا اور بازو باہیں ہوویں گی گول
اُس دم دیکھا چاہیے کیا کیا پیٹ کے پاؤں نکالے گی

کس کس کا دل دھڑکے گا اور کون ملے گا ہاتھوں کو
بچپن سے جب انگیا میں یہ کچے سیب اچھالے گی

پان حیا اور آئینے میں دیکھ کے اپنے ہونٹوں کو
کیا کیا ہنس ہنس دیوے گی اور کیا کیا دیکھے بھالے گی

خانہ جنگیاں ہوویں گی اور لوگ مریں گے کٹ کٹ کر
شہر کے کوچے گلیوں میں اک شور قیامت ڈالے گی

جب یہ میوۂ حسن کا رس رس پک کر ہووے گا تیار — نائکہ اس کی قیمت کا جب دیکھا چاہیے کیا لے گی
سونا روپا سیم و جواہر صبر و دل و دیں ہوش و قرار — آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہی ایک آن میں سب رکھوا لے گی

اپنے وقت جوانی میں یہ شوخ خدا ہی جانے نظیرؔ
کس کس کا زر لوٹے گی اور کس کس کا گھر گھالے گی

چتون میں شرارت ہے اور سین بھی چنچل ہے — کافر تری نظروں میں کچھ اور ہی چھل بل ہے
بالا بھی چمکتا ہے جگنو بھی دمکتا ہے — بدھی کی لپٹ تس پر تعویذ کی ہیکل ہے
گورا وہ گلا نازک اور پیٹ ملائی سا — سینے کی صفائی بھی ایسی گویا مخمل ہے
وہ حسن کے گلشن میں مغرور نہ ہو کیونکر — بڑھتی ہوئی ڈالی ہے اٹھتی ہوئی کونپل ہے
انگیا وہ غضب جس کو ململ ہی کرے دل ہی — کیا جانے کہ شبنم ہے تن سکھ ہے کہ ململ ہے
یہ دو جو نئے پھل ہیں سینے پہ ترے ظالم — ٹک ہاتھ لگانے دے جینے کا یہی پھل ہے
ابھرا ہوا وہ سینہ اور جوشش بھرا جوبن — ایک ناز کا دریا ہے ایک حسن کا بادل ہے
کیا کیجئے بیاں یارو چنچل کی رکھاوٹ کا — ہر بات میں ڈر ڈر ہے ہر آن میں چلبل ہے
یہ وقت ہے خلوت کا اے جان نہ کر کلکل — کافر تری کلکل سے اب جی مرا بیکل ہے
کل میں نے کہا اس سے کیا دل میں یہ آیا جو — کنگھی ہے نہ چوٹی ہے مستی ہے نہ کاجل ہے
معلوم ہوا ہم سے روٹھے ہو تم اے جانی — الٹا ہی ڈوپٹے کا کنگڑے پہ یہ آنچل ہے
یہ سن کے لگی کہنے روٹھی تو نہیں تجھ سے — پر کیا کہوں دو دن سے کچھ دل مرا بیکل ہے

جس دن ہی نظیرؔ آ کر وہ شوخ ملے ہم سے
ہاتھ پھیر ہیں بوسے ہیں دن رات کی مل دل ہے

ترے رخ کی جھمکیں کیا کہوں جسے دیکھ رہیں مہ و مشتری — رہے ہوش گنوا پھرے باؤلی سی تری ایک جھلک کی دیکھ پری

تری نظریں تیر کمان بھویں تری انکھیں ترک سنان مژہ — تیری آن ہٹیلی چلبلی تری شوخ ادائیں فریب بھری
تو نے پان سے منہ کو لال کیا کیا کہوں کیا جو دل کا حال کیا — دیا سرمہ آنکھوں میں وہ بلا جیسے اودی تیغ پہ باڑھ دھری
تیرے تن کی نرمی کیا کہوں تیرے بچھوے پاؤں کے تلوے کو — چھوئی مخمل آن کے جس گھڑی لگی ہاتھ کو میرے کھُرکھُری

زری پوش جو ہو کے نکلا ہے تو چمک جھمک سے او میاں
ہے نظیر بھی تیرا مبتلا، بھلا اس کے پاس بھی بیٹھ ذری

پھڑکتی چشم ہے اور شوق بیتابی جتاتا ہے — خوشی ہے جان کو بھی اور دل بھی نہیں پھولا سماتا ہے
نگہ بھی لحظہ لحظہ سوئے در آتی ہے سرعت سے — خیال گوش بھی ہر دم طرف کھٹکے کے جاتا ہے
تو تم مضطرب ہو دوڑتا ہے دمبدم کہہ کر — چلیں دیکھیں کوئی تو حلقۂ در کھٹکھٹاتا ہے
نجومی خود بخود آ کہہ گیا خوش وقتیاں ہوں گی — ادھر کچھ زاغ بھی پیہم صدا اپنی سناتا ہے
شگوں جتنے معین ہیں جہاں میں شاد ہونے کے — ہر ایک اُن سے بھی ہر ساعت بروئے کار آتا ہے
نگار خوش دلی کرتا ہے وا بند نقاب اپنا — طرب سے دست عشرت بھی تکدر کو مٹاتا ہے

نظیر ایسی تو باتوں سے عیاں یہ ہے کہ وہ گل رو
کوئی دم یا کوئی پل میں ابھی تشریف لاتا ہے

کل سنا ہم نے یہ کہتا تھا وہ اک ہمراز سے — دیکھتا تھا مجھ کو آج ایک شخص عجب انداز سے
وہ نیاز و عجز تھا اس کی نگہ سے آشکار — جس طرح سے تھک رہے طائر کہیں پرواز سے
تو جو واقف ہو تو جا اس کو بلا لا اس گھڑی — میں تسلی دوں اسے کچھ شرم سے کچھ ناز سے
ہے مرا ملنے کو اس کے دل نہایت بے قرار — سن کے وہ ہمراز بولا اس بت طناز سے
میں تو اس کو جانتا ہوں نام اس کا ہے نظیر — اور خبر ہے مجھ کو اس کی چاہ کے آغاز سے
تم ہو شائد ہر دل اس کو کبھی سے یاد ہیں — اور سوا اس کے مرا ڈرتا ہے جی غماز سے

ہنس کے وہ گل رُو لگا ہمراز سے کہنے میاں
کچھ ہی ہو ہم تو ملیں گے اس لکھیڑے باز سے

چتون کی کہوں یا کہ اشارات کی گرمی — ہے نام خدا اس میں ہر ایک بات کی گرمی
رونے سے مرے اس کو عرق آگیا یارو — سچ ہے کہ بری ہوتی ہے برسات کی گرمی
ٹک پھول چھوا تھا سو نزاکت سے کئی بار — رہ رہ کے دکھائی مجھے کل ہاتھ کی گرمی
کھلواتے ہی بندوں کے بدن گرم ہوا یا — شاید کہ لگی اس کو مرے ہاتھ کی گرمی
جلتا ہوں میں اور شعلے نہیں دیتے دکھائی — ہے عشق میں یارو یہ طلسمات کی گرمی
رہنا ہے کوئی دن تو سمجھ جائیو اے دل — یہاں کچھ وہی گھڑی ہے ملاقات کی گرمی
گرمی تھی کہیں آہ ہم افسردہ دلوں میں — ساقی کی فقط ہے یہ عنایات کی گرمی
آتے ہی جو تم میرے گلے لگ گئے واللہ — اس وقت تو اس گرمی نے سب مات کی گرمی
کہتا ہے وہ جس دم کہ چلو ہم سے نہ بولو — اس بات میں ہے اور ہی ایک بات کی گرمی
سب پوچ ہے ظاہر کی یہ شوخی و شرارت — معشوق میں جب تک کہ نہ ہو ذات کی گرمی
تم غصہ ہو یا قہر ہو آتش ہو غضب ہو — اب ہم نے یہ سب دل پہ مساوات کی گرمی
یا حضرت دل تم تو بڑے صاحب دل تھے — رکھتے تھے بہت اپنے کمالات کی گرمی
ایک ہی نگہ گرم سے بس ہو گئے تم سرد — اب کہئے کہاں ہے وہ کرامات کی گرمی

یوں گرمی صحبت تو بہت ہوگی نظیر آہ
پر یار نہ بھولے گی مجھے رات کی گرمی

وہ صنم جو مہر عذار ہے اسے ہم سے ملنے میں عار ہے — وہ لے اپنا جو دل زار ہے وہ ہزار جان سے نثار ہے
ملے جب سے کوچے میں اس کے جا یہ سرور عیش ہے برملا — لب دل سے ہے اور وہ نقش پا برجان ہے اور در یار ہے

وہ نگہ جو اس کی ہے فتنہ گر اسے مشق صید ہے پیشتر
ہے جو دل کا طائر تیز پر اُسی باز کا یہ شکار ہے

وہ مژہ لگا کے جو ایک سناں گئی پھر تو کر نہ دل اب فغاں
کئی ایسے ہوویں گے امتحاں یہ ابھی تو پہلا ہی وار ہے

جو بہار گل پہ ہنسی ہے تل ہمیں کیا جو حسن کی پی سے دل
جنھیں چاہیے ہے وہ رشک گل انھیں گل سے کیا سروکار ہے

جو بتوں کو دیویں دل اور دیں رکھیں اس کو یہ بہ الم قریں
بھلا کہئے کیا اُسے ہمنشیں یہ عجب کچھ ان کا شعار ہے

کئی دن ہوئے ہیں نظیر اب کہ خفا ہے ہم سے وہ غنچہ لب
اُسے کیا ولے ہمیں روز و شب نہ تو صبر ہے نہ قرار ہے

جب آنکھ اس صنم سے لڑی تب خبر پڑی
غفلت کی گرد، دل سے جھڑی، تب خبر پڑی

پہلے کے جام میں نہ ہوا کچھ نشہ تو آہ
دلبر نے دی تب اس سے کڑی تب خبر پڑی

لانے تھے ہم تو عمر پٹا یاں لکھا دلے
جب سیاہی پہ سفیدی چڑھی تب خبر پڑی

ڈاڑھیں لگیں اکھڑنے تو دنداں ہوئے شہید
مجلس میں چل بہ چل یہ پڑی تب خبر پڑی

بن دانت بھی ہنسے پہ جب آنکھیں چلیں تو آہ
جب لاگی آنسوؤں کی جھڑی تب خبر پڑی

شہتیر سا وہ قد تھا، سو خم ہو کے جھک گیا
گرنے لگی، کڑی پہ کڑی تب خبر پڑی

پنجہ دکھایا شیر نے تو بھی یہ سمجھے جھوٹ
جب چاب لی گلے کی نڑی تب خبر پڑی

جب آئے، اس گڑھے میں نظیر اور ہزار من
اوپر سے آکے خاک پڑی تب خبر پڑی

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی
دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

کیا تعجب ہے اگر دیکھے تو مردہ جی اُٹھے
چین نیفے کی ڈھلک پیڑو پہ آنی آپ کی

ہم تو کیا ہیں دل فرشتے کا بھی کافر چھین لے
ٹک جھمک دکھلا کے پھر انگیا چھپانی آپ کی

آ پڑے دو سے برس کے مردۂ بے جاں میں جان
جس کے اوپر دو گھڑی ہو مہربانی آپ کی

ایک لپٹ کشتی کی ہم سے بھی تو لڑ دیکھو ذرا ہاں بھلا ہم بھی تو جانیں پہلوانی آپ کی
وقت تو جاتا رہا پر بات باقی رہ گئی ہے یہ جھوٹی دوستی اب ہم نے جانی آپ کی
کیا ہمیں لگتی ہے پیاری جب وہ کہتی ہے نظیر
ہے میاں کچھ ان دنوں نامہربانی آپ کی

گلباز عشرت ہو جسے کیا گل رخوں سے دم گھڑی کرتا ہے گلبازی کی یہاں ایک دم میں گردوں گلچھڑی
ہر دم تغیر دیکھ یہاں ہیبت سے یوں کانپے ہے جاں جیسے ہوا سے ہر زماں ہو بید کی لرزاں چھڑی
ایک گلبدن مغرور تھا رقص اس کا بس مشہور تھا جس جس کا وہ منظور تھا کرتا تھا جور اس پر کڑی
دل اس نے دیکھا جس جگہ بے جرم و تقصیر و گنہ مارا وہیں تیر نگہ یا تیغ ابرو کی جڑی
ہر دم نگاہ جانستاں لے کر پٹا غمزے کا ہاں کرتی تھی کیا کیا پھرتیاں وہاں جا پڑی یہاں آ پڑی
سر پاؤں سے گل پوش تھا بلبل وشوں کا جوش تھا ہر دل پڑا بیہوش تھا جاں دست بستہ تھی کھڑی
وہ گرم دیکھ اس کی دوکاں ایک سرد مہری کر عیاں ناگاہ جور آسماں اس مہر پیکر سے لڑی
وہ حسن سب جاتا رہا میں نے کہا یہ کیا ہوا بولا نظیر اب کہیے کیا حسرت ہے مجھ کو بھی بڑی
تھی وہ جو خوبی کی چمک جاتی رہی سب یک بیک
کیا جانے وہ ظالم جھمک مہتاب تھی یا پھل جھڑی

ایام شباب اپنے بھی کیا عیش اثر تھے کہتے ہیں جنھیں عیب وہ اس وقت ہنر تھے
دن رات وہ محبوب میسر تھے کہ جن کی زلفیں الم شام تھیں، رخ رشک سحر تھے
ساقی کے ادھر جام ادھر ناز و ادا سے جادو نظر ان خوش نگہاں پیش نظر تھے
محفل سے جو اٹھتے تھے ذرا بھی تو لپٹ کر نازک بدناں موکمراں، دست و کمر تھے
ہمراہ گل اندا موں کے ہو خرم و خنداں باغ و چمن گلشن و بستاں میں گزر تھے

کیا شور تھے کیا روز تھے کیا عیش تھے کیا لطف — کیا ولولے کیا قہقہے بے خوف و خطر تھے
دکھلا کے جھمک جاتے رہے دم میں نظیر آہ
کیا جانئے وہ دن برق تھے یا مثل شرر تھے

یک بہ یک مو کی سیاہی اس قدر جاتی رہی — کیا کہیں گویا سیاہی یک سر مو بھی نہ تھی
گو سفیدی مو کی یوں روشن ہے جوں آب حیات — لیکن اپنی تو اسی ظلمات سے تھی زندگی
دم بہ دم بزم سرود و ہر گھڑی سیر چمن — عشرت و عیش و نشاط و خرمی و تازگی
خندہ شادی سے ہر گز لب نہ ہوتے تھے بہم — ساغر و مینا، سرود و رقص و خوش طبعی ہنسی
جام دیتا تھا ادھر ساقی بہ منت ہاتھ جوڑ — اس طرف کیا کیا لگاوٹ دلبروں کی تھی نئی
گلبدن کرتے تھے کس کس طور اظہار اشتیاق — غنچہ لب ملتے تھے سو سو دل میں رکھ کر بے کلی
کوئی دیتا تھا محبت سے گلے میں ہاتھ ڈال — کوئی دیتا تھا زبردستی سے بوسہ ہر گھڑی
جس طرف تھے دیکھتے عیش و طرب کا جوش تھا — مستی و رندی، ہوس بازی و بے اندیشگی
آن کر مو کی سفیدی نے یہ کیں بربادیاں — کھول دیں جتنی بندھیں تھیں وہ ہوائیں عیش کی
قد میں خم، آنکھوں میں نم، چہرے پہ بکھری رنگ زرد — سر سے پا تک سخت ناخوش منظری بد ہیئتی
کیا تماشے انقلاب چرخ کے دیکھے نظیر
دم میں وہ رونق تھی اور ایک دم میں یہ بے رونقی

جس کے لب سے سخن بند گہر جوش ہوئے — عمر بھر پھر وہ ہمارے گہر گوش ہوئے
کل جو گزرے تھے ہم ایک کہنہ مزارستان میں — وہاں عجب طور کی عبرت سے ہم آغوش ہوئے
یعنی ایک شخص یہ بولا کہ یہاں عظم دہن — سخت بوسیدہ نگہ سے مری ہمدوش ہوئے
مجھ سے یوں کہنے لگی ہم تھے بڑے صاحب عیش — کبھی گلشن میں پھرے اور کبھی مے نوش ہوئے

رات دن عیش و طرب میں ہی بسر کرتے تھے   مثل عشرت طلباں خوش خور و خوش نوش ہوئے
گل عذاران سمن بر سے رہے شاد مدام   نازنینان جفا جو سے وفا کوش ہوئے
ایک دم چرخ حسد پیشہ سے مانند چراغ   ایک پلک بھر نہ کھنچی دیر جو خاموش ہوئے
اب کوئی نام و نشاں سے نہیں اپنے آگاہ   ایسے ہم خاطر عالم سے فراموش ہوئے

جب سنا میں نے یہ اس شخص سے احوال نظیرؔ
روح تھرا گئی لرزاں خرد و ہوش ہوئے

فرض ہے سب کو جناب کبریا کی دوستی   ہے وہی بندہ کہ جس کو ہے خدا کی دوستی
گر شفاعت کی تمنا ہے تو رکھ جی میں سدا   شافع محشر محمد مصطفیٰ کی دوستی
جام کوثر کا پیا چاہے تو اپنے دل میں رکھ   ساقی کوثر علی مرتضیٰ کی دوستی
حشر میں کھیتی ہری چاہے تو کر یہاں اختیار   سبز پیراہن امام مجتبیٰ کی دوستی
سرخ روئی دین دنیا کی اگر درکار ہے   تو تو رکھ دل میں شہید کربلا کی دوستی
زیب و زینت حشر کی چاہے تو سینے میں جما   عابد و باقر شہ ہر دوسرا کی دوستی
گر بہشتی جنتی ہونا ہو تو کر دل میں نقش   جعفر و کاظم علی موسیٰ رضا کی دوستی
قبر کی سختی سے چھٹنا ہو تو اے مومن محب   رکھ تقی حضرت نقی سے پیشوا کی دوستی
راہ جنت کی اگر چاہے تو اپنے ساتھ لے   عسکری مہدی امام رہنما کی دوستی
جس کو کہئے مذہب حق اور صراط المستقیم   ہے وہ بیشک اہل بیت مصطفیٰ کی دوستی
جنتی ہے جنتی ہے جنتی ہے وہ سعید   ان کی خدمت میں جو رکھتا ہے وفا کی دوستی
دوزخی ہے دوزخی ہے دوزخی ہے وہ شقی   اس طرف سے جو رکھے روئے ریا کی دوستی
نوح کی کشتی انھیں کو ہے پیمبر نے کہا   چھوڑ مت اے دل تو ان بحر سخا کی دوستی

پل صراط حشر میں جس دم ترا کھسکے گا پاؤں
وہاں نہ تھامے گی کسی یار آشنا کی دوستی

ہاں مگر جب تو کہے گا یا علی مشکل کشا
جب سنبھالے گی تجھے مشکل کشا کی دوستی

دیکھیو کس کس طرح سے واں ترے آتی ہے کام
مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا کی دوستی

گر تو یہ چاہے خدا اور مصطفیٰ ہو تجھ سے شاد
تو علی حیدر سے رکھ صدق و صفا کی دوستی

حیف اس کی بندگی اور خاک اس کی زندگی
شیر حق سے جو رکھے مکر و دغا کی دوستی

دین و دنیا میں وہی ہے جنتی بے شک نظیر
جس کے دل میں ہے سدا آل عبا کی دوستی

کل دیکھ کے اس کے عالم کو اک عالم کے اوسان گئے
واللہ عجب کچھ عالم تھا جو جان گئے سو جان گئے

کیا حسن کہوں اللہ رے حسن اس رشک پری کی صورت پر
انسان رہے کس گنتی میں جب حور ملک قربان گئے

اس مکھڑے چاند کے ٹکڑے کو تر دیکھ عرق کے قطروں سے
کتنوں کے دین پھرے بہتے اور کتنوں کے ایمان گئے

تھے چین جبیں پر ایسے ہی اس رشک بت چیں کے جس سے
جو کافر تھے چین کے تھے وہ کافر بھی چیں مان گئے

وہ بوند سیاہی مژگاں کی جب اتری تیر اندازی پر
دل چھید جگر سوراخ کیا اور سینہ تو سب چھان گئے

کچھ بھیس بدل کر شب کو ہم جوں پہنچے اس کی محفل میں
وہ کافر تو وہیں بول اٹھا ہم جان گئے ہم جان گئے

وہ دیکھ کے خط آئینے میں کل بھر کر آہ لگا کہنے
اس سبز قدم کے آتے ہی سب خوبی کے سامان گئے

جب میں نے نظیر اس سے یہ کہا اب غم کھائے کیا ہوتا ہے
ان باتوں کو مت یاد کرو وہ پانی بہ ملتان گئے

یہ رنگ پان سے جو دہن اس کا لال ہے
آج ان لبوں سے لعل کی پوری مثال ہے

استغفر اللہ لعل کہاں اور یہ لب کہاں
اے بے وقوف کچھ بھی تجھے انفعال ہے

خورشید جس سے لعل کی ہوتی ہے تربیت
وہ ان لبوں کے پان کا ادنیٰ اگال ہے

یوں لعل گرچہ سُرخ ہے پر سنگ سخت ہے
گو زرم بھی ہوا تو یہ اُس کی مجال ہے

کہتے ہیں لعل ٹوٹ کے ہوتا نہیں درست
سچ ہے، پر اپنے دل میں تو اور ہی خیال ہے

ہر دم سخن میں ٹوٹ کے بنتا ہے لعلِ لب
یہ معجزہ ہے یا کوئی سحر حلال ہے

بس لعلِ لب سے لعل کو نسبت ہے کیا نظیرؔ
یہاں لعل کی بھی اب تو زباں مُنہ میں لال ہے

گل رنگی و گل پیرہنی گل بدنی ہے
وہ نام خدا حسن میں سچ مچ کی بنی ہے

گلزار میں خوبی کے، اب اس گل کے برابر
بوٹا ہے نہ شمشاد نہ سروِ چمنی ہے

انداز بلا ناز ستم، قہر تبسم
اور اُس پہ غضب کم نگہی کم سخنی ہے

اس گورے بدن کا کوئی کیا وصف کرے آہ
ختم اس کے اوپر گل رُخی و سیمتنی ہے

مُنہ چاند کا ٹکڑا ہے بدن چاندی کی تختی
دنداں ہیں گہر ہونٹ عقیق یمنی ہے

بلور کی پُتلی کہوں یا موتی کا دانہ
یا چین میں ایک چینی کی مورت یہ بنی ہے

نرمی میں صفائی میں نزاکت میں تن اس کا
ریشم ہے نہ گلبرگ نہ برگ سمنی ہے

گر پھول کی پتی کی بنا پہنے وہ پوشاک
چھل جاوے بدن اُس کا یہ نازک بدنی ہے

کل میں نے کسی شخص سے نام اُس کا جو پوچھا
یعنی یہ پری یا کہ غزال ختنی ہے

وہ بولا کہ اس شوخ کے تئیں کہتے ہیں ہیرا
کام اس کا سدا دلبری و دل شکنی ہے

جب میں نے وہیں ہنس کے کہا اس سے نظیرؔ آہ
ہیرا نہ کہو اس کو یہ ہیرے کی کنی ہے

جو تو کہتا ہے اے غافل یہ میرا ہے یہ تیرا ہے
یہ جس کا ہے اسی کا ہے نہ میرا ہے نہ تیرا ہے

تو اول سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے
نمازی ہے، شرابی ہے، اچکّا ہے، لٹیرا ہے

فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے، یا آدمی، جن ہے
بلا ہے، بھوت ہے، یا من مزورا یا کمیرا ہے

تری کیا ذات ہے، کیا نام ہے، کیا کام کرتا ہے
مسافر ہے، وطن ہے، یا ترا اس جا پہ ڈیرا ہے

جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھہرا دے
تو اس کے بعد یہ کہیو، یہ تیرا ہے یہ میرا ہے

یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں تو اپنا ہی نہیں مالک
تجھے او بے خبر ناداں یہ کس غفلت نے گھیرا ہے

تو تجھے سوت کا دھاگہ عبث بل پیچ کھاتا ہے
یہ سب وہم و غلط ہے اور قصور فہم تیرا ہے

تو کیا جانے کہ تجھ کو کس نے کس چرخے میں کاتا ہے
تو کیا جانے کہ تجھ کو کس اٹیرن میں اٹیرا ہے

تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے، کیا کیا اہاہاہا
مصور نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے

ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے
اندھیرے میں اجالا ہے، اجالے میں اندھیرا ہے

طلسمات حقیقی ہے یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا
یہی چاند اور یہی سورج، یہی شام اور سویرا ہے

نظیر اللہ اللہ اس جہاں میں دم غنیمت ہے
کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا بسیرا ہے

یہ حسن ہے، آہ، یا قیامت کہ اک بھبھوکا بھبک رہا ہے
فلک پہ سورج بھی تھرتھرا کر منہ اس کا حیرت سے تک رہا ہے

کہو ری چوٹی، ادائیں موٹی، جفائیں لمبی، وفائیں چھوٹی
ہے ایسی کھوٹی کہ دل ہر اک کا ہر ایک لٹ میں لٹک رہا ہے

وہ نیچی کافر سیاہ پٹی کہ دل کے زخموں پہ باندھے پٹی
پڑھی ہے جس نے کہ اس کی پٹی وہ پٹی سے سر پٹک رہا ہے

وہ ماتھا ایسا کہ چاند نکھرے، پھر اس کے اوپر وہ بال بکھرے
دل اس کے دیکھے سے کیوں نہ بکھرے کہ مثل سورج چمک رہا ہے

وہ چین تیوری، وہ کٹیلے ابرو، وہ چشم جادو، نگاہیں آہو
وہ پلکیں کج خو کہ جن کا ہر مو جگر کے اندر کھٹک رہا ہے

غضب وہ چنچل کی شوخ بینی، پھر اس پہ نتھنوں کی کم ترفی
پھر اس پہ نتھ کی وہ ہم نشینی، پھر اس پہ موتی پھڑک رہا ہے

لب و دہان بھی وہ نرم و نازک، مسی دہاں تک وہ تھر آفت
سخن بھی کرنے کی وہ لطافت کہ گویا موتی ٹپک رہا ہے

وہ کان خوبی میں جھک رہے ہیں، جو ابروؤں میں جھمک رہے ہیں
ادھر کو جھمکے جھمک رہے ہیں ادھر کا بالا چمک رہا ہے

صراحی گردن وہ آبگینہ پھر آگے سینہ بھی جوں نگینہ
بھرا ہے جس میں تمام کینہ کہ جوں نگینہ دمک رہا ہے

پچیں وہ کچھ کچھ ثمر درختی کچھ ان کی سختی وہ کچھ کرختی
ہیں جس نے دیکھے وہ پھل درختی کلیجہ اس کا دھڑک رہا ہے

وہ سرخ انگیا جو کس رہی ہے وہ چس رہی ہے اکس رہی ہے
کچھ ایسے ڈھب سے وہ کس رہی ہے کہ اس کا کنا کسک رہا ہے

وہ پیٹ دل کو لپیٹ لیوے وہ ناف جی کو سمیٹ لیوے
مزا جی کا جھپیٹ لیوے کچھ ایسا پیڑو پھڑک رہا ہے

وہ پیٹ گوری کمر وہ پتلی غضب لگاوٹ وہ پھر سرین کی
اب آگے کہئے تو کیا کہوں میں کہ ہوش اس جا ٹھٹک رہا ہے

فقط وہ چمپے کی اک کلی ہے کچھ اک مندی ہے کچھ ایک کھلی ہے
سلاخ سونے کی ایک ڈلی ہے کہ گویا کندن دمک رہا ہے

وہ پیاری رانیں وہ گول ساقیں وہ کف ملائم وہ نرم پہنچے
کڑی کڑی سے کھڑک رہی ہے کڑا کڑے سے کھڑک رہا ہے

نظیر خوبی میں اس پری کی کہوں کہاں تک ثنا بنا کر
صفت سراپا میں جس کے لکھے دل اب اسی سے اٹک رہا ہے

اولاً اس بے نشاں اور بانشاں کو عشق ہے
بعد ازاں سر حلقۂ پیغمبراں کو عشق ہے

لافتا الا علی ہے شان میں جس کی نزول
دوستاں اس شاہ مرداں سے جواں کو عشق ہے

پھر جو ہے باغ نبوت اور امامت کی بہار
غنچہ و گل سبزۂ عنبر فشاں کو عشق ہے

عرش و کرسی حور و غلماں اور ملایک خاص و عام
عالم بالا کے سب باشندگاں کو عشق ہے

جنت و عدن و بہشت و خلد و مینو اور ارم
ساتھ ان باغوں کے رضواں باغباں کو عشق ہے

ہیں جو سیارہ و ثوابت آفتاب و ماہتاب
قایم و میل فلک قطب زماں کو عشق ہے

ہیں جو یہ چودہ طبق متحرک و ساکن سدا
بے سخن ان سب زمین و آسماں کو عشق ہے

مختلف ہیں اور ملے رہتے ہیں باہم روز و شب
خاک باد و آتش و آب رواں کو عشق ہے

ہے جہاں میں جن سے روشن عدل کے گھر کا چراغ
دم بدم ان بادشاہان جہاں کو عشق ہے

اور خراساں اصفہاں ایران اور توران کو
پھر ہمارے گلشن ہندوستاں کو عشق ہے

ہیں جہاں تک سلسلے فقرا کے از کہہ تا بہ مہ　　عارفاں اور کاملاں اور عاشقاں کو عشق ہے

کوہ تھراتے ہیں لرزیں ہیں زمین و آسماں　　عاشق مولا کی فریاد و فغاں کو عشق ہے

ہر طرف گلزار ہے سبزان اور آب رواں　　اپنی نظروں میں بہار گلفشاں کو عشق ہے

وہ جو ہیں اس گلشن ہستی میں اب محو فنا　　ان کے آگے موسم باد خزاں کو عشق ہے

دل کو لے پامال کر دینا بہ صد جور و جفا　　اس خوبان عالم دلستاں کو عشق ہے

گرد کے مانند پھرتی ہیں پڑی اُڑتی خراب　　لٹ گئی دست جنوں کی کارواں کو عشق ہے

لوٹتے ہیں مست مے خانے کے در پر جا بجا　　جام و صہبا ساقی و پیر مغاں کو عشق ہے

کل ہی نقش ذائقہ سن کر بھی ہم عامل رہے　　اے عزیزاں اس حیات رائگاں کو عشق ہے

خلقت کونین میں کیا جن و کیا انساں نظیرؔ
وحشی و طائر زباں و بے زباں کو عشق ہے

موضوعی غزلیں

موضوعی غزلیں

بسنت

جوشِ نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا
ہے طرفہ روزگار طرب زا بسنت کا

باغوں میں لطفِ نشو و نما کی ہیں کثرتیں
بزموں میں نغمہ خوش دلی افزا بسنت کا

پھرتے ہیں کر لباس بسنتی وہ دلبراں
ہے جن سے زرنگار سراپا بسنت کا

چادر پہ یار کے یہ کہا ہم نے صبح دم
اے جان ہے اب تو ہر کہیں چرچا بسنت کا

تشریف تم نہ لائے جو ہو کر بسنتی پوش
کہیے گناہ ہم نے کیا، کیا بسنت کا

سنتے ہی اس بہار سے نکلا کہ جس کے تئیں
دل دیکھتے ہی ہو گیا شیدا بسنت کا

اپنا وہ خوش لباس بسنتی دکھا نظیر
چمکایا حُسن، یار نے کیا کیا بسنت کا

ہولی

ہولی کی رنگ فشانی سے ہے رنگ یہ کچھ پیراہن کا
جوں رنگا رنگ بہاروں میں ہو صحن چمن اور گلشن کا

جس خوبی اور رنگینی سے گلزار کھلے ہیں عالم میں
ہر آن چھڑکواں جوڑوں سے ہے حسن کچھ ایسا ہی تن کا

لے جام لبالب بھر دینا پھر ساقی کو کچھ دھیان نہیں
یہ ساغر پہنچے دوست تلک یا ہاتھ پلک لے دشمن کا

ہر محفل میں رقاصوں کا کیا سحر دلوں پر کرتا ہے
وہ حسن جتانا گانے کا اور جوشش دکھانا جوبن کا

ہے روپ عبیروں کا مہوش اور رنگ گلالوں کا گلگوں
ہیں بھرتے جس میں رنگ بنا ہے رنگ عجب اس تن کا

اس گل رو نے یوں ہم سے کہا کیا مستی و مدہوشی ہے
نہ دھیان ہمیں کچھ ہولی کا نہ ہوش تمھیں کچھ دامن کا

جب ہم نے نظیر اس گل رو سے یہ بات کہی ہنس کر اس دم
کیا پوچھے ہے آ رنگ بھری ہے مست مہینہ پھاگن کا

جوانی

بنا ہے اپنے عالم میں وہ کچھ عالم جوانی کا
کہ عمر خضر سے بہتر ہے ایک ایک دم جوانی کا

نہیں بوڑھوں کی ڈاڑھی پر میاں یہ رنگ وسمے کا
کیا ہے ان کے ایک ایک بال نے ماتم جوانی کا

یہ بوڑھے گو کہ اپنے منہ سے شیخی میں نہیں کہتے
بھرا ہے آہ پر ان سب کے دل میں غم جوانی کا

یہ پیران جہاں اس واسطے روتے ہیں اب ہر دم
کہ کیا کیا ان کا ہنگامہ ہوا برہم جوانی کا

کسی کی مینٹ کیٹری کو بھلا خاطر میں کیا لاوے
اکڑ میں نوجوانی کے جو مارے دم جوانی کا

شراب و گلبدن ساقی مزے عیش و طرب ہر دم
بہار زندگی کہئے تو ہے موسم جوانی کا

نظیر اب ہم اڑاتے ہیں مزے کیا کیا اہا ہا ہا
بنایا ہے عجب اللہ نے عالم جوانی کا

بالا

تم نے جس دن سے صنم کان میں بالا ڈالا — ہو گیا چاند سے مکھڑے کا اجالا بالا
کیوں نہ ہوں ہوش کا میں اس کے دوانہ یارو — جس پریزاد نے بالی سے نکالا بالا
ایک تو قہر ہے جھلکے کے کرن پھول میں جھوک — جس پہ کافر ہے جگر چھید سنے والا بالا
اب تو بالی نہیں، کافر وہ بڑی سیانی ہے — کیوں نہ اب اس کا بتا دے ہمیں بالا بالا
واہ جی ہم کو تو بالے ہی بتانا ہر دم — آپ غیروں میں مزے لوٹنا بالا بالا
یہ بھی کیا آن غضب ہے کہ دکھانا ہر آن — کان کے پاس سے سرکا کے دوشالا بالا
جیسے مہتاب یہ ہالے کا بندھے ہے کنڈل — ہے ترے چاند سے رخسار کا ہالا بالا
کیا غضب تھی وہ ادا آہ کہ چنچل نے شتاب — گونج کھلتے ہی جھجک کر جو سنبھالا بالا
نوک مژگاں کو خبر ہونے نہ دی آہ ذرا — دل کو یوں اس کی نگہ لے گئی بالا بالا
اے دل اس بالے کی ہرگز تو لگاوٹ میں نہ آ — تجھ کو بتلاوے گا بالے پہ یہ بالا بالا
چومے ہر جھوک میں کافر ترے رخسار کو آہ — کیوں نہ مارے مرے سینے میں یہ بھالا بالا
اور بھی یوں تو پری زاد ہیں بالے والے — پر ہے اے جان ترا سب سے نرالا بالا
جب ہلاتی ہے صراحی سی وہ گردن اپنی — نشۂ حسن کو کرتا ہے دوبالا بالا

اب تو رہ رہ کے مرا دل یہی کہتا ہے نظیرؔ
اک نظر، چل کے مجھے، اس کا دکھالا بالا

پنکھیا

کیوں نہ جھمک کر کرے جلوہ گری پنکھیا — کچھ کف نازک پری، کچھ وہ پری پنکھیا

دیکھ چمن میں سحر، اس کی جبیں پر عرق   قطعہ   لائی اُدھر سے نسیم، عطر بھری پنکھیا
شاخ نے گل کی ادھر برگ جو تھی سبز تر   اُن کی بنا کر جھلی اس کو ہری پنکھیا
گرمی میں ایک دن گئے اس سے جو ملنے کو ہم   چھوٹی سی آگے تھی ایک اس کے دھری پنکھیا
ہم تھے پسینے میں تر، بیٹھتے ہی یک بیک   ہاتھ بڑھا کر جو لی، اس کی ذری پنکھیا
اس نے وہیں چھین لی اور یہ کہا واہ واہ   تو نے چھوئی کیوں مری، زیب بھری پنکھیا

کچھ تھی عرق کی تری، کچھ ہوئی خجلت نظیر
اور تری کے اوپر لائی تری پنکھیا

بٹوا

دیکھ تیرا یہ جھلکتا ہوا اے جاں بٹوا   صبح نے پھینک دیا مہر کا رخشاں بٹوا
چاندنی میں ترے بٹوے کے مقابل ہونے   بن کے نکلا ہے فلک پر مہ تاباں بٹوا
گر چمن میں تجھے بٹوے کی طلب ہو تو وہیں   زر بھرا غنچے کا لا دے گل خنداں بٹوا
ہاتھ نازک ہیں ترے اور وہ ہے سنگیں ورنہ   بن کے آ جاوے ابھی لعل بدخشاں بٹوا

قطعہ

یوں کہا میں کہ یہ بٹوا ذرا ہم کو دیجے   ہم بھی بنوائیں گے ایسا ہی درخشاں بٹوا
سن کے بٹوے کو دکھا کر یہ کہا واہ رے شعور   ارے بن سکتا ہے ایسا کوئی اب یہاں بٹوا

جب کہا میں نے سبب کیا تو کہا ہنس کے نظیر
یہ تو لائیں ہیں مرے واسطے پریاں بٹوا

❊

بٹوا

تمھارے ہاتھ سے ہوتا نہیں اک دم جدا بٹوا | یہ کس الفت بھری نے سچ کہو تم کو دیا بٹوا
معطر ہو رہا ہے نکہت جو زد زلف سے | کہوں میں عطرداں، کیوں صاحب، اس بٹوے کو یا بٹوا
گھڑی غنچہ، گھڑی گل، پھر گھڑی میں گل سے غنچہ ہو | تمھارے آگے کیا کیا رنگ بدلے ہے پڑا بٹوا
تمھیں ہم چاہیں تم بٹوے کو چاہو کیا تماشہ ہے | ہمارے دلربا تم اور تمھارا دلربا بٹوا
جو تم نے بدلے ایک بٹوے کے ایک بوسہ ہی ٹھہرایا | تو صاحب یاد رکھیو یہ ہمارا ہے چھٹا بٹوا

قطعہ

نہایت پر تکلف اور بہت خوش قطعہ نازک سا | بہ صد تاکید بنوایا تھا ہم نے ایک نیا بٹوا
گئے ہم اتفاقاً اُس پری رو سے جو ملنے کو | تو کیا کہیے وہی اُس دم ہمارے پاس تھا بٹوا
یکایک آ پڑی اس کی نظر اس پر تو لے ہم سے | کہا، یہ تو بنایا ہے کسی نے واہ کیا بٹوا
بہت تعریف کی اور ہنس دیا جب دل میں ہم سمجھے | کہ یہ تعریف کچھ خالی نہ جاوے گی چلا بٹوا
کبھی یوں اور کبھی یُوں دیکھ آخر یوں کہا ہنس کر | یہ کس کا ہے قیامت پُر نزاکت خوش نما بٹوا
کہا جب میں نے ہنس کر سو نیاز و عجز سے لے جاں | اِسے میلا نہ کیجیے ہے یہ ایک محبوب کا بٹوا
میں بھولے سے لے آیا تھا اگر درکار ہو تم کو | تو میں اس سے بھی بہتر اور دوں تم کو منگا بٹوا
کہا ہم تو یہی لیں گے تو میں نے پھر کہا صاحب | میں بیگانہ تمھیں اب کس طرح سے دوں بھلا بٹوا
جونہی یہ بات نکلی میرے مُنہ سے پھر تو جھنجھلا | وہیں اُس شوخ نے مارا میرے مُنہ پر اٹھا بٹوا
کہا میں نے خفا ہوتے ہو کیوں چاہو تمھیں لے لو | یہ کہہ کر میں نے پھر اُس کی طرف ڈھلکا دیا بٹوا
چلا جب وہ ڈھلکتا اس کی جانب دیکھیے شامت | کہیں ناگہ سر زانو میں اس کے جا لگا بٹوا
تو لے بٹوے کو اور زانو پکڑ کر یوں کہا دشمن | یہ تو نے آپ سے مارا مرے، واروں تیرا بٹوا

جلادوں ٹکڑے کرڈالوں وے تجھ کو نہ دوں ہرگز　　لگا میرے بہت، اب تو یہ میرا ہو چکا بٹوا
نہ بٹوادوں نظیر اور تجھ سے زانو کا بھی بدلہ لوں
یہی دھمکی دکھا کر آخر اس نے لے لیا بٹوا

سنگترا

کیا کیا ہر ایک درخت پہ آیا ہے سنگترا　　پھل زور ہی مزے کا کہایا ہے سنگترا
نارنگی اور انار کب اچھے لگیں اُسے　　جس رس بھری کے دل میں سمایا ہے سنگترا
چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کہا میں نے اس سے جان　　مدت میں میرے ہاتھ یہ آیا ہے سنگترا
گر تم برا نہ مانو تو اک بات میں کہوں　　یہ تو کسی کا تم نے چرایا ہے سنگترا
تم توڑتی تھیں، آن پڑا اس میں باغباں　　انگیا میں اس کے ڈر سے چھپایا ہے سنگترا
یہ سن کے اس نے ہنس دیا اور یوں کہا مجھے　　اب ہم نے اس طرح سے یہ پایا ہے سنگترا
ایک باغ حسن کا ہے جوانی ہے اس کا نام　　واں سے ہمارے ہاتھ یہ آیا ہے سنگترا
جوبن کے باغبان نے اٹھتی بہار سے　　تازہ ابھی یہ ہم کو بھجایا ہے سنگترا
کوٹھے ہی لگ رہا ہے ہمارے تمام عمر　　جس کو کبھی یہ ہم نے دکھایا ہے سنگترا
جب تو نظیر میں نے یہ ہنس کر کہا اُسے
میوہ خدا نے خوب بنایا ہے سنگترا

پنکھا

برگ گل و لالہ کا نہ بنوائیے پنکھا　　اس سے بھی سبک اور کوئی منگوائیے پنکھا

ہم تر ہیں پسینے میں تو کیا آپ کو صاحب — خوش بیٹھے ہوئے آپ تو جھلوائیے پنکھا
مدت کے تمھارے ہیں ہوادار ہمارے جاں — ایک چار گھڑی ہم سے بھی جھلوائیے پنکھا (قطعہ)
سن کر یہ کہا خیر اگر ہے یونہی دل میں — تو جا کے شتابی ابھی لے آئیے پنکھا
جب ہم نے کہا یہاں تو مجبور وں کے ہیں اکثر — مقیش کا لے آویں جو فرمائیے پنکھا
فرمایا کسی کا ہو یہ نازک ہو سبک ہو — ایسا نہ ہو جو پھر کے بدلوائیے پنکھا
بنوا کے بہ صد زیب کہا ہم نے یہ آکر — ہم شرط بدیں ایسا جو دکھلائیے پنکھا
جب ہنس کے کہا چھیڑ تمھاری نہیں جاتی — اب جی میں ہے منہ پر کوئی لگوائیے پنکھا
القصہ جو ہیں جھلنے لگے ہم اسے خوش ہو — بولا وہیں بس بس ذرا ٹھہرائیے پنکھا
حلقے مری زلفوں کے کھلے جاتے ہیں ہل ہل — ایسا بھی تو لپ جھپ نہ جھپکائیے پنکھا
پنکھے کے بھی جھلنے کا نہیں تم کو شعور اب — معلوم ہوا بس جی ادھر لائیے پنکھا
ایک دن عرق آلود ہو گھبرا کے کہا میں — اس وقت تو ہم کو کوئی دلوائیے پنکھا
بولا کہ چہ خوش فائدہ کیا اب جو تمھارے — ان گھر گھرے ہاتھوں سے پکڑوائیے پنکھا
اس چھوٹے سے پنکھے کی ہوا کب تمھیں آئے — بے فائدہ جا کے سے نہ ہلوائیے پنکھا

ایسا ہی جو جھلنا ہے نظیر اب تمھیں تو آپ
گدھ پنکھ کے پر کا کوئی بنوائیے پنکھا

حنا

کچھ دل فریب ہاتھ وہ کچھ دل ربا حنا — لگتی ہے اس پری کی عجب خوش نما حنا
دیکھے ہیں جب سے دل نے حنا بستہ اس کے ہاتھ — راتوں کو چونک پڑتا ہے کہہ کر حنا حنا

ہے سرخ یہاں تلک کہ جو چھلّے ہیں نقرئی — کرتی ہے اس کے ہاتھ میں ان کو طلا حنا
یہ فندقیں نہیں مرے قاتل کے ہاتھ میں — ہوتی ہے پور پور پہ اُس کے فدا حنا
خونِ شفق میں پنجۂ خورشید رشک سے — ڈوبا ہی تھا اگر وہ نہ لیتا چھپا حنا
غرفے سے ہاتھ کھول کے اور پھر لیا جو کھینچ — بجلی سی کچھ چمک گئی کافر بلا حنا
شب کے خلاف وعدہ کا جب بن سکا نہ عذر — ناچار پھر تو ہنس دیا اور دی دکھا حنا
کل مجھ سے ہنس کے اُس گل خوبی نے یوں کہا — پاؤں میں تو ہی آج تو میرے رچا حنا
وہ چھوٹی پیاری انگلیاں وہ گورے گورے پاؤں — ہاتھوں میں اپنے لے، میں لگانے لگا حنا

اُس وقت جیسی نکلیں مری حسرتیں نظیرؔ
اُن لذتوں کو دل ہی سمجھتا ہے یا حنا

برسات

ساقیا موسم برسات ہے کیا روح فزا — دیکھ ملک تازگی صنعت بیچون و چرا
کھل رہے ہیں در و دیوار پہ درہائے بہشت — آ رہی ہے چمنِ خلد کی گھر گھر میں ہوا
جا بجا نکلے ہیں اس حسن سے طفلان نبات — اپنے ہاتھوں پہ کھلاتے ہیں جنھیں نشو و نما
دیکھ سبزوں کی طراوت کو زمیں پڑھتی ہے — دمبدم انبتہ اللہ نباتاً حسنا
برگ اشجار وہ سرسبز ہیں اور نرم و لطیف — فی المثل حلۂ جنت انہیں کہئے تو بجا
کوہ و صحرا میں وہ سبزی ہے کہوں کیا گویا — مخمل تازہ کسی نے ابھی یاں دی ہے بچھا
الغرض دشت تو ہیں کارگہِ مخمل سبز — اور جو ہیں کوہ تو وہ کوہ زمرد برپا
برح سے کرتے ہیں اب نضرت و خضرت و سلوک — جیسے غنچوں سے نسیم سحر اور گل سے صبا

ہے زمینِ چمن ازبس کہ جو پانی سے سفید
اس میں اب عکس ہر ایک گل کا ہے یوں جلوہ نما

عقل کہتی ہے تامل سے جسے دیکھ کے یہ
طشت بلور ہے اقسام جواہر سے بھرا

شاخ پر گل کا یہ عالم ہے کہ جیسے محبوب
سرخ دستار بسر رکھتا ہے اور سبز قبا

غلغل رعد خوش آتا ہے ہر ایک گوش کو یوں
جیسے شادی میں پسند آتی ہے نوبت کی صدا

آتش برق جو ہے مشتعل ازبس ہر دم
اُس سے کیا جھوم کے اٹھی ہے دہواں دھار گھٹا

ایسی آتش کے لئے چاہیئے ایسا ہی دہواں
کیا تناسب ہیں یہ صفت کے اہاہاہا

اس سیہ ابر میں یوں اڑتے ہیں بگلے جیسے
لب مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی صفا

بدلیاں بدلے ہیں کیا رنگ نئے رنگا رنگ
جنگل ایک رنگ پہ سو مانی ارژنگ فدا

روح بہزاد کی کہتی ہے تصدق ہوکر
کس سے یہ رنگ ہوں یارب تری قدرت کے سوا

متصل برسے ہے جھڑیوں سے وہ بارانِ گہر
جس کے قطرے سے بنے صد گُہر بیش بہا

لوگ کہتے ہیں یہ ہیں آب کے قطرے لیکن
ہم تو جانے ہیں یہ کل برسے ہے مینہ موتی کا

بلکہ موتی ہے فقط گوش بتاں کی زینت
یہ وہ قطرے ہیں کہ ہیں آبِ رخِ شاہ و گدا

آب رُخ کیا کہ اسی سے ہے حیات ہر شے
شاہد اس بات کی ہے حیٌ من الما کی ندا

جن کو ہے وصل تو وہ خندہ زناں ہیں جوں برق
اور ہیں مہجور تو وہ گریہ کناں ابر آسا

اس طرف ابر سیہ اس طرف آہوں کے ہجوم
ہے اُدھر مینہ تو ادھر آنسو کا ٹپکا ہے لگا

سن پپیہے کی وہ پی پی کی صدا کہتے ہیں
چپ بھی ہو رہ ارے کم بخت نہ جلتوں کو جلا

قصہ کوتاہ یہ کچھ رنگ ہیں اندوہ فراق
جن کے احوال پہ ہر ابر کو آتا ہے بکا

اب میں ساون کے اندھیرے کی کروں کیا تعریف
کوئی تشبیہ نہیں ملتی مسرت پیرا

ہے تجسس تو بہت لیک میں اب حیراں ہوں
جعد شیریں کہوں یا زلفِ سیاہ لیلا

جگنو اس طور چمکتے ہیں کہ جوں وقت سنگھار　　جبۂ فیل پہ شنگرف کسی نے چھڑکا
کہیں رقاص کا رقص اور کہیں مطرب کا سرود　　کوندا اور شور سے معمور ہے کل ارض و سما
یہاں تو یہاں گاتی ہے وہاں ہر وہ کچھ میگھ ملہار　　جس کو سُن سُن کے فلک ناچ رہا ہے بر روئے ہوا
مور کا شور فغاں غوک کی جھینگر کی جھنکار　　کوئل کی صدا
سجدۂ شکر کہیں نغمۂ رقاص کہیں　　بوس و آغوش کہیں ساغر و مینا کی ادا
ایک جہاں بھیگے ہے ایک خلق ہے سیراب نشاط　　ایک عالم کو ہے عیش و طرب و برگ و نوا
اہل ظاہر ہی نہیں مست مے عیش و سرور　　اہل باطن بھی اُچھلتا ہے ہر ایک وجد میں آ

شہر اور دشت میں یہاں چار مہینے تو نظیر
نظر آجاتے ہیں جنت کے نمونے ہر جا

عید

شاد تھا جب دل وہ تھا اور ہی زمانا عید کا　　اب تو یکساں ہے ہمیں آنا نہ آنا عید کا
دل کا خون ہوتا ہے جب آتا ہے اپنا ہم کو یاد　　آدھی آدھی رات تک مہندی لگانا عید کا
آنسو آتے ہیں بھر جب دھیان میں گزرے ہے آہ　　پچھلے پہرے سے وہ اُٹھ اُٹھ کر نہانا عید کا
حشر تک جاتی نہیں خاطر سے اس حسرت کی بو　　عطر بغلوں میں وہ بھر بھر کر لگانا عید کا
ہونٹھ جب ہوتے تھے لال اب آنکھیں ہو جاتی ہیں سرخ　　یاد آتا ہے جو ہم کو پان کھانا عید کا
دل کے ہو جاتے ہیں ٹکڑے جس گھڑی آتا ہے یاد　　عیدگہ تک دلبروں کے ساتھ جانا عید کا
گلعذاروں کے میاں ملنے کی خاطر جب تو ہم　　ٹھان رکھتے تھے مہینوں سے بہانا عید کا
اب یوں چھپتے ہیں جیسے تیر سے بھاگے کوئی　　یا بنے پھرتے تھے ہم آپ ہی نشانا عید کا

نیند آتی تھی نہ ہرگز بھوک لگتی تھی ذرا　　یہ خوشی ہوتی تھی جب ہوتا تھا آنا عید کا
کیا ہوئے وہ دن کہاں جاتے رہے جواب نظیر
اُٹھ گیا خاطر سے سب ہنسنا ہنسانا عید کا

رات

کھینچ کر اس ماہ رو کو آج یہاں لائی ہے رات　　یہ خدا نے مدتوں میں ہم کو دکھلائی ہے رات
چاندنی ہے رات ہے خلوت ہے صحن باغ ہے　　جام بھر ساقی کہ یہ قسمت سے ہاتھ آئی ہے رات
بے حجاب اور بے تکلف ہو کے ملنے کے لئے　　وہ تو ٹھہرا لیتے تھے دن پر ہم نے ٹھہرائی ہے رات
جب میں کہتا ہوں کسی شب کو تو کافر یہاں بھی آ　　ہنس کے کہتا ہے میاں ہاں وہ بھی بنوائی ہے رات
کیا مزہ ہو ہاتھ میں زلفیں ہوں اور یوں پوچھئے　　اے مری جاں سچ کہو تو کتنی اب آئی ہے رات
جب نشے کی لہر میں بال اُس پری کے کھل گئے　　صبح تک پھر تو چمن میں کیا ہی لہرائی ہے رات
دور میں حُسن بیاں کے ہم نے دیکھا بارہا　　رُخ سے گھبرایا ہے دن زلفوں سے گھبرائی ہے رات
ہے شب وصل آج تو دل بھر کے سو دے گا نظیر
اس نے یہ کتنے دنوں میں عیش کی پائی ہے رات

عالم کے بیچ جس گھڑی آتی ہے شب برات　　کیا کیا ظہور نور دکھاتی ہے شب برات
دیکھے ہے بندگی میں جسے جاگتا تو پھر　　پھولی نہیں بدن میں سماتی ہے شب برات
روشن ہیں دل جنھوں کے عبادت کے نور سے　　اُن کو تمام رات جگاتی ہے شب برات
بخشش خدا کی راہ میں کرتے ہیں جو محب　　برکت ہمیشہ اُن کی بڑھاتی ہے شب برات
خالق کی بندگی کرو اور نیکیوں کے دم　　یہ بات ہر کسی کو سُناتی ہے شب برات

غافل نہ بندگی سے ہو اور خیر سے ذرا
ہر لحظہ یہ سبھوں کو جتاتی ہے شب برات

حسن عمل کرو جو بھلا عاقبت میں ہو
سب کو یہ نیک راہ بتاتی ہے شب برات

لے کر امیر حمزہ کے ہر بار نام کو
خلقت کو اُن کی یاد دلاتی ہے شب برات

کیا کیا میں شب برات کی خوبی کہوں نظیر
لاکھوں طرح کی خوبیاں لاتی ہے شب برات

ازار بند

چھوٹا بڑا نہ کم نہ منجھولا ازار بند
ہے اس پری کا سب سے امولا ازار بند

گوٹہ، کناری، بادلہ، مقیش کے سوا
تھا چار تولے موتی جو تولا ازار بند

ہر ایک قدم پہ شوخ کے زانو کے درمیاں
کھاتا ہے کس جھلک سے جھکولا ازار بند

جوں ہی کمر سے اس کی مرا ہاتھ لگ گیا
لونڈی سے بولی جا مرا ڈھولا ازار بند

ہنستے میں ہاتھ میرا کہیں لگ گیا تو وہ
لونڈی سے بولی جا مرا ڈھولا ازار بند

اور ڈھو نہیں تو پھینک دے ناپاک ہو گیا
وہ دوسرا جو ہے سو پرولا ازار بند

اک دن کہا یہ میں نے کہ اے جان آپ کا
ہم نے کبھو مزے میں نہ کھولا ازار بند

سُن کر لگی یہ کہنے کہ واچھڑے چہ خوش
ایسا بھی کیا میں رکھتی ہوں بولا ازار بند

آجا دے اس طرح سے جو اب ہر کسی کے ہاتھ
ویسا تو کچھ نہیں مرا بھولا ازار بند

اک رات میرے ساتھ وہ عیار مکر باز
لیٹی چھپا کے اپنا مولا ازار بند

جب سو گئی تو میں نے بھی دہشت میں اس کی آ
پہلے تو چپکے چپکے ٹٹولا ازار بند

آخر بڑی تلاش سے اس شوخ کا نظیر
جب آدھی رات گزری تو کھولا ازار بند

کوٹھا

کبھی تو آؤ ہمارے بھی جان کوٹھے پر　　لیا ہے ہم نے اکیلا مکان کوٹھے پر
کھڑے جو ہوتے ہو تم آن آن کوٹھے پر　　کروگے حسن کی کیا تم دکان کوٹھے پر
تمھیں جو شام کو دیکھا تھا بام پر میں نے　　تمام رات رہا، میرا دھیان کوٹھے پر
یقیں ہے بلکہ مری جاں جب کہ نکلے گی　　تو آرہے گی تمھارے ہی جان کوٹھے پر
مجھے یہ ڈر ہے کسی کی نظر نہ لگ جائے　　پھرو نہ تم کھلے بالوں سے جان کوٹھے پر
بشر تو کیا ہے فرشتے کا جی نکل جاوے　　تمھارے حسن کی دیکھ آن بان کوٹھے پر
جھمک دکھا کے ہمیں اور بھی پھنسانا ہے　　جبھی تو چڑھتے ہو تم جانِ جان کوٹھے پر
تمھیں تو کیا ہے و لیکن مری خرابی ہو　　کسی کا آن پڑے اب جو دھیان کوٹھے پر
گو چونے کاری میں ہوتی ہے سرخی تو ایسی　　کسی کے خون کا یہ ہے نشان کوٹھے پر
یہ آرزو ہے کسی دن تو اپنے دل کا درد　　کریں ہم آن کے تم سے بیان کوٹھے پر
لڑاؤ غیر سے آنکھیں کہو ہو ہم سے آہ　　کہ تھا ہمیں تو تمھارا ہی دھیان کوٹھے پر
خدا کے واسطے اتنا تو جھوٹ مت بولو　　کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسمان کوٹھے پر

کمند زلف کی لٹکا کے اس صنم نے نظیرؔ
چڑھا لیا ہے مجھے اپنے نیدان کوٹھے پر

کوٹھا

رہے جو شب کو ہم اس گل کے ساتھ کوٹھے پر　　تو کیا بہار سے گزری ہے رات کوٹھے پر

یہ دھوم دھام رہی صبح تک آ ہا ہا ہا
کسی کی اُتری ہے جیسے برات کوٹھے پر

مکان جو عیش کا ہاتھ آیا غیر سے خالی
پٹے کے چلنے لگے پھر تو ہات کوٹھے پر

گرایا، شور کیا، گالیاں دیں، دھوم مچی
عجب طرح کی ہوئی واردات کوٹھے پر

لکھیں ہم عیش کی تختی کو کس طرح اے جاں
قلم زمین کے اوپر دوات کوٹھے پر

کمند زلف کی لٹکا کے دل کو لے لیجئے
یہ جنس یوں نہیں آنے کی ہات کوٹھے پر

خدا کے واسطے زینے کی راہ بتلاؤ
ہمیں بھی کہنی ہے کچھ تم سے بات کوٹھے پر

لپٹ کے سوئے جو اُس گُل بدن سے کوٹھے پر
تمام ہوگئیں حل مشکلات کوٹھے پر

بہار

گلشن عالم میں جب تشریف لاتی ہے بہار
رنگ و بو کے حسن کیا کیا کچھ دکھاتی ہے بہار

صبح کو لاکر نسیم دلکشا ہر شاخ پر
تازہ ترگس کس طرح کے گل کھلاتی ہے بہار

نونہالوں کی دکھا کر دمبدم نشو و نما
جسم میں روح درواں کیا کیا بڑھاتی ہے بہار

بلبلیں چہکارتی ہیں شاخ گل پر جا بجا
بلبلیں کیا فی الحقیقت چہچہاتی ہے بہار

حوض و فوارں کو دے کر آبرو پھر لطف سے
کیا مُطرّا فرش سبزے کا بچھاتی ہے بہار

جنبش باد صبا سے ہو کے ہم دوش نشاط
ساتھ ہر سبزے کے کیا کیا لہلہاتی ہے بہار

خلق کو ہر لحظہ اپنے حسن کی رنگت دِکھا
بے تکلف کیا ہی ہر دل میں سماتی ہے بہار

مجمعِ خوباں ہجوم عاشقاں اور جوشِ گُل
دیکھ ان رنگوں کو کیا کیا کھلکھلاتی ہے بہار

گُل رخوں کی دیکھ کر گل بازیاں ہر دم نظیرؔ
گُل ادھر خنداں، ادھر دھومیں مچاتی ہے بہار

آگرہ

رکھتا ہے گو قدیم سے بنیاد آگرہ — اکبر کے نام سے ہوا آباد آگرہ
یاں کے کھنڈر بنا اور جگہ کی عمارتیں — یارو عجب مقام ہے دل شاد آگرہ
شداد زر لگا نہ بناتا بہشت کو — گر جانتا کہ ہووے گا آباد آگرہ
توڑے کوئی قلعے کو کوئی لوٹے شہر کو — اب کس سے اپنی مانگے بھلا داد آگرہ
اب تو ذرا سا گاؤں ہے بیٹی نہ دے اسے — لگتا تھا ورنہ چین کا داماد آگرہ
ایک بارگی تو اب مجھے یارب تو پھر بسا — کرتا ہے اب خدا سے یہ فریاد آگرہ
ایک خوبرو نہیں ہے یہاں ورنہ ایک دن — تھا رشک حسن بلخ و نوشاد آگرہ
ہرگز وطن کی یاد نہ آوے اسے کبھی — جو کرکے اپنی جان کو کرے شاد آگرہ

اس میں سدا خوشی سے رہا ہے ترا نظیر
یارب ہمیشہ رکھیو تو آباد آگرہ

پری

رخ پری، چشم پری، زلف پری، آن پری — کیوں نہ اب نام خدا ہو ترے قربان پری
جھلکے جھمکے وہ ثریا کے، کرن پھول، وہ پھول — بندے بالے پری، موتی پری اور کان پری
رشکِ خورشید جبیں، ابر سیہ سی پٹی — لہر چوٹی کی غضب، زلف پریشان پری
حسن گلزار، قمر شکل، صراحی گردن — مہ جبیں، سیب ذقن، چاہِ زنخدان پری
مار غمزے کی بلا، تیر نگہ، دشت سناں — تیغ ابرو کی ستم، ترکشِ مژگان پری

مسکرانے کی ادا جیسے چمک بجلی کی   آن ہنسنے کی قیامت، لب و دندان پری
آنکھیں مستی کی بھری شوخ نگاہیں چنچل   لہر کاجل کی کھچاوٹ، مسی و پان پری
بینی و نتھ کا وہ عالم کہ چھدے دل جس سے   جو رجنی کی جھلک گوہر غلطان پری
چاک سینے کا غضب صاف بدن موتی سا   انگیا تصویر سی، کرتی کا گریبان پری
دھگدھگی چاند سی، جگنو بھی ستاروں کی مثال   توڑے، زنجیر تماشا وہ عطردان پری
پشت گلبرگ، شکم سیم، کمر تار نگاہ   ساق بلور، گلاوٹ میں ہر اک آن پری
گھیر اپشواز کا وہ جس کے کنارے قربان   چال آفت کا نشان، جنبش و دامان پری

کیا کہوں اس کے سراپا کی میں تعریف نظیر
قد پری، دھج پری، عالم پری اور شان پری

بسنت

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دلکشائی   ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جان بسنت آئی
سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر   پوشاک زرفشانی اپنی وہیں رنگائی
جب رنگ آئی اس کی پوشاک پُر نزاکت   سرسوں کی شاخ پُرگل پھر جلد اک منگائی
اک پنکھڑی اٹھا کر نازک سی انگلیوں میں   رنگت کو اس کی اپنی پوشاک سے ملائی
جس دم کیا مقابل کسوت سے اپنے اس کو   دیکھا تو اس کی رنگت اس پر ہوئی سوائی
پھر تو بصد مسرت اور سو نزاکتوں سے   نازک بدن پہ اپنے پوشاک وہ کھپائی
چمپے کا عطر مل کر موقع سے پھر خوشی ہو   سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی
بن ٹھن کے اس طرح سے پھر راہ لی چمن کی   دیکھی بہار گلشن بھر طرب فزائی

جس جس روش کے اوپر جا کر ہوا نمایاں   کس کس روش سے اپنی آن و ادا دکھائی
کیا کیا بیاں ہو جیسے   وہ زرد پوشی اس کی وہ طرز دلربائی
صد برگ نے صفت کی نرگس نے بے تامل   لکھنے کو وصف اس کا اپنی قلم اٹھائی
پھر حسن میں چمن کے آیا بہ حسن خوبی   اور طرفہ تر بسنتی اک انجمن بنائی
اس انجمن میں بیٹھا جب ناز و تمکنت سے   گلدستہ اس کے آگے ہنس ہنس بسنت لائی
کی مطربوں نے خوش ہو آغاز نغمہ سازی   ساقی نے جام زریں بھر بھر کے مے پلائی
دیکھ اس کو اور محفل اس کی نظیر ہر دم
کیا کیا بسنت آکر اس وقت جگمگائی

دوالی

دوستو کیا کیا دوالی میں نشاط و عیش ہے   سب مہیا ہے جو اس ہنگام کے شایاں ہے شے
اس طرح ہیں کوچہ و بازار پر نقش و نگار   ہو عیاں حسن نگارستان چیں کی جن سے رے
گرمجوشی اپنی با جام چراغاں لطف سے   کیا ہی روشن کر رہی ہے ہر طرف روغن کی مے
مایل سیر چراغاں خلق ہر جا دمبدم   حاصل نظارۂ حسن شمع رویاں پے بہ پے
عاشقاں کہتے ہیں معشوقوں سے با عجز و نیاز   ہے اگر منظور کچھ لینا تو حاضر ہیں روپے
گر مکرر عرض کرتے ہیں تو کہتے ہیں وہ شوخ   ہم نہیں لیتے میاں تکرار و حجت تا بہ کے
کہتے ہیں اہل قمار آپس میں ہو گرم اختلاط   ہم تو ڈب میں سو روپے رکھتے ہیں تم رکھتے ہو کے
جیت کا پڑتا ہے جس کا داؤں وہ کہتا ہے لو   سوئے دست راست ہے میرے کوئی فرخندہ پے
ہیں وے شہر میں بھی یوں تو زینت و فرحت نظیر   پر دوالی بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے

خربوزے

اب تو بازار کے ہیں زیب فزا خربوزے — ہیں جدھر دیکھو اُدھر جلوہ نما خربوزے
قند و مصری کی حلاوت تو عیاں ہے لیکن — قند و مصری کے بھی ہیں ہوش رُبا خربوزے
دلکش اتنے ہیں کہ بازار میں لینے تربوز — گر کوئی جاوے تو لاتا ہے تلا خربوزے
ناشپاتی کو لگا کر اگر امرود و انار — ہوں مقابل تو اُنھیں گنتے ہیں کیا خربوزے
سو بڑھل لے کے کٹھل بھی اگر آوے چل کر — اپنے ایک قاش سے دیں اس کو ہٹا خربوزے
قطعہ
یار آیا تو کہا ہم نے منگا دیں لڈّو — ہنس کے اس شوخ شکر لب نے کہا خربوزے
کھِنیاں فالسے منگوادیں تو جھنجھلا کے کہا — پوچھتے کیا ہو، تمھیں کہہ تو دیا خربوزے
ہم نے دیکھا کہ ادھر رغبت خاطر ہے بہت — حکم کرتے ہی دیے ڈھیر لگا خربوزے
چھو لیا سیب ذقن کو تو کہا واہ چہ خوش — تم نے منگوائے اسی واسطے کیا خربوزے
اب کے تنفتالوئے لب سے کوئی لو گے بوسہ — اچھی حرفت کو لئے تم نے منگا خربوزے

شکریں میوے ہوں اور سب کو بہم پہنچیں بہت
سو نظیر ایسے تو تربوز ہیں یا خربوزے

سمدھن

سراپا حسن سمدھن کا گویا گلشن کی کیاری ہے — پری بھی اب تو بازی حسن میں سمدھن سے ہاری ہے
کھنچی کنگھی، گندھی چوٹی، جمی پٹی، لگا کاجل — کماں ابرو، نظر جادو، نگہ ہر ایک دولاری ہے
جبیں مہتاب، آنکھیں شوخ، شیریں لب، گہر دنداں — بدن موتی، دہن غنچہ، ادا ہنسنے کی پیاری ہے

نیا کمخواب کا لہنگا، جھمکتی تاش کی انگیا
کچیں تصویر سی جن پر لگا گوٹا کناری ہے

ملایم پیٹ مخمل سا، کلی سی ناف کی صورت
اٹھا سینہ، صفا پیڑو، عجب جوبن کی ناری ہے

سرین نازک، کمر پتلی، خط گلزار روما دل
کہوں کیا آگے اب اس کے مقام پردہ داری ہے

لٹکتی چال مدھ ماتی، چلے بچھوں کو جھنکاتی
ادائیں دل لئے جاتی، عجب سمدھن ہماری ہے

بھرے جوبن پہ اتراتی جھمک انگیا کی دکھلاتی
کمر لہنگے سے بل کھاتی، لٹک گھونگھٹ کی پیاری ہے

تمھیں کیا ہے خبر اس بات کی سنتے ہو سمدھی جی
ہمیں سمدھن کی خدمت میں بہت مدت سے یاری ہے

ہنسے بولے ہوا دل شاد بوسے بھی لئے ہم نے
مگر اس عین مطلب کی رہی امیدواری ہے

لکھی تو نے نظیر ایسی غزل، اب وصفِ سمدھن میں
مصور نے گویا تصویر نک سُک کی اُتاری ہے

سمدھن

کروں کس منہ سے اب یارو بیاں میں شان سمدھن کی
لگی ہے اب تو میرے دل کو پیاری آن سمدھن کی

چمن میں حسن کے ہوں اس کے رخ اور زلف پر قرباں
اگر دیکھیں ذرا صورت گل و ریحان سمدھن کی

کمر نازک، مٹکتی چال، آنکھیں شوخ، تن گورا
نظر چنچل، ادا اچپل، یہ ہے پہچان سمدھن کی

سنہری تاش کا لہنگا، روپہلے گوٹ کی انگیا
چمکتا حسن جوبن کا جھمکتی آن سمدھن کی

ملائی سا شکم، سینہ مصفا، خوش نما ساقیں
صفا زانو کا آئینہ، ملایم ران سمدھن کی

کہوں کچھ اور ابھی آگے جو سمدھن حکم فرما دیں
صفت منظور ہے ہم کو تو اب ہر آن سمدھن کی

بڑا احسان مانیں ہم تمھارا آج سمدھی جی
میسر ہو اگر صحبت ہمیں ایک آن سمدھن کی

ہمیں ایک دو گھڑی کے واسطے دو ملا دو تم
جو کچھ لہنگے کے اندر چیز ہے پنہان سمدھن کی

نظیر اب آفریں ہے یار تیری طبع کو ہر دم
کہی تعریف تو نے خوب عالی شان سمدھن کی

موتی

پری زادوں میں ہے نام خدا جس شان کے موتی ۔۔۔ کوئی ایسا نہیں موتی مگر موتی مگر موتی
جھمک جاوے نگاہوں میں جواہر خانۂ قدرت ۔۔۔ جو کھا کر پان اور مل کر مسی ہنس دے اگر موتی
رگ گل اس کمر کے سامنے بھرتی پھرے پانی ۔۔۔ لچک میں اور نزاکت میں جو رکھتی ہے کمر موتی
ادھر ہر ایک مکاں پر موتیوں کے ڈھیر ہو جاویں ۔۔۔ ادا سے ناز سے ہنس کر قدم رکھے جدھر موتی
صدا سن کر ہر ایک کی چشم سے موتی ٹپکتے ہیں ۔۔۔ فقط بیٹھے ہی گانے میں یہ رکھتی ہے اثر موتی
عجب نقشہ عجب سج دھج غضب آنکھیں عجب نظریں ۔۔۔ بڑے طالع بڑی قسمت جو دیکھے اک نظر موتی
شرف دیتے کو بیٹے پر شرف ہیرے کو ہیرے پر ۔۔۔ شرف شرفن کو لعلوں پر رہے جس کے گھر موتی
ہر ایک دندان موتی حسن موتی نام بھی موتی ۔۔۔ سراپا چشم موتی اس پہ پہنے سر بسر موتی

جو خوبان بے نظیر اس دور میں ہیں نازک و رنگیں
شرف رکھتی ہے یار و اب تو سب کے حسن پر موتی

آرسی

قطعہ

بنوا کے ایک آرسی ہم نے کہا کہ لو ۔۔۔ پکڑی کلائی اس کی جو وہ شاخسار سی
لے کر بڑے دماغ سے اور دیکھ یک بہ یک ۔۔۔ تیوری چڑھا کے ناز میں کچھ کر کے عار سی
جھنجھلا کے دور پھینک دی اور یوں کہا چہ خوش ۔۔۔ ہم مارتے ہیں ایسی انگوٹھے پہ آرسی

چند تضمین و مستزاد

خمسہ بر غزل سعدی

کل ہم جو گئے باغ میں ٹک لطف اٹھانے اور دل کو لگے سیر گلستاں کی دکھانے
اتنے میں کہوں کیا تجھے اے یار یگانے بربود دلم در چمنے سرو روانے
زرّیں کمرے، سیم برے، موئے میانے

وہ شوخ کہ عالم میں نہ دیکھا ہو کسی نے وہ حسن کہ جس نے حور نے پایا نہ پری نے
کیا تجھ سے کہوں اس کی میں خوبی کے قرینے خورشید رُخے، ماہ وشے، زُہرہ جبینے
یاقوت لبے، سنگ دلے، تنگ دہانے

گلفام، گل اندام، دلارام، نکوئے دلدار، دل آزار، جفا کار دو رُوئے
آہو صفتے، کبک تگے، عنبریں موئے بیداد گرے، کج کلہے، عربدہ جوئے

شکر شکنے، تیر قدے، سخت کمانے

ابرو خم طاق حرم و زلف کنشتے   قد رنج دل طوبیٰ و رخ رشک بہشتے
تل نقش سویدائے دل و خط لب کشتے   جادو نظرے، عشوہ گرے، حسن سرشتے

آسیب دلے، رنج تنے، آفت جانے

وہ رخ کہ ہر اک شوخ پریزاد کو شہ دے   وہ زلف کہ سنبل جسے بیتاب ہو کہہ دے
گر حور بھی دیکھے تو اُسے جان میں رہ دے   عیسیٰ لئے نشتر رہے، یوسف عہد ے

جم مرتبہ، تاجورے، شاہ جہانے

شمشیر نگہ، تیرہ مژہ قاتل خلقے   غارت گر و برباد دہ حاصل خلقے
مشہور جہاں، فتنہ جاں، مقبل خلقے   تنگ شکرے، چوں شکرے در دل خلقے

شوخے، نمکینے، چو نمک شور جہانے

کیا اس کی میں تعریف کہوں حسن ادا کی   ہے ختم دو عالم کی اُسی شوخ پہ خوبی
پھر مثل نظیر اس بت رعنا سے لگا جی   بے زُلف و رُخ و لعل لب او شدہ سعدی

آہے، دُبخارے، و غبارے، و دخانے

خمسہ بر غزل خسرو

کب لالہ و گل کرسکیں عارض سے تیرے ہمسری   قد سے خجل سرو سہی، رفتار سے کبک دری
محبوب تجھ سے سیکھ لیں ناز و ادا و دلبری   اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری

ہر چند وصفت می کنم، در حسن زاں زیباتری

ہے شور تیرے حسن کا لے کر زمیں سے چرخ تک   دل اُن ات صورت کو تری شمس و قمر تکتے ہیں تک

دیکھے ہے جو تیرے تئیں کہتا یہی ہے یک بہ یک   تا نقش می بندد فلک کس را نہ داد است این نمک
حورے نہ دانم یا ملک فرزند آدم یا پری

تیرا رخ اے رعنا صنم بھر کر نظر دیکھے ہے جو   کھو دین و ایماں کے تئیں باندھے ہے وہ زنار کو
دیوانے تیرے عشق میں دل سے نہیں کچھ ایک دو   عالم ہمہ یغمائے تو خلقے ہمہ شیدائے تو
ایں نرگس شہلائے تو آورد رسم کافری

ہے خلق و خوبی میں بھرا اس طور سے وہ نازنیں   بہزاد و مانی دیکھتے تو ہوتے وہ حیرت قریں
گر اس بیاں کے راست کا آتا نہیں تجھ کو یقیں   صورت گر نقاش چیں ر و صورت یارم بہ بیں
یا صورتے کش ایں چنیں یا ترک کن صورت گری

ہیں خلق میں ہر سو عیاں رنگیں ادا زیبا صنم   گلگوں قبا، نازک بدن، نوزیب و زینت سے بہم
کی غور تو سچ ہے یہی مجھ کو محبت کی قسم   آفاق را گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

آیا نظر جس روز سے تجھ سا شکر لب مہ لقا   ابرو کماں، جادو نظر، شیریں سخن، در عشوہ را
اپنے وطن کو چھوڑ کر مثل نظیر مبتلا   خسرو غریب ست و گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

خمسہ بر غزل حافظ

کہاں وہ کیقبادی کارخانہ   کہاں وہ مے، وہ جام خسروانہ
کہوں کیا تجھ سے اے یار یگانہ   سحر گاہانہ مخمور شبانہ
گرفتم بادہ، با چنگ و چغانہ

پڑا جب گوش میں وہ نالہ نے توسوجھی اور ہی عالم کی اک شے
ہوئی مستی نہ مدہوشی جو در پے نہادم عقل را رہ توشہ از مے

بہ ملکِ عاقبت کردم روانہ

کیا پہلے ہی ساغر نے یہ دل شاد کہ سر اپنا رہا مجھ کو نہ یا یاد
تو مجھ کو کر کے اک ایک جام امداد نگارے می فروشم عشوہ داد

کہ ایمن گشتم از مکرِ زمانہ

ہوا جب میں نہایت شاد و خرم تو رکھ کر سر قدم پر اس کے ہر دم
کہا میں نے اسے اے ساقی جم بہ دہ کشتی مے تا خوش سرایم

دریں دریائے ناپیدا کرانہ

کیا ہے گر مجھے منزل سے محرم تو رستے میں نہ چھوڑا اے خضر عالم
کہا جب میں نے یہ نکتہ تو اس دم رساقی کماں ابرو شنیدم

کہ اے تیرِ ملامت را نشانہ

یہ رہ باریک ہے اور تو ہے فربہ کماں اس عزم کی ہر گز نہ کر زہ
گماں وہ وہم کی جا گہ نہیں یہ بر و ایں دام بر مرغ دگر نہ

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اگر ہے تجھ کو اس رہ سے سرو کار تو ہو سب ما سوا سے تارک اے یار
نہ رکھیو بیخودی کی کچھ خبر دار نہ بندی زاں میاں طوقِ کمر دار

اگر خود را نہ بینی در میانہ

وہی عاشق وہی معشوق دلجو ست وہی بو اور وہی مغز اور وہی پوست

وہی جامی، وہی دشمن وہی دوست — شراب و شاہد و ساقی ہمہ اوست
خیالِ آب و گِل در رہ بہانہ

نظیرؔ اب چوں تو شیدائیست حافظ — تن خاکی عجب جائیست حافظ
نہ دریا و نہ صحرائیست حافظ — وجود ما معمائیست حافظ
کہ تحقیقش فسون است و فسانہ

خمسہ بر غزل خود

قمر خجل ہوا خوں کی تھلک نہ دیکھ سکا — سنہرے رنگ کی کندن ڈلک نہ دیکھ سکا
گہر بھی لب کے مسی کی ڈھلک نہ دیکھ سکا — ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا
کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا

ترے الم میں نہ ہو دخل سو مہورت کو — نہ ہمسری ہو کبھی صاف سے کدورت کو
ملاپ تجھ سے کہاں آب و گل کی صورت کو — تو وہ ہے نور سراپا کہ تیری صورت کو
بشر تو کیا ہے مری جاں ملک نہ دیکھ سکا

غم فراق میں جینے سے ہم جو اکتائے — ندان یار کے کوچے میں جا کے کام آئے
تو واں بھی ذرے ہمارے ہوانے اڑوائے — گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے
ہمیں تو آہ فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا

ہوا ہوں سوکھ کے کانٹا میں ہجر میں درد — نہ بال اور نہ کمر اب مرے مقابل ہو
کمال ضعف کا اپنے میں کیا کہوں یارو — یہ ناتواں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو
تو صورت اس کی اٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا

پڑا ہے آہ مجھے جب سے شوخ سے پالا　　نہ جی کو چین ہوا اور نہ دل نے سکھ پایا
لگا لگا کے نگاہوں کا تیر اور بھالا　　گھڑی تو دل کو پرویا گھڑی جگر چھیدا
کبھی خوشی وہ مجھے ایک پل نہ دیکھ سکا

ابھی تو آہ خموں میں شراب ہے باقی　　سبھوں کی عیش کی یاں ہو رہی ہے بیباقی
ہمارے یار کو ظالم یہ چین مشتاقی　　لگا گھٹا نے جواب مے کو دمبدم ساقی
ہمارے جام کی شاید جھلک نہ دیکھ سکا

کبھی ادھر کو جو قاصد ترا گزر ہووے　　وپا کہ راہ میں جاتے کہیں تجھے وہ ملے
تو آہ بھر کے یہ کہیو تو اس پری رو سے　　نظیرؔ تجھ سے نہ ہوتا، کبھی جدا پیارے
مگر یہ عشق، حسد سے فلک نہ دیکھ سکا

خمسہ بر غزل سراجؔ

کھلی جب کہ چشم دل حزیں تو وہ نم رہا نہ تری رہی　　ہوئی حیرت ایسی کچھ آن کر کہ اثر کی بے اثری رہی
پڑی گوش جاں میں عجب ندا کہ جگر نہ بے جگری رہی　　خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو، تو رہا نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

ہوئیں کیا ہی دل کو فراغتیں گئی جب سے قید لباس کی　　نہ ہوائے اطلس و گلبدن، نہ تلاش بادلہ و زری
کوئی پہنوا کہ نہ پہنوا، غرض اس کو جانے بلا مری　　شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

کسی وقت مکتب عقل میں بہت علم ہم نے بھی تھا پڑھا　　کہ ہر اک سے حجت و بحث تھی سو اس علم کا یہ کمال تھا
گیا جب کہ مدرسہ عشق میں تو اب آ گئے یار و کہوں میں کیا　　وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا

کہ کتاب عقل کی طاق میں جو دھری تھی وو وہیں دھری رہی

ترے منہ پہ اب تو ہے وہ جھلک کہ جہاں تو جا کے نہاں ہوا   اگر آفتاب جمال تھا، تجھے دیکھ وہ بھی نہاں ہوا
کوئی آگے تیرے نہ آسکا وہ قمر کہ مہر نشاں ہوا   ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر تو عیاں ہوا

کہ نہ آئنے میں جلا رہی، نہ پری کی جلوہ گری رہی

عجب اتفاق ہے خود بخود مرے دل سے عشق نکل گیا   پڑی آگ غم کی وہ تن میں آکے بہ رنگ شمع پگھل گیا
اُدھر آہ شعلہ زناں ہوئی ادھر اشک آنکھوں سے ڈھل گیا   چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا

مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

کرے عشق اب وہ جہاں میں کہ جنوں سے بیٹھے وہ ہاتھ دھو   نہ کسی کے ڈر سے چھپے کہیں نہ کسی کے خوف سے دیوے د
اسے کچھ کسی کی خبر نہیں ہوا اب تو مثل نظیر وہ   ترے درد عشق میں اے میاں دل بنو اے سراج کو

نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

مستزاد

ساقی مری آغوش میں ہے آج وہ دلبر، یہ وصل کی ہے شب
جلدی سے گلابی سے گلگوں کی اٹھا کر، بھر جام لبالب
عطر و گل و رقص و شب مہتاب و لب بام، اور مجمعِ خوباں
اسباب جو ہیں فرحت و عشرت کے سراسر، اس وقت وہ ہیں سب
سینے میں تری لب میں ہنسی، جان میں شادی، نظروں میں بہاریں
آنکھوں میں نشے دل میں خوشی، ہم میں تمن، کیا عیش ہیں مطلب
رنگین در و دیوار ہیں اور صحن میں ہر جا، ہیں ڈھیر گلوں کے
اس حسرت گلزار کے آنے سے مرا گھر، ہے رشک چمن اب

ساقی کی ادا دل کو اُدھر کھینچے ہے کیا کیا، ہر جام کے ہمراہ
چھینیں ہیں ادھر صبر و خرد ناز سے ہنس کر محبوب تبسم لب

مدت سے نظیرؔ عشق کی سرکار سے، بارے، طالع کی مدد سے
عشرت کی ہوئی ہے مری جاگیر مقرر، اور عیش کا منصب

مستزاد

کرتا ہے نگاہوں کو ترا مطلع انوار، یہ مہر فزا رُخ
کس کا ہے بتا نام خدا ایسا جھمک دار، اے تیرے سوا رُخ

دل تڑپے ہے اور آنکھیں کھلی رہتی ہیں دن رات فرقت کے الم سے
وہ کون سا دن ہوگا مبارک جو ہم اے یار، دیکھیں گے ترا رُخ

مہتاب کی کیا تاب جو ہو تیرے مقابل، اے رشک مہ و مہر
خورشید بھی دیکھے جو تیرے منہ کو تو یک بار چھپ جاوے ترا رُخ

مدت سے ترستے ہیں ترے دیکھنے کو ہم، ڈر کچھ تو خدا سے
زلفوں کے تئیں کھول کے اے دلبر عیار مت ہم سے چھپا رُخ

آئینہ ترے دیکھ کے عارض کی صفائی رہ جاتا ہے حیران
رکھتا ہے ترا حسن میں اے حسرت گلزار، یہ حسن صفا رُخ

اتنا کوئی کہتا نہیں اس شوخ سے جا کر، افسوس صد افسوس
مرتا ہے ترے ہجر میں ایک طالب دیدار، ٹک اس کو دکھا رُخ

کیونکر نہ بھلا دیجئے کو دل دیجئے نظیرؔ آہ، ہو حسن میں جس کا
لب روح فزا، عشوہ ستم، ناز فسوں کار اور ہوش ربا رُخ

فرهنگ

فرہنگ

۱ - الٰہی نامہ

ٹھاٹھ - سامان - انتظام
ہو حق - نیست نابود - فنا فی اللہ
خبیثات - بد روحیں
سماوات - آسمان

کشف - پوشیدہ حالات جاننا
کرامات - خلاف عادت باتیں کرنا معجزہ
مستور - پوشیدہ
خسرہ - پٹواری کا کاغذ - سند

زنار - جنیو
قلندر - آزاد
گھاتے - مشہور
آگے - پیشتر

طور - قسم
وثاقی - وفادار
ٹک - ذرا
ایہام - ایک صنعت شعر کا نام ہے۔

۲ - برسات کی بہاریں

ڈابر - چشمے
ڈونڈ - جوش مارنا
امنڈ - جمع ہو کر غل کرنا
جھڑ - پیہم برسنا

گھمنڈ - یکجا ہونا - جمع ہونا	سوگن - فرقت زدہ	جنگلے - جنگل	گھلاوٹ - حسن
ٹکوریں - ٹکڑیں	برہ - دردِ فرقت	سنگ - ہمراہ	چھک - بدمست
ملار - برسات کا گیت	برہن - مہجور عورت	اسارا - چھپر کا دالان	گھوئی - بورئے کی چادر
زٹل - بیہودہ آواز	سُدھ - خبر	دوانا - پاگل - دیوانہ	نکھٹو - نالائق
سیج - بستر	امڈی - بھری	اٹاری - چھپر کا بالاخانہ	سنگے - پاس
سوہین - زیب دینا - سرخ	ماروجی - جنگجو - عاشق	ندان - آخرکار	رت - موسم
ابرن - پوشاک	رین - رات	کیڑا - سانپ	اکس - اٹھنا

۲- بنجارہ نامہ

بدیس - پردیس	دھن - دولت	دھی پوت - ہونہار فرزند	گڑھ - چھوٹا قلعہ
گونیں - جمع ہے گون کی بہ معنی بدری بوری	ناتی - نواسہ	جنوائی - داماد	رہکلہ - چھوٹی توپ
پلا - تھیلا، ترازو کا پلا	ڈنڈا - لاؤ لشکر	کھپنی - تباہ ہونی - برباد ہونی	دائی - دودھ پلانے والی رضاعی ماں
سربھارا - سر پر رکھنے کا تھیلا	بھانڈا - بھرم، دکھاوٹ کا سامان۔	چوپاری - بالاخانے کا کمرہ جس میں چار کھڑکیاں ہوں۔	ددا - کھلانے والی
لکھی - لکھ پتی	کھانڈا - غالباً کسی پرانے ہتیار کا نام ہے۔	بان - تیر	چیلا - شاگرد
جیترا - بہتر	نایک - سپاہی - جان - روح	تاش تمامی - ایک قدیم کپڑا	بُھنگا - چھوٹے سے چھوٹا کیڑا -
داکھ - کشمش	بانڈا - سیاح - پھرنے والا	کوٹ - عمارت - محل	
کیسر - زعفران	ڈھل - گر پڑنا	رند - دیوار قلعہ کے موکھے	

۴ - عاشق نامہ

نیرنگ - عجائبات
نت - ہمیشہ
رامیل - رائے بیل
سیل - نام ہتھیار، بھاری بوجھ
حال - عالم بیخودی، وجدان
حرم - کعبہ، مسجد

پوتھی - مقدس کتاب
سماچار - حالات، روایات، مذہبی
وار - اس کنارے پر
سمرن - تسبیح
بھوگی - عیاش، غنی
سوگی - مہجور، فرقت زدہ

بیکنٹھ - جنت
دیوات - بقول شہباز غالباً یہ ریوات ہے جس کے معنی بلندی اور ٹیلہ ہیں
سکنات - خموشی، سکون
مرگانک - کشتہ

جیب - زبان
دانگ - مال، سہارا
تھانگ - نقب
مایا - طلسم خیال

۵ - آدمی نامہ

بے نوا - محتاج
گیاتا - مشہور
برملا - کھلم کھلا
حسن - نیکی، اچھائی

قبح - عیب
زور - فریب، چالاکی، ریا
ہادی - رہنما
امام - پیش نماز، پیشوا

تاڑنا - پہچاننا، بھانپنا
نقیب - اعلان کرنے والا
چاکر - نوکر
مزور - مزدور

جاضرور - پاخانہ
دائرے - مجیرے
شنگ - طرحدار
مرید - شاگرد

۶ - ہنس نامہ

سمنبر - سفید رنگ
طور - قسم
سنوارا - بنایا، سجایا

چاہت - محبت
چنگ - ایک ایرانی باجے کا نام ہے
سیمرغ - رخ، ہما، عنقا، موسیقار

ققنس کی طرح رومان کا پرند ہے۔
مدارا - خاطر مدارات

برٹنگے - بڑی ناک کا ایک پرند
غش - بہوت
لکھی - پسند آئی

چھانپو - شہر پیلی، ایک گاؤں کا نام ہے	وارا - نثار کیا	پنکھ - پر	رے - کیفیت - حالت
جھپ - فوراً	پیت - محبت	پسارا - پھیلایا	نرباد - تباہ
بھری - بہبودی	سہارا - برداشت کیا	کرارا - مضبوط	سدھارا - روانہ ہوا

۷۔ روضۂ تاج گنج

گمزیاں - چھوٹے گنبد	باس - خوشبو	سہاگ - تازگی، شگفتگی	سروہی - سیدھے سرو
اساس - مضبوط	مجھر - جالیاں	مجلی - چکیلا	شکر شکن - خوش آواز

۸۔ تندرستی نامہ

حرمت - عزت	میری - سرداری	بنے ٹھنے - خوبصورت سجے ہوئے	تن - بدن
سدا - ہمیشہ	عین - مخصوص	بنے - دولھا	کل - مشین
چلن - چال چلن	سربسر - بالکل	وونہیں - فوراً، اسی دم	کل - آرام
تئیں - واسطے، کو، لئے	تباہ - بسر اوقات	سو - وہ	چل بچل - بیکار

۹۔ ذکر مُرغان

بھتوں - خدا	بیچوں - خدا، جس کے وجود میں کوئی شک و شبہ نہیں	کلپتے - تڑپتے، بے چین ہوتے ہیں -	سوہی - سرخ
سانجھ - شام	تپنے - جلنے	جپتے - دہراتے	تخم - بیج
سویرے - صبح		دادر - مینڈک	پنکھی - پرند

۱۰۔ فنا نامہ

افسر۔ تاج
سرور۔ سردار
دُہائی۔ حکومت
مورچہ۔ محفوظ مقام، قلعہ
سنگر۔ لشکر
جھپاں۔ ایک قسم کی عماری پالکی۔
میگ ڈنبر۔ ایک قسم کی گاڑی۔
مہر چھاپا۔ حکم، عمل
فوجدار۔ افسر پولیس کا عہدہ دار
کٹک۔ زبان مارواڑی میں لشکر کو کہتے ہیں۔
خاصہ۔ مخصوص
جلیب۔ چلنے والا
مرمر۔ بدشکل
لبیدہ۔ سونٹا، آلہ سزا
مردھا۔ مردہہ، دس جوان کا افسر ایک عہدہ دار جو سرکار کی طرف سے دیہاتیوں پر مقرر کیا جاتا ہے
چیرہ۔ ایک قسم کا صافہ
جمدھر۔ ایک قسم کا خنجر
خود۔ لڑائی کے وقت سر پوشش۔
سلاح۔ ہتھیار
بکتر۔ زرہ، لوہے کا بنا ہوا جامہ
گنڈا۔ بدمعاش شہدا
بانکا۔ رنگیلا سپاہی، دعویدار
سپر۔ ڈھال
بچارے۔ سوچے
سبد۔ شبد، نانک شاہیوں کی اصطلاح میں گیت کو کہتے ہیں۔
وید۔ اہل ہنود کی مقدس کتاب یہ چار ہیں۔
پران۔ ہنود کی ایک مقدس کتاب کا نام ہے۔
مشعر۔ عالم
نویلے۔ نئے
جنگم۔ ایک قسم کا فقیر جن کے سر پر جٹائیں ہوتی ہیں اور ہاتھ میں سونٹا۔
سیوڑا۔ جین مذہب کا فقیر
جٹا۔ بالوں کا گچھا۔
بانکا۔ چیلا
گبر۔ آتش پرست
نقاش۔ صورت گر

۱۱۔ طفی

منت۔ مراد
ڈول۔ ڈیلے، ہر طرح
بگڑنا۔ خفا ہونا
گھرنا۔ قید
اوٹتے۔ پھیلاتے
کھسوٹتے۔ کھینچتے
سلونا۔ نمکین
بھونپو۔ منہ سے بجنے والا باجا

١٢- جوانی

ڈنگ - حیران
پھندے میں - گرفتار
معجون - نشہ کی ایک شے ہے
گل - زخم
سین - اشارہ آنکھ کا اشارہ
نین - آنکھ
سیف - تلوار
چاؤ - آؤ بھگت، خوشی
بھاؤ - نرد کرنا
چھل بل - غمزے، ادائیں
جوں - مثل
پن - زمانہ، عالم

١٣- بڑھاپا

کنے - پاس
ردکھ - درخت
پت جھڑ - خزاں
ادھورے - بیکار، لاچار، اپاہج
لنڈورے - بے دم
پھکڑی - نصیحت
مت - عقل
جگت - پھبتی
لگاوٹ - محبت، تعلق
چاہت - محبت
لت - عادت
ڈھاک - ایک ہندوستانی
پیڑ کا نام ہے۔
پات - پتر
بھبوکے - سفید، گورے
چاؤ - محبت، نوازش

١٤- فقیروں کی صدا

بٹ مار - رہزن
بس - قابو
من - طبیعت، قلب، دل
بلج چکا - بیچ چکا
پُن - خیرات
دان - خیرات
بھاجی - مرنے کا کھانا جو
اعزّا کرتے ہیں۔
ناکند - وحشی، بدلگام
ہلکان - پریشان، نیم جان
پژمردہ
لابھ - دلچسپی، حرص
کرنی - افعال، اعمال
سُکھ - آرام
جُنبتی - گھگھیاتی
آنند - آرام
پھند - مکر و فریب
ارتھی - جنازہ
ہستی - ہاتھی
اسواری - سواری

١٥۔ خوشامد

ڈھب ۔ ڈھنگ، انداز	بچ ۔ اندر	آشنا ۔ شناسا	پیر ۔ مرشد، ولی
	سروکار ۔ تعلق	خرابی ۔ بدمست	

١٦۔ کلجگ

کرجگ ۔ جائے عمل، جائے مکافات	پرکھیا ۔ تنقید، پرکھ، پہچان	چیتے ۔ چاہیے	طوفان ۔ بہتان
	تل تل ۔ ذرہ، ذرہ	کل ۔ آرام، چین	جاگہ ۔ جگہ، مقام
بسیکھا ۔ شمار	لیکھا ۔ تحریر	کلپا دے گا ۔ دکھ دے گا	ہانک ۔ خوف، ہشیاری
تس ۔ اس	پڑا ۔ محمد	آن ۔ ذرا سی دیر	

١٧۔ مفلسی

جتاتی ۔ شرمندہ کراتی	پھٹکڑیاں ۔ خواریاں، ذلتیں	گوری ۔ ایک راگنی کا نام ہے	ٹھٹول ۔ مذاق
ان ۔ حمیت، غیرت	جھکڑیاں ۔ خاردار درخت	بھیاس ۔ ایک راگنی کا نام ہے	چدر ۔ چادر
ست ۔ طاقت، خیر و برکت	پرے ۔ دوسری طرف منہ پھیر کر	بول بول ۔ منت مان کر	نجابت ۔ حسب نسب کی درستی
گزر گئی ۔ مر گئی	کلانوٹ ۔ گویا	حلال خوری ۔ مہترانی	ندان ۔ آخر کار

١٨۔ معجزہ حضرت علی علیہ السلام

بنی ۔ جنگل	جنی ۔ پیدا کرنا	جیب ۔ زبان	عنقریب ۔ قریب

بغبغا - آواز
شوم - بد بخت

قدیم - سلف، ہمیشہ سے
کھپاتی - زائل کرتی

کرم نہاد - بخشش کرنے والے، محسن

ناتمام - عاجز

۱۹- دوالی

دیا - چراغ
کھلونے - شکر کے کھلونے
گنڈے - پانچ کوڑی
گِرو - رہن

نکی موٹھ - ایک قسم جوے کی
نرد - چوسر کی گوٹ
زارا - تباہ حال
ازار - پاجامہ

نوگرہی - ایک زیور کا نام ہے
گھرڑوے - ملامت
جھونٹے - بال
خندی - چھنال

فیر - نشانہ لگانا
آڑے آنا - دستگیر ہونا
ٹھانیو - اختیار کرنا
بکھانیو - بیان کرنا

۲۰- حضرت سلیم چشتی

دوجہاں - دنیا و عقبیٰ
عرفان - تصوف، خداشناسی

لوا - جھنڈا، علم
مقتدا - پیشوا

مسلّم - ثابت
سالک - چلنے والے، شاگرد

تفاوت - فرق
دوجگ - دوجہاں

۲۱- ہُولی کی بہار

دف - ایک ایرانی باجا، ڈھول
دمکتے - روشن، چمکدار
چھکتے - مست

آہنگ - آواز، سُر
مُنہ چنگ - ایک مُنہ سے بجنے کا باجا
خوبوں - معشوق، حسین
ڈوبوں - شرابور

بھوئیے - بھانڈ، بھاؤ بتا کر ناچنے والے لونڈے
جھگڑا - ہنگام
پھکڑ - بدلگام، یاوہ گو
لکڑ - لکڑی کا بڑا موٹا ٹکڑا

جو آگ کے لئے سلگتا ہے۔
انتر پتھر - شرابور، لساہوا، غلطاں

۲۲- نانک شاہ گرو

آگاہ - عارف
جگ - دنیا
سیس - سر

نوا - جھکا کر
ارداس - عرض داشت
وچ - بیچ
دھیان - خیال

سیوک - خادم، پرستار
کاج - خواہش، آرزو
من - دل
گہتے - ہاتھ پکڑتے، دستگیری کرتے۔

چنتا - تردد، اضطراب
ہرتے - دور کرتے ہیں
وو - وہ

۲۳- جنم کنہیا جی

ریت - رسم و رواج
جنم - زمانہ
بالک - بچہ، طفل
منڈل - مکان
بتھا - رنج و غم
نچھتر - ساعت
اوتار - پیغمبر
سبھ - نیک سعد
گربھ - حمل
نارومن - روشن ضمیر
سشٹ - عالم

ابکار - حرکات، افعال
بل - زور
تیج - رعب
انیک - انواع اقسام
ڈیل - جسم
گج - ہاتھی
ترنگ - گھوڑے
نیکے - عمدہ، اعلیٰ
پاپی - گنہگار
کٹک دل - بے شمار فوج
بھج - شکل و شباہت

دوجا - دوسرا
بلی - قوی، طاقت ور
بان - تیر
بڑھ بل - مشہور طاقتور
دشٹ - بدذات، شیطان، ظالم
جدھہ - تعلی
موں - مجھ پہ
وا - اس
بول - باتیں
گربھ - غرور
سبھا - انجمن

پرکھ - عاقل، دانا
مارن ہارا - مارنے والا، قاتل
مورکھ - شیطان، گنہگار
ہنکار لیا - غرور کرنا، تعلی کرنا
بھو - ڈر، خوف
سگرے - سارے
بسرے - زائل ہوئے
مات پتا - ماں باپ
ناؤں - نام
ریکھا - لکیر

پاچھے - پیچھے، آخر میں
مارگ - چارہ، طریقہ
پھندا - جال
نکسن - نکلنے
رسوئی - طعام، کھانے پکانے کا مکان -
دوار - دروازہ
ہارے - والے
وا - وہ
چنڈال - بدذات، شیطان
پرگھٹ - پیدائش

اجالی - روشنی
گھیر - جمع کرنا
باشی - باشندے
دیا - عنایت
حال - فوراً
کرم - قسمت
مکھ - مُنہ
ایشر - خدا
سانکر - سانکل، زنجیر در، کنڈی
نربھو - بےخوف
تپنا - اضطراب، مصیبت

پگ - پاؤں
براجے - پہنچے، رونق افروز ہوئے
اجیالی - اُجالا
دیوے - چراغ
اچنبھا - عجیب بات
بھور - صبح
لجیایا - شرمایا
کارج - کام
ناری - عورت
جچا - زچہ
بلہاری - تصدق، نثار

نیگ - حق
بیر - بہن
تہارے - تمہارے
بڑھ بھاگی - خوش قسمت
موپر - مجھ
کرپا - نوازش
باگے - دو جوڑے جو مرد کو دئے جائیں
لوگ لگائی - مرد عورت
پرجاتے - خوش رکھتے

۲۴ بانسری

مرلی - بانسری
میت - محبت
بیاکلی - اضطراب بےچینی

کوڑھ - کُند ذہن
گُنی - عاقل
کانہ جی - کنہیا جی
گوالوں - چرواہوں
گوئیں - گائیں

بنسی - بانسری
پنچھی ٹوہی - چڑیوں کے نام ہیں
شیام جی - کرشن جی
مرار - بانسری

موہن - پیارے
جتن - طریقے، ڈھب
بچن درود
جل پون - پاؤں چلنے والا

۲۵- آگرہ کی تیراکی

پیرنے - تیرنے	بستار - ترتیب	چپو - کشتی	کشتی
رت - موسم	کرارے - کنارے	ڈونگے - سیر و تفریح کی	نواڑے - چھوٹی کشتی
سیانے - سمجھدار جواں	بجرے - کشتی	کشتی	مور - پھولوں کا گجرا
دل لگن - دلچسپی	ناؤ - بڑی کشتی	بنے - ایک قسم کی لمبی	تیر - کنارہ

۲۶- موسم زمستان

چلا - چلے کا جاڑا، سخت	مهاوٹ - ماگھ کی بارش	نیمہ - نیم آستین	چھب - طرحداری
سردی	باؤ - ہوا	جان - معشوقہ، نازنیں	

۲۷- اومس

اومس - سڑی گرمی	بٹ - سراسر	بدلی - بادل	آدھن - کھولتا ہوا پانی
	تاؤ - غصہ	آٹیں - بھریں، پُر کریں	

۲۸- کورا برتن

کھنکی - پڑی گری، جس سے	گولی - بڑا مٹکا	کھرا کھوٹا - فاسد خیالات	گڑھتے - بناتے
آواز پیدا ہوئی	مول - قیمت	کا ہجوم	جوبن - حسن
مات - شکست	ٹھٹولیاں - مذاق	عالم میں - حسین، پُر جمال	جو جرے - پرانے، استعمال شدہ

۲۹ - کوا اور ہرن کا بچہ

لگا - بھلا پھسلا
حذر - ڈر، پرہیز
بدسگال - بدمعاش بدوضع
لیٹ - زمین سے مل کر
جھپاک - فوراً جلدی سے
چیتا - چاہا

۳۰ - خواب کا طلسم

کرمی کرمی - بے غل وغش بکثرت
کھان - کان
جرمت - جرماو
ہڑبڑی - گھبراہٹ، ہیجان، اضطراب
لوٹ پوٹ - بے قابو بے تاب
بناؤ - سنگھار، آرائش
بھرن - بوچھاڑ، جھڑی
دھڑی - بیس سیر کثیر

۳۱ - ریچھ کا بچہ

سونٹا - ڈنڈا
جھولنا - جھولی
دُر - موتی، بندے
تیق - چیخ، ہاتھی کی آواز
ڈکاریں - آواز شتر
جنگلے - جنگل
سدھایا - رام کیا
ڈھپلی - ڈفلی
کہروا - ایک قسم کا ناچ
سحر - جادو

۳۲ - راکھی

راکھی - ایک قسم کا اون اور سنہری پھول کا ہار جو سلونوں کے دن باندھا جاتا ہے
باہمن - برہمن
دوانی - دیوانی
قشقہ - ٹیکا

۳۳ - سخاوت و عشرت

تن زیب - ایک قسم کا باریک کپڑا
نن سکھ - ایک قسم کا کپڑا

پاپی - کنجوس، بخیل
داتا - سخی
ڈنکا - شہرہ

من مانتا - خاطر خواہ
لٹن - قزماق، دیوث
خالصہ - کورٹ

ڈال - نقدی، زر
ان - کھانا، رزق

۳۴ - چاندنی رات

ہوڑیں - موہیں مارنا، ہچکولے لینا

گجر - صبح کا مسلسل گھنٹہ
دوچار - بے حجاب

فرار - غائب
بک نہ دھک - بے تانو

گمان
جیون میں - طبیعتوں میں

۳۵ - ہولی

خرسند - خوش
سج دھج - چلبلاپن، سنگھار
سوانگ - کسی کی صورت بنانا
مودلیا - چھین لیا

مردنگ - ایک قسم کا ڈھولک
جھڑ بیں - تار کی آواز
جاگہ - جگہ

عبیر - گلال
دھینگا مشتی - زبردستی مار دھاڑ کرنا
نوکا جھونکی - مذاق،

فقرہ بازیاں
چُہلوں - خوشی، شگفتگی
کامنیوں - کامنی، حسین، دلربا، نازک اندام عورت

۳۶ - جوگی نامہ

پھبن - زینت
ذقن - ٹھوڑی

بید - ایک درخت کا نام
تکلم - گفتگو

مُندرے - حلقے
سیلی - سیلاب

نمن - طرح
بھبوت - راکھ

پونگی - عام اصطلاح میں اس کو بین کہتے ہیں بین حالانکہ دوسری چیز ہے۔	پنتھ - گروہ	استھل - خانقاہ، اڈہ	بندھن - رشتہ، تعلق	نین - آنکھیں
ہر - خدا	برن - تھوک، جماعت، قبیلہ	مگن - خوش و خرم	جگران - جسم، بدن	اچپل - شوخ
درشن - دیدار	گیان - خدا کا وقوف، عرفان	ان بن - جھگڑا، الجھن	کٹھن - مشکل	آسن - نشست
سیلے - چادر، دوپٹہ	رمائی - لی	بیتم - معشوق	لگن - دھن	چھتر - شامیانہ
	لنگھن - فاقہ	اتیت - جوگیوں کی ایک قسم	اکسیر - امرت	سنگھاسن - چوکی، ایک قدیم سواری
	کارن - وجہ، سبب		قدح - پیالہ	

۳۷- جوگن نامہ

تونبہ - کشکول	پت - شوہر	کمتی - کمی	جلیو - جل جائے	بہاروں - جھاڑوں، صاف کروں
منکوں - تسبیح کے دانے	ساجن - معشوق	من - میرے	متوالا - سرشار، دیوانہ	
چندرماں - چاند	بیری - دشمن	شہانہ - شاہانہ	گنگ - گنگا	پیا - پیارے، عاشق

۳۸- موتی

میسر - تجھ				واریئے - قربان کیجیے، نثار کیجیے
نرموں - کان کی لو	دھگدگی - سینے کا ایک زیور	پور - انگلی کا پورا، ٹکڑا	لہنے - حصہ	

۴۰- اکبرآباد

جہاں تہاں - کسی کسی جگہ	عارض - رخسار	جعد - زلف	نبات - مصری

حَوَاشِی

۱۰- حواشی

(روایتی و ادبی نقطہ نظر سے)

۱- الٰہی نامہ

گنبدِ ازرق - نیلا آسمان۔ مشرقی نجوم اور قدیم فلسفے کی بنا پر آسمان کو گردش کرنے والا سمجھا جاتا ہے اور شعرا اس کو گنبد سے تشبیہ دیتے ہیں۔

لوح، قلم، عرش - قدیم عقیدہ ہے کہ یہ آسمان جو نظر آتا ہے یہ عرش ہے۔ اس پر ایک جگہ کرسی ہے اور کرسی پر لوحِ محفوظ ہے جس پر قرآن مجید اور دیگر کتب آسمانی یعنی زبور، توریت، انجیل وغیرہ منقوش ہیں۔ جس قلم نے ان کتب کو لوح پر تحریر کیا اسے قلمِ قدرت کہتے ہیں

عالمِ ارواح - وہ مقام جہاں مرنے کے بعد روحوں کا اجتماع ہوتا ہے۔

عالمِ جنّات - وہ مقام جو جنّات کا مسکن ہے۔

دارا و سکندر۔ مقدونیہ کے بادشاہ سکندر اعظم نے ایران قدیم پر حملہ کیا اور وہاں کے آتش پرست بادشاہ دارا سے اِس کی جنگ ہوئی۔ جس میں سکندر فتح مند ہوا اور دارا مغلوب۔ نظامی کی مشہور مثنوی سکندر نامہ میں یہ تاریخی فسانہ نہایت وضاحت کے ساتھ مرقوم ہے۔

مجنون لیلی۔ قیس جس کا لقب بعد کو مجنون ہوا عرب کا ضرب المثل عاشق ہے۔ یہ قبیلہ بنی عامر کا ایک فرد اور غالباً جناب امام حسن علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ لیلیٰ اس کی معشوقہ نجد کی رہنے والی تھی۔ جس پر یہ بچپن ہی میں مکتب میں عاشق ہو گیا تھا۔ یہ بدنصیب ناکام و نامراد مرا۔ عُشاق میں اِس کا نام اب بھی نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔

ع قیس سا پھر نہ اُٹھا کوئی بنی عامر میں

فرہاد و شیریں۔ ایران کے آتش پرست بادشاہ خسرو نے شیریں نگار ارمنی کی تصویر پر عاشق ہو کر اسے شادی کا پیغام دیا اور وہ اپنے ملک سے شادی کرنے کے لئے ایران آئی۔ شیریں کی ماں نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے واسطے پہلے محل و باغ و نہر تعمیر کرائے اُس وقت شادی کرنے پر رضامند ہو۔ چنانچہ اس نے اس کی فرمائش خسرو سے کی۔ خسرو نے فرہاد نامی سنگتراش کو بلا کر حکم دیا کہ بے ستون نامی پہاڑ سے "جوئے شیر" کاٹ کر لائے۔ فرہاد شیریں کو دیکھ کر عاشق ہو گیا اور اِسی عالم جنون و بدحواسی میں پہاڑ کاٹنا شروع کر دیا۔ یہ خبر شدہ شدہ خسرو کو پہونچی اِس نے بدنامی کے خیال سے فرہاد کو خفیہ قتل کرانے کی کوشش کی۔ یہ کام ایک پیرزن کے سپرد کیا گیا وہ اِس مقام پر پہونچی جہاں فرہاد شیریں کے عشق میں بہوت نہر کاٹ رہا تھا اور اس سے کہا کہ شیریں نے اپنی جان دیدی۔ دیوانہ عاشق کے لئے یہ تازیانہ کافی تھا۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی فرہاد نے تیشہ مار کر اپنا کام تمام کر لیا۔ جب یہ خبر شیریں کو پہونچی فرہاد کا تیر عشق اس کے جگر کے پار ہو گیا۔ اِس کی وفاداری اور صداقت عشق پر دیوانی ہو کر

شیریں نے بھی اپنے کو ہلاک کر لیا۔ فرہاد و شیریں کا وجود اب دنیا میں نہیں لیکن ان کی محبت کا فسانہ اب تک ہمارے تڑپانے کے لئے زندہ ہے۔

۲۔ برسات کی بہاریں

ا بہ ماہی۔ قدیم فلسفہ ہندوستان اس کا قائل ہے کہ سب سے نیچے پانی ہے اس پر ایک مچھلی قائم ہے اور اُس پر ایک گائے کھڑی ہوئی ہے اور گائے کے ایک سینگ پر دنیا قائم ہے چنانچہ جب گائے کا ایک سینگ تھک جاتا ہے تو وہ دوسرا بدلتی ہے اس طرح جو حرکت ہوتی ہے اس کا نام زلزلہ ہے۔ اس لئے اس محاورے کے یہ معنی ہیں کہ اوج کے اعلیٰ ترین نقطے ماہ سے لے کر حضیض کے پست ترین نقطے ماہی تک۔

۳۔ بنجارہ نامہ

ہ دارو اور گولا۔ زمانہ قدیم میں جب غنیم قلعہ پر حملہ کرتا تھا اور خندق کو پار کرکے دروازہ توڑنے پر آمادہ ہوتا تھا تو قلعہ کے اوپر سے اس پر بہت سے حملے کئے جاتے تھے۔ منجملہ ان کے گولے بھی مارے جاتے تھے اور سیسہ بھی پگھلا کر ڈالا جاتا تھا کہ ان باتوں سے مجبور ہو کر پسپا ہو جائے۔

۴۔ عاشق نامہ

م ۔ قدیم ترکی کا نام ہے۔

ب ۔ زنگبار افریقہ میں ایک ملک کا نام ہے۔

ج ۔ قدیم اسلامی نجوم کے مطابق آسمان پر بارہ برج ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں:۔ حمل، حوت، دلو، جدی

قوس، عقرب، میزان، سنبلہ، اسد، سرطان، جوزا، ثور۔

۵۔ آدمی نامہ

ابدال قطب غوث ولی } یہ تصوف کی اصطلاحیں اور مدارج عرفان کے نام ہیں۔ ابدال سب سے بڑے عارف کو کہتے ہیں اور یہ دنیا میں صرف چالیس ہوتے ہیں۔ غوث کا رتبہ ابدال سے کم ہے اور یہ بہت ہو سکتے ہیں۔ قطب کا مرتبہ غوث سے کم ہے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ تو سب مدارج عرفان اور تصوف کے عہدے ہیں، لیکن ولی کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔ ولایت عہدوں کے سلسلہ میں شامل نہیں لیکن فی نفسہ اعلیٰ تریں درجۂ فقر و تصوف ہے۔

فرعون۔ فراعنہ کے خاندان نے مدت دراز تک قدیم مصر پر حکومت کی ہے فرعون کسی فرد واحد کا نام نہیں بلکہ ایک خاندان کا لقب ہے اس خاندان کی لاشیں ممی بنی ہوئی اب تک مصر کے میناروں اور حفریات سے برآمد ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں جو فرعون بادشاہ تھا اس کا نام بعض مورخوں کے نزدیک رعمسیس تھا۔ اسے نجومیوں نے خبر دی کہ تو موسیٰؑ کے ہاتھ سے جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوگا مارا جائے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں جتنے بچے پیدا ہوتے تھے فرعون انھیں قتل کراتا تھا جب موسیٰؑ پیدا ہوئے تو ان کی ماں نے فرعون کے ڈر سے انھیں ایک صندوق میں بند کر کے ایک دریا میں چھوڑ دیا۔ خدا کی قدرت دیکھو فرعون کی زوجہ آسیا نے اپنے باغ سے صندوق کو دریا میں بہتا دیکھ کر نکلوا لیا۔ آسیا کے کوئی اولاد نہ تھی اس نے موسیٰؑ کو مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا۔ جب موسیٰ بڑے ہو کر پیغمبر ہوئے تو فرعون کو ہدایت فرمائی اور تلقین دین حق کرنی چاہی۔ فرعون نے قبول نہ کیا اور بڑے بڑے ساحروں سے حضرت موسیٰؑ کے مقابلے کرائے۔ آپ نے سب کو اپنے

عصا کے ذریعہ سے شکست دی۔ آخرکار فرعون سے جنگ کی نوبت آئی۔ بہت سی مرتبہ حضرت موسیٰ ہارے لیکن آخرکار غضب الٰہی فرعون اور اس کی فوج پر نازل ہوا اور دریائے نیل میں غرق کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ کو دو معجزے خداوند تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے ایک تو ید بیضا یعنی آپ کی کف دست مثل ماہتاب کے چمکتی تھی دوسرا عصا یعنی جب اپنی لکڑی کو زمین پر ڈال دیتے تھے تو سانپ کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

شدّاد ۔ کہتے ہیں کہ عاد کے دو بیٹے تھے شدّاد اور شدید اور یہ دونوں بادشاہ تھے۔ جب شدید مر گیا تو شدّاد سب ملکوں کا بادشاہ ہوا اور بہت سے بادشاہوں نے اس کی اطاعت اختیار کی۔ اس کا غرور یہاں تک بڑھا کہ خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت داؤد کو اس کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر تو ایمان لائے گا تو خدا تجھ کو بہشت عطا کرے گا۔ اس نے پوچھا بہشت کیا ہے، حضرت داؤد نے بہشت کے محاسن اس کے سامنے بیان کئے۔ اس نے جواب دیا کہ ایسا تو میں خود بنوا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے سرزمین یمن میں ایک بہشت تعمیر کرایا جس کا نام ارم رکھا۔ جس وقت وہ بن کر تیار ہوا اور شدّاد اس میں جانے لگا تو ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی اور داصل جہنم ہوا۔

نمرود ۔ اپنے زمانے کا بہت بڑا بادشاہ گزرا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اسی کے زمانے میں تھے۔ ان کا چچا آذر بت تراش اور بت پرست تھا۔ حضرت ابراہیم کو اس مذہب سے نفرت تھی۔ آخرکار نمرود نے ایک بہت بڑی آگ روشن کرا کے حضرت ابراہیم کو منجنیق میں رکھ کر اس میں پھکوایا۔ اس دوران میں تمام آسمانی فرشتے ایک ایک کر کے حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہمدردی کرنی چاہی لیکن آپ نے ہر ایک کی مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ کی مدد کے منتظر رہے۔ جس وقت آپ کو آگ میں پھینکا گیا۔ خداوند تعالیٰ نے

آگ کو سرد ہو جانے کا حکم دیا آگ سرد ہو گئی اور حضرت ابراہیم کو اس سے کوئی گزند نہ پہونچی۔

کلمہ ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ یہ مسلمانوں کے اعتقاد کا پہلا سبق اور جزو اعظم ہے۔

۷۔ روضۂ تاج گنج

دو مرقدیں۔ ممتاز محل اور شاہجہاں کی قبریں اس کے اندر ہیں لیکن درمیان میں ممتاز محل کی ہے اس لئے کہ صرف اسی کے لئے یہ مقبرہ تعمیر کرایا گیا تھا شاہجہاں کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے شاہجہاں کو بھی اسی میں ایک طرف دفن کرایا اور دوسرا تاج گنج بنوانا فضول خرچی سمجھ کر اس سے قطعی انکار کر دیا۔

خط طغرٰی۔ بہت سی قسم کے خط ہیں مثلاً خط نستعلیق، خط ثلث، خط گلزار وغیرہ وغیرہ منجملہ ان کے خط طغرٰی بھی ہے۔ تاج گنج کے دروازے پر یہی خط لکھا ہوا ہے۔

بُرج بسی۔ تسبیح خانہ کے قریب دریا کے کنارے جو بُرج ہے اس کو برج بسی کہتے ہیں۔

تاجدار شاہجہاں۔ مشہور ہے کہ ممتاز محل کے بعد شاہجہاں نے خواب دیکھا کہ ممتاز محل اس سے یہ فرمایش کر رہی ہے کہ اس کا مقبرہ ایسا بے عدیل بنوایا جائے جس کی مثال و نظیر دنیا میں کہیں نہ ہو۔ اس عالم خواب میں شاہجہاں نے وعدہ کر لیا۔ اس خواب کو دیکھے جب کئی روز ہو گئے تو ایک فقیر دربار میں آیا اور کہا کہ بابا بی بی کی وصیت بھول گیا، شاہجہاں نے کہا سائیں جی بھولا تو نہیں لیکن اس پریشانی میں ہوں کہ نقشہ کہاں سے لاؤں۔ فقیر نے یہ سن کر ایک ٹھیکری اس کے ہاتھ میں دیدی اور کہا کہ اس نقشہ کا بنوا دے، یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔ مشہور ہے کہ وہ فقیر فرشتہ تھا اور ممتاز محل کے مکان بہشتی کا نقشہ شاہجہاں کو دے کر غایب ہو گیا۔ چونکہ بہشت سے

نقشے پر بنا ہے اس لئے تاج میں یہ دلفریبی ہے۔

۹۔ ذکر مرغان

کُن فیکُون۔ یہ عربی کا فقرہ قرآن مجید میں ہے اس کے معنی یہ ہیں "ہوجا پس ہوگیا" اسلام کی کتاب آسمانی یعنی قرآن مجید میں ذکر ہے کہ خداوند عالم نے کائنات کو لفظ کن کہہ کر پیدا کیا اور فوراً تمام کائنات وجود میں آگئی۔

۱۰۔ فنا نامہ

گوہر۔ شہزادہ علی گوہر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بعد کو شاہ عالم کے نام سے بادشاہ ہوا۔

ماہی مراتب۔ اعزازی نشانات۔ یہ انگریزی "کوٹ آف آرمس" کا مترادف ہے۔

جم۔ ایران قدیم کے مشہور بادشاہ جمشید کے نام کا مخفف ہے۔ یہ آتش پرست تھا اور اسی نے جامِ جمشید بنوایا تھا۔

اکبر۔ خاندان مغلیہ کا مشہور و معروف شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر۔

نوشیرواں۔ ایران قدیم کا بادشاہ تھا، اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے ضرب المثل ہے، اس کا مذہب آتش پرستی تھا۔

راج بنسی۔ راجپوت، راجہ کے خاندان کا۔

چتوڑ گڈھ۔ ریاست اودے پور میں ایک مقام ہے جہاں ایک قدیم قلعہ بنا ہوا ہے، یہاں راجپوت راجاؤں کا ایک مشہور خاندان آباد ہے جو غایت شرافت سے اپنے آپ کو آفتاب نسب خیال کرتا ہے اور سورج بنسی کے لقب سے ملقب ہے۔ اس خاندان کے راجہ اپنے تئیں

رام چندر کی اولاد جانتے ہیں، سب سے پہلے چتوڑ گڈھ پر امون نے حملہ کیا مگر اس کا حملہ ناکام رہا، علاءالدین خلجی نے حملہ کرکے اس پر فتح حاصل کی، اس فتح کے بیسیوں قصے بن گئے انہی میں آلا اودل بھی ہے، دوسری فتح اکبر نے حاصل کی۔

ستارا۔ ستارا وہ جگہ ہے جہاں رام راجہ قلعہ جنجی سے بھاگ کر قلعہ بند ہوا مگر اورنگ زیب نے سنہ ۱۶۹۹ء میں بذات خاص اس کا محاصرہ کرکے چوتھے ہی مہینہ فتح کرلیا تاریخ فتح ستارا اپریل سنہ ۱۷۰۰ء ہے۔

کالنجر۔ بندیل کھنڈ کا ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ ہے جس کے محاصرے میں شیر شاہ کی جان گئی۔

پنج ہزاری۔ شاہان مغلیہ کے زمانہ میں پنج ہزاری ایک منصب تھا۔

امیر خاں۔ امیر خاں محمد شاہ رنگیلے کا مصاحب تھا اور بادشاہ کا بہت ہی منہ چڑھا تھا۔

ذوالفقار خاں۔ ذوالفقار خاں اورنگ زیب کا سپہ سالار تھا سنہ ۱۶۹۸ء میں قلعہ جنجی اس کے ہاتھ سے فتح ہوا۔

مخلدار خاں۔ دلی میں مخلدار خاں کا باغ شہر سے باہر چھاونی میں واقع ہے۔

ہانسی - مشہور تاریخی مقام ہے
حصار - مشہور تاریخی مقام ہے } یہ سب پنجاب میں ہیں۔
ٹھٹھہ - مشہور تاریخی مقام ہے

شہنواز خاں۔ یہ ناصر جنگ والی ریاست حیدرآباد کا مدار المہام تھا۔

سرفراز خاں۔ سرفراز خاں، شجاع الدین کا بیٹا اور مرشد قلی خاں کا پوتا تھا۔ سنہ ۱۷۳۹ء میں اپنے باپ کا جانشیں ہوا، نادر شاہ کا حملہ اسی کے زمانہ میں ہوا۔ جب نادر شاہ چلا گیا تو علی وردی خاں صوبہ دار بہار نے محمد شاہ کے وزیر کو کچھ دے لے کر بنگال کی صوبہ داری حاصل کرلی۔ سند

لے کر مرشد آباد پر چڑھ دوڑا، سرفراز خاں گولی سے مارا گیا، علی وردی خاں اس کی جگہ تخت پر بیٹھا اور خطبہ سکہ جاری کیا اور حسب وعدہ دہلی کو ایک کروڑ زر نقد اور ستر لاکھ کے جواہرات بطور نذر روانہ کئے۔

عیسیٰ ۔ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام۔ یہ بن باپ کے پیدا ہوئے مسلمان اور عیسائی دونوں ان کو پیغمبر سمجھتے ہیں۔ ان کا معجزہ یہ تھا کہ مردوں کو جلا دیتے تھے اس لئے ان کا لقب روح اللہ ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کو صلیب پر چڑھا دیا گیا لیکن مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کو خداوند عالم نے زندہ اُٹھا لیا اور اب چوتھے آسمان پر مقیم ہیں۔ حضرت امام مہدی آخر الزماں علیہ السلام کے ہمراہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔

لقمان ۔ لقمان زمانۂ قدیم کا ایک بہت بڑا حکیم اور فلسفی گزرا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا اور ۵۷۰ قبل مسیح میں اس نے کریسس نامی بادشاہ کی خواہش سے شہر سارڈس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈلفی کے باشندوں نے اس پر پیالہ چرانے کا جھوٹا الزام لگا کر اس کو ٹیلے سے سر کے بل نیچے گرا کر ہلاک کر ڈالا۔ لقمان بڑا نیک کردار اور مرتاض شخص تھا اس نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے مصائب اُٹھائے۔ سبق آموز حکایات کا ایک مجموعہ اس کی یادگار ہے اور اُس کی اہمیت اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ سقراط نے اپنی زہر خورانی سے پیشتر اپنی حیات کے باقی چند گھنٹے جیل خانہ میں اسی کتاب کے مطالعہ میں گزارے تھے۔ اہل اسلام اس کو نبی کا درجہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

افلاطون ۔ یونان قدیم کا ایک بڑا حکیم اور عظیم الشان فلسفی تھا، یہ سقراط کے ارشد تلامذہ میں تھا اور قدیم فلسفے کا موجد اور استاذ الاساتذہ سمجھا جاتا ہے۔

نانک ۔ گرو نانک سکھ مذہب کے موجد ہیں اس لئے سکھوں کے بہت بڑے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔

ان کا وطن پنجاب تھا اور یہ اورنگ زیب کے معاصر تھے۔

کبیر - یہ بنارس کے بہت بڑے برگزیدہ بزرگ اور عارف شاعر گزرے ہیں - ان کے اشعار اب ضرب المثل کا کام دیتے ہیں۔ دوہے، مثالوں اور کہاوتوں کے طور پر زبان زد خلائق ہیں - ان کا مذہب کسی کو معلوم نہیں، زندگی میں ہر فرقہ انھیں اپنے مذہب پر سمجھتا تھا۔ جب انتقال ہوا تو لاش پر ہندو مسلمانوں نے جھگڑا کیا اور اپنے اپنے مذہب کے مطابق تجہیز و تکفین کرنی چاہی جب چادر اٹھا کر دیکھی تو لاش غائب تھی صرف کچھ پھول ہاتھ آئے جو نصف ہندوؤں نے لیکر پھونک دیئے اور نصف مسلمانوں نے لے کر دفن کر دئے ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ہے اور محبت کی تلقین کرتا ہے۔ رابندرا ناتھ ٹیگور نے اس کا کچھ حصہ انگریزی میں ترجمہ کرکے شائع کرایا ہے۔

۱۳- بڑھاپا

یوسف ثانی - حضرت یوسف علیہ السلام بنی اسرائیل کے بڑے مشہور اور برگزیدہ پیغمبر اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ حسن و جمال میں اب تک ان کا ثانی کوئی پیدا نہیں ہوا۔ اس لئے حسینان عالم کو یوسف کے حسن سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ حضرت یعقوب ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے ان کے بھائیوں نے ان کو کنویں میں ڈھکیل دیا، خدا کی قدرت سے وہاں ان کو کوئی گزند نہ پہونچی اور ایک شخص نے باہر نکال لیا اور اپنا غلام بنایا۔ اور آخر کار یہ مصر میں فروخت ہوئے عزیز مصر کی زوجہ زلیخا ان پر عاشق ہوگئی جس کے دام فریب سے یہ بہ مشکل اپنے کو محفوظ رکھ سکے۔ عرصۂ دراز تک یہ مصر کے محبس میں قید رہے لیکن آخر کار مصر کے بادشاہ ہوئے۔ ان کا قصہ تفصیل کے ساتھ ملا جامی نے اپنی مشہور مثنوی

یوسف زلیخا میں لکھا ہے۔

خضر۔ حضرت خضر علیہ السلام اسلام کے بڑے جلیل القدر پیغمبر اور انبیاے اولوالعزم میں سے ہیں۔ ان کا علم زبردست اور وسیع ہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کو ان سے استفادہ کرنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ یہ اب تک زندہ سمجھے جاتے ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے لیکن عوام کی نظروں سے نہاں ہیں بھولے بھٹکوں کو راستہ بتانا ان کا کام ہے اور عالم آب خصوصاً ان کی حکومت میں سمجھا جاتا ہے۔

۱۶۔ کلجگ

کلجگ۔ ہندو فلسفے نے دنیا کی عمر چار حصوں میں تقسیم کی ہے ست یُگ، تریتا، دوآپر، اور کل یُگ۔ ست یگ بہترین زمانہ تھا۔ تریتا اور دُوآپر درمیانی لیکن کل یُگ (کل جگ) جو آج کل ہے بدترین زمانہ ہے۔ ہر زمانہ کی مدت بہت وسیع ہے جس کا صحیح حساب بتانا بہت مشکل ہے۔

۱۷۔ مُفلِسی

گوری
بھیاس } یہ دونوں راگنیوں کے نام ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظیر علم موسیقی اور اس کی اصطلاحوں سے خوب واقف تھے۔

۱۸۔ معجزہ حضرت علی علیہ السلام

علی۔ حضرت علی علیہ السلام اسلام کے وہ رکن اعظم ہیں جنہوں نے سب سے پہلے دعوت اسلام تیرہ سال کی عمر میں قبول کی۔ آپ جناب سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے چچازاد بھائی اور اُن جناب کے داماد تھے اسلام کی جڑ آپ کی ذات سے جمی اور ابتدا کی تمام لڑائیاں مثل بدر، خیبر، خندق وغیرہ سب محض آپ کی ذات سے فتح ہوئیں۔ اہل تشیع آپ کو آنحضرت کے بعد وصی رسول اور خلیفہ برحق جانتے ہیں۔ لیکن اہل تسنن چوتھا خلیفہ سمجھتے ہیں۔ نوروز کے دن آپ کو کوفہ میں ظاہری خلافت ملی۔ اس لئے اور موسمی تیوہار ہونے کی وجہ سے بھی ایران میں نوروز منایا جاتا ہے۔ اہل تصوف کے آپ سب سے بڑے پیشوا ہیں اور یہ فرقہ آپ کو سرچشمہ ولایت وتصوف گردانتا ہے۔

نجف اشرف۔ حضرت مولا علی علیہ السلام کی قبر اطہر نجف اشرف میں ہے جو عراق عرب کا ایک مشہور شہر ہے۔

حیدر صفدر۔ حضرت علی علیہ السلام نے عہد طفولیت میں ایک اژدہا چیر کر پھینک دیا تھا اس لئے آپ کا لقب حیدر ہوا اور چونکہ آپ ایسے شجاع یکتا تھے کہ تن تنہا صفوں کے منہ پھیر دیتے تھے اس لئے صفدر مشہور ہوئے۔

صاحب قنبر۔ حضرت قنبر حضرت مولا علی کے خادم اور ذوالجناح کے سائیس تھے اسلام میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور بڑے جلیل القدر بزرگ سمجھے جاتے ہیں حضرت علی علیہ السلام چونکہ قنبر کے آقا تھے اس لئے آپ کو صاحب قنبر بھی کنایتہً کہا جاتا ہے۔

شریف۔ نجف اشرف کے ملکی حاکم کو شریف کہتے ہیں۔

۱۹۔ دِوالی

دِوالی ۔ دِوالی ہندوؤں کا نہایت لطیف تیوہار ہے۔ آب وہوا پر اس کا خصوصاً نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ مکانوں کی صفائی لازمی طور پر کرائی جاتی ہے، شب کو چراغاں کیا جاتا ہے اور سیروں بلکہ منوں گھی اور خوشبودار مسالے بخورات کے لئے جلا دئے جاتے ہیں جس سے ہوا نہایت

صاف اور صحت پرور ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں جبکہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا شباب تھا یہاں کے مصور لڑکے اور لڑکیاں دوالی کے روز اپنی صنعتوں کے نمونے عوام کے سامنے پیش کرتے تھے اور بہترین تصویر کو انعام دیا جاتا تھا۔ یہ بات تو اب مفقود ہوگئی ہے لیکن تصویروں کی نمایش اب بھی ہوتی ہے کاش ہندوستان کا وہ عہد زریں پھر واپس آجائے اور اسی طرح آرٹ کی نمایش پھر ہونے لگے۔ دوالی کے دن لکشمی کی جو ہندو علم الاصنام میں دولت کی دیوی سمجھی جاتی ہے پرستش ہوتی ہے۔

۲۰۔ حضرت سلیم چشتی

حضرت سلیم چشتی۔ شیخ سلیم بن بہاؤ الدین چشتی فتح پور سیکری میں دفن ہیں اور ۲۹ رمضان کو آپ کا عرس ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جہانگیر آپ ہی کی دعا کی برکت سے پیدا ہوا تھا اس وجہ سے اکبر کو آپ سے خاص عقیدت تھی۔ آپ فریدی ہیں اور حضرت بابا فرید کی اولاد سے ہیں۔

فغفور۔ چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

خاقان۔ یہ بھی چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

سلیمان۔ حضرت سلیمان بن داؤد بہت بڑے پیغمبر اور جملہ خلائق کے بادشاہ تھے آپ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس پر کچھ اسمائے الٰہی کندہ تھے۔ اس کی وجہ سے تمام مخلوق آپ کے زیر فرمان تھی۔ آپ کا تخت بساط سلیمان ہمیشہ ہوا پر اڑا کرتا تھا۔ آصف بن برخیا جو قوم جن سے تھے آپ کے وزیر اعظم تھے۔ سبا کی شہزادی بلقیس کے حسن و جمال، تہذیب و شایستگی کا قصہ حضرت سلیمان نے ہدہد سے سن کر اس شاہزادی کو اپنے یہاں دعوت دی تھی۔ یہ شاہزادی خود بھی نہایت دولتمند اور بڑی جلیل القدر ملکہ تھی حضرت سلیمان کی بلقیس سے ملاقات ایک نہایت دلچسپ

تاریخی فسانہ ہے۔ آخر کار بلقیس نے ایمان قبول کیا اور حضرت سلیمانؑ کی زوجیت میں داخل ہوئی۔

۲۲۔ نانک شاہ گرو

واہ گرو واہ گرو۔ بابا نانک شاہ گرو کی تعریف کا فقرہ اور سکھوں کی قومی صدا ہے۔

۲۳۔ جنم کنھیّا جی

کنس ۔ کنس متھرا کا راجہ اور نہایت ظالم و بدکردار شخص تھا اِس کے اطوار راون کے سے تھے۔ یہ کرشن جی کا ماموں تھا۔ آخر کار کرشن جی کے ہاتھ سے مارا گیا کنس اور کرشن کا قصہ بالکل فرعون اور موسیٰ کا سا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں اور تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مشابہت نہایت پرلطف اور بار آور نکتہ ہے۔

بسدیو ۔ کرشن جی کے باپ کا نام ہے۔

دیوکی ۔ کرشن جی کی ماں کا نام ہے۔

روہنی ۔ ایک نچھتر کا نام ہے یعنی یہ اس ساعت سعد و نیک کا نام ہے جس میں کرشن جی پیدا ہوئے۔

گوکل ۔ ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے جو متھرا کے نزدیک ہے۔ یہ بہت بڑی تیرتھ کی جگہ ہے۔ کرشن جی کا بچپن اِسی مقام پر گزرا۔

نند ۔ اس شخص کا نام جس نے کرشن جی کی بطور باپ کے پرورش کی اس لئے اس کو رضاعی باپ سمجھنا چاہیئے۔

جسودا ۔ نند کی زوجہ کا نام ہے یہ کرشن جی کی رضاعی ماں تھی۔

دَودکاندے۔ ہندوؤں کی ایک قدیم رسم کا نام ہے۔ یہ اُس وقت کی جاتی ہے جب بچہ پہلی مرتبہ پاخانہ پھرتا ہے۔ دہی اور زعفران ملاکر بچہ کا مصنوعی پاخانہ بنایا جاتا ہے اور کورے مٹی کے برتنوں میں دودھ بھر کر رکھوایا جاتا ہے اور اس میں ہلدی پیس کر ملادی جاتی ہے تاکہ اس کا رنگ زرد ہوجائے۔ پھر اس دودھ کو تمام اہل خانہ غالباً ایک دوسرے پر چھڑکتے ہیں۔

۲۴۔ بانسری

رادھے۔ رادھا کرشن جی کی معشوقہ کا نام ہے۔

۲۵۔ آگرہ کی تیراکی

جھرنا۔ تاج گنج سے لنڈلہ تک تیر کر جاتے ہوئے درمیان میں ایک مقام پڑتا ہے جس کو جھرنا کہتے ہیں۔ وہاں ایک پل بنا ہوا ہے جسے جھرنے کا پل کہتے ہیں۔

سہجا کا پیالہ۔ سہجا کسی اُستاد تیراک کی لڑکی اور قوم کی ساقن تھی۔ اِس کو تیرنے کا بڑا شوق تھا، نوچندی کے میلہ میں سہجا حقہ لے کر جاتی تھی اور تیرنے کی حالت میں انھیں حقہ پلاتی جاتی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد تیراکوں نے اس کی یادگار میں ایک میلہ قائم کیا۔ جس کا نام پیالہ رکھا، سہجا کا انتقال چونکہ نوچندی جمعرات سے دو روز پیشتر یعنی منگل کو ہوا تھا اِس لئے یہ میلہ ہمیشہ منگل کو ہوتا ہے۔ جس مقام پر پہلے پہل سہجا کی فاتحہ خوانی تیراکوں نے کی تھی وہ مقام اب سہجا کے نام سے مشہور ہے اور سہجا مائی کا پیالہ کہلاتا ہے۔ شہباز کی رائے ہے کہ سہجا کسی امیر عورت کا نام تھا اور اس کا کوئی نالہ ہے۔ یہ قطعی غلط معلوم ہوتا ہے۔

چھتری۔ سہجا کے پیالے سے تھوڑی دور لب دریا ایک برج بنا ہوا ہے جسے چھتری کہتے ہیں۔ یہ آگرہ

کے کسی قدیمی سیٹھ نے جس کا نام جسونت تھا بنوائی ہے۔ اس مقام پر غالباً کوئی مندر یا معبد بنوانے کا قصد تھا جو کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا لیکن یہ چھتری اب تک موجود ہے۔

بُرج خونی ۔ آج کل یہ بُرج دریا کنارہ کی سڑک پر واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہاں سڑک نہ تھی بلکہ دریا اس سے ٹکراتا تھا۔ یہاں پانی اس قدر عمیق اور خطرناک تھا کہ اکثر اناڑی تیراک ڈوب جایا کرتے تھے اس لئے اس کا نام خونی بُرج مشہور ہو گیا۔

دارا کا چونترہ ۔ سید کے باغ اور آرام باغ کے درمیان شکستہ شاہی عمارات کا ایک سلسلہ ہے جس میں سے ایک دالان منہدم ہو کر پانی کے اندر بیٹھ گیا ہے اس دالان کی چھت مثل چبوترے کے ہو گئی ہے جو کبھی پانی کے اندر پوشیدہ اور کبھی نمایاں رہتی ہے۔ ممکن ہے یہاں پہلے دارا کا محل ہو اور اس مقام کو محل منہدم ہو جانے کے بعد دارا کا چونترا کہنے لگے ہوں۔

مہتاب باغ ۔ تاج گنج کے سامنے دوسرے کنارے پر ایک بُرج بنا ہوا ہے اس مقام کو تیراک مہتاب باغ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ غالباً کسی زمانہ میں یہاں باغ تھا اور وہ خصوصاً تاج گنج کے تیراکوں کی آماج گاہ بنا رہتا تھا۔ اس جگہ شاہجہاں اپنا مقبرہ بنوانا چاہتا تھا۔

سید ۔ جھرنے سے آگے لب دریا ایک قبر ہے جو سید شاہ صوفی کی مشہور ہے۔ سید سے مراد یہ مقام ہے۔ یہ مقام تاج گنج سے براہ آب ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے تیر کر ٹونڈلے جانے والے تیراک اس مقام پر دریا سے نکل آتے ہیں اور پھر ریل سے آگرہ واپس آتے ہیں۔

تُلسی ۔ تاج گنج اور جھرنے کے درمیان ایک باغیچہ ہے جو سیا چرن کی باغیچی کہلاتا ہے اس میں کوئی تلسی باوا رہتے تھے جنھیں تیراکوں سے بڑی محبت تھی۔ باوا ان لوگوں کے لئے بھنگ، تمباکو، چرس، آگ، پانی ہمیشہ مہیا رکھتے تھے، یہاں پرانے تیراک اکثر جایا کرتے تھے، تلسی باوا کے مرنے کے بعد ان کی سِل جس پر وہ بھنگ پیسا کرتے تھے بہت مشہور ہوئی۔

باغ حکیم۔ سبھا کے پیلے اور بلکیشر کے درمیان ایک باغ ہے جو حکیم کا باغ مشہور ہے یہاں ایک لانبی سفید قبر ہے جو غالباً کسی شاہی حکیم کی ہے۔ تیراکی کے میلہ کے دن یہاں رقص وسرود کی محفلیں بپا ہوتی اور تیراک یہاں کچھ دیر قیام کرتے ہیں۔

شیو داس کا چمن۔ جس مقام پر لب دریا کارخانے بنے ہوئے ہیں وہاں کسی زمانے میں ایک بہت بڑا باغ تھا جو رائے شیو داس کا بنایا ہوا تھا یہاں میلے کے دن رقص وسرود کی محفلیں قائم ہوتی تھیں۔ اور تیراک یہاں بھی تفریح کے لئے ٹھیرتے تھے۔ یہ باغ اب موجود نہیں لیکن یہ مقام اب بھی راشو داس کا چمن کہلاتا ہے جو یقیناً رائے شیو داس کی خرابی ہے۔

۲۸۔ کورا برتن

آب حیات۔ مشہور ہے کہ آب حیات وہ پانی ہے جس کو پی کر انسان کبھی نہیں مرتا۔ اس کا چشمہ ظلمات میں ہے۔ سکندر ذوالقرنین کو اس چشمے تک پہنچنے کی خواہش ہوئی لیکن کیونکر پہنچ سکتا تھا اس لئے کہ وہ تو نگاہوں سے پوشیدہ ہے آخر کار حضرت خضر کی رہبری سے وہاں پہنچا لیکن وہاں عجیب عبرتناک منظر نظر آیا۔ دیکھا سینکڑوں آدمی اپاہج بنے پڑے ہیں صرف سانس چل رہا ہے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ آب حیات پی کر یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو اس نے نہ پیا اور واپس چلا آیا۔

۲۹۔ کوّا اور ہرن کا بچّہ

کوّا اور ہرن۔ یہ قصہ اصل میں انوار سہیلی میں ہے۔ میاں نظیر نے خود اعتراف کیا ہے کہ یہ قصہ نثر میں تھا میں نے نظم کیا ہے۔

۳۴۔ چاندنی رات

ارم — ارم ایک بہشت کا نام ہے۔ ارم دراصل اس بہشت کا نام ہے جو شدّاد نے دنیا میں تعمیر کرایا تھا شدّاد کے واصل جہنم ہونے کے بعد اس کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

۳۶۔ جوگی نامہ

بندرابن۔ متھرا کے نزدیک ایک مشہور پرستش گاہ اور تیرتھ کا مقام ہے۔

آدم — ابوالبشر حضرت آدم کو خداوند تعالیٰ نے مٹی سے بنایا اور ان کی زوجہ حوا کو ان کی بائیں پسلی سے پیدا کیا۔ ابلیس کو حکم ہوا کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کرے لیکن اس نے انکار کیا۔ اِس لئے اس کو راندہ درگاہ کر دیا گیا اور مردود خلائق قرار پایا اور شیطان کے نام سے مشہور ہوا۔ حضرت آدم کو بہشت میں سوائے گندم کے جملہ میوہ جات کھانے کا حکم تھا۔ شیطان کی اب یہ کوشش ہوئی کہ آپ کو کسی طرح گیہوں کھلائے۔ پہلے

اس نے حضرت حوّا کو بہکایا اور اُن کے ذریعے اسے حضرت آدمؑ کو گیہوں کھلانا چاہا۔ لیکن ناکامیاب ہوا۔ کئی ناکامیوں کے بعد آخر کار ایک مرتبہ شیطان حضرت آدمؑ کو فریب دینے میں کامیاب ہوا اور اُنھیں گیہوں کھلا دیا۔ اس ترک اولیٰ کی بنا پر حضرت آدم اور حوّا بہشت سے نکال کر دنیا پر ڈال دیے گئے اور دونوں کو علیحدہ علیحدہ مقام پر رکھا گیا ایک مدت کے فراق اور بڑی آہ و زاری کے بعد دونوں کو ایک دوسرے کی ملاقات نصیب ہوئی۔ بنی نوع انسان ان ہی کی نسل سے ہے۔

۳۷۔ جوگن نامہ

کاشی ۔ بنارس کا قدیم نام ہے۔ یہ ہندوؤں کا بڑا مقدس شہر، پرستش گاہ اور تیرتھ ہے، یہ زمانہ قدیم میں بہت بڑا دارالعلوم تھا۔ اب بھی سنسکرت کے بڑے بڑے علما اور جوتشی یہاں رہتے ہیں۔ اس مقام پر شیخ علی حزیں کی قبر ہے۔

دکن ۔ شاہی زمانہ میں دکن نہایت دور دراز جگہ سمجھی جاتی تھی۔

۳۸۔ موتی

موتی ۔ موتی، میاں نظیر کی معشوقہ کا نام تھا۔ یہ شہباز کی تحقیق ہے اور غالباً صحیح ہے۔

۴۰- اکبر آباد

اکبر آباد- آگرہ کا قدیمی نام ہے۔ یہ مقام اکبر کو بہت پسند تھا اور اسی نے اس کو آباد کیا اور اُسی زمانہ سے اس کا نام اکبر آباد پڑا۔ پُرانا آگرہ جمنا کے بائیں کنارے پر ہے اور اب صرف ایک محلہ کی حیثیت رکھتا ہے، کوئی جانتا بھی نہیں کہ اکبر کے بسانے سے پیشتر آگرہ اس طرف آباد تھا۔

عنوانات کا انڈیکس

۱۱۔ عنوانات کا انڈیکس

(اشاریہ)

خاتمہ

دہلی
نوشتۂ حفیظ اکبرآبادی